ایچ اقبال کلیکشن

(سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ کی شاہکار کہانیاں)

(2)

ایچ اقبال کلیکشن

(سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ کی شاہکار کہانیاں)

(2)

ہیروں کا مدفن

جنگ دل ربا

جنون

پرخار راستے

شکستہ گڑیا

زخمی محبت

طویل لمحوں کے انتظار کے بعد آپ کے پسندیدہ مصنف ایچ اقبال کی خوبصورت تحریر

ہیروں کا مدفن

ایچ اقبال

دولت دنیا کی واحد شے ہے، جس سے مثبت اور منفی دونوں طرح کے رویے وابستہ ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی دولت کا استعمال مثبت طریقے سے کرتے ہیں اور ان کے کئے گئے کام ان کے مرنے کے بعد بھی جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کچھ لوگ اسی دولت کو نہایت بے دردی سے ایسے کاموں میں صرف کرتے ہیں جس کا خمیازہ نہ صرف ان کو بلکہ بعد کی نسلوں کو بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے گرد گھومتی کہانی جو اپنے اپنے انداز سے اپنی دولت کو برت رہے تھے۔

ان شاہکار کہانیوں میں سے ایک جو تادیر دلوں پر راج کرتی ہیں

چٹانی پگڈنڈیوں پر شنتال اک شانِ بے پروائی سے اچھلتی کودتی نشیب میں اتر رہی تھی جدھر کوئی میل بھر کے فاصلے پر اس کا گاؤں تھا۔ وہ پھول دار کپڑے کی شلوار اور اسی کپڑے کے لمبے جمپر پر ہلکی سی کوٹی بھی پہنے ہوئے تھی۔ شہد جیسے رنگ کے گھنے بالوں کی دو چٹیاں اس کے سینے پر متحرک تھیں۔ گداز اور سرخ و سفید پیر ننگے تھے۔ جب بھی وہ اس پہاڑ پر چڑھتی، اپنی چپلیں نیچے ہی ایک جھاڑی میں چھپا آتی تھی۔

نشیب میں اترتے ہوئے وہ کوئی لوک گیت بھی گنگنا رہی تھی۔ اس کے گلے میں پڑا ہوا دوپٹا ہوا سے لہرا رہا تھا۔ وہ خود بھی اسی طرح لہراتی، جھومتی سی لگ رہی تھی۔ اس کے الھڑ انداز میں اپنے وجود سے خطرناک حد تک غفلت تھی۔ شاید اس نے کبھی خود کو اس طرح محسوس نہیں کیا تھا جیسے دوسرے دیکھنے والے محسوس کر سکتے تھے۔ اس کا حسن و شباب پندرہ سال کی عمر میں ہی ان چٹانوں سے زیادہ مضبوط اور پہاڑ کی چوٹیوں سے زیادہ سرکش ہو چکا تھا۔

مغرب کی طرف جھکتے ہوئے سورج کی کرنیں چٹانوں پر نارنجی رنگ بکھیر رہی تھیں۔ اس رنگ میں شنتال کے سرخ و سفید عارض بھی دہکے ہوئے.... لگ رہے تھے۔

کچھ نیچے ایک چٹان پر کھڑا ہوا زمام خان ہوس ناک نظروں سے، نیچے آتی ہوئی شنتال کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ وہ بھوری شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ پیروں میں خاصے موٹے سول کی چپلیں تھیں۔ چھوٹے چھوٹے سفید دائروں والا سرخ رومال اس کے گلے میں پڑا ہوا تھا جس کے سرے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھے تھے۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی خباثت آمیز چمک اس کے دل کی تمام خباثتیں آشکارا کر رہی تھی۔

شنتال اپنی دھن میں مست نیچے اترتی رہی۔ جب کوئی اپنے آپ سے ہی بے خبری کے عالم میں ہو تو دوسرے سے باخبر کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ اس وقت چونکی جب زمام خان اس کے بالکل سامنے آ گیا۔ وہ ٹھٹک کر رکی۔ اس کی گنگناہٹ کو ایک جھٹکا سا لگ گیا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو زمام خاناں؟'' شنتال نے اپنی سبزی مائل سیاہ آنکھیں اس طرح نچائیں جیسے اپنی زبان پر آنے والا سوال اپنی آنکھوں سے بھی دہرا رہی ہو۔

زمام خان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی ''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''میں تو اوپر سے آ رہی ہوں۔'' شنتال نے اپنے سینے پر متحرک ایک چوٹی جھٹکے سے اپنی پیٹھ پر ڈالی۔

''اور میں تمہیں اوپر سے آتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔''

''شہر سے آنے کے بعد یہاں تمہیں کوئی کام نہیں کرنا ہے کیا؟'' شنتال اسے گھورتے ہوئے بولی ''ہر وقت بس ادھر ادھر گھومتے رہتے ہو!''

''تم بھی تو روزانہ یہاں آتی ہو، کئی کئی گھنٹے اوپر رہتی ہو۔''

شنتال چونکی۔ ''تم بھی روزانہ یہاں آتے ہو؟''

''تین دن سے تو آ رہا ہوں۔ اوپر تم نہ جانے کہاں جاتی ہو۔ آج میں بھی تمہارے پیچھے اوپر چڑھا تھا۔ تم اچانک نہ جانے کہاں غائب ہو گئیں!''



شنتال چونکی تھی' اس کے دل کی دھڑکنیں بھی کچھ تیز ہوئیں' اور اس نے زمام خان کو گھورا بھی۔

زمام خان نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''تم غائب ہو گئیں تو میں نیچے آ گیا۔ تین گھنٹے سے یہیں کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

''کیوں؟'' شنتال اسے گھورتی رہی۔

زمام خان نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا اور مسکراتے ہوئے بولا ''کسی دن مجھے بھی اپنے ساتھ اوپر لے چلو!''

''کیوں لے چلوں؟''

''بس!... سمجھ لینا' میں تمہارا دوست بن گیا ہوں۔'' شنتال کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''کیا تم پاگل ہو گئے ہو زمام خاناں ؟ لڑکیوں کی بس سہیلیاں ہوتی ہیں۔ دوست لڑکوں کے ہوتے ہیں۔ تمہیں اتنا بھی نہیں پتا؟''

زمام خان کی للچائی ہوئی نظریں شنتال کی ٹھوڑی کے نیچے بھٹک رہی تھیں۔ وہ بولا ''شہر میں لڑکے لڑکیاں بھی آپس میں میل جول رکھتے ہیں' ایک دوسرے کے دوست بنتے ہیں۔''

''یہ شہر نہیں ہے زمام خاناں!'' شنتال نے منہ بنایا۔ ''شہر کی باتیں نہ کرو مجھ سے! فقیر راجا نے مجھے بتایا تھا کہ شہروں میں برے لوگ زیادہ ہوتے ہیں۔''

''فقیر راجا کبھی شہر نہیں گیا' اسے کیا معلوم؟ وہ تو بس گاؤں گاؤں گھومتا رہتا ہے۔ میں تو پانچ سال شہر میں رہ کر آیا ہوں۔ جب میں گیا تھا تو...'' زمام خان نے اپنی شیطانی آنکھوں سے شنتال کا سراپا کریدنے کی کوشش کی۔ ''تم ایسی نہیں تھیں!''

شنتال کو اچانک خیال آیا کہ وہ یہاں کھڑی ہو کر زمام خان سے باتیں کیوں کرنے لگی۔ یہ شخص نہ جانے کیوں اسے کبھی اچھا نہیں لگا تھا۔

''دیکھو!'' وہ تنبیہ کرنے والے انداز میں بولی۔ ''پھر کبھی میرا پیچھا نہیں کرنا۔''

شنتال نے جواب سنے بغیر آگے بڑھ جانا چاہا تھا لیکن زمام خان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

معصوم شنتال مرد عورت کے تعلق کے بارے میں گاؤں کی چند لڑکیوں سے کچھ مبہم باتیں سن چکی تھی مگر انہیں پوری طرح سمجھ نہیں سکی تھی' پھر بھی زمام خان کی یہ حرکت اسے بری لگی۔ اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور زمام خان کو خوں خوار نظروں سے دیکھنے لگی۔

''میں بابا سے کہہ دوں گی زمام خاناں!''

''ارے!'' زمام خان کچھ گھبرا گیا۔ ''اتنی سی بات بابا سے کہنے کی کیا ضرورت ہے!''

''بات جیسی بھی ہو' مجھے بری لگے گی تو بابا کو ضرور بتاؤں گی۔'' شنتال نے جھٹکے سے اپنی دوسری چوٹی بھی پیٹھ پر ڈال لی اور آگے بڑھ گئی۔

زمام خان اپنی جگہ کھڑا اسے گھورتا رہ گیا۔ وہ دائیں ہاتھ سے اپنی ٹھوڑی مسلتا ہوا بڑبڑایا تھا۔ ''کسی دن تو آؤ گی تم میرے جال میں!''

شنتال نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ کچھ فکر مند ہو گئی تھی۔ اس کی دانست میں ضروری ہو گیا تھا کہ اب وہ جب بھی اوپر جائے' اردگرد کا پورا خیال رکھے۔ زمام خان کی وجہ سے اب چوکنا رہنا اس کے لیے لازم تھا۔ وہ اپنے ''راز'' میں کسی کو بھی شریک نہیں کر سکتی تھی۔

نیچے اتر کر اس نے ایک جھاڑی میں سے اپنی چپلیں نکالیں۔ دو فیتے کی چپل پر گلاب جیسا ایک بڑا پھول بنا ہوا تھا۔

گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں علاقے کے روایتی لباس میں نظر آتی تھیں اور زیادہ تر ننگے پیر رہتی تھیں لیکن شنتال کی وضع قطع ان سب سے مختلف نظر آتی تھی۔ وہ گاؤں کے ایک ''بڑے آدمی'' افضال خان کی بیٹی تھی۔ افضال خان قبیلے کے سردار کا بہت قریبی دوست بھی تھا۔ اسی لیے شنتال کی دھمکی نے زمام خان کو تھوڑا سا ڈرا دیا تھا۔

چپلیں پہن کر شنتال تیزی سے گاؤں کی طرف چل پڑی۔ اسے اندھیرا پھیلنے سے پہلے اپنے گھر پہنچنا تھا ورنہ اسے اپنی سوتیلی ماں کی بک بک جھک جھک کا سامنا کرنا پڑتا۔ چند سال پہلے کی طرح اب وہ اپنی سوتیلی ماں سے خوف زدہ تو نہیں رہتی تھی لیکن تصادم سے گریز اب اس کے مزاج کا ایک حصہ بن گیا تھا۔

تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے اس کے قدم اس وقت ذرا ٹھٹکے جب اس نے قریبی گاؤں سے اپنے گاؤں کی طرف آنے والی کچی سڑک پر دھول اڑتے دیکھی۔ پھر اسے وہ جیپ بھی نظر آ گئی جس کی وجہ سے دھول اڑ رہی تھی۔

ڈاکٹر باجی آ رہی ہیں' شنتال کو خیال آیا اور اس کے ہونٹوں پر بچوں جیسی معصوم مسکراہٹ آ گئی۔

بچوں کی مسکراہٹ میں کوئی مقصد' کوئی مصلحت نہیں ہوتی۔

پل بھر کے لیے ٹھٹکنے کے بعد شنتال نے اپنی رفتار پہلے

سے کچھ زیادہ کردی۔ اس سے پہلے کہ جیپ گزر جاتی' وہ کچے راستے کے قریب پہنچ جانا چاہتی تھی تاکہ ڈاکٹر نائلہ کو سلام کر سکے۔ وہ نائلہ کو بہت پسند کرتی تھی۔

☆☆☆

نائلہ کا تعلق ایک نہایت آسودہ حال اور ماڈرن گھرانے سے تھا۔ اس کے والد شہر کے چند بڑے تاجروں میں سے ایک تھے۔ ان کا آبائی گھر اسٹیٹ آباد میں تھا۔ دولت انہیں میراث میں ملی تھی۔ وہ خود بھی تعلیم یافتہ تھے اور اپنے بچوں کو بھی انہوں نے تجارت کی طرف راغب کرنے سے پہلے بہتر سے بہتر تعلیم دلانا ضروری سمجھا۔ نائلہ کے دونوں بڑے بھائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد تجارت کے میدان میں باپ کے دست و بازو بن گئے۔ نائلہ اپنے دونوں بھائیوں سے چھوٹی تھی۔ اس نے جب میڈیکل میں داخلہ لیا تھا' تبھی اپنی اس خواہش کا اظہار کر دیا تھا کہ ڈاکٹر بننے کے بعد وہ اپنے وطن کے ان پس ماندہ اور غریب لوگوں کی خدمت کرے گی جو بڑے شہروں سے کوسوں دور چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہنے کے باعث مناسب طبی سہولتوں سے بھی محروم رہتے ہیں۔

پندرہ ماہ قبل وہ ڈاکٹر بن کر امریکا سے لوٹی تھی۔ تجربات حاصل کرنے کے لیے وہ سال بھر تک ایک بڑے ہاسپٹل سے وابستہ رہی تھی۔ اس نے ابتدا میں جو کچھ سوچا تھا' اس پر عمل بھی کرنا چاہتی تھی۔ ایک ماڈرن اور دولت مند گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود اس میں وہ خُو بُو نام کو نہیں تھی جو اس طبقے کی لڑکیوں میں کثرت سے پائی جاتی ہے۔ مشرقی روایات اور اپنی معاشرت وہ امریکا جیسے ملک میں رہ کر بھی نہیں بھولی تھی اور غریبوں سے محبت کا جذبہ اس کی نس نس میں رچا بسا ہوا تھا۔ اپنی خواہش کی تکمیل کرتے ہوئے اسے دو ماہ سے کچھ زیادہ دن گزر چکے تھے۔ اس نے اپنا مستقل مرکز تو شنتال کے گاؤں میں بنایا تھا لیکن آس پاس کے چند اور دیہات بھی اس کی توجہ سے محروم نہیں رہے تھے۔ یہ دیہات ملک کے شمال میں فلک بوس پہاڑوں سے گھرے ہوئے تھے۔ نائلہ صبح ناشتے کے بعد فوراً مصروف ہو جاتی تھی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹا شنتال کے گاؤں میں مریضوں کی دیکھ بھال میں گزارنے کے بعد وہ جیپ میں بیٹھ کر قریب کے ایک اور گاؤں میں چلی جاتی۔ وہاں ایک ڈیڑھ گھنٹا گزار کر کسی اور گاؤں کا رخ کرتی۔ اس طرح دن بھر میں پانچ گاؤں کے مریض اس کی مسیحائی سے مستفید ہوتے تھے۔ قدرت نے اس کے ہاتھ میں کچھ زیادہ شفا غالباً اسی لیے دی

جواب شکوہ

باپ نے ہچکچاتے ہوئے بیٹی سے کہا ''تمہارا منگیتر ہمارے ہاں آتا ہے تو بہت رات گئے تک بیٹھا رہتا ہے۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ کیا تمہاری ممی نے اس سلسلے میں تم سے کوئی بات نہیں کی؟''

''جی ہاں پاپا......! انہوں نے بات کی تو تھی۔'' لڑکی نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا ''وہ کہہ رہی تھیں، زمانہ بدل گیا...... مگر مرد بالکل نہیں بدلے۔''

تھی کہ اس کے دل میں غریبوں کا درد تھا۔

اندھیرا پھیلنے تک وہ اپنے مرکز' شنتال کے گاؤں کی طرف لوٹ آتی۔ رہنے کے لیے اسے قریب ہی ایک ڈاک بنگلا مل گیا تھا۔ جہاں اس نے دواؤں کا ایک بہت بڑا اسٹور بھی بنالیا تھا۔ وہاں اتنی قیمتی دوائیں بھی تھیں۔ جنہیں خریدنے کی استطاعت شہروں میں رہنے والے ایک بڑے طبقے میں بھی نہیں ہوتی۔

نائلہ اس شام اپنے مستقر ہی کی طرف لوٹ رہی تھی جب اس نے دور سے ہی شنتال کو دیکھ لیا۔ اتنی دور سے نقش و نگار دکھائی نہیں دے سکتے تھے لیکن اپنی وضع قطع کے اعتبار سے شنتال گاؤں کی تمام عورتوں اور لڑکیوں سے مختلف نظر آتی تھی۔

نائلہ جب پہلے پہل یہاں آئی تھی' انہی دنوں میں شنتال کے باپ کو بخار ہوا تھا۔ اس کے وسائل اتنے تھے کہ وہ شہر جا کر بھی اپنا علاج کروا سکتا تھا لیکن نائلہ خود ہی اسے دیکھنے اس کے گھر پہنچ گئی تھی۔ اس نے پہلے ہی دن سے اپنا وتیرہ بنالیا تھا کہ ایک مریض کو دیکھتی تھی تو اس سے اس کے جاننے والوں کا حال احوال بھی پوچھا کرتی تھی۔ کسی کی بیماری کے بارے میں معلوم ہوتا تو خود اسے دیکھنے پہنچ جاتی تھی۔ اس میں یہ امتیاز بھی نہیں ہوتا تھا کہ بیمار گاؤں کا کوئی آسودہ حال شخص ہے یا کوئی غریب کسان!

تین دن میں شنتال کے باپ کی طبیعت ٹھیک ہوگئی تھی۔ اسے دیکھنے کے لیے نائلہ کو صرف ایک دن جانا پڑا تھا۔ باقی دو دنوں میں اس کی دوا لینے شنتال اس کے ''کلینک'' آتی رہی تھی۔

دو کمروں کا ایک معمولی سا کلینک گاؤں میں نائلہ نے

خود بنوایا تھا۔ دو کیا' اسے ڈیڑھ کمرا کہا جاسکتا تھا۔ کلینک کے اس ایک تہائی حصے میں دوائیں رکھی جاتی تھیں۔ رات کو کمپاؤنڈر وہیں سو بھی جاتا تھا۔

ان دیہاتوں میں مریضوں کی وہ اکثریت نہیں تھی جو شہروں میں ہوتی ہے۔ نائلہ سب کچھ خود بھی کرسکتی تھی۔ بس احتیاطاً ہی وہ ایک کمپاؤنڈر پشاور سے اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ وہ صرف اس لحاظ سے نائلہ کے لیے مفید ثابت ہوا کہ اگر کسی مریض کو اس کے گھر جاکر انجکشن لگانا ضروری ہوتا تھا تو وہ کمپاؤنڈر کو بھیج دیا کرتی تھی۔ جب وہ دوسرے دیہات کا رخ کرتی تو بھی وہ کمپاؤنڈر اس کے ساتھ ہی رہتا۔ اس کا نام باذل تھا۔

شنتال نے جب پہلے دن نائلہ کو ڈاکٹر باجی کہا تھا' تبھی وہ خوب صورت اور پیاری لڑکی نائلہ کے دل پر اپنا اثر چھوڑ گئی تھی۔ بعد کے دو دنوں میں جب وہ دوا لینے آئی تو اس کی سیدھی سادی باتوں نے نائلہ کے دل پر اپنا اثر کچھ اور گہرا کیا۔ پھر وہ تیسرے دن بھی آئی تھی اور اس نے بتایا تھا کہ اس کے باپ کی طبیعت اب بالکل ٹھیک تھی۔ دوا کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

شنتال کو کھٹی چیزیں کھانے سے کچھ زیادہ ہی رغبت تھی اس لیے وہ اکثر کھانسی میں مبتلا ہوجاتی تھی۔ دو مہینوں میں وہ اپنی کھانسی کی دوا لینے چھ سات مرتبہ نائلہ کے پاس گئی تھی۔ نائلہ نے اسے سمجھایا بھی تھا کہ وہ کھٹی چیزیں نہ کھایا کرے۔

''تو پھر اور کیا کھاؤں ڈاکٹر باجی!'' وہ معصومیت سے پوچھ بیٹھی۔ ''ایسی کوئی چیز مجھے اچھی ہی نہیں لگتی جو کھٹی نہ ہو۔''

شنتال کا اندازِ گویائی ایسا تھا کہ نائلہ بے اختیار ہنس پڑی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ یہ لڑکی واقعی اس کی نصیحت ہرگز نہیں مانے گی اس لیے اس نے روزانہ کھانے کے لیے شنتال کو ایسی دوا دے دی تھی کہ اس کی کھٹی چیزیں کھانے کی رغبت کم سے کم ہوجائے۔

اس وقت وہ کچے راستے پر ایک طرف کھڑی دکھائی دی تو نائلہ نے شوفر سے کہا کہ جیپ وہ شنتال کے قریب روکے۔

نائلہ جیپ کی پچھلی نشست پر تھی۔ اس کے ساتھ اس کا کمپاؤنڈر باذل بھی تھا۔ اگلی سیٹ پر شوفر کے برابر میں اس کا باڈی گارڈ بیٹھا تھا۔ وہ دونوں نائلہ کے خاندانی ملازم تھے۔ نائلہ کے باپ ہی نے ان دونوں کو نائلہ کے پاس بھیجا تھا۔ اپنے نمک خواروں میں وہ ان دونوں پر سب سے زیادہ اعتماد کرسکتا تھا۔

شوفر نے جیپ شنتال کے بالکل قریب روکی۔

''سلام ڈاکٹر باجی!'' شنتال کا ہاتھ سیلوٹ کرنے والے انداز میں پیشانی تک گیا۔ نہ جانے کیوں وہ صرف نائلہ ہی کو اس طرح سلام کیا کرتی تھی۔

''وعلیکم السلام۔'' نائلہ نے جواب دیا اور بڑی محبت سے پوچھا۔ ''یہاں اس وقت کیا کررہی ہو؟''

''گھر جارہی ہوں ڈاکٹر باجی!'' شنتال نے یہ بتانے سے دانستہ گریز کیا تھا کہ وہ کہاں سے آرہی تھی۔ اس نے کہا ''بس آپ کی جیپ دیکھی تو آپ کو سلام کرنے کے لیے رک گئی۔''

''آؤ' جیپ میں آجاؤ۔'' نائلہ نے کہا ''تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ دوں گی۔''

''جیپ میں تو میں کبھی نہیں بیٹھی۔'' شنتال نے کچھ اس انداز میں کہا جیسے جیپ میں نہ بیٹھنا اس کی زندگی کی کوئی محرومی ہو۔

''تو آؤ' آج بیٹھ جاؤ۔'' نائلہ مسکرائی۔

شنتال جلدی سے جیپ میں بیٹھ گئی۔ نائلہ نے اسے اپنے دائیں ہاتھ پر بٹھالیا۔ بائیں ہاتھ پر تیس سالہ باذل بیٹھا تھا۔

جیپ چل پڑی۔

☆☆☆

ناصر ایک پرانے دوست سولجر کے ساتھ ایبٹ آباد کے ایک مکان میں داخل ہوا جہاں وہ پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ وہاں اسے سولجر لایا تھا۔ ناصر کے اس دوست کا اصل نام تو کچھ اور تھا لیکن اب تو پولیس کی بلیک لسٹ میں بھی اس کا نام سولجر ہی تھا۔ اس کے نام میں یہ تبدیلی اس لیے آئی تھی کہ ایک زمانے میں وہ فوج میں جانے کا شدید خواہش مند تھا۔ ہمیشہ اس نے یہ دعوے بھی کیے تھے کہ وہ فوج میں کسی اعلیٰ منصب تک ترقی کرے گا لیکن میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد اس نے فوج میں جانا چاہا تو اسے پہلے ہی مرحلے میں فوج کے لیے نااہل قرار دے دیا گیا۔ اس نے کسی کو اپنی نااہلی کا سبب نہیں بتایا تھا۔ دوستوں کو اس کی نااہلی کا سبب جاننے سے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ ایک موقع پر کسی نے اسے چھیڑنے کے لیے اسے ''سولجر'' کہہ کر مخاطب کیا تو دوسرے بھی اسے اسی طرح چھیڑنے لگے۔ خیر یہ چھیڑ چھاڑ اس حد تک بڑھی کہ اس کا نام سولجر ہی پڑگیا۔

فوج میں جگہ نہ ملنے سے وہ بہت دل برداشتہ تھا۔ بی اے تک اس نے بڑی بے دلی سے تعلیم حاصل کی تھی اور اس

کے بعد نہ جانے کس طرح اس کا واسطہ کچھ جرائم پیشہ عناصر سے پڑ گیا۔ دل برداشتگی کے عالم میں اس نے انہی غلط راہوں کو اپنا مستقبل بنالیا۔ دوستوں کے کانوں میں اس کی بھنک پڑی تو وہ دھیرے دھیرے اس سے کتراتے چلے گئے۔ ان کترانے والوں میں خود ناصر بھی تھا۔ پھر کوئی دو سال پہلے ناصر کو معلوم ہوا کہ سولجر کراچی چلا گیا ہے۔ وہاں پولیس کو ایک نہایت سنگین واردات میں سولجر کے ملوث ہونے کا ثبوت مل گیا تھا۔ سولجر کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کردیا گیا لیکن سولجر کی گرفتاری عمل میں نہیں آسکی تھی۔ وہ روپوش ہوگیا۔ پولیس اس کی تلاش میں رہی لیکن اس کا پتا نہیں لگا سکی۔

دو سال بعد اس شام وہ اچانک ناصر سے ملا تو ناصر بھونچکا رہ گیا۔ ان دنوں ناصر کے حالات بھی ایک انقلاب سے دوچار ہو چکے تھے۔ اسے اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا تھا۔ انہی دنوں دو ایک بار اسے سولجر کا خیال بھی آیا تھا۔ اسے خواہش ہوئی کہ کسی طرح سولجر سے اس کی ملاقات ہوجائے۔ اس نے سوچا کہ سولجر کی رہنمائی میں یا اس کے تعاون سے وہ اپنے تاریک مستقبل میں روشنی لانے کے لیے کسی غیر قانونی اقدام سے بھی گریز نہیں کرے گا۔ اسی لیے سولجر سے اپنی ملاقات اسے بہت خوشگوار لگی تھی۔ ایک چھوٹے سے چائے خانے میں بیٹھ کر ان دونوں میں گھنٹا بھر تک راز و نیاز ہوئے تھے۔ پھر سولجر نے الگ جا کر موبائل پر کسی سے کوئی بات کی تھی۔ اس کے بعد وہ ناصر کو اپنے باس سے ملوانے کے لیے ایک مکان میں لے آیا تھا۔

سولجر کا باس بھاری جبڑوں کا مالک ایک پچاس سالہ شخص تھا۔ اسے دیکھ کر ناصر کو جھرجھری سی آگئی۔ اسے احساس ہوا تھا کہ وہ اس وقت ایک بہت ہی خطرناک شخص کے سامنے تھا۔

''یس باس!'' سولجر نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔ ''میں اپنے دوست کو لے آیا ہوں۔''

بھاری جبڑے والے نے گہری نظر سے ناصر کے سراپا کا جائزہ لینے کے بعد آنکھوں سے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ناصر نے سولجر کی طرف دیکھا۔ سولجر نے بھی اشارہ کیا کہ وہ بیٹھ جائے۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ سولجر کھڑا ہی رہا۔ غالباً اس کے لیے اپنے باس کا ادب کرنا ضروری تھا جو ایک کھڑکی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کی موٹی موٹی انگلیوں میں ایک موٹا سا سگار بھی دبا ہوا تھا۔

''تو'' بھاری جبڑے والے کی تیز نگاہیں ناصر پر جمی

ہوئی تھیں۔ ''تم یہ کام کرنے کے لیے تیار ہو؟''

''ہاں۔'' ناصر نے سر ہلایا۔ ''اس میں تو مجھے خطرے کی کوئی بات بھی نظر نہیں آ رہی ہے۔ میں تو پانچ کروڑ کے لیے کوئی خطرناک کام کرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔''

''میں تمہیں بتا دوں کہ خطرہ تو اس میں ہے۔ افضال خان کو اگر شبہ ہو گیا کہ تم کوئی سرکاری جاسوس ہو تو مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ اس گاؤں میں کوئی تمہاری مدد کرنے والا نہیں ہو گا۔ افضال خان اس گاؤں کا ایک با اثر آدمی ہے کیونکہ قبیلے کا سردار اس کا دوست ہے۔''

''باس!'' سولجر بول پڑا۔ ''میرا دوست پڑھا لکھا بھی ہے اور ذہین بھی!...... یہ افضال خان کو شبہ نہیں ہونے دے گا۔''

بھاری جبڑے والے کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے تیکھی نظروں سے سولجر کی طرف دیکھا۔ اسے سولجر کی دخل اندازی یقیناً گراں گزری تھی۔ سولجر نے اس کی نظروں کی تاب نہ لا کر سر جھکا لیا۔

''میں نے ابھی کہا تھا۔'' ناصر بولا۔ ''پانچ کروڑ روپوں کے لیے میں کوئی بھی خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہوں لیکن......'' ناصر ہچکچا کر خاموش ہو گیا۔ وہ اس بھاری جبڑے والے سے بات کرنے میں دشواری محسوس کر رہا تھا۔

''لیکن؟'' بھاری جبڑے والا سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

ناصر نے کچھ توقف سے ہمت کر کے کہا ''اس کی کیا ضمانت ہے کہ کام ہو جانے کے بعد روپیا مجھے مل جائے گا۔''

''میری زبان ہی اس کی ضمانت ہے۔'' بھاری جبڑے والے نے دبنگ لہجے میں کہا۔ ''میں تمہاری دنیا کا آدمی نہیں ہوں جہاں معاملات طے کرنے والوں کے دلوں میں بے ایمانی ہوتی ہے۔ ہماری دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔ ہم اپنے ایسے کام صاف ستھرے انداز میں کرتے ہیں۔ میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ تمہیں پانچ کروڑ دے کر مجھے اس سے کہیں زیادہ فائدہ ہو گا۔''

''میں نے تمہیں سمجھایا تھا ناصر!'' سولجر بول پڑا۔ ''تمہیں باس سے یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔''

''اسے اپنا اطمینان کر لینے دو سولجر!'' بھاری جبڑے والے نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''مطمئن ہونے کے بعد ہی انسان صحیح طور پر اپنا کام کر سکتا ہے۔ اگر میری بات تمہارے دوست کے لیے قابلِ اطمینان نہیں تو یہ شوق سے اپنے گھر واپس جا سکتا ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔'' پھر وہ سوالیہ انداز میں ناصر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم واپس اپنے گھر جانا پسند کرو گے؟''

''نہیں۔'' ناصر نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں تم پر اعتماد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں یہ کام ضرور کروں گا۔''

بھاری جبڑوں والا مسکرایا۔ بڑی کشادہ مسکراہٹ تھی اس کی۔ اس کے سفید سفید دانت کسی بھیڑیے کے دانتوں کی طرح چمکدار تھے۔

''مجھے یقین تھا کہ تم یہ چانس ضرور لو گے۔ تمہارے حالات اچانک ایسے ہو گئے ہیں کہ تم اس کے لیے مجبور ہو۔''

ناصر چونک گیا۔ اس نے سولجر کو اپنے حالات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

''حیران ہو رہے ہو!'' بھاری جبڑے والے کے دانت چمکتے رہے۔ ''دراصل میں چاہتا ہوں کہ تمہارے دل میں کسی بھی لمحے مجھے دھوکا دینے کا خیال نہ آ سکے۔ یہ خیال تمہاری زندگی خطرے میں ڈال سکتا ہے۔ تمہیں جان لینا چاہیے کہ میرے وسائل اور میرے ذرائع کتنے لامحدود ہیں۔ میں تمہارے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔ تمہارا باپ ریس کھیلنے کا رسیا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کے کاروباری حالات بہت خراب ہو گئے تھے۔ اپنا یہ شوق اس نے اپنے خاندان والوں اور دوستوں تک سے چھپائے رکھا تھا۔ اس کی دوستی ایک ایسے شخص سے بھی تھی جس کا آبائی گھر ایبٹ آباد میں ہے لیکن اس کی تجارت کا مرکز پشاور میں ہے۔ اس کی اولادوں میں ایک لڑکی نائلہ بھی ہے جو ڈاکٹر بن چکی ہے۔ کوئی چھ ماہ قبل اس سے تمہاری منگنی بھی ہو چکی ہے۔''

ناصر دم بہ خود بیٹھا' بھاری جبڑے والے کی طرف دیکھتا رہا۔

بھاری جبڑے والے نے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا اور بات جاری رکھی۔

''میرا اندازہ ہے' تمہارے باپ کا خیال یہ تھا کہ ایک بہت مالدار گھر کی بیٹی کو وہ اپنی بہو بنا کر لائے گا تو اس سے اس کی کاروباری ساکھ بھی سنبھل جائے گی۔ اس نے اپنے دوست یعنی نائلہ کے باپ کو اس شادی کے لیے کسی طرح آمادہ بھی کر لیا لیکن نائلہ اپنے باپ کی بہت لاڈلی ہے۔ وہ اپنی بیٹی پر کسی بھی معاملے میں زیادہ دباؤ نہیں ڈالتا۔ نائلہ اس شادی کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس لڑکی کو غریبوں کی خدمت کرنے کا جنون ہے۔ اس نے اپنے باپ سے بھی کہہ دیا تھا کہ شادی کے بعد وہ اپنا مشن اس طرح جاری نہیں رکھ

سکے گی جس طرح وہ چاہتی ہے۔ تمہارے باپ نے اپنے دوست کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ شادی نائلہ کے مشن میں رکاوٹ نہیں بنے گی اور اس کا بیٹا ہر طرح نائلہ سے تعاون کرے گا' لیکن نائلہ سمجھتی تھی کہ عملاً یہ ممکن نہیں ہوگا' شادی کے بعد وہ خود بھی گھریلو ذمے داریوں میں کسی نہ کسی حد تک ضرور پھنسے گی۔''

بھاری جبڑے والے کی آواز کے سوا کمرے میں سکوت تھا۔ سولجر نظریں جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ ناصر کی نظریں تو بھاری جبڑے والے پر تھیں لیکن خاموش وہ بھی تھا۔

بھاری جبڑے والے نے ایک جگہ رک کر سگار کی راکھ جھاڑی اور پھر ٹہلنے لگا۔

''نائلہ جو کچھ سوچ رہی تھی' ٹھیک سوچ رہی تھی لیکن اس کی ماں نے اسے سمجھایا کہ ہمارے معاشرے میں شادی کیے بغیر کوئی لڑکی اپنی ساری زندگی نہیں گزار سکتی۔ چونکہ بات یہ بھی معقول تھی لہٰذا نائلہ کی سمجھ میں بھی آ گئی لیکن اس نے اپنی یہ بات بھی والدین سے منوالی کہ شادی کے بعد وہ تین سال تک پوری یکسوئی سے اپنا مشن جاری رکھنا چاہتی ہے۔ جب تمہارے باپ کو اس کا علم ہوا تو اس نے کوشش کی کہ کم از کم منگنی تو فوری طور پر کر دی جائے۔ نائلہ کو یہ بھی منظور نہیں تھا لیکن ماں باپ کے کہنے سننے سے اسے اس پر آمادہ ہونا ہی پڑا۔ اس طرح تمہاری اور نائلہ کی منگنی ہوگئی۔'' بھاری جبڑے والے نے رک کر ناصر کی طرف دیکھا۔ ''کیا میرا کوئی ایک جملہ بھی غلط ہے؟''

ناصر بمشکل جواب دے سکا۔ ''نہیں'' اس کی آواز بہت مدھم تھی۔

بھاری جبڑے والے کے سفید دانت پھر چمکے اور اس نے ٹہلتے ہوئے پھر بولنا شروع کر دیا ''تمہارے باپ نے سوچا تھا کہ وہ تین سال کسی نہ کسی طرح گزار ہی لے گا۔ اس وقت... میرا مطلب ہے جب تمہاری اور نائلہ کی منگنی ہوئی... تمہارے باپ کی کاروباری حالت تو خراب ہوئی ہی تھی لیکن وہ کسی سے پانچ کروڑ روپیا لے کر بھی ریس میں ہار چکا تھا۔ قرض دینے والے کو اس نے یہ امید دلائی تھی کہ تمہاری اور نائلہ کی شادی کے بعد وہ پانچ کروڑ کا قرض آسانی سے ادا کر دے گا لیکن یہ نہیں ہوسکا۔ قرض دینے والے کو جب اس کا علم ہوا تو وہ پریشان ہوگیا۔ وہ اپنے پانچ کروڑ کے لیے تین سال تک انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے تمہارے باپ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ کسی طرح بھی اس کا قرض اتارے۔ تمہارا باپ ٹال مٹول سے کام لیتا رہا لیکن کوئی تین ماہ قبل اسے قانونی نوٹس مل گیا کہ وہ کسی طرح بھی قرض ادا کرے ورنہ معاملہ عدالت میں آ جائے گا۔ اس نوٹس نے تمہارے باپ کے پیروں تلے سے زمین نکال دی۔ وہ اپنا گھر بار' اپنا سب کچھ بیچ کر قرض تو ادا کر سکتا تھا لیکن پھر وہ فٹ پاتھ پر آ جاتا' کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جاتا' بدنامی الگ ہوتی۔ تمہاری اور نائلہ کی شادی بھی خطرے میں پڑ جاتی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ مقدمے بازی میں پھنستا' معاملے کو زیادہ سے زیادہ طول دینے کی کوشش کرتا لیکن اس صورت میں بھی یہ بات سامنے آ ہی جاتی کہ ریس کے شوق نے اسے پانچ کروڑ کا مقروض کر دیا تھا اور اس کی کاروباری حالت بھی خراب ہوگئی تھی۔ اسے بدنامی کا سامنا کرنا ہی پڑتا اور اس صورت میں بھی نائلہ سے تمہاری شادی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ حالات کے اس سنگین موڑ پر تمہارا باپ خود کو سنبھال نہ سکا۔ اسے ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ اس دنیا سے چلا گیا۔''

بھاری جبڑے والا ٹہلتے ٹہلتے کھڑکی کے پاس گیا اور پہلے ہی کی طرح اس سے ٹیک لگا کر ناصر کی طرف دیکھنے لگا جو اس کی باتیں سن بھی رہا تھا اور کچھ سوچ بھی رہا تھا۔

بھاری جبڑے والے نے سگار کا ایک گہرا کش لے کر کچھ توقف سے پھر بولنا شروع کیا۔ ''تمہیں کاروباری معاملات سے کبھی کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی۔ تم بہت کم اپنے باپ کے دفتر جاتے تھے۔ تمہارا زیادہ تر وقت اپنے دوستوں اور تفریحات میں گزرتا تھا۔ باپ کے بعد جب تمہیں پوری طرح کاروبار پر توجہ دینا پڑی تو تمہیں حالات کا پوری طرح پتا چلا۔ تم اس شخص کے پاس گئے جس نے تمہارے باپ کو پانچ کروڑ روپیا دیا تھا۔ تم اسے مقدمہ دائر کرنے سے روکنا چاہتے تھے۔ تمہارے باپ کی موت کے باعث اس شخص کا دل کچھ نرم پڑ گیا تھا۔ وہ تم سے کچھ نرمی سے پیش آیا۔ تم چاہتے تو یہ تھے کہ وہ نائلہ سے تمہاری شادی تک کے لیے خاموشی اختیار کر لے لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ شخص دل کا برا نہیں ہے لیکن اس کی اپنی کچھ مجبوریاں ہیں۔ اسی لیے وہ تمہیں صرف چھ ماہ کی مہلت دے سکا۔ اس مہلت کے ڈھائی ماہ گزر چکے ہیں۔ اب تمہارے پاس ساڑھے تین مہینے رہ گئے ہیں لیکن تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم اپنے باپ کا قرض کیسے اتار سکو گے۔ وہ تمہارے باپ کی کمپنی' تمہارا گھر' سب کچھ نیلام کروا دے گا۔ کیا تم اس تباہی سے بچ سکتے ہو؟ کوئی راستہ ہے تمہارے پاس؟''

ناصر نے مایوسانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔''

''بس اسی لیے آج سولجر تم سے ملا تھا'' بھاری جبڑے والے نے کہا۔

ناصر نے چونک کر اس کی طرف اور پھر سولجر کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔'' بھاری جبڑے والا بولا ''اس ملاقات کو تم ایک اتفاق سمجھ رہے ہو گے لیکن ایسا نہیں ہے۔ مجھے تمہارے جیسے ایک آدمی کی ضرورت تھی۔ تمہارے متعلق مجھے یہ معلومات حاصل ہوئیں تو میں نے سوچا کہ تم میرے کام آسکتے ہو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ سولجر تمہیں اپنے کالج کے زمانے سے جانتا ہے۔ اسی لیے یہ میرے کہنے پر تم سے ملا تھا۔ تم اتنی دیر سے میری باتیں سن رہے ہو۔ تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میری مادری زبان اردو ہے۔ میں پہلی مرتبہ سولجر کے ساتھ ایبٹ آباد آیا ہوں۔ سولجر بھی یہاں رہا ضرور ہے لیکن اس کی مادری زبان بھی اردو ہے۔ یہ یہاں کی زبان بول تو سکتا ہے لیکن کسی اہلِ زبان کی طرح نہیں!...... خود میں یہاں کی زبان تھوڑی بہت سمجھ تو لیتا ہوں لیکن بول نہیں سکتا۔ میرے ساتھیوں میں سے بھی یہاں کا مقامی آدمی صرف ایک ہی ہے۔ اس کا نام زمام خان ہے۔ وہ یہاں کے اسی گاؤں سے تعلق رکھتا ہے جہاں افضال خان رہتا ہے۔ کئی سال پہلے وہ اپنے گاؤں سے کراچی آیا تھا اور میرے ساتھیوں میں شامل ہو گیا تھا۔ اس نے خود یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ میرا کام کر سکتا ہے۔ وہ کچھ پڑھا لکھا اور ذہین آدمی نہیں ہے۔ لیکن یہ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے دغابازی نہیں کر سکتا۔ اس وقت یہ میری مجبوری تھی کہ اس کام پر اسی کو لگاؤں۔ اس میں یہ خدشہ نہیں تھا کہ وہاں اسے شبے کی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ تو پیدا ہی وہاں ہوا تھا۔ اس نے یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ وہ افضال خان کی نوجوان بیٹی شنتال کو اپنے دام میں پھنسا کر افضال خان تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکتا ہے لیکن ایسا ہوا نہیں۔ اسے واپس اپنے گاؤں پہنچے دو مہینے سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ مجھے اس پر بھروسا تو ہے لیکن اس کی ناکامی کے باعث میں ایک مہینا پہلے ہی مایوس ہو گیا تھا۔ ایک مہینے سے مجھے کسی اور آدمی کی تلاش تھی جسے اس کام کے لیے وہاں بھیجوں۔ اب تم مجھے ملے ہو اور اس کام کے لیے نہایت مناسب آدمی معلوم ہوتے ہو۔ گاؤں وغیرہ میں اجنبیوں کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے لیکن وہ لوگ یہ جان کر مطمئن ہو جائیں گے کہ تم ڈاکٹر نائلہ کے منگیتر ہو۔''

ان ساری باتوں کے دوران میں پہلی مرتبہ ناصر کے چہرے پر الجھن کے تاثرات ابھرے۔

''وہ کیسے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''نائلہ مستقل طور پر اسی گاؤں کے قریب ایک ڈاک بنگلے میں رہتی ہے اور مریضوں کو دیکھنے کے لیے آس پاس کے دیہات میں بھی جاتی رہتی ہے۔ کیا تمہیں اس کا علم نہیں؟''

''نہیں۔'' ناصر نے سر ہلایا ''مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ وہ اس طرف پہاڑوں میں گھرے ہوئے دیہات میں کام کر رہی ہے۔''

''خیر!..... اب تمہیں معلوم ہو گیا۔ اس کام کے لیے تم ہر اعتبار سے ایک موزوں آدمی ہو۔ نائلہ کی وجہ سے تمہیں اس گاؤں میں شک کی نظر سے نہیں دیکھا جائے گا۔ تم پڑھے لکھے بھی ہو۔ سولجر کو تمہاری ذہانت پر بھی اعتماد ہے۔ یہاں کی زبان بھی تم جانتے ہو...... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمہیں پانچ کروڑ روپوں کی ضرورت ہے۔ تمہاری یہ ضرورت میں پوری کر سکتا ہوں۔''

''میں نے وہ گاؤں کبھی نہیں دیکھا۔ اطراف میں بھی گیا ہی نہیں۔''

''اس کی پروا مت کرو۔ تمہیں وہاں تک پہنچانا سولجر کی ذمے داری ہے۔ تمہیں زمام خان کی تصویر دکھا دی جائے گی تا کہ تم اسے پہچان سکو۔ تم چاہو تو وہ تصویر اپنے ساتھ بھی لے جا سکتے ہو۔ کسی نہ کسی طرح تمہاری تصویر بھی زمام خان تک پہنچا دی جائے گی' یا اسے پیغام بھی بھیجا جا سکتا ہے کہ لیڈی ڈاکٹر کا منگیتر میرا آدمی ہے۔ وہ تم سے ہر طرح کا تعاون کرے گا۔ اگر تم اسے اپنا آلۂ کار بنا سکو تو...... میرا مطلب ہے اگر تم اس کے ذریعے سے میرا کام کر سکے تو بھی تمہیں وہ رقم مل جائے گی جس کی تمہیں ضرورت ہے۔''

''مجھے کب جانا ہوگا؟'' ناصر نے کچھ توقف سے پوچھا۔

''میں چاہتا تو یہ ہوں کہ تمہیں وہاں پہنچنے میں بالکل وقت نہ لگے لیکن سولجر کو ابھی میرے ساتھ کراچی واپس جانا ہوگا۔ وہاں اسے کوئی کام کرنا ہے۔ ممکن ہے وہ کام ایک آدھ دن میں ہی ہو جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ہفتہ لگے۔ بہرحال اسی ہفتے کے دوران میں یہ کسی دن بھی واپس آئے گا اور تمہیں وہاں پہنچا دے گا۔ اس کے بعد جب تک تم کام مکمل نہ کر لو' یہ ایبٹ آباد میں ہی رہے گا۔ آج کے بعد مجھ سے تمہارا رابطہ رہے گا۔ گاؤں میں تم جو کچھ بھی کرتے رہو'

اس کی رپورٹ سولجر کو دیتے رہنا۔ وہاں تمہیں ٹیلی فون کی سہولت تو نہیں ملے گی اور پہاڑوں سے گھرے ہوئے اس علاقے میں موبائل فون بھی کام نہیں کرتا۔ تمہیں ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر دیا جائے گا۔ وہ اتنا چھوٹا ہوگا کہ تم اسے موبائل فون ہی کی طرح اپنی جیب میں رکھ سکو گے۔ اس سے اور سولجر کے ریڈیو ٹرانسمیٹر سے رابطہ کیسے ہوگا' یہ تمہیں سولجر ہی سمجھا دے گا۔''

''وہاں ٹیلی فون نہیں ہے!'' ناصر کا انداز بڑبڑانے کا سا تھا۔

''نہیں۔'' بھاری جبڑے والے نے جواب دیا۔

''لیکن نائلہ تو ٹیلی فون پر اپنے گھر والوں سے بات کرتی رہتی ہے!''

''اس کے لیے اسے ایک خاصا بڑا رستہ طے کرکے جنگل منگل جانا پڑتا ہوگا۔ وہاں سے کسی کو ٹیلی فون کیا جاسکتا ہے۔''

''جنگل منگل۔'' ناصر پھر بڑبڑایا۔ ''یہ نام میں نے کہیں سنا تو ہے!''

''اسی علاقے میں رہنے والے کسی آدمی سے سنا ہوگا' یا کسی ایسے شخص سے جو بھی ان اطراف میں گیا ہو۔ نقشوں میں تو اس جگہ کا یہ نام نظر نہیں آتا مگر ان اطراف میں رہنے والے اس سے خوب واقف ہیں۔''

''زمام خان کس قسم کا آدمی ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

بھاری جبڑے والے نے گھڑی پر نظر ڈالی اور بولا ''مجھے اب کراچی واپس جانا ہے۔ سولجر بھی میرے ساتھ جائے گا۔ میں تمہیں ساری بنیادی باتیں بتا چکا ہوں۔ اب اس قسم کے چھوٹے موٹے سوالات تم اپنے پاس لکھتے رہو۔ سولجر جب واپس آکر تمہیں اس گاؤں تک لے جائے گا' تو وہ ساری باتیں تم اسی سے پوچھ لینا۔''

ناصر متفکرانہ انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔

''آخر میں ایک بات اور!'' بھاری جبڑے والے نے تنبیہ کرنے والی نظروں سے ناصر کی طرف دیکھا۔ ''مجھے سولجر پر اعتماد ہے اور سولجر کو تم پر ہے۔ سولجر کی وجہ سے میں نے بھی تم پر اعتماد کیا ہے۔ تم جان چکے ہو کہ میں کیا کام کروانے کے لیے بے تاب ہوں۔ یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ تم میرا ایک راز جان چکے ہو۔ اگر تم نے یہ راز کسی اور پر ظاہر کیا تو یہ تمہارے حق میں بہت برا ہوگا۔ کسی بھی شخص کو چیونٹی کی طرح مسل دینا میرے لیے کوئی بڑا کام نہیں ہے۔''

''میں اپنا مستقبل تباہی سے بچانا چاہتا ہوں۔ اسی لیے میں نے تمہاری پیشکش قبول کی ہے۔ تمہارا یہ راز کسی پر ظاہر کرکے میں اپنا مستقبل داؤ پر کیسے لگا سکتا ہوں۔''

''میں نے ضروری سمجھا کہ تمہیں وارننگ دے دوں۔'' بھاری جبڑے والے نے کہا' پھر سولجر کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''تم نے اپنے دوست کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے نا کہ اسے گاؤں میں جا کر کیا کرنا ہے؟''

''یس باس!'' سولجر نے مستعدی سے جواب دیا۔ ''جب میرا دوست یہ کام کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہوگیا تھا' اس کے بعد ہی میں نے موبائل پر آپ سے بات کی تھی اور آپ کی اجازت ملنے کے بعد ہی اسے آپ کے پاس لایا تھا۔''

''اب اسے باہر تک چھوڑ بھی آؤ!...... وقت کم ہے۔ ہمیں اب یہاں سے روانہ ہوجانا چاہیے۔''

سولجر فوراً کھڑا ہوا۔ اس نے ناصر کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ دونوں اس کمرے سے' پھر اس مکان سے باہر آگئے۔

''میں نے تمہارا موبائل نمبر لکھ لیا ہے۔'' سولجر نے کہا۔ ''جس دن مجھے یہاں پہنچنا ہوگا' میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔''

ناصر نے کھوئے کھوئے سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے اپنی کار کا دروازہ کھولا۔

''لگتا ہے' اچانک تم کچھ پریشان ہوگئے ہو!'' سولجر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم نے اب اپنا ارادہ بدل دیا ہے اور یہ کام کرتے ہوئے ڈر رہے ہو تو مجھے ابھی بتا دو۔ مجھے شرمندگی تو ہوگی لیکن میں باس کو بتا دوں گا۔ پھر وہ کوئی دوسرا بندوبست کرنے کے بارے میں سوچ لے گا۔ تمہیں بس یہ خیال رکھنا ہوگا کہ یہ راز تمہارے سینے میں دفن رہے۔ میں اسی صورت میں یہ ذمہ لے سکتا ہوں کہ تمہاری زندگی کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔''

''نہیں سولجر!'' ناصر نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''میں پریشان نہیں ہوا ہوں۔ تمہارا باس مجھ سے جو کام کروانا چاہتا ہے' وہ میں ضرور کروں گا۔ میں بس اپنی مصیبت کے بارے میں سوچنے لگا تھا کہ یہ جانے کب ختم ہوگی!''

''مصیبت سے تمہارا مطلب ہے' پانچ کروڑ کا قرضہ؟''

''ہاں۔''

''یہ مصیبت تو ختم ہوجائے گی جب تم باس کا یہ کام کردو گے۔ اسے بھی تم میری ذمے داری سمجھ لو کہ پانچ کروڑ

روپیا تمہیں مل جائے گا۔ باس نے غلط نہیں کہا کہ ہماری دنیا کے لوگ اس قسم کی بے ایمانیاں نہیں کرتے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔'' ناصر نے دھیرے سے ہنس کر سولجر کا شانہ تھپکا اور ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر کار میں بیٹھ گیا۔

☆☆☆

نہ جانے کیوں شنتال کو نائلہ بہت ہی زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ہر وقت اپنی ''ڈاکٹر باجی'' کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کیا کرے، لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ نائلہ بس گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا اس گاؤں میں گزارنے کے بعد آس پاس کے دوسرے دیہات کی طرف نکل جاتی تھی۔ پھر جب شام کا اندھیرا پھیلنے لگتا تھا، تبھی وہ واپس آتی تھی۔ اگر گاؤں میں کسی خاص مریض کو دیکھنا ہوتا تھا تو وہ اس کے گھر جاکے اسے دیکھ لیتی تھی ورنہ سیدھی اپنے ڈاک بنگلے ہی کی طرف رخ کرتی تھی۔ اس سے ملنے صرف صبح اس کے کلینک ہی جایا جاسکتا تھا مگر کلینک جانے کے لیے اس کے پاس کوئی جواز نہیں ہوتا تھا۔ وہ بچکانا انداز میں دعا کیا کرتی تھی کہ اس کی کھانسی کبھی ٹھیک نہ ہو اور وہ اس بہانے نائلہ کے پاس جاتی رہا کرے۔

دو دن قبل اسے جیپ میں نائلہ کے ساتھ بیٹھنے کا موقع تو ملا تھا لیکن زیادہ باتیں وہ اس لیے نہیں کرسکی تھی کہ گاؤں تک کا فاصلہ ہی زیادہ نہیں تھا۔ جیپ نے اسے ایک ڈیڑھ منٹ بعد ہی اسے اس کے گھر کے دروازے تک پہنچا دیا تھا۔

بعد کے دو دنوں میں شنتال محسوس کرتی رہی تھی کہ اسے نائلہ سے ملے بہت عرصہ ہوگیا۔ تیسرے دن وہ صبح ہی صبح نائلہ کے کلینک کی طرف روانہ ہوگئی۔ اس نے سوچا تھا کہ زبردستی کھانسے گی اور کہہ دے گی کہ وہ دوا لینے آئی ہے۔ اسے کھانسی پر غصہ آرہا تھا جو اسے ایک ہفتے سے نہیں ہوئی تھی۔

جب وہ کلینک کے قریب پہنچی تو صفدر جان کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

صفدر جان گاؤں کی مسجد کے مؤذن اور امام ادریس کا بیٹا تھا۔ گاؤں میں اس کی جانوروں کے چارے کی دکان تھی۔ چھوٹے موٹے کسان وہیں سے چارا خریدا کرتے تھے۔ گاؤں میں مولانا ادریس کی شرافت اور انسانیت کا ڈنکا بجتا تھا اور صفدر جان کی کوشش بھی ہمیشہ یہی رہتی تھی کہ اپنے باپ کی عزت پر کوئی حرف نہ آنے دے۔ دکان داری میں ذرا سی بھی بے ایمانی اس نے کبھی نہیں کی تھی۔ راہ چلتے ہوئے اس کی نظریں جھکی رہتی تھیں۔ گاؤں کے دوسرے نوجوانوں کی طرح اس میں تیزی طراری نہیں تھی۔ اس کے نقش و نگار شنتال کو بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ جب بھی اسے دیکھتی تھی، اس کے دل میں گدگدی سی ہونے لگتی تھی، لیکن اس کا معصوم ذہن کبھی نہیں سمجھ سکا تھا کہ اس کی یہ کیفیت کیوں ہوتی تھی۔

صفدر جان کو دیکھ کر اس وقت اس کے ٹھٹکنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود کو آڑ میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ٹکٹکی باندھے کلینک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ خود کو آڑ میں رکھنے کے لیے اسے ایک کنوئیں کی ٹوٹی پھوٹی سی منڈیر مل گئی تھی۔ برسوں پہلے وہ کنواں خشک ہو چکا تھا لیکن اس کی شکستہ منڈیریں کسی نہ کسی حالت میں باقی تھیں۔

شنتال دبے قدموں چلتی، صفدر جان کے بالکل پیچھے پہنچ گئی۔ یہاں سے کلینک کی ایک کھڑکی نظر آرہی تھی۔ کلینک میں نائلہ کسی مریض کو دیکھ رہی تھی۔

کیا یہ کسی مریض کو لے کر آیا ہے؟ شنتال نے سوچا۔ اس کی دانست میں یہی ایک امکان تھا کہ صفدر جان کسی مریض کو لایا ہو اور اسے کلینک میں بھیج کر یہاں اس کی واپسی کا انتظار کرتے ہوئے کلینک کی طرف دیکھ رہا ہو۔ وہ اتنا شرمیلا بھی تھا کہ نائلہ کے سامنے جانے سے گریز کرسکتا تھا۔

شنتال کو کبھی صفدر جان سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ صفدر جان کو دیکھ کر اس کے دل نے ہمیشہ چاہا تھا کہ اس سے بات کرے لیکن اس کی ہمت نہیں ہوسکی تھی۔ گاؤں کا کوئی بھی آدمی یہ بات اس کے باپ تک پہنچا سکتا تھا مگر اس وقت کوئی بھی آس پاس نہیں تھا۔ صفدر جان سے بات کرنے کے لیے اسے ایک سنہرا موقع ملا تھا۔ اس خیال سے اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں کہ وہ اس وقت صفدر جان سے بات کرسکتی تھی۔

اِدھر اُدھر محتاط نظر ڈالنے کے بعد شنتال نے آہستگی سے ایک قدم اور بڑھا کر صفدر جان کے کچھ قریب ہونا چاہا۔ اس کا پیر کسی چھوٹے سے پتھر سے ٹکرا گیا۔ اس آواز نے صفدر جان کو چونکا دیا۔ وہ تیزی سے مڑا۔

''تم!'' اس کے منہ سے نکلا۔ وہ شنتال کو دیکھ کر کچھ بوکھلا گیا تھا۔

شنتال اس سے باتیں کرنے کی خواہش مند تھی لیکن جب اس کی نظریں صفدر جان کی نظروں سے ملیں تو وہ بھی بوکھلا گئی۔

''وہ...... وہ...... ڈاکٹر باجی...... میری طبیعت......؟''

شنتال بولی۔ وہ ہکلا گئی تھی۔ زبان میں لکنت بھی آ گئی تھی۔ وہ اپنی بات بھی پوری نہیں کر سکی۔

''اچھا تو انہیں دکھانے آئی ہو!..... جاؤ؟'' صفدر جان نے جلدی سے کہا اور مڑ کر تیزی سے ایک طرف جانے لگا۔

صفدر جان سے نظریں چار ہوتے ہی شنتال کے تنفس کی رفتار بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ کنوئیں کی منڈیر سے ٹیک لگا کر اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ صفدر جان بہت تیزی سے چلتا ہوا اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

شنتال کو اپنی سانسوں پر قابو پانے میں ایک منٹ سے زیادہ لگ گیا' اور پھر اسے خود پر غصہ بھی آنے لگا۔ اس نے صفدر جان سے بات کرنے کا ایک سنہری موقع کھو دیا تھا۔ آخر اچانک کیا ہو گیا تھا اسے! وہ مردوں سے بات نہیں کرتی تھی لیکن کبھی کوئی ایسا موقع آ جاتا تھا تو اس کی حالت اتنی غیر نہیں ہو جاتی تھی۔ ابھی دو ہی دن پہلے اس نے زمام خان کو اس طرح پھٹکار ڈالا تھا۔ ضرورت پڑنے پر وہ اس کا منہ بھی نوچ کھسوٹ ڈالتی لیکن اس وقت صفدر جان سے نظریں چار ہوتے ہی اسے ایسا لگا تھا جیسے اس کے جسم سے اس کی جان نکلنے لگی ہو۔

ایسا کیوں ہوا تھا؟ یہ سوچتے ہوئے اس کا ذہن الجھنے لگا۔

''شنتال!'' نائلہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

وہ چونکی اور اس نے دیکھا کہ نائلہ کھڑکی میں کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یکا یک شنتال کے قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔ وہ کلینک کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جلد ہی وہ کلینک میں داخل ہوئی۔

''سلام ڈاکٹر باجی!''

''وعلیکم السلام! بیٹھو!'' نائلہ نے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''وہاں کنوئیں کی منڈیر کے پاس کیوں کھڑی ہوئی تھیں؟''

''وہاں... ؟ نہیں تو!'' شنتال نے جلدی سے کہا۔ ''وہ تو میں آپ کے پاس آ رہی تھی دوا لینے!'' شنتال زبردستی کھانسی۔

''اچھا!'' نائلہ اسے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتی ہوئی اپنی کرسی پر بیٹھی اور بولی۔ ''بیٹھو نا! کھڑی کیوں ہو؟''

شنتال دوبارہ زبردستی کھانستے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی۔

''تم مجھے کیا سمجھتی ہو؟'' نائلہ بولی۔ ''مجھے بے وقوف بنانا کیا تم نے آسان کام سمجھ لیا ہے؟''

''جی!'' شنتال گھبرا کر نائلہ کا منہ تکنے لگی۔

''ڈاکٹر ہوں میں!'' نائلہ دھیرے سے ہنسی۔ ''اصلی کھانسی بھی میری سمجھ میں آ جاتی ہے اور مصنوعی کھانسی بھی!''

شنتال کی نظریں جھک گئیں۔

''سچ سچ بتاؤ' کیا چکر ہے؟'' نائلہ پھر بولی۔ ''وہاں ایک نوجوان بھی تھا جس کے پاس تم آ کھڑی ہوئی تھیں۔''

''ارے نہیں ڈاکٹر باجی!'' شنتال نے نظریں اٹھا کر جلدی سے کہا۔ ''میں تو آپ کے پاس آ رہی تھی۔ وہ وہاں کھڑا نظر آیا تھا تو میں اس سے پوچھنے لگی تھی کہ وہ وہاں کیوں کھڑا ہے؟''

''وہ ہے کون؟'' نائلہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''وہ اپنی مسجد ہے نا!...... اس کے جو مولانا ادریس ہیں۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں ڈاکٹر باجی! سارا گاؤں عزت کرتا ہے ان کی۔''

''میں مل چکی ہوں ان سے.. ایک بار دوا لینے آئے تھے وہ' لیکن میں تم سے اس نوجوان کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔''

''وہ انہی کا بیٹا ہے۔''

''مولانا ادریس کا؟'' نائلہ کی پیشانی پر ایک شکن پڑ گئی۔

''ہاں ڈاکٹر باجی! انہی کا بیٹا تو ہے وہ...... چارے کی دکان ہے اس کی گاؤں میں!...... صفدر جان ہے اس کا نام!''

نائلہ فوراً کچھ نہیں بولی۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھر آئے تھے جیسے وہ کسی الجھن آمیز سوچ میں پڑ گئی ہو۔ پھر جلد ہی وہ جیسے چونکی۔

''خیر چھوڑو اس کی بات!'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''تم اس وقت میرے پاس کیوں آئیں؟ کھانسی تو نہیں ہے تمہیں!''

اپنی ''چوری'' پکڑے جانے پر شنتال بائیں ہاتھ سے اپنا سر کھجانے لگی۔ اس کے ہونٹوں پر جھینپی ہوئی سی مسکراہٹ تھی۔

''بولو!'' نائلہ نے اسے ٹوکا۔

شنتال نے نائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں ڈاکٹر باجی!''

''اچھا!'' نائلہ مسکراتی رہی' ''لیکن یہ میری بات کا جواب نہیں ہوا!''

''بس جی چاہتا ہے' آپ کے پاس بیٹھی رہوں' آپ سے باتیں کرتی رہوں۔'' شنتال نے بچوں جیسی معصومیت سے کہا۔ پھر کچھ شکایت کرنے کے سے انداز میں بولی۔ ''لیکن آپ تو بس تھوڑی دیر رہتی ہیں یہاں' پھر چلی جاتی

ہیں، پھر شام کو آتی ہیں تو ادھر نہیں آتیں۔"
"اگر کسی مریض کو دیکھنے اس کے گھر نہ جانا پڑے تو میں یہاں اچھا خاصا وقت گزارتی ہوں۔ ڈیڑھ گھنٹا تو رکتی ہوں۔ تم اس وقت آ جایا کرو۔ باتیں کیا کرو مجھ سے۔ کوئی مریض آ جائے تو تھوڑی دیر باتیں نہ کیا کرو۔ کسی وقت جی چاہے تو شام کو ڈاک بنگلے پر بھی آ سکتی ہو۔ رات کے وقت پابندی تو نہیں ہے تم پر گھر سے نکلنے کی؟"
"وہ تو ہے ڈاکٹر باجی لیکن جب بابا کو بتادوں گی کہ میں آپ کے پاس جاتی ہوں تو وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ بس وہ میری ماں ہے نا' وہ ذرا منہ بنائے گی۔ آپ کو پتا ہے؟" شنتال کا انداز رازدارانہ ہوگیا۔"وہ میری سوتیلی ماں ہے!"
"اچھا!...... ہاں یہ تو مجھے معلوم نہیں تھا!...... تمہاری ماں کہاں ہے؟"
"وہ تو مر گئی ڈاکٹر باجی!" شنتال کچھ اداس ہوگئی۔
"مجھے تو ٹھیک طرح یاد بھی نہیں۔ بابا نے بتایا تھا کہ میں پانچ سال کی تھی۔ وہ مر گئی تو بابا نے دوسری شادی کر لی۔ چھ سال بعد وہ بھی مر گئی۔ پھر بابا نے ایک اور شادی کر لی پتا نہیں یہ کب مرے گی!" شنتال نے منہ بنایا۔"اور یہ بھی مر گئی تو کیا' بابا پھر کرلیں گے کسی سے شادی۔ سوتیلی مائیں تو سبھی بری ہوتی ہیں۔"
"اتنی شادیاں کی ہیں تمہارے بابا نے تو تمہارے سوتیلے بھائی بہن بھی ہوں گے!"
"نہیں ڈاکٹر باجی! اللہ کا شکر ہے۔ سوتیلے بھائی بہنوں کی مصیبت میں نہیں پڑی میں!"
شنتال کے بولنے کا انداز اور لہجہ ایسا تھا کہ نائلہ کو ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ شنتال اتنی تیزی سے بولتی چلی گئی تھی کہ اس کی ماں کی موت کے ذکر پر نائلہ کو اظہارِ ہمدردی کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔
ایک مریض آ گیا تو نائلہ کو اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ مریض کی موجودگی تک شنتال چپ رہی لیکن بار بار اس نے مریض کو بڑی ناگواری سے دیکھا تھا۔ اسے مریض کی آمد بہت بری لگی تھی۔
مریض کے جانے کے بعد نائلہ نے شنتال کی طرف دیکھا۔"ہاں!...... اب تم پھر باتیں کرسکتی ہو۔"
شنتال کی زبان چل پڑی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بہت دن سے کسی کو اپنے گھریلو حالات بتانے کے لیے بے چین رہی ہو لیکن اسے کوئی ایسا شخص ملا ہی نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی پہلی سوتیلی ماں تو اسے بہت مارتی پیٹتی تھی کیونکہ اس کا باپ اپنے کام کے سلسلے میں زیادہ تر گاؤں سے باہر رہا کرتا تھا۔ گھر میں کوئی اور تھا نہیں جو اسے سوتیلی ماں کے ظلم وستم سے بچاتا۔ اس کے مرنے کے بعد دوسری سوتیلی ماں آئی تو اس کا رویہ بھی دو تین سال تک اسی طرح کا رہا لیکن اس کے بعد شنتال میں سرکشی آ گئی۔ چودہ سال کی عمر میں ہی وہ خاصی بڑی لگنے لگی تھی۔ اس نے بھی اپنی سوتیلی ماں کو آڑے ہاتھوں لینا شروع کر دیا۔ وہ اسے نوچ کھسوٹ ڈالتی۔ ماں اسے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتی تو وہ اس کی کلائی اتنی زور سے پکڑ لیتی کہ چھڑائی نہ جاسکے۔
"جھینگا سی تو ہے وہ!" شنتال نے ہنس کر کہا۔"اور میں تو دیکھیں' کیسی مسٹنڈی ہوں۔ زمام خان بھی ڈر گیا تھا مجھ سے!"
"یہ زمام خان کون ہے؟" نائلہ نے مسکراتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا۔
شنتال نے فوراً جواب دیا۔ اس کے بیان کے مطابق وہ گاؤں کے ایک معمولی آدمی کا بیٹا تھا۔ پانچ سال پہلے شہر گیا تھا۔ وہاں کوئی ایسا کام کرتا تھا جس سے اچھی خاصی کمائی ہوتی تھی۔ سال میں دو چار دن کے لیے گاؤں آتا تھا تو باپ کو خاصے پیسے دے جایا کرتا تھا۔ اس بار یہ غیر معمولی بات ہوئی تھی کہ شہر سے آئے اسے دو ماہ گزر چکے تھے۔
شنتال نے نائلہ کو وہ واقعہ بھی بتایا جب زمام خان نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا اور وہ اس پر بگڑ گئی تھی۔
نائلہ کے لیے وہ سب کچھ ایسا نہیں تھا جسے جاننے کی وہ خواہش مند ہوتی لیکن شنتال کے بولنے کا انداز اسے اچھا لگ رہا تھا۔
"تم پہاڑ پر کہاں گئی تھیں؟" نائلہ پوچھ بیٹھی۔
شنتال کی زبان پھر چل پڑی۔ اس نے بتایا کہ وہ آٹھ دس سال کی ہی تھی جب اس کے بابا نے اسے نصیحت شروع کر دی تھی کہ وہ گاؤں کی لڑکیوں سے زیادہ میل جول نہ رکھے۔ شنتال نے اپنے باپ کی نصیحت نظر انداز نہیں کی تھی۔ اسی لیے وہ تنہائی کا شکار ہوگئی۔ باپ زیادہ تر گھر سے باہر رہتا تھا۔ سوتیلی ماؤں سے اس کی بنی نہیں تھی اس لیے وہ اپنا وقت گھومنے پھرنے میں گزارا کرتی تھی۔ پہاڑوں پر بھی چلی جاتی جہاں لومڑیوں اور خرگوشوں کے پیچھے دوڑنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ ایک لومڑی کے تعاقب ہی کی وجہ سے اسے پہاڑ پر ایک غار مل گیا جس کے دہانے پر اتنا جھاڑ جھنکاڑ تھا کہ گاؤں کے کسی بھی شخص کو اس غار کا علم نہیں تھا۔ اس وقت شنتال تیرہ سال کی تھی۔ اپنی کچھ چیزیں محفوظ کرنے کے لیے

اسے وہ غار بہت مناسب معلوم ہوا۔
جب شنتال کی سگی ماں زندہ تھی تو وہ اس کے باپ سے کہہ کر شہر سے اس کے لیے اچھے اچھے کھلونے اور گڑیاں منگوایا کرتی تھی۔ اپنے ہاتھ سے بھی اس کے لیے کچھ نہ کچھ بنایا کرتی تھی۔ وہ شنتال کے لیے ایک ''سرمایہ'' تھا جو اس کی ماں کے مرنے کے بعد خطرے میں پڑ گیا۔ سوتیلی ماں نے اس کے کھلونے توڑنا پھوڑنا اور غائب کرنا شروع کیے تو شنتال نے باقی سب چیزیں گھر میں ہی کسی خاص جگہ چھپا دیں۔ اس طرح وہ ان سب چیزوں سے گویا محروم ہی ہوگئی تھی لیکن غار ملنے کے بعد اس نے وہ سب چیزیں دھیرے دھیرے اس غار میں پہنچا دیں۔ غار کی صفائی بھی خود کی۔ اسے اپنے کھلونوں اور ماں کی ایک تصویر سے سجا دیا۔ کسی طرح ایک تو شک بھی وہاں پہنچا دی جس پر وہ لیٹ سکتی تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنے دن کے دو ایک گھنٹے وہیں گزارنا شروع کر دیے تھے لیکن کبھی کبھی اس پر کوئی انجانی سی محرومیت اور اداسی طاری ہوتی تھی تو وہ کئی کئی گھنٹے اسی غار میں گزار دیتی تھی۔ ماں کی تصویر کے آگے سر رکھ کر لیٹتی تھی تو اسے سکون مل جاتا تھا اور نیند آ جاتی تھی۔
ان باتوں نے نائلہ کو کچھ متاثر کیا۔ وہ شنتال کو صرف لا ابالی اور الھڑ سمجھتی تھی لیکن اب اسے معلوم ہوا تھا کہ اس لڑکی کے اندر تو محرومیاں اور اداسیاں بھی رچی بسی ہوئی تھیں۔
''جب میں اس غار سے نکلتی ہوں نا ڈاکٹر باجی!'' شنتال نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''تو سب کچھ بھول کر بالکل ٹھیک ہو جاتی ہوں۔''
''سب کچھ کیا؟'' نائلہ نے پوچھا۔
شنتال کے چہرے پر الجھن کے آثار دکھائی دیے۔ ''سب کچھ۔'' وہ بڑبڑائی۔ ''پتا نہیں کیا ڈاکٹر باجی!...... بس وہاں جاتی ہوں تو کوئی اور بات ہوتی ہے۔ جب وہاں سے نکلتی ہوں تو کچھ اور بات ہوتی ہے۔''
نائلہ سمجھ گئی کہ اس بھولی بھالی لڑکی کو اپنی کیفیت کا اظہار کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ دراصل وہ محرومی اور اداسی کی کیفیت میں وہاں جاتی تھی لیکن اپنے کھلونوں اور ماں کی تصویر کے ساتھ وقت گزار کر اس کی وہ اداسی ختم ہو جاتی تھی۔
ایک مریض کے آ جانے کی وجہ سے شنتال کو پانچ چھ منٹ کے لیے خاموش ہو جانا پڑا۔ مریض کے جاتے ہی وہ پھر بول پڑی۔
''ایک بات بتائیں گی ڈاکٹر باجی؟'' اس نے پوچھا۔
''ہاں ہاں، بولو!''
''زمام خان نے میرا ہاتھ پکڑا تھا تو مجھے بہت برا لگا تھا لیکن......'' شنتال کے چہرے پر الجھن نظر آئی۔ وہ کچھ توقف سے بولی۔ ''صفدر جان میرا ہاتھ پکڑتا تو مجھے برا نہیں لگتا۔''
''کیوں؟''
''یہی تو پوچھ رہی ہوں میں آپ سے!'' شنتال نے معصومیت سے کہا۔ ''پتا نہیں کیوں، صفدر جان مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ اسے دیکھتی ہوں تو پتا نہیں کیا ہونے لگتا ہے مجھے۔ جیسے آپ سے باتیں کر رہی ہوں نا، اسی طرح اس سے باتیں کرنے کو بھی دل چاہتا ہے۔ کسی اور کو دیکھ کر ایسا نہیں ہوتا۔ ایسا کیوں ہے ڈاکٹر باجی؟''
شنتال کی ان باتوں کے دوران میں نائلہ پہلی بار سنجیدہ ہوئی اور کچھ متفکرانہ انداز میں شنتال کی طرف دیکھنے لگی۔
''کیا ہوا ڈاکٹر باجی؟ آپ مجھے یوں کیوں دیکھ رہی ہیں؟'' شنتال نے ایسے لہجے میں پوچھا جیسے نائلہ کی نظروں نے اسے پریشان کر دیا ہو۔
نائلہ خفیف سا مسکرائی اور بولی۔ ''تمہیں سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ تم خطرناک حد تک معصوم ہو شنتال!''
شنتال ہنس پڑی۔ ''میں خطرناک ہوں؟''
''ہاں، خود اپنے لیے خطرناک!...... اچھا تم مجھے صفدر جان کے بارے میں تو کچھ بتاؤ! جانتی ہو اس کے بارے میں؟''
''ہاں ڈاکٹر باجی! بہت پڑھا لکھا ہے وہ۔ دس جماعتیں پاس ہے۔''
''وہ کیسے؟'' نائلہ نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہاں گاؤں میں تو ایسا کوئی اسکول نہیں ہے جہاں......''
''ایبٹ آباد میں پڑھا ہے اس نے۔'' شنتال نے نائلہ کی بات کاٹی۔ ''وہاں اس کا کوئی ماموں رہتا ہے۔ جب وہ چھوٹا تھا تو ملا صاب ہی پڑھاتے تھے اسے۔ چار سال ایبٹ آباد میں رہ کر پڑھا ہے اس نے...... وہاں تو بابوؤں جیسی نوکری مل سکتی تھی اسے لیکن وہ گاؤں آ گیا اور چارے کی دکان کھول لی۔ اسے بڑے بڑے شہر اچھے نہیں لگتے، بس اپنا گاؤں اچھا لگتا ہے۔''
''تمہیں کیسے معلوم؟''
''ایک بار ملا صاب بتا رہے تھے بابا کو، میں نے سن لیا۔ صفدر جان سے تو کبھی میری بات ہی نہیں ہوئی۔ آج پہلی بار......''

شنتال کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ گاؤں کا ایک آٹھ سالہ بچہ روتا ہوا کلینک میں آیا اور اس نے بتایا کہ اس کی ماں کھانا پکاتے پکاتے بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔

''گھبراؤ نہیں، میں ابھی چلتی ہوں۔'' نائلہ نے بچے کا گال تھپکا اور کھڑی ہو گئی۔

''آپ کی جیپ تو نظر نہیں آئی ڈاکٹر باجی!'' شنتال بولی۔ ''آپ جائیں گی کیسے؟''

''پیدل ہی جانا پڑے گا۔ ڈرائیور کو میں نے ایک کام سے بھیجا ہے۔'' نائلہ نے جواب دیا اور پھر اپنے کمپاؤنڈر باذل کو آواز دے کر اسے کچھ ہدایات دینے لگی۔

''چپ ہو جا شمبو! چپ ہو جا!'' شنتال روتے ہوئے بچے کو سمجھانے لگی۔ ''ڈاکٹر باجی ابھی جا تو رہی ہیں تیرے ساتھ..... ٹھیک ہو جائے گی تیری ماں!''

☆☆☆

آس پاس کے کسی بھی گاؤں میں ٹیلی فون کی سہولت نہ ہونے کے باعث نائلہ کو اپنے گھر والوں سے بات کرنے کے لیے ''جنگل منگل'' نامی ایک علاقے میں جانا پڑتا تھا جہاں لوگوں کو ٹیلی فون کی سہولت میسر تھی۔ وہاں آنے جانے میں اتنا وقت لگ جاتا تھا کہ نائلہ اپنے دن بھر کے شیڈول میں ایک گاؤں کم کرنے پر مجبور ہوتی تھی۔ کسی ایک گاؤں کے لوگوں کو وہ دو دن کی دوا دے کر آتی تھی۔ گزشتہ روز اس نے ایسا ہی کیا تھا گزشتہ روز اسے اپنی والدہ کی بیماری کے بارے میں پتا چلا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی تھی لیکن اس کے والد نے اسے دلاسا دیا تھا کہ اس کی ماں کا علاج کرنے والا ڈاکٹر فکرمند نہیں تھا۔ اس کے خیال کے مطابق دوسرے دن تک اس کی ماں کی حالت سنبھل جانی چاہیے۔

فون پر بات کرنے کے بعد نائلہ نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر دوسرے دن بھی اس کی ماں کی حالت نہ ٹھیک ہوئی تو وہ گاؤں والوں کو ایک ہفتے کی دوا دے کر اپنی ماں کو دیکھنے چلی جائے گی۔

دوسرے دن اس نے خود جانے کے بجائے اپنے شوفر کو فون کرنے کے لیے بھیج دیا تھا اس لیے دس سالہ شمبو کی ماں کو دیکھنے کے لیے اسے پیدل ہی جانا پڑا۔ اس کا باڈی گارڈ اس کے ساتھ ہی تھا اور شنتال بھی اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔

شمبو کی ماں کو ہوش میں لانے، اس کا کیس سمجھنے اور اسے دوائیں دینے میں بیس منٹ سے زیادہ لگ گئے۔ اس کی دانست میں تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔

جب وہ شمبو کے گھر سے نکلی تو جیپ وہیں موجود تھی۔ شوفر فون کر کے واپس آ گیا تھا اور لوگوں سے پوچھتا ہوا وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس نے نائلہ کو بتایا کہ اس کی ماں کی طبیعت سنبھل چکی تھی۔ نائلہ نے اطمینان کا سانس لیا ورنہ وہ اس دن گاؤں گاؤں جا کر سب لوگوں کو ایک ایک ہفتے کی دوا دے کر شام کو وہاں سے روانہ ہو جاتی۔

گھڑی دیکھنے کے بعد نائلہ نے فیصلہ کیا کہ اب اسے اپنے کلینک کا رخ کرنے کے بجائے قریبی گاؤں کی طرف چل پڑنا چاہیے۔ یہاں شنتال اس سے جدا ہو کر اپنے گھر چلی گئی۔

دوسرے گاؤں کی طرف جاتے ہوئے نائلہ کا ذہن شنتال میں الجھا رہا۔ اس نے یہ بالکل صحیح سمجھا تھا کہ شنتال خطرناک حد تک معصوم تھی۔ اپنی اس معصومیت کے باعث کسی وقت اسے خود نقصان اٹھانا پڑ سکتا تھا۔ گاؤں کی لڑکیوں سے الگ تھلگ رہنے اور ماں کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے باعث وہ جان ہی نہیں سکی تھی کہ لڑکیوں کو اپنی جوانی بہت محتاط رہ کر گزارنی چاہیے۔ وہ تو یہ جانتی ہی نہیں تھی کہ اس کا ہاتھ اگر زمام خان کے بجائے صفدر جان نے پکڑا ہوتا تو اسے کیوں برا نہیں لگتا۔ وہ نائلہ سے پوچھ رہی تھی کہ اسے صفدر جان سے باتیں کرنے کی خواہش کیوں ہوتی ہے اور کسی دوسرے شخص کو دیکھ کر اس کی کیفیت وہ کیوں نہیں ہوتی جو صفدر جان کو دیکھ کر ہوتی ہے۔

نائلہ کے خیال میں یہ بات بڑی خطرناک تھی کہ شنتال اپنی اس ''کیفیت'' کی تشریح نہیں کر سکی تھی کیونکہ اسے اس کیفیت کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ وہ عورت مرد کے ایک نازک تعلق سے قطعی بے خبر تھی۔

نائلہ نے فیصلہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں افضال خان سے بات کرے گی۔ اس شخص کو اشاروں کنایوں میں یہ سمجھانا ضروری تھا کہ اس نے اپنی بیٹی پر ضرورت سے زیادہ پابندیاں لگا دی تھیں۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے رکھتے ہر لڑکی کو جان لینا چاہیے کہ اس کے حق میں کیا اچھا ہے اور کیا برا!..... شنتال کو تو اتنا بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ صفدر جان کے قریب کیوں ہونا چاہتی تھی، اور جب کوئی لڑکی اتنی بے خبر ہو تو وہ کسی وقت بھی ایسی ٹھوکر کھا سکتی ہے جس کا ازالہ ہی ممکن نہ ہو۔

شنتال کو وہ ٹھوکر صفدر جان کی وجہ سے بھی لگ سکتی تھی۔ اس نے اپنے خیال میں صفدر جان کو صرف اس لیے اچھا سمجھ لیا تھا کہ وہ اپنے گاؤں سے بہت محبت کرتا تھا اور بہت پڑھا لکھا تھا۔

LEUCODERMA-VITILIGO

پہلبہری

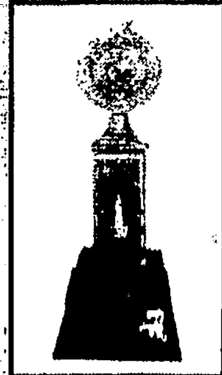
سفید داغ قابلِ علاج مرض ہے

STEROIDS FREE
MOST PROGRESSIVE TREATMENT

اجمل زیدی

ایوارڈ ہولڈر

ماہرِ برص کے دورۂ پاکستان کا مستقل پروگرام



پشاور

ہوٹل امین

یکم فروری تا 11 فروری
یکم جون تا 11 جون
یکم اکتوبر تا 11 اکتوبر

قیام: جی ٹی روڈ نزد میونسپل کارپوریشن پشاور شہر
فون 19-218215 (091)
فیکس نمبر 214772 (091)

لاہور

عامر ہوٹل

14 فروری تا 27 فروری
14 جون تا 27 جون
14 اکتوبر تا 27 اکتوبر

قیام: لوئر مال نزد سیشن کورٹ لاہور
فون 19-7115015 (042)
فیکس نمبر 7115013 (042)



کراچی

فورچون سینٹر

13 مارچ تا 27 مارچ
13 جولائی تا 27 جولائی
13 نومبر تا 27 نومبر

قیام: آفس 706، 7 فلور سری شاہراہ فیصل
نزد کے۔ ایف۔ سی۔ کراچی
فون: 0300-8566188



ملتان

ہوٹل سلور سینڈ

28 مارچ تا 6 اپریل
28 جولائی تا 6 اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر

قیام: ریلوے روڈ نزد چوک عزیز ہوٹل ملتان
فون 42062-42061 (061)



اسلام آباد

8 اپریل تا 30 مئی
8 اگست تا 30 ستمبر
9 دسمبر تا 30 جنوری

مستقل پتہ: مکان نمبر 62 اسٹریٹ نمبر 20 سیکٹر G-8-1
مرکز چوک (تعلیمی چوک) اسلام آباد
فون 2255880-2854595 (051)
موبائل: 8566188 (0300)
فیکس: 2261636

THE LASERDOT

گاؤں کی ایک معصوم لڑکی کے لیے کسی کا ''میٹرک'' تک پڑھ لینا بہت بڑی بات تھی لیکن نائلہ نے سمجھ لیا تھا کہ صفدر جان اسے صرف اس لیے اچھا نہیں لگتا تھا۔ پسندیدگی کی وجہ یہ بھی کہ صفدر جان کی مردانہ وجاہت اور دل کش نقش و نگار نے اس کے دل و دماغ میں کچھ ایسے دھند لکے بکھیر دیے تھے۔ جنہیں وہ سمجھ نہیں سکتی تھی لیکن سرشاری کی کیفیت سے دوچار ہو جاتی تھی اور اسے اپنی اس کیفیت کا بھی بالکل ادراک نہیں تھا۔

ابھی خود نائلہ بھی اس الجھن کا شکار تھی کہ صفدر جان کس قسم کا نوجوان ہے۔ وہ اسے کچھ دن سے اپنے کلینک کے آس پاس منڈلاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ دو مرتبہ وہ شام کو گاؤں لوٹتے ہوئے بھی اسے دیکھ چکی تھی۔ وہ کسی درخت، کسی ٹیلے کی آڑ سے اس کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ نائلہ نے صفدر جان کو گاؤں کے راستے پر صرف دو ہی مرتبہ دیکھا تھا لیکن یہ بات ممکن تھی کہ اس نے مستقل ہی اپنا یہ وتیرہ بنا رکھا ہو لیکن نائلہ کی نظر میں صرف دو بار آیا ہو۔

کسی جواز کے بغیر نائلہ یہ نہیں سمجھنا چاہتی تھی کہ اس کے لیے صفدر جان کے دل میں کچھ ''گندگی'' تھی لیکن یہ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اسے بس دیکھا کرتا ہے یا کسی وجہ سے اس کی نگرانی کر رہا ہے...... اور پھر اس کی نگرانی بھی آخر کیوں؟

اب نائلہ کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ مولانا ادریس کا بیٹا تھا۔ مولانا ادریس ایک مرتبہ اپنے بخار کی وجہ سے اس کے پاس آ بھی چکا تھا۔ نائلہ کو وہ ایک اچھا انسان لگا تھا۔ وہ گاؤں والوں سے بھی مولانا ادریس کی تعریفیں سن چکی تھیں۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے شنتال کے لہجے میں بھی احترام تھا۔

یہ جان کر نائلہ کی الجھن اور بڑھ گئی تھی کہ ایک حد درجہ شریف انسان کا بیٹا یہ گھٹیا قسم کی حرکت کیوں کر رہا ہے۔

دوسرے گاؤں پہنچنے تک نائلہ ذہنی طور پر شنتال کی خطرناک حد تک معصومانہ باتوں اور صفدر جان کی شخصیت کے اسرار میں ہی الجھی رہی۔ گاؤں پہنچنے کے بعد اس کی توجہ اپنے مریضوں پر مرکوز ہو گئی لیکن جب وہاں سے ایک اور گاؤں کی طرف روانہ ہوئی تو پھر وہی خیالات اس کے دماغ میں کلبلانے لگے...... کبھی کبھی اسے اپنی ماں کا بھی خیال آیا۔ جن دنوں وہ اپنے ''مشن'' پر ان دیہاتوں میں آئی تھی اس سے ایک ہفتے پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا کہ اس کی ماں کو اپنی سانس گھٹتی ہوئی سی لگی تھی۔ اسے فوراً ہاسپٹل لے جایا گیا تھا لیکن ڈاکٹرز بھی دس بارہ گھنٹے تک اس کی کیفیت پر قابو نہیں پا سکے تھے۔ دس بارہ گھنٹے بعد اس کی ماں کی حالت سنبھلنا شروع ہوئی تھی اور مزید دس بارہ گھنٹوں بعد وہ بالکل ٹھیک ہو گئی تھی، جیسے اسے کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ہاسپٹل میں اس کے ہر طرح کے ٹیسٹ کر لیے گئے تھے لیکن سانس گھٹنے کی اس کیفیت کا سبب سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔

اب یہ نائلہ کی ماں پر اس قسم کا دوسرا دورہ پڑا تھا اور حسب سابق دوسرے دن اس کی حالت سنبھل بھی گئی تھی۔ امکان یہی تھا کہ وہ شام تک بالکل ٹھیک ہو جاتی لیکن نائلہ کو اس سلسلے میں تشویش ہو گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ بیس پچیس دن بعد جب چند دن کے لیے اپنے گھر جائے گی تو انٹرنیٹ کے ذریعے اپنی ماں کی تمام میڈیکل رپورٹس امریکا کے ایک ڈاکٹر کو بھیجے گی جو دوران تعلیم اس کا استاد رہ چکا تھا۔ رپورٹس بھیجنے کے بعد وہ ڈاکٹر سے طویل مشاورت بھی کرتی۔

شام کا میلا پن جب رات کی سیاہی میں گھلنے والا تھا، اس وقت نائلہ واپس لوٹی۔ جب اس کی جیپ ڈاک بنگلے کے قریب پہنچی تو وہاں ایک لینڈ کروزر کھڑی دیکھ کر اسے الجھن ہوئی۔ جیپ جب بالکل قریب جا کر رکی تو ہیڈ لائٹ میں یہ دیکھ کر اس کی پیشانی پر ایک شکن پڑ گئی کہ لینڈ کروزر سے ٹیک لگائے ناصر کھڑا ہوا تھا اور مسکراتا ہوا جیپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جیپ سے اتر کر نائلہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

ناصر نے بھی اس کی طرف چند قدم بڑھائے۔

''ہیلو!'' ناصر کے انداز میں چہکار سی تھی۔ ''بہت انتظار کرایا تم نے...... میرا خیال تھا کہ تیسرے پہر تک فارغ ہو کر یہاں آ جاتی ہو گی۔''

''تم یہاں کیسے؟'' نائلہ نے خشک لہجے میں کہا۔

ناصر اس کا منگیتر سہی لیکن یہاں اس کی آمد نائلہ کو گراں گزری تھی۔

ناصر نے اس کے لہجے کی گرانی محسوس کی تو سنجیدگی سے بولا۔ ''میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کروں گا۔ بس اِدھر اُدھر گھومتا رہا کروں گا۔''

نائلہ چونکی۔ ''کیا یہاں رہنے آئے ہو؟''

''ہاں، کچھ دن کے لیے۔'' ناصر نے جواب دیا۔ ''دراصل والد صاحب کی وفات کے بعد مجھے بہت گھبراہٹ رہنے لگی تھی۔ ڈاکٹر نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کچھ دن کے لیے شہری ہنگاموں سے دور کہیں پہاڑوں پر یا دیہی علاقوں میں چلا جاؤں۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ تم یہاں ہو تو میں نے یہیں آنے کا فیصلہ کیا۔''

نائلہ سوچ میں ڈوبی ہوئی ڈاک بنگلے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ مشرقی طرزِ فکر رکھتی تھی اس لیے اسے بہت غیر مناسب لگ رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہاں کوئی ایسا شخص رہے جس سے ابھی اس کی صرف منگنی ہی ہوئی تھی، شادی نہیں ہوئی تھی۔ ان دونوں کے والد چونکہ دوست تھے اس لیے فریقین کا ایک دوسرے کے گھروں میں خاصا آنا جانا بھی رہا تھا۔ نائلہ جب بہ غرضِ تعلیم امریکا گئی تھی، اس وقت تک ان دونوں میں کسی حد تک دوستانہ بے تکلفی بھی ہو چکی تھی لیکن نائلہ نے کبھی بھی ناصر کو اس نظر سے نہیں دیکھا تھا کہ وہ کبھی اس کا شریکِ زندگی بن جائے گا۔ اس سے اس کی منگنی بھی اس لیے ہوگئی تھی کہ مشرقی روایات کا پاس رکھنے کے لیے نائلہ اپنے باپ کے سامنے لب کشائی نہیں کرسکی تھی۔ یہ الفاظ زبان پر لانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ اپنی زندگی کے ساتھی کے انتخاب کا فیصلہ وہ اپنے پاس محفوظ رکھنا چاہتی ہے۔ اس نے ایک سعادت مند اولاد کی طرح اپنے باپ کے فیصلے پر سرِ اطاعت خم کردیا تھا اور سوچ لیا تھا کہ غالباً یہی اس کا مقدر ہے۔

ڈاک بنگلے میں داخل ہوتے ہوئے نائلہ نے پوچھا۔ ''یہاں کب پہنچے؟''

''چار بجے سے انتظار کررہا ہوں تمہارا۔''

''سامان؟''

''بس ایک سوٹ کیس ہے۔ ابھی گاڑی ہی میں رکھا ہے۔ چوکیدار نے مجھے اندر قدم بھی نہیں رکھنے دیا۔ میں نے اسے اپنے اور تمہارے رشتے کے بارے میں بھی بتایا تھا لیکن وہ اس پر اڑا رہا کہ میں باہر ہی تمہارا انتظار کروں۔ اب تم کسی سے کہہ کر میرا سوٹ کیس تو گاڑی سے اتروالو۔''

''بیٹھو!'' نائلہ نے سٹنگ روم کے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

''بہت تھکی ہوئی نظر آرہی ہو۔ پہلے ذرا فریش ہوجاؤ۔ پھر اطمینان سے باتیں کریں گے۔''

''مجھے ابھی تم سے کچھ کہنا ہے۔'' نائلہ نے کہا اور ناصر سے پہلے ہی ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ مجبوراً ناصر کو بھی بیٹھنا پڑا۔

''دیکھو، ناصر!'' نائلہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''مستقبل میں ہمارا جو رشتہ بننے گا، وہ بہرحال ابھی نہیں بنا۔ ابھی ہم صرف منگیتر ہیں۔ فی الحال یہ مناسب نہیں ہوگا کہ ہم ایک چھت کے نیچے رہیں۔''

ناصر ہنسا۔ ''کیا فرسودہ باتیں لے بیٹھی ہو نائلہ! امریکا سے آنے کے بعد تو تمہیں بہت بدل جانا چاہیے تھا۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے بتادوں کہ میں انکل سے اجازت لے کر آیا ہوں یہاں! کل شام ان سے ملا تھا۔ دن میں تو آنٹی کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ وہی دو مہینے پہلے والا دورہ!......شام کو وہ تقریباً سنبھل چکی تھیں۔ اسی لیے انکل مجھ سے بڑے سکون کے ساتھ باتیں کرسکے۔''

یہ جان کر نائلہ تلملاسی گئی کہ اس کے باپ نے ناصر کو اس کے پاس آنے کی اجازت دے دی تھی۔

ناصر پھر بولا ''تمہاری باتوں سے مجھے اندازہ ہورہا ہے کہ انکل تمہیں بتانا بھول گئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آج جب تم انہیں فون کروگی تو وہ تمہیں میرے پہنچنے کی اطلاع دے دیں گے۔''

نائلہ کو اندازہ تھا کہ ناصر جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ جھوٹ بولتا تو بات کسی وقت بھی کھل سکتی تھی۔ اگر وہ خود فون کرنے جاتی تو یقیناً اس کے والد اسے ناصر کے بارے میں بتادیتے۔ شوفر سے انہوں نے یہ بات کہنا غالباً مناسب نہیں سمجھا تھا۔

''غالباً اب تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا!'' ناصر کے ہونٹوں پر بڑی عیارانہ مسکراہٹ تھی۔

''اچھا خیر!'' نائلہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''ایک بات کا خیال تو بہرحال رکھنا پڑے گا۔ یہاں سے باہر گھومنے پھرنے کے لیے میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گی۔ گاؤں کے لوگوں کا بھی خیال رکھنا پڑے گا مجھے، یہ شہری مزاج کے لوگ نہیں ہیں۔ ان کو تو یہ بھی اچھا نہیں لگے گا کہ میرا منگیتر میرے ساتھ رہے۔'' نائلہ یکایک کھڑی ہوئی۔ ''شوفر تمہیں جانتا ہے۔ اس سے اپنا سوٹ کیس اتروالو۔ میں جس کمرے میں سوتی ہوں، اس کے علاوہ کوئی بھی کمرا اپنے لیے منتخب کرلینا۔''

نائلہ اٹھ کر تیزی سے اندرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ اس نے وہ عجیب سی مسکراہٹ نہیں دیکھی جو اس وقت ناصر کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن گاؤں سے کچھ دور ایک سنسان مقام پر ناصر ایک چٹان کے سائے میں کھڑا تھا۔ یہ جگہ اسے سولجر ہی نے دکھائی تھی جو اسے لے کر گاؤں آیا تھا۔ اس کے لیے لینڈ کروزر سولجر کے پاس نے ہی فراہم کرائی تھی۔ سولجر نے اس سے کہا تھا کہ وہ دوسرے دن پانچ چھ بجے کے درمیان اس چٹان کے قریب زمام خان کا انتظار کرے۔ اسے ڈاک

بنگلا دور سے ہی دکھا کر سولجر لینڈ کروزر سے اتر گیا تھا۔ اس نے ناصر کو یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا کہ وہ ایبٹ آباد واپس کس طرح جائے گا۔

ناصر کو اس چٹان تک پہنچے پندرہ منٹ گزر چکے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ زمام خان کو بھی یہ پیغام سولجر ہی نے پہنچایا ہوگا کہ دوسرے دن اسے کس وقت کس جگہ پہنچ کر ناصر سے ملاقات کرنی ہے۔

ناصر وہاں پانچ بج کر پانچ منٹ پر پہنچا تھا۔ بیس منٹ بعد زمام خان بھی وہاں پہنچ گیا۔ گاؤں کی طرف آتے ہوئے سولجر نے اسے زمام خان کی تصویر دکھادی تھی۔ وہ اسے پہچان گیا۔ زمام خان کو بھی اس کی تصویر دکھادی گئی ہوگی کیونکہ اس نے بھی ناصر کو پہچان لیا تھا۔

''معاف کرنا برادر! مجھے تھوڑی دیر ہوگئی۔'' زمام خان نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ادھر...... وہ پتھر ٹھیک رہے گا بیٹھ کر بات کرنے کے لیے۔''

وہ پتھر خاصا بڑا تھا۔ دو آدمی اس پر آسانی سے بیٹھ سکتے تھے۔ نہ جانے کیسے اس پتھر کی اوپری سطح بالکل سپاٹ اور کسی حد تک چکنی تھی۔ اس پر بیٹھنا تکلیف دہ نہیں ہوتا لیکن ناصر کو یہ اچھا نہیں لگا کہ وہ زمام خان جیسے معمولی آدمی کے ساتھ ایک پتھر پر بیٹھ کر باتیں کرے۔ اس نے قریب ہی کے اور بڑے پتھر کے قریب اپنی بائیں ٹانگ اٹھا کر پیر اس پر رکھ دیا اور اپنے دونوں ہاتھ گھٹنے پر رکھتے ہوئے بولا۔

''تم بیٹھو۔ باتیں کرتے ہوئے آمنے سامنے ہونا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔''

زمام خان نے کوئی تکلف نہیں کیا۔ اس نے اپنے موٹے سول کی چپلیں اتاریں اور پتھر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

''ہاں برادر! اب بولو!'' اس نے ناصر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ اتنے دن تک تمہاری ناکامی کا سبب کیا ہے۔''

''افضال خان نے اپنے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا ہے۔ وہ بہت خوف زدہ ہے۔''

''یہ تو مجھے باس نے بتادیا تھا۔'' ناصر نے جواب دیا۔ ''اس نے کسی طرح ... شہر سے ایک جوہری کو بلایا تھا اور اسے ایک ہیرا پانچ لاکھ میں فروخت کیا تھا' لیکن افضال خان کا گھر سے نکلنا تمہاری ناکامی کا سبب کیوں ہے۔ تم تو اس دعوے کے ساتھ یہاں آئے تھے کہ اس کی جوان بیٹی شنتال کے ذریعے کام نکالو گے۔''

''کیا بولوں برادر!'' زمام خان نے مایوسانہ انداز میں سر ہلایا۔ ''مجھے بالکل خیال نہیں تھا کہ جوان ہو کر وہ اتنی خوں خوار ہوگئی ہوگی۔ وہ تو بلی کی طرح کاٹنے کو دوڑنے لگی ہے۔''

''یہ تمہیں کب معلوم ہوا؟'' ناصر نے پوچھا۔

زمام خان نے اس شام کا واقعہ سنادیا جب اس نے شنتال کا ہاتھ پکڑا تھا اور وہ بری طرح بپھر گئی تھی۔

وہ واقعہ سن کر ناصر کچھ سوچنے لگا' کچھ توقف سے بولا۔

''پہاڑ پر چڑھ کر وہ کہاں غائب ہوجاتی ہے؟''

''ابھی مجھے اس کا پتا نہیں چلا۔''

ناصر نے پتھر سے اپنا پیر نیچے اتارا اور کچھ سوچتا ہوا ٹہلنے کے سے انداز میں چند قدم ایک طرف بڑھا' پھر واپس مڑا۔

''تمہیں میرے بارے میں سولجر نے کیا بتایا ہے؟''

''یہی کہ باس نے تمہیں بھیجا ہے اور اب تم وہ کام کرو گے جو میں نہیں کر سکا۔''

''یہ نہیں بتایا کہ ضرورت پڑنے پر میں تم سے بھی مدد لے سکتا ہوں؟''

''یہ بھی بولا تھا۔''

ناصر نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا' پھر بولا۔ ''جب تم یہاں آئے تھے تو تمہیں ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر دیا گیا تھا جس پر تم سولجر سے بات کیا کرتے تھے۔''

''ہاں۔'' زمام خان نے جواب دیا۔ ''دس بارہ دن پہلے وہ میرے ہاتھ سے ایک چٹان پر گر گیا تھا۔''

''سولجر مجھے یہ بھی بتا چکا ہے۔'' ناصر نے کہا اور اپنی جیب سے موبائل سائز کا ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر نکال کر زمام خان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ مت توڑ دینا۔ میں مناسب نہیں سمجھتا کہ تم سے میری بار بار ملاقات ہو۔ تم اسی ریڈیو ٹرانسمیٹر پر مجھ سے رابطہ کر سکتے ہو۔''

''تمہارے پاس بھی ہے یہ؟''

''ہاں۔'' ناصر نے جواب دیا۔ ''دوسرا مجھے اسی لیے دیا گیا تھا کہ تمہیں دے دوں۔ آج کی ملاقات میں بس اتنی ہی باتیں کافی ہیں۔ تم نے مجھے بتادیا ہے کہ شنتال کس قسم کی لڑکی ہے۔ اب میں سوچوں گا کہ اس خوں خوار بلی کو اگر کسی طرح بھی استعمال نہیں کیا جا سکتا تو پھر دوسری کیا تدبیر ممکن ہے۔ ہاں ایک بات میں ضرور معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ پتا لگاؤ کہ شنتال پہاڑ پر جا کے کہاں غائب ہوجاتی ہے۔ کہیں ایسا تو

نہیں کہ کسی سے اس کا معاشقہ چل رہا ہو اور ان دونوں نے ملاقات کے لیے پہاڑ پر کوئی خفیہ جگہ تلاش کر لی ہو۔''

زمام خان نے کچھ کہنا چاہا لیکن ناصر نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔ ''اب کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی طرح بھی اس کا پتا لگاؤ اور مجھے بتاؤ۔''

زمام خان کے چہرے سے ایسا ظاہر ہوا جیسے ناصر کا حاکمانہ انداز اسے گراں گزرا ہو لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔

اس طرح ان دونوں کی ملاقات ختم ہوگئی۔ جاتے جاتے ناصر نے زمام خان کو اتنا اور بتا دیا کہ وہ کس فریکوئنسی پر اس کے ریڈیو ٹرانسمیٹر سے رابطہ کر سکتا ہے۔

ناصر پہاڑوں پر اِدھر اُدھر گھومتا ہوا گاؤں کی طرف بڑھا۔ وہ دن میں بھی کچھ دیر گاؤں میں گھومتا رہا تھا۔ نائلہ سے اس کی یہ بات ہو چکی تھی کہ وہ اسی دن گاؤں والوں میں یہ بات پھیلا دے گی کہ اس کا منگیتر کچھ دن کے لیے وہاں آیا ہوا ہے۔

غروبِ آفتاب کے ساتھ شام کا مٹیالا رنگ پھیلنے لگا تھا جب ناصر گاؤں میں داخل ہوا۔ دن میں بھی وہ گاؤں میں گھومتے ہوئے وہاں کی چند لڑکیوں کو کن انکھیوں سے دیکھ چکا تھا لیکن اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ ان میں کوئی شنتال تھی یا نہیں لیکن اب اسے زمام خان سے شنتال کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان کی وجہ سے وہ شنتال کو پہچان لیتا اگر وہ کہیں نظر آتی۔

اس وقت ناصر کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ گاؤں میں لوگوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ غالباً وہاں کے لوگ سرِ شام ہی اپنے گھروں تک محدود ہو جانے کے عادی تھے۔

مایوس ہو کر ناصر ڈاک بنگلے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ اب کچھ تھکن بھی محسوس کر رہا تھا۔ اسے اتنی دیر تک پیدل چلنے کی عادت نہیں تھی۔ پھر اونچے نیچے پہاڑی راستے تو کچھ زیادہ ہی تھکا دیتے ہیں۔

اندھیرا پھیل چکا تھا جب وہ ڈاک بنگلے پہنچا۔ نائلہ ابھی نہیں لوٹی تھی۔ ناصر نے اس کا انتظار کیا۔ وہ تھوڑی دیر بعد آگئی۔ ناصر کے استفسار پر اس نے بتایا کہ کبھی کبھی کسی مریض کی وجہ سے وہ تاخیر سے واپس آتی تھی۔ اسی وقت ڈاک بنگلے کا چوکیدار بھی قریب آ گیا۔ اس نے نائلہ کو بتایا کہ ذرا دیر پہلے گاؤں سے ایک لڑکی آئی تھی اور اسے پوچھ رہی تھی۔

ناصر اس وقت چونکا جب چوکیدار نے اس لڑکی کا نام شنتال بتایا۔ ناصر کو افسوس ہوا کہ اسے ذرا سی دیر ہوگئی تھی۔ شنتال اس سے صرف ڈیڑھ دو منٹ پہلے ڈاک بنگلے آئی تھی۔

''شاید اس کے گھر میں کوئی بیمار ہوگا۔'' ناصر نے نائلہ سے کہا۔

''نہیں۔'' نائلہ نے جواب دیا۔ ''اگر ایسا ہوتا تو وہ چوکیدار کو بتا کر جاتی۔ یوں ہی مجھ سے ملنے آ گئی ہوگی۔ کبھی کبھی کلینک بھی آ جاتی ہے۔''

ناصر سوچتا رہ گیا کہ اس وقت قدرت نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اسے نائلہ سے باتیں کرنے کا موقع اس وقت ملا جب وہ کھانے کی میز پر پہنچا۔ چھوٹی سی میز باورچی خانے کے قریب کے کمرے میں تھی۔

''یہ گاؤں والے تمہیں یہاں بھی ڈسٹرب کرتے ہیں!'' ناصر بولا۔

''اگر کوئی یہاں آئے گا تو بھی میں ڈسٹرب نہیں ہوں گی۔'' نائلہ نے جواب دیا۔ ''یہ بات تم نے غالباً شنتال کی وجہ سے کہی ہے حالانکہ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ وہ کبھی کبھی مجھ سے صرف ملنے کے لیے آتی ہے۔ وہ ایک بھولی بھالی لڑکی ہے جسے مجھ سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔''

''گاؤں کی لڑکیاں بھولی تو ہوتی ہیں۔''

''وہ زمانہ گزر گیا جب گاؤں کی لڑکیاں بھولی بھالی ہوا کرتی تھیں۔ لیکن شنتال بہت معصوم ہے۔ بہت زیادہ معصوم!'' نائلہ کا انداز ایسا تھا جیسے کچھ سوچ بھی رہی ہو۔

''بہت زیادہ معصوم کیا مطلب!'' ناصر نے پوچھا۔

نائلہ اس وقت صفدر جان کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اسے آج بھی اپنی واپسی کے راستے پر ایک جگہ چھپا نظر آیا تھا۔ اس کے بارے میں سوچ بچار کے باعث نائلہ بے خیالی میں شنتال کے کردار پر خاصا تبصرہ کر گئی۔

اس رات ناصر اپنے بستر پر پڑا، کافی دیر تک شنتال کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ شنتال جیسی معصوم لڑکیوں کو آلۂ کار بنانا زیادہ مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ بس ذرا غور و فکر کی ضرورت تھی۔ کوئی نہ کوئی راستہ سوجھ ہی جاتا۔

وہ راستہ ناصر کو دوسرے دن سہ پہر کے بعد اس وقت سوجھا جب زمام خان ریڈیو ٹرانسمیٹر پر اس سے بات کر چکا تھا۔ آج اسے اس غار کا پتا چل چکا تھا جہاں شنتال جاتی تھی۔ اس روز زمام خان نے چالاکی یہ کی تھی کہ شنتال کا تعاقب کرنے کے بجائے وہ پہلے ہی سے پہاڑ پر چڑھ گیا تھا

اور اس نے اوپر آتی ہوئی شنتال پر کڑی نظر رکھی تھی۔

☆☆☆

شنتال سے صفدر جان کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہو جانے کے بعد نائلہ نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ اب اسے صفدر جان کے بارے میں کوئی اقدام کرنا ہی چاہیے لیکن یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا قدم اٹھائے۔ اس کے مزید دو دن اسی ادھیڑ بن میں گزر گئے۔ ان دنوں میں اس نے اپنے مریضوں ہی سے سرسری باتیں کرتے ہوئے صفدر جان کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہی لیکن کوئی خاص بات علم میں نہیں آ سکی۔ اس نے بس اتنا اور جانا کہ لگ بھگ ڈیڑھ مہینے سے صفدر جان اپنی دکان کھولنے اور بند کرنے کے معاملے میں وقت کا پابند نہیں رہا تھا۔ اس کی دکان اب ڈیڑھ دو گھنٹے کی تاخیر سے کھلتی تھی اور کچھ جلدی ہی بند ہو جاتی تھی۔

اس کا سبب نائلہ کی سمجھ میں فوراً آ گیا۔ صبح جو وقت وہ کلینک میں گزارتی تھی، صفدر جان وہ وقت اس کے کلینک کے آس پاس منڈلاتے ہوئے گزارتا تھا۔ پھر اس کی دکان جلدی اس لیے بند ہوتی تھی کہ وہ نائلہ کی واپسی کے وقت اس کے راستے میں کسی جگہ چھپا ہوا ہوتا تھا۔

ایک بار نائلہ کو خیال آیا کہ وہ مولانا ادریس کو اس کے بیٹے کی حرکت کے بارے میں بتائے لیکن اس نے یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

ان دو دنوں میں شنتال اس کے پاس آتی رہی۔ اپنی معصومانہ باتوں میں اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کے باپ نے شہر سے بڑی خوب صورت موم بتیوں کا اسٹاک منگوایا تھا۔ شنتال اس میں سے ایک پیکٹ چھپا کر اپنے غار میں لے گئی تھی۔ پہلے وہ غار کی تاریکی دور کرنے کے لیے وہی عام موم بتیاں استعمال کیا کرتی تھی جو گاؤں کے لوگوں کے پاس ہوتی تھیں۔

نائلہ جلد از جلد کسی طرح افضال خان سے ملنا چاہتی تھی لیکن صفدر جان کی وجہ سے اس کا ذہن بہت الجھا ہوا رہتا تھا۔ وہ افضال خان کے گھر جانے کا کوئی بہانہ نہیں سوچ سکی تھی۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ اب اسے اس الجھن سے نجات حاصل کرنے میں مزید تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔

کلینک بند کرنے کا وقت ہوا تو اس نے اپنے باڈی گارڈ کو بلا کر اسے صفدر جان کے بارے میں بتایا۔ اس وقت اسے معلوم ہوا کہ اس کا باڈی گارڈ بھی صفدر جان سے بے خبر نہیں رہا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ نائلہ بھی بے خبر نہیں تھی مگر کیونکہ اس نے خاموشی اختیار کیے رکھی تھی۔۔۔ اس لیے باڈی گارڈ بھی چپ رہا تھا۔

اس گفتگو کے بعد نائلہ اپنے شیڈول کے مطابق قریبی گاؤں کی طرف روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

نصف النہار پر پہنچنے کے بعد سورج کو مغرب کی طرف اپنا سفر شروع کیے ڈیڑھ گھنٹا گزر چکا تھا جب شنتال پہاڑ پر چڑھ رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اچانک پلٹ کر دیکھ بھی لیتی۔ زمام خان سے اچانک سامنا ہو جانے کے بعد سے وہ اپنے اس غار کی طرف جاتے ہوئے محتاط رہنے لگی تھی۔ جہاں اسے بے حد سکون ملتا تھا۔ آج وہ دو دن بعد اس غار کی طرف جا رہی تھی۔ غار کی طرف جانا اس کا معمول نہیں تھا۔ کبھی کبھی وہ کئی کئی دن تک اس طرف کا رخ نہیں کرتی تھی اور کبھی ایسا ہوتا تھا کہ وہ چھ چھ سات سات دن تک وہاں جاتی رہتی تھی۔ اس کا سارا انحصار اس کی قلبی و ذہنی کیفیت پر تھا۔

غار کے قریب پہنچنے کے بعد وہ ایک بڑے پتھر کی آڑ میں بیٹھ گئی۔ پانچ منٹ اس نے وہاں ساکت بیٹھے بیٹھے گزار دیے۔ جب اتنی دیر تک اسے کوئی آہٹ نہیں سنائی دی تو وہ اطمینان سے ان گھنی جھاڑیوں کی طرف بڑھی جنھوں نے غار کا دہانہ پوری طرح چھپا رکھا تھا۔ اتنی گھنی جھاڑیاں شنتال نے اس پہاڑ پر کہیں نہیں دیکھی تھیں۔ ان جھاڑیوں میں کہیں کہیں کانٹے بھی تھے اس لیے احتیاط بھی کرنا پڑتی تھی۔ غار کے دہانے تک پہنچنے میں شنتال کو ایک ڈیڑھ منٹ تو لگ ہی جاتا تھا۔

جھاڑیاں اتنی زیادہ گھنی تھیں کہ دن میں بھی وہاں رات کا سا اندھیرا ہوتا تھا۔ شنتال وہاں برسوں سے آ رہی تھی اس لیے اندھیرے میں بھی وہ بڑی آسانی سے اس جگہ پہنچ گئی جہاں موم بتیاں اور ماچس رکھی ہوئی تھی۔ شنتال نے صرف ایک موم بتی روشن کی اور ماں کی تصویر کے قریب رکھ دی۔ صرف ایک موم بتی اس غار کا اندھیرا ختم کرنے کے لیے ناکافی تھی لیکن شنتال اس معاملے میں کفایت شعاری پر مجبور تھی۔ گھر سے جلدی جلدی موم بتیاں چرا کر لاتی تو اس کی سوتیلی ماں کو شک ہو سکتا تھا۔ اس نے ابتدا ہی سے کم روشنی پر اکتفا کیا تھا۔

روشنی میں شنتال نے اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ جھاڑیوں میں سے کبھی کبھی کچھ ٹوٹ کر اس کے کپڑوں میں الجھ جاتا تھا۔ اطمینان کرنے کے بعد وہ تو شک پر اس طرح اوندھی لیٹ گئی کہ ماں کی تصویر اس کے سامنے رہی۔

تصویر کے ساتھ ہی اس نے اپنی گڑیاں اور کھلونوں کے علاوہ چند اور چیزیں بھی سجا رکھی تھیں جو وہ اپنے گھر سے ہی چرا کر لائی تھی۔

''تم مجھے دیکھ رہی ہو اماں اور میں تمہیں دیکھ رہی ہوں'' شنتال تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''لیکن میں بولتی رہتی ہوں اور تم چپ رہتی ہو۔ کبھی کبھی تم میری کسی بات کا جواب دیتی ہو تو خواب میں آ کر...... اسی لیے جب مجھے تم سے کوئی بات پوچھنا ہوتی ہے تو میں یہیں سو جاتی ہوں۔ گھر پر تو مجھے دن میں کبھی نیند نہیں آتی۔ آج میں تم سے ایک ایسی بات پوچھنا چاہتی ہوں اماں جو میں نے ڈاکٹر باجی کے سوا کسی کو نہیں بتائی۔ مجھے اس کا جواب چاہیے کہ صفدر جان مجھے اچھا کیوں لگتا ہے؟ میں کیوں اس سے باتیں کرنا چاہتی ہوں؟ میں اس سے کیا چاہتی ہوں؟'' شنتال نے کچھ توقف کیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کچھ گہری ہو گئی۔ وہ توقف سے بولی۔ ''بتاؤ گی نا اماں؟''

چند لمحے رک کر شنتال دھیرے سے ہنسی۔ ''بتاؤ گی تو ضرور لیکن خواب میں آ کر بتاؤ گی۔''

شنتال نے اپنی پیشانی تصویر کے سامنے ٹکا دی اور آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ عموماً ایسا ہی ہوتا تھا۔ خواب میں ماں سے باتیں کرنے اور سونے کی اس کی خواہش اتنی ہی شدید ہوتی تھی کہ اسے دن میں بھی نیند آ جاتی تھی۔ اسے یاد نہیں تھا کہ وہ کبھی سونے کی خواہش کے باوجود نہ سو سکی ہو......

گہری نیند میں پہنچنے کے بعد اس نے خواب میں دو ہاتھ دیکھے جو اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ ایسا خواب دیکھ رہی تھی۔ ہاتھ اس کے بالکل قریب آ کر اس کے شانوں پر ٹک گئے، پھر آہستہ آہستہ اوپر سرکے۔ اس نے اپنا چہرہ ان ہاتھوں میں محسوس کیا۔ انگلیاں اس کے ہونٹ چھونے لگیں۔ پہلے تو وہ ان ہاتھوں کو دیکھ کر پریشان ہوئی تھی لیکن جب اس کے ہونٹوں کو چھوا گیا تو اسے اچھا لگا۔ پھر وہ ہاتھ نیچے سرکے اور اس کی گردن سے ہوتے ہوئے اس کے شانوں تک پہنچے۔

شنتال کے لیے...... وہ احساس بالکل اجنبی تھا جو ہاتھوں کی حرکت سے پیدا ہوا۔ وہ اپنے جسم میں ایک عجیب سی حرارت محسوس کرنے لگی۔ اس کی سانسیں کچھ تیزی سے چلنے لگیں۔ سب کچھ اسے اچھا ہی لگ رہا تھا لیکن ایک مرتبہ اس نے اپنے جسم میں اٹھنے والے ایک انجان سے طوفان کو روکنے کے لیے ان ہاتھوں کو اس حرکت سے باز رکھنا چاہا۔ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس کے جسم کی اندرونی کیفیت کچھ ایسی ہو چکی تھی کہ مزاحمت نے دم توڑ دیا تھا۔

یکایک اس کی آنکھ کھل گئی۔ جاگ جانے کے باوجود اس کی جسمانی کیفیت وہی تھی جو اس نے خواب میں محسوس کی تھی۔ وہی شدید سی گدگدی جو اس کے سراپا میں ایک نشہ گھول رہی تھی۔

جب وہ جاگی تو چونکی بھی۔ اس نے زمام خان کا چہرہ اپنے بہت قریب دیکھا اس وقت زمام خان نے پھونک مار کر موم بتی بجھا دی۔

☆☆☆

اس دن نائلہ کچھ جلدی ہی واپس لوٹی تھی اور معمول کے مطابق اپنے ڈاک بنگلے کا رخ کرنے کے بجائے کلینک آ گئی تھی۔ شوفر اس کی ہدایت کے مطابق اسے چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔ نائلہ چاہتی تھی کہ گاؤں کا کوئی شخص کلینک کی طرف آئے تو اس کی جیپ وہاں نہ پا کر یہی سمجھے کہ نائلہ ابھی لوٹی نہیں ہوگی یا معمول کے مطابق اپنے ڈاک بنگلے کی طرف چلی گئی ہو۔

کمپاؤنڈر باذل نے خود کو کلینک کے اسی حصے تک محدود رکھا تھا جو اس کے لیے مخصوص تھا۔

نائلہ کو بے چینی سے ٹہلتے ہوئے بہ مشکل پانچ منٹ گزرے تھے کہ دروازہ کھلا۔ اس کا باڈی گارڈ صفدر جان کا بازو پکڑے ہوئے اسے اندر لے آیا۔ صفدر جان کچھ بوکھلایا اور کچھ سہما ہوا سا تھا۔ خاصا صحت مند ہونے کے باوجود اس نے مزاحمت نہیں کی تھی لیکن کلینک میں آ جانے کے بعد بھی باڈی گارڈ نے اس کے بازو پر اپنی مضبوط گرفت قائم رکھی تھی۔

نائلہ کے سامنے آتے ہی صفدر جان نے نظریں جھکا لی تھیں۔

''چھوڑ دو اس کا بازو!'' نائلہ نے صفدر جان کو گھورتے ہوئے اپنے باڈی گارڈ سے کہا۔

صفدر جان اپنا بازو چھوٹ جانے کے بعد بھی نظریں جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے وہ ندامت محسوس کر رہا ہو۔

''اب بتاؤ۔'' نائلہ نے صفدر جان کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم اتنے دن سے میری نگرانی کیوں کر رہے ہو؟''

صفدر جان خاموش رہا۔

''بتاؤ!'' کچھ توقف سے نائلہ گرجی۔

صفدر جان نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا، پھر سر جھکا کے دھیمی آواز میں بولا ''میں نے آپ کی نگرانی نہیں کی۔''
''جھوٹ مت بولو......''
''یقین کیجیے! میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ آپ کی نگرانی میں کیوں کروں گا۔ میں تو آپ کو بس دیکھا کرتا ہوں۔''
صفدر جان کی آواز میں لرزش تھی۔
جواب کے آخری فقرے سے نائلہ نے خجالت سی محسوس کی۔ وہ فقرہ اس کے باڈی گارڈ کے سامنے کہا گیا تھا۔ خجالت کے ساتھ ہی وہ جھنجلائی بھی تھی۔
''تم باہر جاؤ......'' اس نے باڈی گارڈ سے کہا۔ ''دروازے کے قریب ہی رہنا۔''
باڈی گارڈ نے سر کی جنبش سے تعمیل کا اشارہ دیا اور صفدر جان کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔
''کیا بکواس کی تھی ابھی تم نے......!'' نائلہ صفدر جان کو بڑی تیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔
صفدر جان خاموش رہا۔
''بولو!'' نائلہ پھر گرجی۔ ''اگر ٹھیک ٹھیک جواب نہیں دو گے تو اپنی جان سے جاؤ گے۔ میرا باڈی گارڈ میرا اشارہ ملتے ہی تمہاری بوٹیاں اڑا دے گا۔ اسے یہ پروا نہیں ہوگی کہ پھر وہ گاؤں والوں کا یا قانون کا سامنا کس طرح کرے گا۔''
''میں نے ابھی بتایا تو ہے آپ کو'' صفدر جان کی نظریں جھکی رہیں۔ ''میں پھر قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اور کوئی بات نہیں۔ میں آپ کو بس دیکھتا تھا۔''
''کیوں دیکھتے تھے؟'' نائلہ شدت سے جھنجلا گئی۔
''آپ...... آپ مجھے...... آپ مجھے'' صفدر جان نے نائلہ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد پھر سر جھکا لیا۔ ''آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔''
''کیا......!'' نائلہ یک بہ یک اس انداز میں ہنسی جیسے صفدر جان کے جواب سے بری طرح کھسیا گئی ہو۔ ''کیا تمہارا دماغ خراب ہے!''
''آپ کچھ بھی سمجھ لیں۔'' صفدر جان کی آواز ایسی تھی جیسے اس کے حلق میں اٹک رہی ہو۔
نائلہ ہونٹ بھینچ کر اسے گھورنے لگی، پھر کچھ توقف سے طنزیہ انداز میں بولی۔ ''گویا محبت کرنے لگے ہو مجھ سے!''
''جی......!'' صفدر جان کی آواز دھیمی ہی رہی۔
نائلہ اتنی تیزی سے اس کی طرف گئی جیسے اس کے منہ پر طمانچہ رسید کر دینا چاہتی ہو لیکن قریب جا کر رک گئی۔ اس کی دونوں مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے بپھرے ہوئے انداز کو زیادہ بے قابو ہونے سے روکنا چاہتی ہو۔
صفدر جان نے اپنی جگہ سے ذرا بھی جنبش نہیں کی تھی۔ اس طرح سر جھکائے کھڑا رہا تھا جیسے ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو۔
''تم...... تم......'' نائلہ نے کچھ کہنا چاہا مگر غصے کی زیادتی کے باعث اپنی بات فوراً پوری نہیں کر سکی۔ اس نے کچھ رک کر کہا۔ ''تم نے چند سال شہر میں بھی گزارے ہیں۔ وہاں تم نے فلمیں بھی دیکھی ہوں گی۔ انہی کا کچھ اثر ہو گیا ہے شاید تمہارے دماغ پر۔''
''یقین کیجیے!'' صفدر جان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''میں کہانیوں کی دنیا سے کبھی متاثر نہیں ہوا۔''
نائلہ نے غصے اور جھنجلاہٹ کی کیفیت میں دائیں ہاتھ کا مکا بائیں ہتھیلی پر مارا اور پیر پٹخنے کے سے انداز میں ایک دیوار تک چلی گئی، پھر پلٹ کر طنزیہ لہجے میں بولی ''کیا تم فلمی ہیرو صاحبان کی طرح اس قسم کے دعوے بھی کرو گے کہ میری خاطر آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتے ہو یا میرے کہنے پر پاتال کی خبریں بھی لا سکتے ہو!''
''میں پاتال کی خبریں تو نہیں لا سکتا لیکن پاتال تک جا ضرور سکتا ہوں۔'' صفدر جان نے نظریں اٹھا کر نائلہ کی طرف دیکھا اور اس مرتبہ دیکھتا ہی رہا۔ اچانک ایسا لگا تھا جیسے وہ شدت سے جذباتی ہو گیا ہو۔ ''آپ کے کہنے پر میں کسی کھائی میں چھلانگ لگا سکتا ہوں۔ اپنی محبت ثابت کرنے کے لیے اپنی جان دے سکتا ہوں۔''
نائلہ اس کا منہ تکتی رہ گئی۔ اب وہ اس انداز میں سوچ رہی تھی کہ یہ سیدھا سادہ نظر آنے والا شخص بہت ہی چالاک ہے اور اسے اپنی باتوں سے متاثر کر کے خود کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے یا کسی کا آلۂ کار ہے!
''ٹھیک ہے۔'' نائلہ کچھ توقف سے بولی ''میں تمہیں ضرور آزماؤں گی۔'' صفدر جان خاموش رہا۔ اس نے پھر نظریں جھکا لی تھیں۔
نائلہ نے آواز دے کر باڈی گارڈ کو اندر بلایا اور اس سے کہا کہ وہ ٹرانسمیٹر پر شوفر سے رابطہ کر کے اس سے واپس آنے کے لیے کہے۔
باڈی گارڈ نے شوفر سے رابطہ کیا۔ وہ کہیں زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ پانچ منٹ میں ہی آ گیا۔
''چلو ہمارے ساتھ۔'' نائلہ نے صفدر جان سے کہا اور پھر باڈی گارڈ سے بولی۔ ''خیال رکھنا' یہ بھاگنے نہ پائے۔''

''میں کہیں نہیں بھاگوں گا۔'' صفدر جان کے ہونٹوں پر پہلی مرتبہ مسکراہٹ نظر آئی جو بہت پھیکی پھیکی سی تھی۔

نائلہ اس کے جواب پر دھیان دیے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ باڈی گارڈ نے صفدر جان کا بازو پکڑ لیا۔ صفدر جان نے اس کی طرف سے کوئی سختی شروع ہونے سے پہلے ہی نائلہ کے پیچھے قدم بڑھا دیے تھے۔

☆☆☆

تاریکی گہری ہو چکی تھی جب گاؤں سے دور نائلہ اور صفدر جان پہاڑوں میں ایک نشیب کے قریب کھڑے تھے۔ نائلہ کا باڈی گارڈ ان دونوں سے کچھ دور کھڑا تھا۔ جیپ کچھ نیچے چھوڑ دی گئی تھی اور شوفر جیپ کے ساتھ ہی تھا۔ وہ اس بلندی تک نہیں آ سکتی تھی جہاں نائلہ، اس کا باڈی گارڈ اور صفدر تھے۔

نائلہ نے ٹارچ کی روشنی نشیب کی طرف کی۔ وہ روشنی نشیب کے آخری حصے تک نہیں جا سکی۔ نشیب خاصی حد تک عمودی تھا اس لیے اسے کھائی بھی کہا جا سکتا تھا۔

''کیا کوئی انسان یہاں سے کود کر زندہ رہ سکتا ہے؟'' نائلہ نے صفدر جان سے کہا۔ اندھیرے میں وہ اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتی تھی کیونکہ اس نے ٹارچ بجھا دی تھی۔

صفدر جان خاموش رہا۔

''بولو!'' نائلہ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''کیا یہاں سے چھلانگ لگا کر کوئی آدمی زندگی رہ سکتا ہے۔''

''شاید نہیں۔'' صفدر جان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''اور اگر فوری طور پر نہ مرا تو موت کے بہت قریب ضرور چلا جائے گا۔''

''تو پھر، کیا خیال ہے؟'' نائلہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''کیا ثابت کرو گے اپنی محبت؟''

''اگر میری موت ہی آپ کو میری محبت کا یقین دلا سکتی ہے تو میں اس کے لیے تیار ہوں۔'' صفدر جان کے لہجے میں افسردگی تھی۔ ''لیکن کیا آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں گی؟''

''کیا وعدہ؟''

''کسی طرح میری لاش یہاں سے نکلوا لیجیے گا۔ ایک قبر بنوا دیجیے گا میری۔ پھر اس قبر پر آ کر بس اتنا کہہ دیجیے گا کہ آپ کو میری محبت پر یقین آ گیا ہے۔''

نائلہ دھیرے سے ہنسی۔ ''چالاک آدمی! اس طرح کی باتوں سے تم مجھے متاثر نہیں کر سکتے!''

''میرا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے۔''

''تو ثابت کرو اپنی محبت!''

صفدر جان خاموش اور ساکت کھڑا رہا۔

''بس!'' نائلہ کچھ توقف سے طنزیہ انداز میں بولی۔ ''کافور ہو گئی تمہاری محبت؟''

''نہیں...... '' صفدر جان نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''بس ایک بار ٹارچ کی روشنی اپنے چہرے پر ڈال لیجیے۔ میں آخری بار آپ کو دیکھ لوں!''

''کیا یہ دوسری شرط ہے؟'' نائلہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں...... '' صفدر جان کے لہجے میں گداز آ گیا۔ ''صرف ایک خواہش ہے، مرنے والے کی آخری خواہش!''

''تم فضول باتوں میں کتنا وقت ضائع کرنا چاہتے ہو؟''

''اچھا ! '' صفدر جان نے مضمحل لہجے میں کہا۔ ''بہت بدقسمت ہوں میں کہ میری یہ آخری خواہش بھی پوری نہیں ہو سکتی۔''

نائلہ بدستور یہی سمجھ رہی تھی کہ یہ چالاک شخص اس قسم کی باتیں کر کے اس کے جذبات چھیڑنا چاہتا ہے لیکن یکایک وہ ہکا بکا رہ گئی جب صفدر جان نے دل گرفتہ آواز میں ''خدا حافظ'' کہنے کے بعد خود کو نشیب میں گرا دیا تھا۔

نائلہ کی وہ آواز ایک چیخ کی طرح تھی جب اس نے اپنے باڈی گارڈ کو پکارا تھا لیکن باڈی گارڈ اس سے پہلے ہی اس کی طرف لپک چکا تھا۔ یہ اس نے بھی دیکھ لیا تھا کہ صفدر جان نے خود کو نشیب میں گرا دیا تھا۔

نائلہ کی سانسیں پھول گئی تھیں اور اس کا جسم ہولے ہولے کانپنے لگا تھا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں بھی لرزش تھی جب اس نے ٹارچ کی روشنی نیچے ڈالی۔ باڈی گارڈ اس وقت اس کے بالکل قریب آ گیا تھا۔

صفدر جان کا جسم بہت نیچے نہیں جا سکا تھا۔ ٹارچ کی روشنی اس تک پہنچ گئی تھی۔ وہ ایک جگہ جھاڑیوں میں الجھ کر رک گیا تھا۔ ٹارچ کی روشنی اس کا خون میں ڈوبا ہوا چہرہ صاف دکھا رہی تھی۔ جھاڑیوں اور پتھروں سے ٹکراتے ہوئے وہ لہولہان ہو چکا تھا۔

''اسے...... اسے کسی طرح اوپر لاؤ!'' باڈی گارڈ سے کہتے ہوئے نائلہ کی آواز بری طرح کانپ رہی تھی۔

باڈی گارڈ نے فوراً ہی نیچے اترنا شروع کر دیا۔ وہ گھاس اور نکیلے پتھروں کے سہارے نیچے اتر رہا تھا۔

''سنبھل کر!'' نائلہ نے تھوک نگلا۔
''میں اسے نکال لاؤں گا بی بی صاحب......!'' باڈی گارڈ نے بلند آواز میں جواب دیا۔ اس کے لہجے میں اعتماد تھا لیکن نائلہ محسوس کر رہی تھی کہ اس نے اپنے باڈی گارڈ کو ایک خطرناک کام سونپا تھا۔ اس تقریباً عمودی نشیب میں اترنا اس کے لیے ہلاکت کا سبب بن سکتا تھا۔ کوئی نکیلا پتھر اتنا چکنا بھی ہوسکتا تھا کہ اس پر اس کی گرفت قائم نہ رہ پاتی۔ کوئی جھاڑی اتنی کمزور ہوسکتی تھی کہ باڈی گارڈ کا وزن نہ سنبھال پاتی اور اپنی جڑیں چھوڑ دیتی۔
اچانک نائلہ کو یاد آیا کہ جیپ میں ایک رسا پڑا ہوا تھا۔ اس نے چیخ کر شوفر کو آواز دی اور اس سے رسا لانے کے لیے کہا۔ وہ خود وہاں سے ہٹ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی ٹارچ کی روشنی میں باڈی گارڈ کے لیے نیچے اترنا نسبتاً آسان تھا۔
شوفر کچھ فاصلے اور تاریکی کے باوجود سمجھ اور دیکھ چکا تھا کہ وہاں کیا صورتِ حال بنی تھی۔ وہ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا لیکن اسے اتنا وقت لگ گیا کہ باڈی گارڈ صفدر جان تک پہنچ چکا تھا۔
''رسا پھینکو!'' نائلہ نے شوفر سے کہا۔ ''اس کا ایک سرا خود پکڑے رہنا۔''
نائلہ کو دوسرا فقرہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ شوفر بھی سمجھ سکتا تھا کہ نائلہ کیا چاہتی تھی۔
رسا، شوفر کے صحیح اندازے کی وجہ سے باڈی گارڈ کے اوپر ہی جا کر گرا۔
''صفدر جان کو اس سے باندھ کر اوپر لاؤ۔'' نائلہ نے چیخ کر کہا، پھر پوچھا ''وہ زندہ ہے یا نہیں؟''
''ابھی تو زندہ ہے بی بی صاحب......!'' باڈی گارڈ کو بھی چیخ کر ہی جواب دینا پڑا تھا۔
رسے کا ایک سرا شوفر کے ہاتھ میں تھا۔
''یہ لے جا کر جیپ سے باندھ دو۔'' نائلہ نے شوفر کو ہدایت کی۔ ''انجن اسٹارٹ کر کے جیپ میں ہی بیٹھو۔ میں کہوں تو جیپ کو آہستہ آہستہ دور لے جانا۔''
شوفر تقریباً دوڑتا ہوا جیپ کی طرف چلا گیا۔ نائلہ کے اندازے کے مطابق رسے کی لمبائی اتنی تھی کہ ناکافی نہ ہوتی۔
ٹارچ کی روشنی میں نظر آ رہا تھا کہ باڈی گارڈ نے پہلے اپنا جسم رسے سے لپیٹا تھا، پھر رسے کے سرے کی طرف سے صفدر جان کی کمر باندھنے لگا۔ اتنی ہی دیر میں شوفر نے جیپ کے قریب پہنچ کر رسا اس سے باندھ دیا تھا۔
باڈی گارڈ نے صفدر جان کا جسم اپنی پیٹھ پر اس طرح لادا کہ رسے کو ایک بل دے کر صفدر جان کو بھی اپنے جسم سے کس لیا۔
جیپ کا انجن اسٹارٹ ہوچکا تھا۔ نائلہ کی ہدایت پر شوفر اسے حرکت میں لایا۔
''اب تم خطرے میں نہیں ہو۔'' نائلہ نے چیخ کر باڈی گارڈ کو بتایا۔ ''رسا جیپ سے باندھ دیا گیا ہے۔''
''میں سمجھ گیا ہوں بی بی صاحب!''
جیپ آہستہ آہستہ ایک طرف بڑھتی رہی۔ باڈی گارڈ صفدر جان کو اپنی پیٹھ پر لادے آہستہ آہستہ اوپر آنے لگا۔
نائلہ اس وقت اپنے جسم کو پسینے میں ڈوبا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ ہوگیا تھا جو اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا۔ وہ سوچ ہی نہیں سکتی تھی کہ اس مشینی دور میں بھی کوئی ایسی جنونی محبت میں مبتلا ہوسکتا ہے۔
صفدر جان کی جو حالت تھی، اس سے نائلہ کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اس کے لیے کچھ نہیں کر سکے گی۔ صفدر جان کو کسی ہاسپٹل تک لے جانا ضروری تھا۔

☆☆☆

رات ہو جانے کے بعد گاؤں کے کچھ ہی لوگ اپنے گھروں سے باہر ہوتے تھے۔ ان چند لوگوں تک بات نائلہ کے کمپاؤنڈر بازل نے پہنچائی اور پھر ان چند لوگوں نے ہلچل مچا دینے والی ایک خبر سارے گاؤں تک پہنچا دی۔
بازل کے کہنے کے مطابق مولوی ادریس کا بیٹا صفدر جان پاؤں پھسل جانے کے باعث ایک کھائی میں گر گیا تھا۔ قریب سے گزرتی ہوئی نائلہ نے اتفاقاً اسے گرتے دیکھ لیا۔ اسی کے باڈی گارڈ نے صفدر جان کو کھائی سے نکالا تھا۔ اس کی حالت انتہائی خراب تھی۔ وہ اپنے خون میں نہایا ہوا تھا۔ گاؤں میں اس کے علاج کے وسائل نہیں تھے اس لیے نائلہ اسے اپنی جیپ میں ڈال لے گئی تھی۔ صفدر جان کو جلد از جلد کسی ہاسپٹل یا کلینک تک پہنچانا ضروری تھا۔
گاؤں کے بہت سے لوگ کلینک پہنچ گئے تھے جن میں صفدر جان کا غم زدہ اور پریشان حال باپ مولوی ادریس بھی تھا۔ وہ لوگ بازل سے مزید تفصیل اور کم از کم یہ جاننا چاہتے تھے کہ صفدر جان کو کہاں لے جایا گیا تھا لیکن بازل مزید کچھ نہیں بتا سکا۔ اس نے بس اپنے اس اندازے کا اظہار کر دیا کہ نائلہ نے شاید مانسہرہ کا رخ کیا ہو......
ناصر بھی ریڈیو ٹرانسمیٹر پر سولجر کو اس سے زیادہ کچھ نہیں

بتا سکتا تھا۔

''خیر!'' سولجر کا جواب آیا۔'' مجھے اس حادثے سے کوئی دلچسپی نہیں دوست......! مجھے تو شنتال کے بارے میں بتاؤ... زمام خان بہت گھبرایا ہوا اور خوف زدہ ہے۔ کئی مرتبہ مجھ سے رابطہ کر چکا ہے۔''

''میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اگر کوئی خطرہ سامنے آیا تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ زمام خان کو یہ گاؤں چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا لیکن میرے اندازے کے مطابق خطرے کی کوئی بات سامنے نہیں آ ئی ہے' میں نے شنتال کے بارے میں بہت کچھ جاننے کے بعد ہی یہ منصوبہ بندی کی تھی۔ غالباً میرا اندازہ ٹھیک بھی ثابت ہو چکا ہے۔ شنتال نے اس بارے میں اپنے باپ کو کچھ نہیں بتایا ہوگا ورنہ معاملہ اب تک کوئی نہ کوئی خاص رنگ اختیار کر چکا ہوتا۔''

''لیکن یہ میں نہیں سمجھ پا رہا ہوں کہ اس حرکت کی وجہ سے تم اپنے مقصد میں کس طرح کامیاب ہو سکتے ہو۔ تمہاری رپورٹ میں باس کو بھی دے چکا ہوں۔ اسے بھی اس سوال نے الجھن میں ڈالا ہے کہ تم نے کیا سوچ کر زمام خان کو اس خطرے میں ڈالا ہے۔''

''میں نے جو کچھ سوچا تھا' اس میں تھوڑی سی تاخیر ہو سکتی ہے۔ نتیجہ اس صورت میں جلدی سامنے آتا جب نائلہ یہاں ہوتی۔''

''یہ تم نے مجھے ایک اور الجھن میں ڈال دیا۔ نائلہ کی موجودگی یا عدم موجودگی سے آخر کیا فرق پڑ رہا ہے؟''

''وضاحت میں کل تک کر سکوں گا۔ کل تک یہ بھی سامنے آ جائے گا کہ خود شنتال پر کیا ردعمل ہوا ہے۔''

''میں نے تم پر بڑے اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ اب مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ تم مجھے باس کی نظروں میں ذلیل نہ کروا دو۔''

''بے فکر رہو دوست! تمہارے اعتماد کا خون نہیں ہوگا۔ مجھے بھی آخر ایک بڑی رقم کی سخت ضرورت ہے۔ اگر میرا یہ منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکا تو میں کچھ اور سوچوں گا لیکن مجھے اپنے اسی منصوبے کی کامیابی کا بڑی حد تک یقین ہے۔''

''اچھا!'' سولجر نے طویل سانس لی۔'' اوور اینڈ آل!'' اس طرح ریڈیو ٹرانسمیٹر پر ان کی گفتگو ختم ہوگئی۔

☆☆☆

نائلہ چاہتی تو یہ تھی کہ صفدر جان کو کسی بڑے ہاسپٹل میں لے جائے لیکن اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ کسی بڑے شہر کا رخ کرتی۔ اتنا وقت تھا نہیں۔ بہت زیادہ خون نکل جانے کی وجہ سے صفدر جان کی حالت غیر تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ اس کی حالت غیر ہوتی ہی چلی جاتی۔ نائلہ کو مانسہرہ ہی کے ایک کلینک کا رخ کرنا پڑا تھا۔

پھر دن پر دن گزرتے چلے گئے۔ ان دنوں میں نائلہ نہ صرف پریشان رہی بلکہ اکثر بالکل گم صم ہو جاتی تھی۔ صفدر کی دیوانہ وار اور جنونی محبت نے اس کا وجود ہلا کر رکھ دیا تھا۔

یہ صفدر جان کی خوش قسمتی تھی کہ اتنی گہرائی میں گرنے کے باوجود اسے کوئی ایسی خطرناک چوٹ نہیں آئی تھی جس سے اس کی زندگی کے لالے پڑ جاتے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ بلندی سے گرا نہیں تھا بلکہ لڑھکتا چلا گیا تھا۔ سارے جسم اور سر پر بے تحاشا چوٹیں لگی تھیں جن کی وجہ سے اس کا خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا لیکن کلینک میں اسے معقول دیکھ بھال میسر آ ہی گئی تھی۔ تاہم یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ مہینا بھر سے پہلے بھلا چنگا ہو جاتا۔ ہاں البتہ مہینا بھر سے زیادہ لگ جانے کا امکان ضرور تھا۔

گاؤں میں اس کا باپ مولوی ادریس بھی مانسہرہ آ گیا تھا۔ نائلہ نے اس کے طعام و قیام کا بھی معقول بندوبست کیا تھا۔

گو کہ نائلہ کے باڈی گارڈ اور شوفر نے کسی کو بھی صفدر جان کی یہ حالت ہونے کا سبب نہیں بتایا تھا لیکن نائلہ خود کو مجرم سمجھنے لگی تھی۔ کلینک میں جب صفدر جان کو ہوش آیا تھا تو وہ اسے دیکھنے گئی تھی اور بس دیکھ کر ہی رہ گئی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ صفدر جان سے نظریں ملا سکتی۔ البتہ اسے دیکھ کر پٹیوں میں جکڑے ہوئے صفدر جان کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آ گئی تھی جیسے اسے خوشی ہو کہ موت کی آغوش میں جانے سے محفوظ رہتے ہوئے بھی وہ محبت کے امتحان میں پورا اترا تھا۔

صحیح واقعے کا علم کسی کو صفدر جان کی زبان سے بھی نہیں ہوا تھا۔

اس دوران میں نائلہ ایک بار اپنے گھر ایبٹ آباد بھی گئی تھی لیکن چند گھنٹوں کے لیے۔ اس نے اپنے گھر والوں کو بھی صفدر جان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اسے اپنے باڈی گارڈ اور شوفر کی وجہ سے ڈر لگا رہا تھا کہ وہ اس کے باپ کو اصل واقعہ بتا دیں۔ گو اس نے ان دونوں کو زباں بندی کی تاکید کی تھی لیکن اسے احساس تھا کہ نمک خوار تو وہ اس کے باپ ہی کے تھے۔

نائلہ کا دن تو معمول کے مطابق دیہات میں اپنے مریضوں کو دیکھ کر گزرتا تھا لیکن رات کو وہ مانسہرہ ہی میں رہتی تھی۔ ذہنی طور پر بے حد منتشر رہنے کے باعث وہ اپنے مریضوں کے سلسلے میں حد درجہ احتیاط بھی برت رہی تھی۔

اسے یہ ڈر تھا کہ وہ کسی مریض کو غلط دوا نہ دے بیٹھے۔

ناصر بہ دستور گاؤں کے قریب ڈاک بنگلے میں مقیم نہیں تھا۔ نائلہ جب گاؤں پہنچ کر اپنے کلینک پہنچتی تو ذرا دیر کے لیے وہ بھی اس سے ملنے آجاتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ نائلہ ذہنی طور پر اتنی منتشر کیوں تھی۔ اسے معلوم ہی نہیں ہوسکتا تھا کہ صفدر جان کی جو حالت ہوئی تھی، اس کی ذمے دار نائلہ تھی۔

صفدر جان کی حالت خطرے سے باہر ہونے کے بعد نائلہ جب پہلی بار گاؤں پہنچ کر اپنے کلینک میں بیٹھی تھی تو گاؤں کے بہت سے لوگ بھی اس سے صفدر جان کی خیریت دریافت کرنے پہنچے تھے اور حیران ہوئے تھے کہ ایک خوش مزاج لیڈی ڈاکٹر ایک چڑچڑی سی عورت کیسے بن گئی تھی۔

حیران ہونے والوں میں سے ایک ھنتال بھی تھی۔ نائلہ سے ملنے کے لیے اس کی بے قراری کا تو کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ نائلہ کو کچھ بتانا بھی چاہتی تھی لیکن نائلہ کے رویے کے باعث اس کی زبان نہیں کھل سکی تھی۔

دن پر دن گزرتے رہے اور ھنتال کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ اس کی ''ڈاکٹر باجی'' اتنی بدل کیوں گئی تھیں؟ کیا ہوگیا تھا انہیں؟

لگ بھگ ایک مہینا اسی طرح گزر گیا۔

سورج مغرب کی طرف اپنا سفر شروع کرچکا تھا۔ ھنتال کے دماغ میں نائلہ بسی ہوئی تھی اور اس کے قدم غیر ارادی طور پر اس پہاڑ کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں غار میں مہینا بھر پہلے اسے اپنی زندگی کا ایک عجیب و غریب تجربہ ہوا تھا۔ [illegible] اسے وہ تجربہ ہوا تھا' اس وقت تک وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ وہ [illegible] کچھ اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ زمام خان کا چہرہ دیکھ کر اس [illegible] جسم میں ایک [illegible] بھی اٹھی تھی: [illegible] نے اس سے [illegible]

[illegible]

وہ [illegible] کچھ اس [illegible] اچھا لگا تھا۔ اس کے بعد [illegible] بے اختیار اس پہاڑ کی طرف بڑھ [illegible] تھے جہاں غار [illegible] زمام خان اس کا منتظر ہوتا تھا۔ وہ زمام خان کو [illegible] بھی نا پسند ہی کرتی تھی، پھر بھی بار بار اسی تجربے سے گزرنے کی شدید خواہش مند رہتی تھی۔ وہ اچھا تھا یا برا، اس کا اسے احساس ہی نہیں تھا۔ بس اتنا وہ ضرور سوچا کرتی تھی کہ کاش زمام خان کی جگہ صفدر جان ہوتا۔

زمام خان اس سے نہ جانے کیا کیا باتیں کرتا رہتا تھا لیکن وہ خاموش ہی رہتی تھی۔ اسے زمام خان سے باتیں کرنا اب بھی گوارا نہیں تھا۔ اس نے زمام خان کو یہ تک نہیں بتایا تھا کہ چند دن سے اس کی طبیعت کچھ خراب رہنے لگی تھی۔ کسی وقت چکر سا آجاتا تھا۔ متلی تو عموماً ہوتی رہتی تھی۔ وہ صرف اپنی ڈاکٹر باجی ہی کو اپنی کیفیت سے آگاہ کرنا چاہتی تھی لیکن نائلہ کے رویے کے باعث اسے اب تک کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اس کی متلی کی کیفیت زمام خان نے خود ہی دیکھ لی تھی اور اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی لیکن ھنتال اس مسکراہٹ کا سبب بھی نہیں سمجھ سکی تھی۔

پہاڑ پر چڑھتے ہوئے وہ ہمیشہ ننگے پیر ہی ہوتی تھی۔ اس دن اچانک اسے احساس ہوا کہ سنگلاخ چٹانیں گزشتہ روز کی نسبت کچھ گرم تھیں۔ اس احساس کے باوجود ھنتال نے اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں سوچا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بڑھتی ہوئی وہ تپش آنے والی ایک بہت بڑی تباہی کی پیغام بر تھی...... اس نے گاؤں گاؤں پھرنے والے فقیر راجا کی بڑبڑاہٹ پر بھی دھیان نہیں دیا تھا۔

فقیر راجا ان دنوں اس قسم کے جملے بڑبڑایا کرتا تھا۔

''توبہ کرو!...... توبہ کرو...... ! اپنے اعمال دیکھو! اپنے گریبان میں جھانکو! قیامت نے تمہارے دروازے دیکھ لیے ہیں!''

ھنتال جب غار میں داخل ہوئی تو زمام خان وہاں اس کا منتظر تھا۔

☆☆☆

پورے پینتیس دن بعد صفدر جان اپنے گھر لوٹ آیا۔

اب سب کچھ معمول کی طرف لوٹ آنا چاہیے تھا لیکن نائلہ کے ساتھ ایسا نہیں ہوسکا۔ چڑچڑاہٹ اس کے مزاج کا لازمی حصہ بن کر رہ گئی تھی۔ اس لیے وہ اس وقت بھی ھنتال [illegible] ھنتال نے اس سے کہا تھا۔

''آپ کو کچھ بتانا [illegible] ڈاکٹر باجی!''

''لیکن مجھے نہیں سننا!'' نائلہ برہمی تھی ''میں مریضوں کو دیکھوں یا تمہاری [illegible] سنا کروں۔''

''اس وقت...... اس وقت تو...... اس وقت تو کوئی...... کوئی مریض نہیں ہے ڈاکٹر باجی!'' ھنتال ہکلا گئی۔

نائلہ واحد ہستی تھی جس کا احترام ھنتال کے دل میں تھا۔ اس لیے وہ ہکلا گئی تھی۔ ہکلاہٹ کا سبب کوئی احساسِ جرم نہیں تھا۔ اس نے اب تک نہیں جانا تھا کہ وہ کس سنگین غلطی کی مرتکب ہوچکی تھی۔

باجی نے اسے مارا تھا۔

نائلہ نے بٹھا کر اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اس نے اسے کیوں مارا تھا؟ شنتال نے جو کچھ کیا تھا، وہ اس کی ایک سنگین غلطی کیوں تھی؟ اس غلطی کی وجہ سے وہ سارے گاؤں میں بدنام ہو جاتی۔

شنتال جیسی معصوم لڑکی کے لیے وہ سب سمجھ لینا آسان نہیں تھا لیکن نائلہ نے اتنے اچھے طریقے سے بات کی کہ شنتال نے خاصا کچھ سمجھ لیا اور بہت پریشان نظر آنے لگی۔

''اب اس کا حل صرف ایک ہے۔'' نائلہ نے کہا۔ ''زمام خان سے تمہاری شادی۔''

اس پر شنتال بھڑک اٹھی اور نائلہ کو پھر سمجھانا پڑا کہ زمام خان سے شادی نہ کر کے وہ کس قسم کے حالات سے دوچار ہو سکتی ہے۔ اس نے شنتال کے سامنے ایک خوفناک نقشہ کھینچ دیا۔ شنتال پھر رونے لگی۔ اس مرتبہ اس کے آنسو اس کے احساسِ بے بسی کا اظہار تھے...... وہ مجبور ہو گئی کہ زمام خان سے شادی کر لے۔

''شام کو میں تمہارے گھر آؤں گی۔'' نائلہ نے اس سے کہا ''تمہارے باپ سے بھی تو بات کرنا ہو گی۔''

اب شنتال خوف زدہ نظر آنے لگی۔ نائلہ ہی کی باتوں کی وجہ سے اسے خیال آیا تھا کہ حقیقت جاننے کے بعد اس کا باپ اسے کہیں گولی نہ مار دے۔ اس نے خواہش ظاہر کی کہ جب نائلہ اس کے باپ سے ملنے جائے تو اسے اپنے کلینک ہی میں چھوڑ جائے۔ خود نائلہ نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ شنتال اس وقت اپنے گھر میں نہ ہو۔ یہ اندیشہ تو بہرحال تھا کہ نائلہ کی بات سمجھنے سے پہلے ہی وہ فوری طور پر اپنی بیٹی کے ساتھ کچھ کر بیٹھتا۔

شنتال کو سمجھانے بجھانے اور اسے زمام خان سے شادی پر آمادہ کرنے کے بعد نائلہ نے گاؤں کے مریضوں کے لیے کلینک کا دروازہ کھلوا دیا۔

ایک گھنٹے بعد وہ اپنے شیڈول کے مطابق آس پاس کے دیہاتوں کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس دن بھی شام کو اس نے جلد واپس لوٹنے کی کوشش کی تھی لیکن ایک مریض کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا جب اس کی جیپ کلینک کے سامنے رکی، شنتال کلینک کے باہر اس کی منتظر تھی۔

نائلہ نے کلینک کھلوایا، شنتال کو اندر بٹھایا، بازل کو اس کا خیال رکھنے کی ہدایت کی اور جیپ میں ہی شنتال کے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔

شنتال کے باپ افضال خان نے بڑی حیرت سے اس کا استقبال کیا۔ اسے قریب سے بٹھایا اور آمد کا سبب پوچھا۔

نائلہ نے جواب دیا۔ ''میں آپ سے شنتال کے بارے میں کچھ بات کرنے آئی ہوں۔''

''ہاں وہ بتا رہی تھی کہ اس کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ وہ تو ابھی آپ کے کلینک ہی کی طرف گئی ہے!''

''میں اسے وہیں چھوڑ کر آ رہی ہوں۔''

افضال خان کے چہرے پر تشویش کے آثار ابھر آئے۔ ''کیا آپ مجھے اس کی بیماری کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہیں؟''

''ہاں۔'' نائلہ نے کہا ''میرا خیال ہے کہ وہ ماں بننے والی ہے۔''

نائلہ نے راستے ہی میں سوچ لیا تھا کہ دھماکا وہ پہلے ہی کر دے گی اور ''ملبے'' کی صفائی کی کوششیں بعد میں شروع کرے گی۔

اندیشے کے مطابق افضال خان بری طرح بھڑک اٹھا تھا لیکن نائلہ کے ایک ہی جملے نے اسے گونگا بنا دیا۔

''آپ اچھی طرح سمجھ لیں خان صاحب!'' نائلہ نے کہا ''اس معاملے میں بنیادی مجرم آپ ہی ہیں۔''

اور پھر نائلہ سانس لیے بغیر بولتی ہی چلی گئی۔ وہ سب کچھ اس نے پہلے سے نہیں سوچا تھا۔ عین وقت پر ہی وہ پُرجوش ہو گئی۔ اگرچہ ایک غیر شادی شدہ جوان لڑکی کے لیے کسی مرد سے ایسے موضوع پر بات کرنا مشکل ہوتا ہے مگر وہ نہ صرف ایک ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھتی تھی بلکہ ڈاکٹر بننے کے باعث اسے ماحول بھی ایسا ملا تھا کہ وہ آسانی سے بولتی چلی گئی۔ عین وقت پر ایسے الفاظ، ایسے جملے اور ایسے دلائل بھی اس کی زبان پر آئے کہ افضال خان شدت سے خود ہی اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگا۔

''ہاں خان صاحب!'' نائلہ نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے کہا ''آپ ہی نے اپنی بیٹی کو تباہی کی طرف دھکیلا ہے۔ اب اگر آپ بدنامی سے بچنا چاہتے ہیں اور اپنی بیٹی کو مکمل تباہی سے بچانا چاہتے ہیں تو اس کا راستہ ایک ہی ہے۔ زمام خان اور شنتال کی شادی۔''

''کیا زمام خان تیار ہے؟'' افضال خان نے پھٹی پھٹی سی آواز میں پوچھا۔ اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔

''اسے بھی کسی نہ کسی طرح تیار کر لیا جائے گا۔''

افضال خان دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگا اور سسکتا ہوا بولا۔ ''میں تو بس اس لیے اسے سب سے الگ

تھلگ رکھنا چاہتا تھا کہ وہ کسی غلط راہ پر نہ چلی جائے لیکن......" وہ اپنا جملہ پورا نہیں کر سکا۔

نائلہ نے ٹھنڈے لہجے میں اسے سمجھایا۔" ایک اچھے باپ کی حیثیت سے آپ کی سوچ غلط نہیں تھی۔ بس آپ کو یہ دھیان نہیں آیا کہ سگی ماں کے سائے سے محروم ہو جانے والی لڑکیاں زمانے کی اونچ نیچ سے بھی بے خبر رہ جاتی ہیں جس سے انہیں کسی وقت شدید نقصان پہنچتا ہے۔"

افضال خان اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

"میں اب چلتی ہوں۔" نائلہ کھڑی ہو گئی۔" شنتال کو میں ابھی واپس بھیجتی ہوں۔ آپ اس سے کچھ نہ کہیے گا۔"

"میں تو اب اس سے نظر بھی نہیں ملا سکوں گا۔" افضال خان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

نائلہ خاصی مطمئن ہو کر افضال خان کے گھر سے نکلی۔ وہ اس مرحلے کو بہت دشوار سمجھ رہی تھی لیکن توقع کے برعکس وہ آسانی سے طے ہو گیا تھا۔

شنتال کو سب کچھ بتانے اور اسے اس کے گھر بھیجنے کے بعد جب نائلہ ڈاک بنگلے پہنچی تو ناصر کے انداز سے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔

"زمام خان تیار ہو گیا ہے اس شادی کے لیے۔" اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا" اسے ڈرانے دھمکانے کی تو ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔ وہ تو محبت کرتا ہے شنتال سے۔ ایسی خوبصورت لڑکی سے کون شادی نہ کرنا چاہے گا۔ نائلہ! وہ بس اس خیال سے پریشان ہو گیا ہے کہ شنتال کو رکھے گا کہاں!..... وہ ایک کسان کا بیٹا ہے۔ گاؤں میں بہت معمولی سا گھر ہے اس کا!"

نائلہ کچھ سوچتی ہوئی بولی۔" افضال خان کو میں نے اس شادی کے لیے تیار کر لیا ہے۔ اب اس سے اس معاملے میں بھی بات کرلوں گی...... وہ گاؤں کا آسودہ حال شخص ہے۔ گھر بھی ٹھیک ٹھاک ہے اس کا......! اپنی بیٹی سے محبت بھی کرتا ہے وہ! زمام خان کو وہ اپنے ساتھ رکھ لے گا۔"

نائلہ یہ سب کچھ کہتے ہوئے کسی اور طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ ناصر کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی فاتحانہ مسکراہٹ نہ دیکھ سکی۔

☆☆☆

وقت کو جیسے "پر" لگ گئے تھے۔ سب کچھ تیزی سے ہوتا چلا گیا تھا۔ دوسرے ہی دن شام کو زمام خان اور شنتال کی شادی ہو گئی۔ نکاح مولوی ادریس نے پڑھایا۔ گاؤں میں سبھی کا نکاح وہی پڑھایا کرتے تھے۔

اچانک شادی گاؤں والوں کے لیے حیران کن تھی، ان کے دلوں میں کچھ خیالات تو ابھرے ہوں گے لیکن کسی کی زبان پر کچھ نہیں آیا۔ افضال خان قبیلے کے سردار کا دوست تھا۔ اس کے ڈر سے گاؤں میں چہ میگوئیاں نہیں ہو سکیں۔

نکاح کے بعد اس مختصر سی محفل میں مولوی ادریس نے نہ جانے کتنی بار کے بعد ایک بار پھر نائلہ کا شکریہ ادا کیا جس کی وجہ سے اس کے بیٹے کی جان بچ گئی تھی۔

مولوی ادریس نے یہ بھی کہا۔" لیکن جب سے وہ گاؤں لوٹا ہے' بخار اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا ہے۔ میں تو چاہتا تھا کہ وہ آپ ہی کو دکھاتا لیکن وہ حکیم کا علاج کر رہا ہے۔ وہ حکیم صاحب قریب کے ایک گاؤں میں رہتے ہیں۔"

نائلہ چپ رہ گئی۔ اس کے لیے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ صفدر جان نے اس سے علاج کروانے سے گریز کیوں کیا ہوگا۔

ڈاک بنگلے کی طرف لوٹتے ہوئے وہ بہت مضمحل رہی۔ شنتال کے معاملے میں الجھ جانے کے باعث چھتیس گھنٹے تک اس کے دماغ پر صفدر جان کا دباؤ بہت کم رہا تھا جواب پھر طوفان کی طرح امنڈ پڑا تھا۔

افضال خان کے گھر سے رخصت ہوتے وقت اس نے شنتال کو ایک انجکشن لگا دیا تھا اور کچھ دوائیں بھی دی تھیں جس سے اس کی متلی میں کمی ہو سکتی تھی۔ اور سر چکرانا بھی کم ہو جانا چاہیے تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ دو ایک دن بعد وہ اسے مانسہرہ لے جائے گی۔ اس کا باقاعدہ میڈیکل چیک اپ کروائے گی اور کسی گائناکولوجسٹ سے مشورہ کر کے فی الحال خود ہی اس کا باقاعدہ علاج شروع کرے گی۔

ڈاک بنگلے کی طرف جاتے ہوئے جیپ میں اس کے ساتھ ناصر بھی تھا اور بہت خوش نظر آرہا تھا۔ اس کی وہ خوشی بھی ایسی تھی کہ اس نے نائلہ کا اچانک گم صم ہو جانا محسوس ہی نہیں کیا۔

اسی رات وہ ریڈیو ٹرانسمیٹر پر سولجر سے کہہ رہا تھا۔

"اب تو تم مان ہی جاؤ گے کہ تم نے اور تمہارے باس نے مجھ پر اعتماد کر کے غلطی نہیں کی۔ آج رات زمام خان افضال خان کے گھر پہنچ چکا ہے۔ میری منصوبہ بندی میں وقت تو لگا لیکن اب منزل قریب ہے۔ اس گھر میں رہتے ہوئے زمام خان جلد ہی معلوم کر لے گا کہ افضال خان نے وہ ہیرے کہاں چھپا کر رکھے ہوں گے۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد وہ ہیرے غائب کر دینا کوئی مشکل کام ثابت نہیں ہوگا اور یہ تو ممکن ہی

نہیں کہ افضال خان ان ہیروں کی چوری کے بارے میں پولیس سے رابطہ کرے۔''

ناصر کا یہ خیال بالکل درست تھا۔ وہ ہیرے افضال خان کی ملکیت ہی نہیں تھے کہ وہ ان کی رپورٹ کرواتا۔ ان ہیروں کا اصل مالک سولجر کے باس ہی کو کہا جا سکتا تھا اس نے کروڑوں کے وہ ہیرے اسمگل کروائے تھے۔ اس کا ایک خاص آدمی وہ ہیرے لے کر کہاں سے آ رہا تھا، یہ بات ناصر کو نہیں بتائی گئی تھی۔ وہ بس اتنا جانتا تھا کہ وہ شخص سری نگر سے ہوتا ہوا اس علاقے میں داخل ہوا تھا۔ وہ سولجر کے باس تک کس طرح پہنچتا، یہ بات بھی ناصر کو نہیں بتائی گئی تھی۔ اس علاقے سے گزرتے ہوئے اس شخص کی گاڑی کسی خطرناک پہاڑی موڑ پر ایک چٹان سے ٹکرا کر خاصی گہرائی میں جا گری تھی۔ افضال خان بھی اس وقت وہاں سے گزر رہا تھا۔ وہ انسانی جذبے کے تحت نیچے اترا۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر اس گاڑی کا کوئی فرد زندہ بچ گیا ہو تو وہ اس کی مدد کرے لیکن نیچے پہنچ کر جب اس نے وہاں ہیرے بکھرے ہوئے دیکھے تو اس کی نیت بدل گئی۔

سولجر کے باس کا وہ آدمی نہایت زخمی حالت میں ایک طرف بے سود پڑا ہوا تھا۔ بہ ظاہر اس کی حالت ایسی تھی جیسے وہ کوئی لاش ہو۔ افضال خان نے اس آدمی کو پہچان بھی لیا۔ وہ شخص کبھی انہی علاقوں میں کہیں رہتا تھا اور تین سال سے مفرور تھا۔ پولیس اس کی تلاش میں اس علاقے کے لوگوں میں پوچھ گچھ بھی کر چکی تھی۔ اسی لیے افضال خان کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ وہ شخص ہیرے اسمگل کرنے والے کسی گروہ میں شامل ہو گیا تھا۔

مردہ سے پڑے ہوئے اس شخص کے قریب ہی وہ تھیلی بھی پڑی تھی جس میں ہیرے تھے اور کچھ ہیرے اس میں سے نکل کر ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ انہی کو دیکھ کر افضال خان کی نیت میں فتور آیا تھا۔ اس نے ہیرے سمیٹ کر اس تھیلی میں ڈالے۔ وہاں پڑے ہوئے مفرور شخص کو اس نے مردہ سمجھ لیا تھا لیکن اس وقت تک وہ مرا نہیں تھا۔ اس نے ہیروں کی تھیلی لے جاتے ہوئے افضال خان کو دیکھ لیا مگر کچھ نہ کر سکا، نہ بول سکا۔ اس کی آنکھوں کے آگے بار بار اندھیرا سا چھانے لگتا تھا۔ بہ مشکل وہ کچھ دیر بعد اتنی ہمت کر سکا کہ اپنی جیب سے ریڈیو ٹرانسمیٹر نکال کر اس نے اپنے باس سے رابطہ کیا۔ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اس نے حادثے کے بارے میں بتانے کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ ہیروں کی تھیلی افضال خان اٹھا لے گیا تھا۔ شکستہ آواز میں یہ چند باتیں کرنے کے بعد اس شخص کو یکا یک خون کی ایک بڑی سی قے ہوئی تھی اور وہ مر گیا۔

افضال خان نے وہ ہیرے تو ہتھیا لیے تھے لیکن وہ خوف زدہ بھی تھا کہ اس نے پیشہ ور اسمگلروں کے ''مال'' پر ہاتھ ڈالا تھا۔ اسی خوف کے باعث اس نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔

سولجر کے باس کو اپنے انہی بیش قیمت ہیروں کی تلاش تھی اور اس کام کے لیے وہ ناصر کو پانچ کروڑ روپیا دینے کے لیے بھی تیار ہو گیا تھا۔

☆☆☆

شنتال کی شادی کو دس دن گزر گئے۔ نائلہ اسے مانسہرہ لے جا کر اس کا میڈیکل چیک اپ کرا لائی تھی۔ اس میں شبے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا کہ وہ زمام خان کے بچے کی ماں بننے والی تھی لیکن شادی ہو جانے کے بعد بھی اس نے اپنے ہونے والے بچے کے باپ کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا تھا۔ وہ بہت چپ چپ رہنے لگی تھی۔ گھر سے نکلنا بھی اس نے چھوڑ دیا تھا۔ خود نائلہ ہی صبح ڈاک بنگلے سے نکل کر پہلے اسے دیکھنے اس کے گھر چلی جاتی تھی پھر کلینک کھولتی تھی۔

دسویں دن جب وہ شنتال کو دیکھنے کے بعد اپنے کلینک پہنچی تو مولانا ادریس اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اس نے التجا کی کہ نائلہ فوراً اس کے گھر چلے کیونکہ صفدر جان کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔

اس اطلاع پر دورانِ خون نائلہ کی کنپٹیوں پر جیسے ٹھوکریں مارنے لگا۔ صفدر جان کی وجہ سے اس کا ذہنی دباؤ ابھی کم بھی نہیں ہو سکا تھا کہ اس خبر نے اسے ہیجان میں مبتلا کر دیا۔ دس دن پہلے اسے صفدر جان کے بخار کا پتا چلا تھا اور یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ وہ کسی حکیم سے علاج کروا رہا تھا۔

اگر بات صرف معمولی بخار کی ہوتی تو حکیم کی دوائیں اسے ٹھیک کر ہی دیتیں لیکن دس دن میں اس کی حالت اتنی زیادہ خراب ہو جانے کی وجہ ایک ہی ہو سکتی تھی۔ نائلہ سے محبت کرنے والا وہ جنونی اس صدمے ہی سے بد حال ہو سکتا تھا کہ وہ نائلہ کی صورت دیکھنے کو بھی ترس گیا تھا۔ نائلہ جیپ میں مولوی ادریس کے گھر کی طرف روانہ ہوئی جو گاؤں کی مسجد کے قریب ہی تھا۔ مولوی ادریس کو اس نے اپنے ساتھ جیپ میں ہی بٹھا لیا تھا۔ وہ شدید ہیجان میں مبتلا تھی اس لیے مولوی ادریس سے بہ مشکل ہی پوچھ سکی۔

''جب حکیم کی دوا سے آپ کے بیٹے کی حالت سنبھل نہیں رہی تھی تو آپ پہلے ہی میرے پاس کیوں نہیں آئے؟''

اس سوال کے جواب نے نائلہ کے دل و دماغ کی حالت اور ابتر کردی۔ ادریس کے جواب کے مطابق وہ تو ایسا کرنا چاہتا تھا لیکن صفدر جان اسے رو کے ہوئے تھا۔

مولوی ادریس نے روتے ہوئے کہا تھا۔ ''وجہ تو میری سمجھ میں آ نہیں سکی۔ وہ بس ایک ہی بات کہا کرتا تھا۔ ایک بار تو انہوں نے میری جان بچالی۔ میں دوسری بار انہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ اب تو انہیں میرے بارے میں بس آخری اطلاع یہ ملنی چاہیے کہ میں مرگیا۔''

نائلہ جیسی حساس لڑکی کے جذبات پر یہ بات ایک کاری ضرب تھی۔ مولوی ادریس نے یہ بھی بتایا کہ آدھی رات کے بعد سے صفدر جان پر غشی طاری تھی اسی لیے وہ اس وقت مولوی ادریس کو نائلہ کے پاس جانے سے نہیں روک سکا تھا۔

جب نائلہ مولانا ادریس کے گھر پہنچی اور اس نے ایک چھوٹے سے کمرے میں صفدر جان کو بستر پر پڑا ہوا دیکھا تو اسے ایسا لگا جیسے خود اس کی سانس گھٹنے لگی ہو۔

صرف دس دن میں ایسا لگنے لگا تھا جیسے صفدر جان برسوں کا بیمار ہو۔ نائلہ نے ہیجانی کیفیت میں نہ جانے کس طرح اس کا معائنہ کیا اور فوراً اسے ایک انجکشن لگایا۔ تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ صفدر جان پر انجکشن کے اثر کا انتظار کرتی رہی۔ مولانا ادریس دم سادھے اس کے قریب موجود تھا۔

دس منٹ بعد صفدر جان کے ساکت پپوٹوں میں کچھ جنبش نظر آئی تو نائلہ نے فوراً اسے ایک اور انجکشن لگایا۔

نائلہ کی جگہ کوئی اور ڈاکٹر ہوتا تو پہلا انجکشن لگا کر یہ فیصلہ سنا دیتا کہ صفدر جان کو فوری طور پر ہاسپٹل لے جایا جائے لیکن اسے یہ ڈر بھی رہتا کہ اس چھوٹے سے گاؤں سے دور کسی ہاسپٹل پہنچنے تک صفدر جان زندہ بھی بچے گا یا نہیں۔

یہ ڈر خود نائلہ کو بھی تھا اور اسی لیے وہ صفدر جان کو ہاسپٹل لے جانے کا فیصلہ کرنے سے پہلے اسے..... ایک ایسی طاقت دے دینا چاہتی تھی کہ وہ ہاسپٹل پہنچنے تک زندہ رہے۔

دوسرا انجکشن لگانے کے بعد اس نے لرزتی ہوئی آواز میں.... ادریس سے کہا۔ ''آپ ذرا کمرے سے باہر چلے جائیں!''

''میرے بیٹے کو ہوش آ رہا ہے نا ڈاکٹر صاحبہ؟'' مولوی ادریس شاید کچھ خوشی سے ہانپنے لگے تھے۔

''جی ہاں'' نائلہ نے کہا ''اسی لیے میں آپ سے باہر جانے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ آپ کی عدم موجودگی ہی میں آپ کے بیٹے کو میں ایک خاص دوا دینا چاہتی ہوں۔''

یہ عجیب سی بات مولانا ادریس کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس نے بس سر ہلایا اور انگوٹھے سے اپنی آنکھیں صاف کرتا ہوا کمرے سے چلا گیا۔

صفدر جان کی طرف دیکھتے ہوئے نائلہ شدید اضطرابی کیفیت میں تھی۔ صفدر جان اب آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہا تھا۔ وہ اس وقت چت لیٹا ہوا تھا۔ نظریں چھت کی طرف تھیں۔ نائلہ اٹھی اور اس پر جھک گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ صفدر آنکھیں کھولتے ہی اسے دیکھ لے۔ اسے اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی۔ صفدر جان نے آنکھیں کھولتے ہی اسے دیکھ لیا لیکن اس کا چہرہ سپاٹ ہی رہا۔ کوئی ایسا تاثر نہیں ابھرا جس سے پتا چلتا کہ اس نے نائلہ کو پہچان لیا تھا۔

''اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرو صفدر!'' نائلہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی ''مجھے پہچانو!...... یہ میں ہوں...... ڈاکٹر نائلہ!''

صفدر جان کی آنکھوں میں یکا یک ہلکی سی چمک آ گئی۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کپکپائی۔

''صفدر!'' نائلہ پھر بولی۔ ''پہچان لیا تم نے مجھے؟''

صفدر جان کے ہونٹ ہلے لیکن شاید نقاہت کی وجہ سے اس کی آواز نہیں نکلی۔ اس نے آہستہ سے سر ہلایا، جیسے ''ہاں'' کہا ہو۔

''بس اب تم زندہ رہو گے۔'' نائلہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''یہ وعدہ میں اپنے آپ سے کر رہی ہوں۔ میں ابھی تمہیں ہاسپٹل لے جاؤں گی۔ ہاسپٹل پہنچنے تک تمہیں زندہ رہنے کی کوششیں کرنی ہے اور یہ کوشش تم ضرور کرو گے۔ اس کوشش میں کامیابی کے لیے میں تمہیں ایک ہی دوا دے سکتی ہوں۔ اس احساس، اس یقین کی دوا کہ جب تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو میں تم سے شادی کرلوں گی۔''

مضبوط لہجے میں بولنے کے باوجود اس وقت نائلہ کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک گئے۔ وہ آنسو صفدر جان کے ہونٹوں پر ٹپکے اور اس نے اس طرح اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری جیسے وہ قطرے اسے جامِ کوثر سے ملے ہوں۔

☆☆☆

صفدر جان کو نائلہ جیپ میں ڈال کر پہلے اپنے کلینک لے گئی۔ وہاں صفدر جان کو ایک ڈرپ لگائی گئی۔ پھر اسے ڈرپ کے ساتھ ہی جیپ کی پچھلی نشست پر اس طرح لٹایا گیا کہ اس کا سر اپنے باپ...... کی گود میں تھا۔ پچھلی اور اگلی نشست کے بیچ میں نائلہ کا باڈی گارڈ اس طرح کھڑا ہو گیا کہ

ڈرپ اپنے ہاتھ میں سنبھالے رہے۔ خود نائلہ شوفر کے برابر میں اگلی سیٹ پر تھی۔

اس ہنگامی صورتِ حال کو دیکھ کر گاؤں کے بہت سے لوگ بھی کلینک کے قریب جمع ہو گئے تھے، ناصر کو ان حالات کی خبر نہیں مل سکی ہوگی۔ وہ وہاں نہیں آیا تھا۔

جیپ کا انجن اسٹارٹ ہونے تک نائلہ اپنے کمپاؤنڈر باذل کو ہدایات دیتی رہی تھی کہ اسے اپنی ڈاکٹر کی عدم موجودگی میں اس کے مریضوں کا کس طرح اور کس حد تک خیال رکھنا تھا۔

پھر جیپ ممکنہ تیز رفتاری کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگئی۔ نائلہ بار بار مڑ کر صفدر جان کی طرف دیکھ لیتی تھی جس کی آنکھیں کبھی کھلتی تھیں، کبھی بند ہو جاتی تھیں۔

خطرناک پہاڑی راستوں پر جیپ کی رفتار جب خاصی کم کرنا پڑتی تھی تو نائلہ کی بے چینی میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ صفدر کی زندگی کے لیے خود اس کی جان ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر کی حیثیت سے اس میں جو تحمل ہونا چاہیے تھا، وہ عنقا ہو چکا تھا۔ وہ اس وقت ڈاکٹر نہیں، ایک ایسی لڑکی تھی جسے شدت سے احساس ہو گیا تھا کہ وہ جو موت کے دہانے تک پہنچ گیا تھا، وہ اس سے ایسی جنونی محبت کرتا تھا جو کم ہی لوگوں نے کسی سے کی ہوگی۔

صفدر جان سے نائلہ نے شادی کرنے کا صرف وعدہ نہیں کیا تھا، وہ اپنا وعدہ نباہنا چاہتی تھی۔ اسے اس کی بالکل پروا نہیں رہی تھی کہ جب وہ ناصر سے اپنی منگنی توڑ کر صفدر جان سے شادی کرے گی تو اس کے والدین پر اس کا کیا ردِعمل ہوگا۔ وہ بس صرف اس احساس تلے دبی ہوئی تھی کہ اس سے اتنی شدت محبت کرنے والا اگر دنیا سے رخصت ہو گیا تو وہ زندگی بھر خود کو اس کا قاتل سمجھتی رہے گی اور اسے کبھی سکون نہیں مل سکے گا۔ اس کے علاوہ اسے یہ احساس بھی شدت سے ہو گیا تھا کہ صفدر جان جیسا محبت کرنے والا شریکِ حیات اس کی خوش بختی کی علامت ہوگا۔

جیپ جب مانسہرہ کے ایک ہاسپٹل میں پہنچی تو صفدر جان موت سے اپنی جنگ جاری رکھے ہوئے تھا، اس نے یہ جنگ اس وقت بھی جاری رکھی جب اس محاذ پر ہاسپٹل کے ڈاکٹر بھی اس کے ساتھ ہو گئے تھے۔

نائلہ نے سکون کا سانس اس وقت لیا جب ڈاکٹروں نے اسے بتایا کہ اب صفدر جان کی حالت خطرے سے باہر تھی۔

☆☆☆

زندگی کبھی اتنی برق رفتار ہو جائے گی، نائلہ نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ بیس دن بعد گاؤں میں ہی اس کا نکاح صفدر جان سے ہو رہا تھا۔ اس نکاح کی خفیہ تقریب میں نائلہ کی طرف سے صرف شنتال شریک ہوئی تھی اور وہ معصوم اس پر بڑی خوش تھی کہ جو اسے اچھا لگتا تھا، وہ آج اس کی ڈاکٹر باجی کا شوہر بن رہا تھا۔

نکاح کی وہ تقریب نائلہ ہی کے کہنے پر خفیہ رکھی گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا اعلان ہونے سے پہلے وہ ایبٹ آباد اپنے گھر جا کر اپنے والدین کو اس غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لے۔ فی الحال وہ نکاح نامہ بھی اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتی تھی کہ مبادا کسی کی نظر اس پر نہ پڑ جائے۔

شنتال نے اس کا نکاح نامہ اس وعدے کے ساتھ اپنے پاس رکھ لیا کہ انسان تو کیا، وہ اس پر کسی پرندے کی نظر بھی نہ پڑنے دے گی۔

نکاح کے بعد وہ ذرا بھی تاخیر کیے بغیر جیپ میں ایبٹ آباد روانہ ہوگئی۔ اس نے صفدر جان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ چند دن کے اندر اندر اپنے والدین کو ہموار کر لے گی اور جب صفدر جان ایبٹ آباد آئے گا تو وہ دلہن بنی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ وہاں سے وہ صفدر جان کے ساتھ واپس گاؤں آ جاتی اور اس طرح اسے زندگی بھر دیہات میں بسنے والے غریب مریضوں کی خدمت کرنے کا موقع مل جاتا۔

صفدر جان کو دوبارہ زندگی مل جانے پر نائلہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک بیوی کی حیثیت سے سرشار تھی۔ ایسا محبت کرنے والا شوہر اسے اپنی زندگی کے کسی بھی موڑ پر نہیں مل سکتا تھا۔

نائلہ کی وہ سرشاری اس وقت کافور ہوئی جب ایبٹ آباد پہنچنے پر اسے پتا چلا کہ اس کی ماں کی حالت اس مرتبہ کچھ زیادہ ہی خراب ہو گئی تھی۔ انہیں ہاسپٹل میں داخل کیا جا چکا تھا۔ نائلہ کو اطلاع دینے کے لیے ایک ملازم بھی گاؤں روانہ کیا جا چکا تھا لیکن نائلہ تو وہاں سے ایبٹ آباد آ چکی تھی۔

پہلے یہ ہوتا تھا کہ پیٹ میں درد کا وہ دورہ نائلہ کی والدہ پر کبھی کبھی پڑتا تھا اور دوسرے دن تک وہ ٹھیک بھی ہو جاتی تھیں لیکن اس مرتبہ صورتِ حال مختلف تھی۔ درد کا دورہ چند گھنٹے میں ختم ہو جاتا تھا اور چند گھنٹے بعد پھر شروع ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹرز پہلے بھی ان دوروں کا سبب سمجھنے میں ناکام رہے تھے اور اب بھی ناکام تھے۔

ان حالات میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ نائلہ اپنے گھر

والوں کو ناصر سے اپنی منگنی توڑنے کے بارے میں بتاتی یا صفدر جان کا ذکر بھی کرتی۔ خود اسے بھی اپنی ماں سے بہت محبت تھی، اس نے بھی ہاسپٹل کے ڈاکٹروں کے ساتھ اپنا دن رات ایک کر ڈالا لیکن بہتر گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ نائلہ نے نیٹ پر امریکا میں مقیم اپنے استاد ڈاکٹر سے بھی رابطہ کیا تھا۔ تمام میڈیکل رپورٹس بھی نیٹ پر بھیج دی تھیں۔ وہاں سے مختلف مشورے بھی آئے تھے جن پر عمل بھی کیا گیا لیکن نائلہ کی ماں کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

کسی نے تجویز کیا کہ انہیں علاج کے لیے امریکا لے جایا جائے لیکن یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اتنا طویل سفر طے کر سکتیں۔ اس مرتبہ پڑنے والے دوروں میں تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے اتنی شدت بھی آتی تھی کہ وہ مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگتی تھیں۔

چوتھے دن رات گئے اس وقت جب وہ دورے کی حالت میں نہیں تھیں، انہیں دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی مردہ قبر سے اٹھ آیا ہو۔ ان کے چہرے پر ایسی زردی کھنڈ گئی تھی جیسے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی نہ بچا ہو..... اسی دن انہوں نے نقاہت سے لرزتی آواز میں اپنے شوہر سے کہا۔ ''اس مرتبہ میں زندہ نہیں بچوں گی۔ اب میری آخری خواہش پوری کر دیجیے۔ میں اپنی بیٹی کو دلہن بنا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں۔ ناصر جہاں بھی ہو، اسے بلوائیے۔ اب نائلہ کی شادی میں ایک دن کی بھی دیر نہ کیجیے۔''

نائلہ اس وقت ڈاکٹروں کے ساتھ میٹنگ میں تھی۔

نائلہ کے والد کو بھی احساس ہونے لگا تھا کہ اب ان کی رفیقِ حیات کسی وقت بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کی رفاقت چھوڑ سکتی تھیں لہٰذا انہوں نے نائلہ کو میٹنگ سے بلوالیا اور اسے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ ان کی دانست میں نائلہ سے شادی کرنے کی بات کے لیے ہاسپٹل کوئی مناسب جگہ نہیں تھی۔

نائلہ کو جب اپنی والدہ کی خواہش کا علم ہوا تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اب اس کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا تھا کہ وہ اپنے والد کو اپنے تمام حالات اور اپنی شادی کے بارے میں بتا دیتی۔

نائلہ کے والد کو جب وہ سب کچھ معلوم ہوا تو وہ گنگ ہو کر رہ گئے۔ نائلہ سب کچھ صاف صاف بتانے کے بعد سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی تھی۔

''شاید آپ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں بابا!'' نائلہ نظریں اٹھائے بغیر بولی ''اسی لیے شاید مجھ سے بات بھی نہیں کرنا چاہتے، لیکن مجھے بتائیے ڈیڈی! میں کیا کرتی۔ کیا اس شخص کو نظرانداز کر دیتی، اسے مرجانے دیتی جو مجھے اپنی جان سے زیادہ چاہتا ہے۔ ایسی محبت مجھے ناصر تو کیا، کوئی بھی نہیں دے سکتا تھا۔''

''نہیں لختِ جگر!'' نائلہ کے والد بھرائی ہوئی آواز میں بولے ''میں تم سے بالکل ناراض نہیں ہوں۔ میرا نظریہ تو ہمیشہ سے یہی ہے کہ اپنی زندگی کا اتنا اہم فیصلہ لڑکیوں کو بھی خود کرنا چاہیے۔ ان حالات میں تم نے جو کچھ کیا، ٹھیک کیا۔ میں تو ابھی تمہاری ماں کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ شاید وہ تمہاری باتوں پر یقین نہیں کریں گی۔ انہیں یہی خیال آئے گا کہ پہلے کی طرح اب بھی تم نے شادی سے بچنے کے لیے ایک کہانی گھڑ لی ہے۔''

''میری شادی کا ثبوت نکاح نامہ ہے بابا!''

''ہاں..... '' نائلہ کے والد نے سر ہلایا۔ ''اس سے تو انہیں تمہاری باتوں پر یقین آ جانا چاہیے۔ اس کے بعد تمہیں یہاں سے دلہن بنا کر ہی رخصت کیا جائے گا۔ ان کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ اپنا نکاح نامہ لاؤ۔ وہ میں انہیں دکھا دوں گا۔''

اس وقت نائلہ کو سکتہ سا ہو گیا۔ اپنا نکاح نامہ تو وہ خنتال کو دے آئی تھی۔

☆☆☆

ناصر اب بھی گاؤں کے قریب اسی ڈاک بنگلے میں مقیم تھا۔ جاتے وقت نائلہ اس کے لیے ایک لفافہ چھوڑ گئی تھی۔ چند سطروں میں اس نے اسے اپنی منگنی توڑنے کے فیصلے سے آگاہ کیا تھا لیکن اس کی وجہ نہیں بتائی تھی۔ منگنی کی انگوٹھی بھی اس نے اسی لفافے میں ڈال دی تھی۔

ناصر کے لیے یہ ایک بہت بڑا جھٹکا تھا۔ مستقبل کی ساری امیدیں اس نے نائلہ ہی سے باندھ رکھی تھیں۔ وہ اس معاملے کی جانچ پڑتال کے لیے فوری طور پر ایبٹ آباد جانا چاہتا تھا لیکن صورتِ حال ایسی بن گئی تھی کہ وہ وہیں رکنے پر مجبور تھا۔ ریڈیو ٹرانسمیٹر پر زمام خان اس سے کہہ چکا تھا کہ وہ کسی وقت بھی یہ جاننے میں کامیاب ہو سکتا ہے کہ افضال خان نے وہ ہیرے کہاں چھپا کر رکھے تھے۔ یہ جاننے کے بعد زمام خان کو فوری طور پر ناصر کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

ناصر بس اتنا ہی کر سکا کہ ''جنگل منگل'' چلا گیا۔ اسے فون پر نائلہ کی ماں کے بارے میں تمام معلومات حاصل ہو گئیں۔

ناصر نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لی کہ ان حالات میں

نائلہ فوری طور پر کسی اور سے شادی تو کر نہیں سکتی للہٰذا وہ ہیروں کا معاملہ نمٹا کر ایبٹ آباد جائے گا اور نائلہ کے والدین کے سامنے دہائی دے گا۔ اسے یہ خوش فہمی تھی کہ اس طرح وہ صورتِ حال کو پھر اپنے حق میں کر لے گا۔ فی الحال اس کے لیے یہی ضروری تھا کہ وہ کسی طرح سولجر کے باس سے اپنے کام کے معاوضے میں ایک کثیر رقم حاصل کرے اور اس عذاب سے نجات پائے جو اس کا مرحوم باپ اس کے سر ڈال گیا تھا۔

وہ بے چینی سے زمام خان کے پیغام کا منتظر رہا' تین دن گزر گئے۔ وہ روزانہ جا کر فون پر ایبٹ آباد کے حالات معلوم کرتا رہا اور اسے یہ تسلی رہی کہ نائلہ کی ماں کی حالت بہ دستور خراب تھی۔

چوتھے دن شام کو زمام خان نے اس سے رابطہ کیا۔

''مجھے وہ جگہ معلوم ہوگئی ہے۔'' ریڈیو ٹرانسمیٹر پر اس نے کہا تھا۔'' افضال خان کے کمرے میں ایک خفیہ تجوری ہے۔ ہیرے اسی میں رکھے ہیں لیکن وہ چوری نہیں کیے جاسکتے۔ ڈاکا ڈالنا پڑے گا۔ کمرے کے دروازے پر ایک مسلح محافظ رہتا ہے۔ اسے ختم کیے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا اور یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔ میں نے کبھی کسی کو قتل نہیں کیا اور نہ کرسکتا ہوں۔ باس کو بھی اس کا پتا ہے۔ اب اگر تم اسے قتل کر سکتے ہو تو یہ کام ہو جائے گا۔''

ناصر کا سر چکرا گیا۔ یہ اس نے قطعی نہیں سوچا تھا کہ پانچ کروڑ روپوں کے لیے اسے کوئی اتنا سنگین قدم بھی اٹھانا پڑے گا..... اس نے زمام خان کو جواب دیے بغیر رابطہ منقطع کیا اور سولجر سے رابطہ کیا۔ اسے صورتِ حال کے بارے میں بتایا۔ جواب میں سولجر نے سرد لہجے میں کہا'' اب یہ فیصلہ کرنا کام ہے کہ تم کیا کر سکتے ہو اور کیا نہیں کر سکتے۔ باس اب زیادہ انتظار نہیں کرسکتا زمام خان کی اس کامیابی کے بعد اب وہ ایک دن بھی تمھیں اور نہیں دے گا۔''

ناصر نے نہایت پریشانی کے عالم میں زمام خان سے دوبارہ رابطہ کیا اور پوچھا۔'' یہ کام کب کرنا ہے۔ مجھے کس وقت آنا ہوگا؟''

''یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا۔ میں موقع کی تلاش میں رہوں گا۔ تمھیں رازداری کے ساتھ گھر میں لانے کے لیے دروازہ تو مجھے ہی کھولنا ہوگا۔ ممکن ہے یہ کام رات کو کسی وقت ہو یا کل دن میں کسی وقت! میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم بس تیار رہو۔ میرے پیغام کا انتظار کرو۔''

☆☆☆

پانچویں دن کا سورج طلوع ہوا۔ شنتال بہت پریشان تھی، نائلہ کے جانے کے دوسرے دن شام کو بھی وہ چوری چھپے ملا ادریس کے گھر گئی تھی اور گزشتہ شام کو کلینک بھی جا چکی تھی۔ کمپاؤنڈر باذل وہیں تھا لیکن اس سے بھی نائلہ کے بارے میں کوئی بات نہیں معلوم ہوسکی تھی۔ وہاں سے شنتال دوبارہ مولوی ادریس کے گھر گئی۔ وہاں اس نے صفدر جان کو بے حد اداس پایا تھا۔

''وہ شاید اب کبھی نہیں آئے گی شنتال!'' صفدر جان کے لہجے میں رو دینے کی حد تک آزردگی تھی۔ ''میں شہر میں تھا تو فلمیں بھی دیکھا کرتا تھا۔ کئی فلموں میں دیکھ چکا ہوں کہ شہر والوں کی محبت میں گرفتار ہوکر پہاڑی لڑکیوں کی زندگی برباد ہوگئی۔ ان کے محبوب ان سے وعدے کر کے گئے اور کبھی نہیں لوٹے۔ میرے ساتھ اس کے برخلاف ہوا ہے۔ ایک شہری لڑکی ایک دیہاتی کو دغا دے گئی ہے۔ اس نے جو کچھ کیا' صرف انسانیت کے لیے کیا۔ ایک انسان کی زندگی بچانے کے لیے کیا۔ وہ چاہتی ہے کہ میں زندہ رہوں اور ساری زندگی اس کا انتظار کرتا رہا ہوں۔''

شنتال کے دل نے اس کی یہ باتیں نہیں مانی تھیں۔ چوتھے دن صبح بھی وہ کمرے میں پڑی یہی سوچ رہی تھی کہ اس کی ڈاکٹر باجی کے ساتھ کوئی مجبوری ہوگئی ہوگی' وہ واپس ضرور آئیں گی یا صفدر جان کو اپنے پاس بلائیں گی۔

زمام خان اس وقت کمرے میں نہیں تھا اور شنتال کو اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ کچھ وقت زمام خان کے ساتھ گزارنے کے علاوہ شنتال کو اب بھی زمام خان سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوسکی تھی۔ اسے اب بھی یہ خیال آتا رہتا تھا کہ کاش وہ زمام خان کے بچے کی ماں نہ بنتی۔

وہ اب بہت بدل گئی تھی۔ اس نے گھر سے نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ زمام خان سے شادی کے بعد وہ صرف چار مرتبہ گھر سے نکلی تھی۔ ایک بار اپنی ڈاکٹر باجی کے نکاح میں جانے کے لئے' دوسری بار اور تیسری مرتبہ اس نے مولانا ادریس کے گھر کا رخ کیا تھا۔ صرف ایک مرتبہ اپنے غار میں بھی گئی تھی جہاں اس کی ہر چیز جوں کی توں رکھی تھی۔ اس نے اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی افسردگی سے کہا تھا۔ ''تم نے بھی مجھے اس سے نہیں بچایا ماں!.....تم کیوں چلی گئیں مجھے اکیلا چھوڑ کر؟ ڈاکٹر باجی کہتی ہیں' اگر تم ہوتیں تو مجھے پہلے ہی سے سب کچھ سمجھا دیتیں۔''

شنتال کا خیال تھا کہ اپنی ماں سے یہ گلہ اسے زندگی بھر رہے گا۔

نائلہ کے جانے کے بعد پانچویں صبح اس کا دل بہت گھبرایا۔ زمام خان تھا نہیں' وہ اٹھ کر اپنے باپ کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ زمام خان سے شادی کے بعد ایسا ہی ہوتا رہا تھا۔ جب بھی اس کا دل گھبراتا' اپنے باپ کے پاس چلی جاتی اور اس سے دیر تک اس طرح باتیں کرتی رہتی جیسے وہ اس کا باپ نہیں' اس کی ماں ہو جس سے وہ کسی حد تک بے تکلفانہ باتیں کرسکتی تھی۔

لیکن اس دن وہ اپنے باپ سے باتیں نہیں کرسکی۔ ذرا دیر پہلے ہی اس کا باپ دنیا سے رخصت ہوچکا تھا۔ شنتال نے کمرے میں اس کی لاش دیکھی۔ اس کے سینے میں دل کے مقام پر چاقو پیوست تھا۔

شنتال کے منہ سے ایک دہشت زدہ سی چیخ نکلی جس نے زمام خان اور ناصر کو چونکا دیا۔ اس وقت ناصر نے تجوری سے ایک ریشمی تھیلی نکالی تھی۔ زمام خان اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے شنتال کو دیکھا تو اس کی طرف لپکا۔ غالباً وہ یہی چاہتا ہوگا کہ شنتال کو دوبارہ نہ چیخنے دے۔ اس کی آواز گھر کے دو ملازموں میں سے کسی کو بھی اس طرف لاسکتی تھی۔

زمام خان کو اپنی طرف لپکتے دیکھ کر وہ اور دہشت زدہ ہوگئی۔ اسے خیال آیا تھا کہ زمام خان اس کے سینے میں بھی چاقو اتار دے گا۔ وہ چیختی ہوئی تیزی سے پلٹی اور کمرے سے نکل گئی۔ زمام خان بھی اس کے پیچھے آیا لیکن اسے پکڑ نہ سکا۔ وہ بری طرح ڈگمگا گیا تھا۔ خود شنتال کی بھی یہی حالت ہوئی تھی۔ اسے ایسا لگا تھا جیسے در و دیوار کسی جھولے کی طرح ڈولنے لگے ہوں۔ عجیب سی آوازوں کے ساتھ دیواروں میں دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔ پھر چھت ایک دھماکے کے ساتھ گری۔ شنتال کے سر سے کچھ ٹکرایا۔ وہ ضرب اتنی شدید تھی کہ شنتال کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور ہوش و حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔

☆☆☆

تیزی سے گاؤں کی طرف بڑھتی ہوئی جیپ یکا یک اس طرح لہرا گئی جیسے اسٹیئرنگ پر نائلہ کی گرفت مضبوط نہ رہی ہو۔ جیپ میں وہ اکیلی ہی تھی۔ اپنے نکاح کی سند' اس کا ثبوت لانے کے لیے وہ اکیلی ہی گھر...... سے چل پڑی تھی۔

جب اس کی جیپ اس بری طرح لہرائی تو اس کی سمجھ میں آ ہی نہ سکا کہ ہوا کیا تھا۔ اس نے گھبرا کر بریک لگا دیے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو جیپ سمیت نہ جانے کتنی گہرائی میں چلی جاتی۔ اس کی جیپ سے کچھ ہی آگے زمین ایک خوفناک آواز کے ساتھ پھٹی تھی۔

''زلزلہ!...... زلزلہ!...... زلزلہ!''

گاؤں کی طرف سے کچھ چیختی ہوئی آوازیں سنائی دیں۔

جیپ میں دم بخود بیٹھی نائلہ نے ایک بھیانک خواب کی طرح دیکھا کہ اس سے کچھ ہی دور نظر آنے والا گاؤں ملبے کا ڈھیر بنتا جارہا تھا۔ کچے پکے مکانات ریت کی طرح بکھر رہے تھے۔ درختوں نے اپنی جڑیں چھوڑ دی تھیں۔ بھینسیں اور کچھ دوسرے جانور بوکھلائے ہوئے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے اور کسی کتے کے بھونکنے کی آواز نائلہ کو صورِ اسرافیل کے مانند لگی تھی۔ زمین میں کئی اور مقامات پر بھی خوف ناک آوازوں کے ساتھ دراڑیں پڑ گئی تھیں۔

سکتے کی سی حالت میں بیٹھی ہوئی نائلہ کو یہ احساس بھی نہیں ہوسکا تھا کہ اس کی ایک جگہ کھڑی ہوئی جیپ بھی کچھ دیر تک لرزتی رہی تھی۔ جیسے اس کے پہیوں کے نیچے کی زمین بے چینی سے کسمسا رہی ہو۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد ہر طرف ایک بھیانک سکوت طاری ہوگیا۔ بھونکنے والا کتا بھی شاید کسی دراڑ میں دفن ہوچکا تھا۔

نائلہ بہت دیر تک ساکت بیٹھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس طرف دیکھتی رہی جہاں کبھی ایک گاؤں تھا لیکن اب وہاں صرف ملبے کے ڈھیر دکھائی دے رہے تھے...... گرد و غبار کا ایک طوفان سا فضا میں اٹھ رہا تھا۔

نائلہ کو یہ احساس بھی نہیں ہوسکا کہ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کتنی دیر میں جاگی تھی اور کب اسے خیال آیا تھا کہ اس کی نظروں کے سامنے پھیلی ہوئی تباہ کاری ایک زلزلے کا نتیجہ تھی۔ وہ گاؤں اب صفحۂ ہستی سے نابود ہوچکا تھا جہاں شنتال رہتی تھی' جہاں صفدر جان رہتا تھا' جہاں اپنے کلینک میں وہ اپنے کمپاؤنڈر بازل کو چھوڑ آئی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ جیپ سے اتری۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے اور آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ اس گاؤں میں گزری ہوئی مختصر زندگی کی بہت سی یادیں اس کے دل میں تڑپ رہی تھیں۔

زمین میں پڑنے والی دراڑوں سے بچتی ہوئی وہ اس جگہ تک پہنچ گئی جہاں اب سب کچھ صرف ملبے کے ڈھیر کی صورت میں موجود تھا۔ وہاں اس نے مختلف سمتوں سے آتی ہوئی انسانی کراہیں سنیں اور کئی دل خراش منظر دیکھے۔

نائلہ وحشت زدہ ہوکر مڑی اور ایک طرف دوڑتی چلی گئی لیکن اس گورستان میں وہ خوف ناک مناظر سے بچ ہی

نہیں سکتی تھی۔

اب کسی کے کراہنے یا سسکنے کی آوازیں بھی نہیں آرہی تھیں۔ غالباً ان لوگوں نے بھی دم توڑ دیا تھا۔

کچھ دیر بعد نائلہ اٹھی۔ اس کے قدم پھر ایک طرف اٹھنے لگے۔ اب اس کی حالت بالکل پاگلوں جیسی تھی۔ وہ اس طرح ادھر ادھر گھومنے اور بھاگنے دوڑنے لگی جیسے کسی کو ڈھونڈ رہی ہو۔ ایک جگہ اسے ایک ایسا ملبا نظر آیا جس میں لکڑیاں زیادہ تھیں۔ غالباً وہ بھینسوں کے باڑے کا ملبا تھا۔ پھر ایک جگہ مسجد کا مینار پڑا دکھائی دیا تو وہ آس پاس کے ملبوں کے اوپر یا ان کے اردگرد چکرانے لگی۔ اس کے خیال میں یہیں کہیں اس مکان کا ملبا بھی ہونا چاہیے تھا جہاں پانچ دن پہلے صفدر جان سے اس کا نکاح ہوا تھا۔

اگر شنتال وہاں ہوتی تو نائلہ کو ضرور بتاتی کہ مرتے وقت صفدر جان نے اس کے علاوہ کچھ نہیں سوچا ہوگا کہ شہر کے لڑکے ہی نہیں، لڑکیاں بھی بے وفا ہوتی ہیں اور کبھی ان میں سے کوئی لوٹتا ہے تو اس وقت جب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

دن کب گزر گیا، رات کب آ گئی، نائلہ کو اس کا ہوش نہیں تھا۔ جب وہ تھک کر بری طرح نڈھال ہو گئی تو ایک جگہ پڑی اور نہ جانے کب اسے نیند آ گئی۔ دن ہوا تو وہ پھر جاگی اور پھر اس گورستان میں چکرانے لگی۔ اس کی بھوک پیاس کا احساس شاید فنا ہی ہو گیا تھا۔ ملبے میں دبی ہوئی کوئی لاش نظر آتی تو وہ دوڑ کر اس کے قریب جاتی اور پہچاننے کی کوشش کرتی کہ ان میں سے کوئی صفدر جان تو نہیں ہے، کوئی شنتال تو نہیں ہے؟ پھر مایوس ہو کر وہ کسی اور طرف بڑھ جاتی۔

دوپہر ہو چکی تھی جب اس نے انجنوں کا شور سنا۔ کچھ گاڑیاں اس طرف آتی دکھائی دیں۔ فضا میں دو ہیلی کاپٹر بھی چکراتے نظر آئے۔

آخر حکومت کے کارندے اس گورستان کی لاشیں سمیٹنے کے لیے وہاں پہنچ ہی گئے تھے۔

شام ہوتے ہوتے ''امدادی کارروائیاں'' خاصی تیز ہو گئیں لیکن نائلہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ لاشوں کی آخر کیا مدد کی جا سکتی ہے۔

گورستان میں انسانوں کا ایک میلہ سا لگ گیا۔ وہ سبھی کچھ نہ کچھ کر رہے تھے لیکن نائلہ کی طرف کسی نے دھیان نہیں دیا کیونکہ وہ نہ تو زخمی تھی، نہ وہ کسی اندرونی درد سے چلا رہی تھی۔

ایک رات اور گزر گئی۔

ملبے سے لاشیں اور انسانی اعضا نکالنے کی کوشش جاری رہیں۔ صرف ایک لڑکی کو وہاں سے زندہ نکالا جا سکا اور نائلہ اسے دیکھتے ہی چیختی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔

''شنتال! شنتال! میری بہن!''

پھر وہ ان لوگوں سے الجھ گئی جو شنتال کو اٹھا کر ایک گاڑی کی طرف لے جارہے تھے۔ وہ ان لوگوں سے کہہ رہی تھی کہ شنتال کو چھوڑ دیں لیکن کسی نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ شاید انہوں نے یہی سمجھا ہو کہ اس خوفناک سانحے سے اس عورت کا دماغ الٹ گیا ہے۔

شنتال کو ایک گاڑی میں ڈالا گیا۔ نائلہ بھی اس پر چڑھ گئی۔ نہ جانے کیوں کسی نے اسے گاڑی سے اتارنے کی کوشش نہیں کی اور گاڑی چل پڑی۔

اس دن امدادی کارروائیاں کرنے والوں کے علاوہ بھی بہت سے ایسے لوگ وہاں پہنچے جنہیں اپنے پیاروں کی تلاش تھی۔ ان میں نائلہ کے والد اور بھائی بھی تھے جو نائلہ کے باڈی گارڈ اور شوفر کی رہبری میں وہاں تک پہنچ سکے تھے۔ انہیں کچھ فاصلے پر نائلہ کی جیپ تو مل گئی تھی لیکن وہ ہر طرف گھومنے کے باوجود نائلہ کو تلاش نہیں کر سکے تھے۔

نائلہ تو اس وقت کسی شہر کے ایک ہاسپٹل میں شنتال کے قریب بیٹھی تھی۔ وہاں شنتال کی طرح اور بھی بہت سے زخمیوں کو لایا گیا تھا اور لایا جا رہا تھا۔ شنتال کو بھی وہاں پہنچا تو دیا گیا تھا لیکن ڈاکٹروں اور نرسوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ فوری طور پر کوئی شنتال کی طرف توجہ نہیں دے سکا تھا۔

☆☆☆

شنتال ہوش میں آ چکی تھی۔

''میری اچھی ڈاکٹر باجی!...... مجھے یقین تھا آپ آئیں گی!'' وہ اپنی دھندلی پڑتی ہوئی آنکھوں سے نائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے بمشکل بول رہی تھی۔ ''میں نے آپ کی امانت اب تک اپنے پاس محفوظ رکھی ہے۔ میرے ہاتھ حرکت نہیں کر رہے ہیں۔ وہ آپ میرے گریبان میں سے نکال لیں۔''

اس طرح نائلہ کو اپنے نکاح کا ثبوت مل گیا جس کی اب اسے کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ بس کاغذ کا ایک معمولی ٹکڑا تھا۔ نائلہ وہ بس اپنی ماں کو دکھا سکتی تھی لیکن اسے اس کا موقع نہیں ملا۔ زمین نے ایک زبردست جھٹکا کھایا اور سب کچھ ملبے میں دفن ہو گیا۔ نائلہ شاید صفدر جان کو بتانے چلی گئی کہ شہر کی وہ لڑکی بے وفا نہیں تھی۔



جنگِ دل ربا

ایچ اقبال

جنگ فوجوں کی ہو یا جذبوں کی... انجام کبھی بہتر نہیں ہوتا... ہارنے والا روتا ہے تو جیتنے والا بھی اپنے زخموں پر مرہم پاشی کررہا ہوتا ہے... جنگ کی صورت میں ہونے والی تبدیلیاں دور تک دونوں فریقوں کا پیچھا کرتی ہیں... سائے کی طرح ساتھ ساتھ رہتی ہیں جنہیں بھلایا نہیں جاسکتا... نہ جھٹلایا جاسکتا ہے... ایسے ہی کشیدہ ماحول میں زندگی و جنگ کی بازی میں الجھ جانے والے دو فریقوں کی جدوجہد... ایک جنگ کا مقروض تھا... دوسرے پر محبت کا قرض واجب الادا تھا... رنگین و سنگین لمحوں میں گزرتی ہوئی ایک ایسی دل ربا کہانی جس کے نقوش دیر تک قارئین کے ذہنوں پر ثبت رہیں گے...

ایک ہی مشن پر دو مخالف سمتوں سے کام کرنے والے جاسوسوں کی تہلکہ خیز داستان

کہیں قریب ہی سے سانپ کی پھنکار سن کر گھوڑا بدک کر سرپٹ دوڑ پڑا۔ انور نے اسے قابو میں لانے کی بے حد کوشش کی لیکن اچھا گھڑسوار ہونے کے باوجود کامیاب نہیں ہوسکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گھوڑے نے سانپ کی پھنکار نہیں، موت کی آواز سنی ہو۔

شام نہیں ہوئی تھی لیکن اس پہاڑی علاقے کا جنگل اتنا گھنا تھا کہ فضا مٹیالی سی تھی۔ اس جنگل میں ہرن، بارہ سنگھا اور خرگوش کثرت سے پائے جاتے تھے۔ انور اپنے چند دوستوں کے ساتھ شکار کھیلنے آیا تھا۔ اس کا گھوڑا اس وقت بدکا تھا جب وہ ایک ہرن کا تعاقب کررہا تھا۔ ہرن پر وہ رائفل سے ایک گولی بھی چلا چکا تھا لیکن گولی صحیح نشانے پر نہیں لگی تھی، ہرن کی ٹانگ پر لگی تھی اور غالباً اس کی ہڈی کو متاثر نہیں کرسکی تھی اسی لیے ہرن اس کے بعد بھی برق رفتاری سے دوڑتا رہا۔

گھوڑے کو قابو میں کرنے کی ناکام کوشش کے بعد انور نے رائفل سرعت کے ساتھ اپنے کندھے سے لٹکالی تھی اور آگے جھک کر گھوڑے کی گردن سے لپٹ گیا تھا۔ دراصل اسے خدشہ تھا کہ اونچے نیچے راستے پر دوڑتے ہوئے گھوڑے نے اگر کہیں ٹھوکر کھائی تو وہ اچھل کر گھوڑے کی پشت

سے زمین پر جا گرتا۔
اب اسے یہ احساس بھی ہو چکا تھا کہ وہ اپنے دوستوں سے دور نکل آیا تھا۔ اسے اس کا بھی ہوش نہیں تھا کہ ہرن اپنی جان بچا کر نہ جانے کس طرف نکل گیا اور دوڑتے ہوئے گھوڑے کا رخ کس طرف تھا۔ دو مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ گھوڑا کسی تناور درخت سے رگڑ کھاتا ہوا گزرا تو اس کی زد پر انور کی رانیں بھی آئیں جن میں شدید سوزش بھی ہوئی لیکن اس وقت اس سوزش سے زیادہ انور کو یہ فکر لاحق تھی کہ وہ کہیں گھوڑے سے گر نہ پڑے اور گھوڑا کہیں پڑوسی ملک کی سرحد میں داخل نہ ہو جائے۔
دس میل بعد پڑوسی ملک کی سرحد شروع ہو جاتی تھی۔ جبکہ اس کا تعلق شام سے تھا۔ اگر گھوڑا پڑوسی ملک کی طرف نکل جاتا تو انور کے لیے خاصی پریشانی ہو سکتی تھی لیکن وہ کرتا بھی کیا، گھوڑا کسی طرح قابو میں نہیں آ سکا تھا۔ اس کے دماغ میں اپنے باپ کی یہ بات آئی کہ گھڑسواری کی مہارت حاصل کرنے کے بعد ہی شکار کے لیے گھوڑا استعمال کرنا چاہیے۔
اس کے والد شکاریوں کی دنیا میں خاصی شہرت کے حامل تھے۔ انہوں نے جو کچھ کہا تھا، اپنے تجربات کی روشنی میں کہا تھا۔ انور نے ان کی بات نظر انداز نہیں کی تھی لیکن جب اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ شکار کا پروگرام بنایا تو سوچا تھا کہ ہرن اور بارہ سنگھا جیسے جانوروں کے لیے بہت اچھا گھڑسوار ہونا ضروری نہیں تھا۔ اس جنگل میں درندے تو ہوتے نہیں تھے۔
اس کے والد کو درندوں ہی کے شکار کا شوق رہا تھا۔ شیر، چیتے جیسے شکار انہوں نے اپنے ہی ملک میں نہیں کیے تھے۔ ان کا شوق انہیں دو مرتبہ افریقا بھی لے جا چکا تھا۔
انور کو درندوں کے شکار سے دلچسپی تھی، نہ خرگوش جیسے معصوم جانوروں سے۔ اسے صرف ہرن اور بارہ سنگھوں کے شکار سے دلچسپی تھی۔ کالج کی چھٹیوں میں وہ تین سال سے اس پہاڑی جنگل میں آ رہا تھا لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ اس کا گھوڑا اس بری طرح بدکا کہ کسی طرح اس کے قابو میں نہیں آ سکا۔ دونوں رانوں پر شدید رگڑ لگنے کے کچھ ہی دیر بعد گھوڑے نے کسی بڑی چیز سے ٹھوکر کھائی یا نہ جانے کیا ہوا کہ وہ بہت زور سے اچھلا۔ انور کا سر ایک درخت کی بہت مضبوط اور موٹی ٹہنی سے ٹکرایا اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ دو ایک لمحوں میں اس اندھیرے کا تسلط مکمل ہو جاتا۔ انہی دو ایک لمحوں میں اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ اچھل کر گھوڑے سے گرا اور ایک جانب لڑھکتا چلا گیا۔ لڑھکتے ہی اس کے جسم پر جگہ جگہ چوٹیں آنے لگیں لیکن اس وقت تک اس کا دماغ مکمل تاریکی میں جا چکا تھا اور وہ کسی تکلیف کا احساس نہیں کر سکتا تھا۔
جب اسے ہوش آیا تو ایسے موقعوں پر انسان کی تمام حسیات بتدریج بیدار ہوتی ہیں، اسی طرح انور کی حسیات بھی بیدار ہوئیں۔ اس نے خود کو کسی جگہ لیٹا ہوا دیکھا، بستر کا احساس بھی ہوا، جسم میں تکلیف بھی محسوس ہوئی۔ یہ بھی یاد آیا کہ وہ ہرن کے تعاقب میں تھا اور اس کا گھوڑا بے قابو ہو گیا تھا جس کے اچھلنے سے اس کے سر پر چوٹ لگی تھی۔ یہ سوال بھی ذہن میں ابھرے کہ اس کے بعد کیا ہوا؟ اور اب وہ کہاں ہے؟ آنکھوں کے سامنے سے دھند بھی بتدریج کم ہوئی۔ اس نے خود کو ایک کمرے میں پایا۔ اس کے قریب ہی ایک نسوانی چہرہ بھی تھا۔ دھند صاف ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ نسوانی چہرہ اٹھارہ بیس سالہ ایک خوب صورت لڑکی کا تھا۔
یہ سب کچھ بتدریج تو ہوا لیکن اس عمل کا دورانیہ چند لمحات پر محیط تھا۔
''شکر ہے کہ تمہیں ہوش آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی انور!''
انور لڑکی سے اپنا نام سن کر چونکا۔ اس نے غور سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ چہرہ اس نے پہلے بھی کبھی دیکھا ہے۔ غور سے دیکھنے پر یہ احساس اور زیادہ قوی ہو گیا۔
''تم...... کون؟'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
''اور میں، میں کہاں ہوں؟''
''تم ایک خطرناک جگہ آ گئے ہو انور!'' وہ بولی۔ اس کی آواز میں دلآویز سی کھنک تھی۔ ''یہ تو میں نے دیکھ لیا ہے کہ تم دانستہ یہاں نہیں آئے لیکن سارا واقعہ کیا ہے، یہ تو تم ہی بتا سکو گے۔ تم سرحد پار آ گئے ہو۔''
''سرحد پار؟'' انور چونکا۔
''ہاں۔'' جواب دیا گیا۔ ''اور خوش قسمت ہو کہ بارڈر پولیس نے تمہیں نہیں دیکھا۔ میں نے بھی دیکھ لیا تو بس اتفاق ہے۔ میں دوربین سے وادی کو گھیرے ہوئے پہاڑوں کی چوٹیاں دیکھ رہی تھی کہ نظر ایک گھوڑے پر پڑی۔ وہ نہ جانے کیوں بہت زور سے اچھلا اور تم اس پر سے گر کر وادی میں لڑھکتے چلے آئے۔ میں فوراً اپنی دو ملازماؤں اور ایک ملازم کے ساتھ اس طرف دوڑی۔ گھنٹے بھر کی تلاش کے بعد تو تم ملے۔ میں اپنے ملازموں کی مدد

سے تمہیں اٹھا کر اپنے اس ریسٹ ہاؤس میں لے آئی۔ کیونکہ میں میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہوں اس لیے فرسٹ ایڈ باکس ساتھ رکھنے کی بھی عادت پڑ گئی ہے۔ میں نے ہی تمہارے زخموں کی ڈریسنگ کی ہے۔ شکر ہے کہ تمہاری کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی۔''

انور محسوس کر چکا تھا کہ اس کے سر کے علاوہ بھی جسم کے کئی حصوں کی ڈریسنگ کی گئی تھی اور معمولی قسم کی چوٹوں پر دوا لگانے پر ہی اکتفا کی گئی تھی۔ اس کے جسم پر اس کا لباس بھی نہیں تھا۔ ایک چادر اس کے جسم پر پڑی ہوئی تھی۔

''میں تمہارا شکر گزار ہوں۔'' انور حسنین نے کہا۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ وہ واقعی ایک خطرناک جگہ پہنچ گیا ہے۔ خطرناک اس اعتبار سے کہ وہ اپنے ملک کی سرحد پار کر کے پڑوسی ملک کے اندر آ گیا تھا۔ لڑکی بھی کہہ چکی تھی کہ وہ بارڈر پولیس کی نظر میں نہیں آیا تھا۔ اگر آجاتا تو گرفتار کیا جا چکا ہوتا اور ہوش میں آنے کے بعد جب اس کی آنکھ کھلتی تو وہ خود کو نہ جانے کہاں پاتا!

لڑکی نے اس کی بات کے جواب میں فوراً کہا تھا۔ ''دوست کو دوست کا شکر گزار ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں انور؟ تمہاری ہی طرح میں بھی آٹھ سال میں اتنی زیادہ تبدیل تو نہیں ہوئی کہ تم مجھے پہچان نہ سکو۔''

آٹھ سال! انور کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ آٹھ سال قبل وہ اور اس کا بے حد مختصر خاندان اسی ملک کے باشندے تھے۔ اس کے گھر کے برابر کے گھر میں جو لڑکی رہتی تھی، وہ اس وقت پندرہ سولہ سال کی تھی۔ میٹرک کر چکی تھی اور فرسٹ ایئر میں داخلہ لینے والی تھی۔ وہ اور انور ایک دوسرے سے دوستی کی حد تک مانوس ہو گئے تھے۔ جب انور کے والد نے کسی مصلحت کے تحت ملک شام کی شہریت لے لی تھی تو ان کی روانگی کے وقت لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''زنوبیا!'' انور کے منہ سے نکلا۔

''شکر ہے۔'' وہ کھل کر مسکرائی۔ ''آخر پہچان لیا تم نے مجھے۔ اتنی دیر سے پہچاننے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے مجھے بُھلا دیا تھا مگر یقین کرو، میں تمہیں نہیں بھول سکی تھی۔''

''مجھے فوراً پہچان لیا تھا تم نے؟'' انور نے پوچھا۔

''یقین سے تو نہیں پہچانا تھا لیکن خیال آ گیا کہ تم ہی ہو۔ یقین اس وقت آیا جب میں نے تمہاری جیبوں سے سب کچھ نکال کر یکجا کیا۔ تمہارے شناختی کارڈ پر تمہارا پورا نام لکھا ہے۔ انور حسنین، گل زاد۔''

جسم میں جگہ جگہ تکلیف کا احساس تھا لیکن انور مسکرایا۔ ''بہت ہی غیر معمولی اتفاق ہے کہ تم سے اس طرح ملاقات ہوئی۔ میں اس پر شرمندگی کا اظہار ہی کر سکتا ہوں کہ میں نے تمہیں بُھلا دیا لیکن میں تمہیں کیسے یاد رہ گیا؟''

زنوبیا اس کا سوال ٹال گئی اور بولی۔ ''اتنی باتیں ہو گئیں۔ مجھے سب سے پہلے یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ اب تم خود کو کیسا محسوس کر رہے ہو؟''

''تکلیف تو سارے جسم میں ہے لیکن سر میں زیادہ تکلیف ہے۔''

''لیکن قابلِ برداشت ہے۔ اس کا اندازہ میں تمہارے چہرے سے بھی کر رہی ہوں اور تمہارے باتیں کرنے کے انداز سے بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ تمہارے سر کی چوٹ ہے بھی کچھ زیادہ۔ اسی لیے میں تمہیں ایک پین کلر انجکشن لگا چکی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم نقاہت بھی محسوس کر رہے ہو گے۔''

''بالکل ٹھیک سمجھا ہے تم نے۔''

''تمہیں تلاش کرنے میں دیر لگی تھی۔ تمہارے سر سے کافی خون بہہ چکا تھا۔ اس کی وجہ سے نقاہت تو ہونا ہی چاہیے۔''

''میں یہاں خطرے میں تو ہوں۔'' انور سوچتا ہوا بولا۔

''جب تک تم یہاں، میرے ریسٹ ہاؤس میں ہو، تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' زنوبیا کی مسکراہٹ بھی دلکش تھی۔

''میری چوٹیں کب تک ٹھیک ہوں گی؟''

''دو تین روز تو تم بستر سے اٹھو بھی نہیں۔ سر میں دھمک ہونے لگے گی۔ تین دن بعد تم تھوڑی بہت چہل قدمی کر سکتے ہو۔ سر کا زخم مندمل ہونے میں ایک ہفتہ لگ سکتا ہے۔ میرے پاس ایسی دوا نہیں ہے جو اس زخم کو جلد مندمل کر سکے لیکن اگر میں تمہیں شہر لے جا کر کسی اسپتال میں داخل کراؤں تو اندیشہ ہے کہ تم گرفتار ہو سکتے ہو۔''

انور نے متفکرانہ انداز میں سر کو آہستگی سے اثباتی جنبش دی پھر پوچھا۔ ''وقت کیا ہوا ہے؟''

''سات بج چکے ہیں۔''

''اوہ! میرا خیال ہے، جب میں گرا تھا، اس وقت ساڑھے پانچ بجے ہوں گے۔ میری کلائی پر اس وقت گھڑی بھی نہیں ہے۔''

''جو سامان میں نے تمہاری جیبوں سے نکالا ہے، ان میں کوئی گھڑی نہیں۔ وہ تمہاری کلائی سے کھل کر کہیں گر گئی ہوگی؟''

''موبائل؟''

''وہ بھی کہیں گر گیا ہوگا۔ تمہاری جیبوں سے مجھے صرف تین چیزیں ملی ہیں۔ رومال، ایک والٹ اور تمہارا شناختی کارڈ۔ اور......'' وہ مسکرائی۔ ''یقین کرو، میں نے تمہارے والٹ سے کوئی رقم چوری نہیں کی ہے۔''

انور دھیرے سے ہنس دیا۔ اسے خاصی حد تک یقین ہو چکا تھا کہ زنوبیا کی وجہ سے وہ کسی مخدوش حالت میں نہیں ہے۔

اچانک زنوبیا اس کے بستر کے قریب ہی رکھی ہوئی کرسی سے اٹھی۔ ''میں ابھی آئی، دو تین منٹ میں۔''

''ایک بات بتاتی جاؤ۔'' انور جلدی سے بولا۔ ''ایک خلش ہے میرے ذہن میں۔''

''کہو۔'' زنوبیا بیٹھ گئی۔

''تم نے اپنے ملازموں کو میرے بارے میں کیا بتایا ہے؟''

''ان کی طرف سے تم بے فکر رہو۔ وہ میرے بارے میں یا مجھ سے متعلق کوئی بات کبھی کسی کو نہیں بتاتے، البتہ میں نے ان سے کہا ہے کہ میں اتفاق سے تمہیں جانتی ہوں۔ تم یہاں کے ایک شریف گھرانے کے فرد ہو۔ اس طرف گھومنے آنکلے ہوگے۔ تم نے کہیں ٹھوکر کھائی اور ڈھلان پر لڑھکتے ہوئے وادی میں آگرے۔''

''یہ کیا جگہ ہے؟'' انور پوچھ بیٹھا۔

''اس طرح تو سوال سے سوال نکلتا چلا آئے گا۔'' زنوبیا مسکراتے ہوئے دوبارہ کھڑی ہوئی۔ ''یہ سب تفصیلات ابھی آکر بتاؤں گی۔ بس دو تین منٹ۔'' وہ جواب کا انتظار کیے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

انور کو شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ حادثاتی طور پر دوسرے ملک کی حدود میں آگرا تھا جبکہ ان دنوں، دونوں ممالک کے معاملات بھی کشیدگی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اگر وہ بارڈر پولیس کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ لوگ اسے شام کا جاسوس ہی سمجھتے۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ زنوبیا کی پناہ میں آگیا جسے وہ بھول چکا تھا لیکن وہ اسے نہیں بھولی تھی اور اسے کسی مصیبت سے بچانا بھی چاہتی تھی۔ وہ اس ملک کی شہری ضرور تھی لیکن وہاں کے سرکاری مذہب سے اس کا تعلق نہ تھا۔ وہ ایک پارسی خاندان سے تعلق رکھتی تھی جو تجارت پیشہ تھا۔ اس کے ایک چچا نے وہاں کی فوج میں شمولیت اختیار کرلی تھی۔ آٹھ سال قبل وہ کیپٹن تھے۔

زنوبیا جلد ہی واپس آگئی۔ اس کے ہاتھ میں جو گلاس تھا، اس کے مشروب کی رنگت زردی مائل تھی۔

''لو یہ پی لو۔'' زنوبیا نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ ''اس کی رنگت سے کچھ اور نہ سمجھنا۔ یہ دودھ ہے۔ بس ذرا سی ہلدی ملائی ہے میں نے اس میں۔ یہ تمہارے لیے مفید ثابت ہوگی۔''

دودھ کسی قدر گرم تھا۔ انور ایک گھونٹ پی کر ہی رک گیا۔

''ہاں۔'' زنوبیا بولی۔ ''آہستہ آہستہ ہی پیا جا سکے گا۔''

''اب میرے سوال کا جواب دو۔''

''قدرتی بات ہے کہ تم بہت کچھ جاننے کے لیے بے تاب ہوگے۔ میں بتاتی ہوں تمہیں۔ یہ بڑی خوب صورت وادی ہے۔ یہاں کوئی آبادی نہیں ہے۔ لوگ یہاں صرف گھومنے پھرنے ہی آتے ہیں۔ یہ تو تمہیں شاید یاد ہوگا کہ مجھے بچپن ہی سے ڈرائنگ کا شوق تھا۔ اسی شوق کی پیاس بجھانے میں یہاں آتی ہوں۔ لینڈ اسکیپ بناتی ہوں لیکن صرف ان دنوں میں جب کالج کی چھٹیاں ہوتی ہیں۔''

''کیا؟'' انور کو تعجب ہوا۔ ''تم نے ابھی تک تعلیم مکمل نہیں کی؟''

''ہاں۔'' زنوبیا نے کہا۔ ''تعلیم کے سلسلے میں کئی سال کا تعطل آگیا تھا۔ تمہیں تو اسی وقت چونکنا چاہیے تھا جب میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہوں۔''

''اس وقت تک میں نے جانا ہی نہیں تھا کہ تم زنوبیا ہو۔''

''ہاں۔'' زنوبیا نے سر ہلایا۔ ''خیر...... دراصل تعلیم کے سلسلے میں کسی وجہ سے کئی سال کا تعطل آگیا تھا۔ اس کی تفصیل پھر کسی وقت بتاؤں گی۔ میری خواہش تو یہی تھی کہ میں مصوری کی دنیا میں کوئی مقام پیدا کروں لیکن ڈیڈی شدت سے چاہتے تھے کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ میں نے ان کی خواہش کا احترام کیا۔ میری تعلیم کا رخ مڑ گیا۔ اب میں فائنل ایئر میں ہوں لیکن میں مصوری سے اپنا ناتا نہیں توڑ سکی۔ لینڈ اسکیپ بنانے کے لیے میں تین سال سے اس وادی میں آرہی ہوں۔ شاید......'' اس کے چہرے کے تاثرات میں کچھ تبدیلی آئی۔ ''شاید میرا یہ شوق اسی لیے تھا کہ میں آٹھ سال بعد تمہیں اس طرح پاسکوں، میرا مطلب

ہے دیکھ سکوں۔''

انور اس کے تاثرات کی تبدیلی کو کوئی معنی نہیں پہنا سکا۔ اس نے دودھ کا ایک گھونٹ لیا، پھر بولا۔ ''ان دنوں تم کب سے اس وادی میں ہو؟''

''تین چار روز سے۔'' زنوبیا نے جواب دیا۔ ''میں عموماً یہاں ایک ماہ گزارتی ہوں۔'' پھر ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کچھ سوچنے لگی ہو۔

''اچانک کہاں کھو گئیں؟'' انور پوچھ بیٹھا۔

''آں۔'' زنوبیا چونکی، پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''تم یہاں سے جلد از جلد واپس جانا چاہو گے نا؟''

''ظاہر ہے زنوبیا! میں اس ملک میں کیسے رہ سکتا ہوں؟''

''ہاں۔'' زنوبیا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''واپس تو جانا ہی پڑے گا تمہیں۔ میں تمہیں ایک ایسا راستہ بھی دکھا دوں گی کہ تم یہاں کی بارڈر پولیس کی نظر میں آئے بغیر اپنے ملک پہنچ جاؤ لیکن تمہیں ایک ہفتہ تو یہاں گزارنا ہی پڑے گا۔ تمہاری چوٹیں مندمل ہونے میں اتنا وقت تو لیں گی۔''

انور نے اثبات میں سر ہلایا، پھر بولا۔ ''میرے دوستوں نے ڈیڈی کو اطلاع تو دے دی ہوگی کہ میں غائب ہو گیا ہوں۔ وہ خاصے پریشان ہوں گے۔ میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے پاس موبائل تو ہوگا۔''

''ہاں، ہاں کرلو بات۔'' زنوبیا نے اپنے پرس سے موبائل نکالا۔

انور اس دوران میں دودھ کا آدھا گلاس ختم کر چکا تھا۔ وہ زنوبیا نے اس سے لے لیا۔ ''پہلے بات کرلو مگر...... انہیں بتاؤ گے کیا؟''

''یہی سوچ رہا ہوں۔ شدید الجھن ہے۔'' انور نے موبائل اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ''دوستوں نے تو انہیں یہی اطلاع دی ہوگی کہ میرا گھوڑا بدک کر کسی طرف بھاگ نکلا تھا اور......''

''ہاں...... میں نے تمہیں گھوڑے ہی سے گرتے دیکھا تھا۔ میں ابھی تک تم سے نہیں پوچھ سکی کہ تم گھوڑے پر تھے لیکن اس طرف کیسے آ نکلے؟''

''میں اپنے دوستوں کے ساتھ پہاڑی جنگل میں شکار کھیل رہا تھا۔'' انور نے جواب دیا اور مختصر سا واقعہ زنوبیا کو بتا دیا۔

''تو اب کیا بتاؤ گے اپنے ڈیڈی کو؟''

''یہی تو سوچ رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ سب کچھ سچ سچ بتا دوں۔''

''سچ سچ؟''

''ہاں اگر میں نے بتایا کہ اپنے ہی ملک میں کسی جگہ ہوں تو وہ فوراً میرے پاس پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ کوشش کیا، پہنچ ہی جائیں گے وہاں۔''

زنوبیا نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔

انور نے اپنے والد اشرف حسنین گل زاد سے رابطہ کیا۔ وہ انور کی آواز سنتے ہی چیخ پڑے۔ ''کہاں ہو؟ خیریت سے ہو؟''

''جی ہاں، میں......''

اشرف حسنین گل زاد اتنے مضطرب تھے کہ اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے بولے۔ ''تمہارے دوستوں سے معلوم ہوا تھا کہ تمہارا گھوڑا بدک کر بھاگا تو نہ جانے کہاں لے گیا۔ نہ گھوڑا ملا، نہ تم۔ میں اب پولیس سے رابطہ کرنے والا تھا۔''

''میرے بارے میں آپ سبھی کو صرف یہ بتائیے گا کہ میں جہاں بھی ہوں، خیریت سے ہوں۔''

''مگر کہاں ہو؟''

''یہی تو بتانے جا رہا تھا۔'' انور نے کہا اور پھر بے کم و کاست سب کچھ بتا دیا۔ حقیقت سن کر وہ پریشان ہوتے رہے۔ بیچ بیچ میں کوئی سوال بھی کر دیتے۔ سب کچھ سننے کے بعد بولے۔

''یہ لڑکی...... زنوبیا، کیا مکمل بھروسا ہے تمہیں اس پر؟''

''جی ہاں ڈیڈی...... آپ کو یاد تو ہوگا، جب آٹھ سال پہلے ہم یہاں رہتے تھے تو ہمارے پڑوس میں شاپور صاحب رہتے تھے۔ یہ انہی کی بیٹی ہیں۔''

''ہاں وہ تو مجھے یاد ہے۔ ان کے ساتھ پولو کھیلا کرتا تھا میں، یاد آ گیا، ان کی بیٹی کا نام زنوبیا تھا۔''

''جی، یہ وہی زنوبیا ہیں۔''

''واپس کیسے آؤ گے؟ کب آؤ گے؟''

''زخم ٹھیک ہونے میں ایک ہفتہ لگ سکتا ہے۔ اس کے بعد ہی واپس آسکوں گا۔ زنوبیا کی رہنمائی میں کسی محفوظ راستے سے واپس لوٹوں گا۔''

''ایک ہفتہ......! اتنے دن تک پریشان رہوں گا میں۔ مجھے روزانہ فون کرتے رہنا بیٹے!''

''جی، ضرور۔''

گفتگو ختم کرنے کے بعد انور نے زنوبیا کا موبائل

واپس کر دیا۔

☆☆☆

دن گزرتے رہے۔ زنوبیا نے انور کا ہر طرح پورا پورا خیال رکھا۔ اس کے اندازے کے مطابق ساتویں دن انور محسوس کر رہا تھا کہ وہ بالکل ٹھیک ہو چکا ہے۔

''اب مجھے جانا چاہیے زنوبیا!'' اس نے کہا۔ ''تم وعدہ کر چکی ہو کہ مجھے......''

''سب یاد ہے انور!'' زنوبیا نہ جانے کیوں افسردگی سے بولی۔ ''ایک بار پھر بچھڑنے کا وقت آ گیا۔''

''زنوبیا!'' انور نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''اگر دونوں ملکوں کی کشیدگی بڑھتی رہی تو شاید ہم پھر کبھی نہ مل سکیں لیکن تم مجھے ہمیشہ یاد رہو گی۔ ہاں اگر حالات کبھی ٹھیک ہو گئے تو میں پاسپورٹ کے ذریعے آؤں گا تم سے ملنے۔ تمہارا گھر اب بھی وہی ہے نا؟''

زنوبیا نے سر ہلایا، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی آئی جو انور کے خیال کے مطابق جبری تھی، وہ بولی۔ ''ہم آج رات کو یہاں سے روانہ ہوں گے۔ کھانا جلدی کھا لینا۔ اندھیرا پھیلتے ہی روانگی ہو گی۔''

''ٹھیک ہے۔''

پھر باقی دن اس طرح گزرا کہ زنوبیا نے بہت زیادہ وقت انور سے باتیں کرتے ہوئے گزارا۔ باتوں کے دوران میں وہ امرا القیس کے اشعار بھی سناتی رہی۔ دونوں ملکوں کے حالات پر بھی گفتگو ہوئی۔ زنوبیا کا خیال تھا کہ اب ان کی ملاقات پھر کبھی نہیں ہو گی کیونکہ دونوں ملکوں کی بڑھتی ہوئی کشیدگی میں اضافہ یقینی نظر آ رہا تھا جبکہ کشیدگی ختم ہونے کا امکان برائے نام ہی تھا۔

انور نے اس گفتگو میں زنوبیا کے دلی جذبات بھی پڑھ لیے۔ نتیجہ یہ کہ اس کے دل میں بھی زنوبیا کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو گیا۔ اس نے اپنے خیال کے مطابق زنوبیا کا دل رکھنے کے لیے کہا۔ ''کیسا عجیب اتفاق ہوا ہے کہ ہم آٹھ سال بعد حادثاتی طور پر ایک دوسرے سے ملے ہیں۔ کیا عجب کہ ایسا خوش گوار حادثہ دوبارہ بھی ہو جائے۔''

زنوبیا عجیب سے انداز میں ہنس پڑی اور اس نے کہا۔ ''بقول شاعر، دل کو بہلانے کی بات ہے۔ خیر! موبائل فون پر تو ہمارا رابطہ رہے گا۔ تم نے میرا نمبر تو ذہن نشین کر لیا ہے نا؟''

''خوب اچھی طرح۔'' انور نے کہا۔ ''اپنے پاس لکھ کر اس لیے نہیں رکھا کہ اگر یہاں سے جاتے وقت بارڈر پولیس کے ہاتھ لگ جاؤں تو انہیں میرے پاس سے وہ نمبر نہ مل سکے جو تمہارے لیے پریشانی کا سبب بنے۔''

''کوئی امکان نہیں ہے کہ تم بارڈر پولیس کے ہاتھ لگو۔'' زنوبیا نے کہا۔ ''میں اس وادی سے لے کر سرحد تک اس زمین کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ کچھ لوگ کن راستوں سے سرحد پار آتے جاتے رہتے ہیں۔'' زنوبیا کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا لیکن انور احتیاط برتنا چاہتا تھا۔

اس شام اندھیرا پھیلنے تک وہ دونوں کھانا کھا چکے تھے جس کے بعد روانگی تھی۔ انور کے لیے لباس کا بندوبست زنوبیا نے پہلے ہی دن کر دیا تھا۔ اس کا ملازم شہر جا کر وہ سب کچھ لے آیا تھا جو زنوبیا کے خیال کے مطابق انور کے لیے ضروری تھا۔

''ایک وعدہ کرو گے انور؟'' روانگی سے کچھ ہی لمحے پہلے زنوبیا نے کہا۔ ''میں تمہیں ایک لفافے میں بند کوئی چیز دینا چاہتی ہوں جو تم اپنے ملک میں پہنچنے سے پہلے نہیں دیکھو گے۔''

''ایسی کیا چیز ہے؟''

''اگر یہ بتانا ہوتا تو میں تم سے وعدہ کیوں لیتی؟''

''اچھا۔'' انور خفیف سا مسکرایا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں۔ لاؤ، کہاں ہے لفافہ؟''

''ابھی نہیں۔'' زنوبیا نے کہا۔ ''جب تم سرحد پر جدا ہو گے، تب دوں گی۔ چلو اب اٹھو۔''

انور کھڑا ہو گیا۔

روانگی زنوبیا کی کار میں ہوئی جو ریسٹ ہاؤس کے باہر کھڑی تھی۔ زنوبیا نے انور کو ڈرائیونگ سیٹ کے برابر میں بٹھایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا ملازم بھی ڈرائیونگ جانتا ہے لیکن میں عموماً خود ہی ڈرائیو کرتی ہوں۔''

''خود اعتمادی بہت ہے تم میں۔''

زنوبیا مسکرا کر رہ گئی۔

کار کے اس سفر میں انور نے دیکھا کہ وہ وادی کتنی خوب صورت تھی، لیکن کار کے سفر کے لیے خطرناک بھی! راستے ایسے تھے کہ ایک جانب کھائی اور دوسری جانب پہاڑ تھے۔ راستہ بھی اتنا چوڑا نہیں تھا کہ بہ یک وقت دو گاڑیوں سے زیادہ چل سکتیں۔ کار بلندی کی طرف جا رہی تھی۔

زنوبیا بولی۔ ''ایک امکان ہے کہ بارڈر پولیس کے لوگ دوربین سے ہر طرف کی نگرانی کرتے ہوئے یہ کار بھی

دیکھ لیں مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ میری کار پہچانتے ہیں۔ میری ہی کیا، وہ ان سبھی کاروں کو پہچانتے ہیں جو اس وادی میں آتی جاتی رہتی ہیں۔''

''تو وہ مجھے دیکھ سکتے ہیں تمہارے ساتھ بیٹھے ہوئے؟''

''ہاں دیکھ سکتے ہیں کہ میرے ساتھ کوئی ہے مگر انہیں یہ خیال تو نہیں آسکتا کہ تمہارا تعلق اس ملک سے نہیں۔''

انور اردگرد نظر دوڑانے لگا۔ اس نے وادی کے حسن کی تعریف کی۔ انہی باتوں میں کار کا سفر جاری رہا۔ آخر کار ایک جگہ روک دی گئی۔

''یہاں سے آگے کار لے جانا ممکن نہیں ہے۔'' زنوبیا نے کہا۔ ''ہم اب اس بلندی پر ہیں جہاں سے تم گرے تھے۔ اب ہمیں گھنے درختوں کے درمیان پیدل چلنا ہوگا۔''

جس جگہ کار روکی گئی تھی، وہاں اسے دوربین سے بھی نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔

کار سے اُتر کر انور نے کہا۔ ''تم کتنا پیدل چل سکتی ہو؟''

''زیادہ نہیں چلنا ہے۔ پندرہ بیس منٹ بعد تم سرحد پر ہوگے جہاں سے آگے صرف تم جاؤ گے۔ میں تم سے جدا ہو جاؤں گی۔'' آخری فقرہ کہتے ہوئے زنوبیا کی آواز بھرّا گئی تھی۔

انور نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

ان دونوں نے گھنے جنگل میں آگے بڑھنا شروع کیا۔ انور کے لیے اب تک کوئی خطرہ سامنے نہیں آیا تھا۔ زنوبیا کی یہ بات درست ہی ثابت ہو رہی تھی کہ وہ انور کو کسی خطرے سے دوچار نہیں ہونے دے گی اور وہ سرحد پار اپنے ملک میں پہنچ جائے گا۔

آخر زنوبیا ایک جگہ رک گئی۔

''اب آگے صرف تم جاؤ گے۔'' وہ بولی۔ ''پانچ منٹ بعد تم اپنے ملک کی سرحد پر ہوگے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ اپنے ملک کی سرحد کے نگراں فوجیوں کی نظر سے کس طرح بچوگے۔ اگر نہ بچ سکے تو بھی پریشانی وقتی ہوگی۔ پوچھ گچھ کے بعد تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ اس کا امکان بہرحال کم ہے کہ تم کسی پریشانی میں پڑو، میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ اس راستے سے لوگ اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔''

''ہوں۔'' انور خفیف سا مسکرایا۔ اندھیرے میں اس کی مسکراہٹ زنوبیا نہیں دیکھ سکی ہوگی۔ درختوں کی بہتات کے باعث تاریکی اتنی ہی گہری تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو ہیولوں کی طرح ہی دیکھ سکتے تھے۔

''تو اب میں تمہیں الوداع کہوں۔'' وہ ایک لمحہ رک کر بولا۔

''ہاں۔'' زنوبیا کی آواز بھرا گئی اور اس نے ایک لفافہ انور کی طرف بڑھایا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ......''

''مجھے یاد ہے۔'' انور نے لفافہ لیتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے ملک میں پہنچنے کے بعد ہی دیکھوں گا کہ اس میں کیا ہے۔''

''الوداع انور!''

''تم اس اندھیرے میں اکیلی واپس جاؤ گی۔ ڈر نہیں لگے گا تمہیں؟''

''نہیں۔ میں کئی بار یہاں تک آچکی ہوں۔ بس دیکھنے کے لیے۔ لوگوں سے سنا تھا کہ لوگ یہاں سے سرحد کے پار آتے جاتے رہتے ہیں۔''

''تو اب میں بھی جاؤں؟''

''میں تمہیں الوداع کہہ چکی ہوں۔''

''الوداع زنوبیا!'' انور نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ اس وقت اسے پہلی بار اپنے قدم بوجھل ہوتے محسوس ہوئے۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ زنوبیا اس وقت تک اس کی طرف دیکھتی رہے گی جب تک اس کا ہیولا اندھیرے میں مدغم نہیں ہوجائے گا۔

☆☆☆

دوسرے دن انور اپنے گھر پہنچ گیا۔ سرحد کے ایک قریبی شہر سے اس نے فلائٹ لی تھی۔ ٹکٹ کے لیے اس کے پاس ڈالر تھے جو اسے زنوبیا نے دیے تھے۔

''یہ قرض سمجھ کر لے لو۔ اپنے ملک سے تمہیں جب بھی موقع ملے، کسی طرح واپس بھجوا دینا۔ میں نہیں چاہتی کہ تم اسے میرا احسان سمجھو۔''

حالانکہ جو دن اس نے زنوبیا کے ریسٹ ہاؤس میں گزارے تھے وہ بھی اس پر زنوبیا کا احسان ہی تھے۔

اپنے گھر پہنچنے سے پہلے ہی انور فلائٹ میں وہ لفافہ کھول کر دیکھ چکا تھا اور اس میں اسے زنوبیا کے ''محبت نامے'' ہی کی امید تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

''انور! میں اتنے دنوں میں بھی تم سے براہِ راست وہ بات نہیں کہہ سکی جو لکھ رہی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم نے ان دنوں میں خود بھی سمجھ لیا ہوگا۔ آئی لو یو انور! لو یو ٹو مچ! اور یہ

اس اتفاقی ملاقات کے موقع پر نہیں ہوا۔ یہ محبت تو میں آٹھ سال سے اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہوں۔ جب تم میرے ملک میں رہتے تھے، تبھی میں تمہیں پسند کرنے لگی تھی۔ اپنی محبت کی شدت کا احساس مجھے اس دن ہوا تھا جب تم میرا ملک چھوڑ کر جا رہے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ان آٹھ سالوں میں کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا ہوگا جب تم میری یاد کے پردے پر نہ جھلملائے ہو۔ ذرا بھی امید نہیں تھی کہ تمہیں پھر کبھی دیکھ سکوں گی لیکن آٹھ سال بعد شاید میری محبت ہی تمہیں حادثاتی طور پر یہاں کھینچ لائی۔ یقین کرو، جب تم بے ہوشی کی حالت میں ملے تھے اور میں نے تمہیں پہچانا تھا تو میری آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آگئے تھے لیکن اس مرتبہ یہ خوشی کے آنسو تھے پھر ان چند دنوں میں مجھے یہ درد بھی رہا کہ تم پھر بچھڑ جاؤ گے۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ اگر تم نے اپنے وعدے کے مطابق مجھے فون کیا تو میں خوش ہو جاؤں گی کہ تمہارے دل میں بھی میرے لیے تھوڑی بہت جگہ ہے۔ میں بہت بے چینی سے تمہاری کال کا انتظار کروں گی۔ کرو گے نا فون؟ یہ اندازہ تو ہے کہ میں اب تمہیں کبھی نہیں پا سکوں گی، پھر کبھی ایسا خوش گوار حادثہ نہیں ہوگا لیکن یہ بھی میرے لیے بہت ہے کہ تم سے کبھی کبھی بات ہو جایا کرے۔ تم اس کاغذ پر کچھ دھبے دیکھ رہے ہو گے۔ یہ میرے آنسو ہیں انور جو یہ خط لکھتے ہوئے میری آنکھوں سے ٹپک رہے ہیں۔ کیا تمہارے دل میں ان آنسوؤں کی قدر ہوگی؟ تم مجھے فون کرو گے نا انور! کرو گے نا؟...... محبت کے معاملے میں بدنصیب، زنوبیا۔''

اس خط کو پڑھتے ہوئے انور بھی جذباتی ہو گیا تھا۔ اس وقت اس کے جو احساسات تھے، ان کی ترجمانی وہ خود بھی نہیں کر سکتا تھا۔ آٹھ سال تک وہ اس بات سے بے خبر رہا کہ ایک خوب صورت لڑکی اس کی محبت میں تڑپتی رہی تھی۔

انور گھر پہنچا تو اس کے والد نے اسے سینے سے لگا لیا۔ خوشی کے آنسو ان کی آنکھوں میں بھی آگئے تھے۔ اس کے بہن بھائی یا والدہ نہیں تھے ورنہ ان کی بھی یہی حالت ہوتی۔ اس کے والد نے اسی وقت کہا کہ بیٹا مل جانے کی خوشی میں وہ اسی رات جشن منائیں گے جس میں تمام جاننے والوں کو مدعو کیا جائے گا پھر انہوں نے اس سے کہا کہ وہ اپنے کمرے میں جا کر آرام کرے۔

اپنے کمرے میں آکر بستر پر لیٹتے ہی اس نے اپنا موبائل نکالا لیکن فوری طور پر زنوبیا کا نمبر نہیں ملا سکا۔ طیارے میں بیٹھنے سے پہلے بھی اس کی خواہش تھی کہ زنوبیا کو فون کرے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ وہ زنوبیا سے کیا کہے گا اور اب بھی اس کی یہی کیفیت تھی۔ آخر چند منٹ بعد اس نے نمبر ملا ہی لیا۔

دوسری طرف گھنٹی بجی اور فوراً ہی کال ریسیو کی گئی۔

''انور! انور!...... مجھے یقین ہے کہ تم ہی ہو...... مجھے......'' زنوبیا یکایک ہانپنے لگی۔ وہ بالکل ہذیانی انداز میں بولی تھی۔

''ہاں زنوبیا! میں ہی بول رہا ہوں۔'' انور کی آواز میں ایسی لرزش تھی جیسے وہ بھی جذباتی ہو گیا ہو۔

''خیریت سے پہنچ گئے تھے نا؟ گھر سے ہی بول رہے ہو؟ میں تو رات سے جاگ رہی ہوں۔ انتظار کرتی رہی تمہارے فون کا...... اس وقت میری آنکھیں خوشی سے بھیگ گئی ہیں انور! مجھے لگتا ہے، میں خوشی سے پاگل ہو جاؤں گی۔ آٹھ سال بعد تم سے ملی اور اب تمہاری آواز سن رہی ہوں۔ تم نے میرا خط پڑھ کر کیا محسوس کیا۔ میں بس یہی سوچتی رہی اور......''

''سانس تو لے لو زنوبی!'' انور نے اس کی بات کاٹ دی ورنہ وہ نہ جانے کیا کیا بولتی رہتی۔ انور کے ٹوکنے پر وہ ہنسی۔ ہنسنے کا انداز بھی پاگلوں جیسا تھا۔

''زنوبی کہا تم نے۔'' وہ بولی۔ ''بہت اچھا لگا انور...... بہت اچھا لگا۔''

''تھوڑا سا پانی پی لو۔ اپنی وحشت پر قابو پاؤ۔''

''تمہاری آواز سن کر میری بھوک پیاس سب اُڑ چکی ہے۔''

''میری بات مانو! پانی پی لو۔''

''اچھا، ہولڈ کرنا۔ لائن ڈس کنیکٹ نہ ہو۔''

''میں ہولڈ کیے ہوئے ہوں زنوبی۔''

''اچھا، اچھا۔'' دوسری طرف ایک منٹ کے لیے خاموشی چھا گئی، پھر زنوبیا کے ہنسنے کی آواز آئی۔ ''پی لیا پانی۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ٹھیک کیا۔ اب تمہاری آواز صاف ہو گئی۔ ہانپ رہی تھیں اور بولے جا رہی تھیں۔''

''میرے سوال کا جواب نہیں دیا تم نے؟''

''تم نے تو ایک سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ کس سوال کا جواب دوں؟''

''میرا خط پڑھ کر کیا محسوس کیا تم نے؟''

''شرمندہ ہوا کہ ایک خوب صورت لڑکی مجھے آٹھ

سال تک اپنے دل میں بسائے رہی اور میں بے خبر رہا۔''
''خوب صورت ہوں میں؟'' وہ زور سے ہنسی۔
''اس سے زیادہ خوب صورت کون ہو سکتا ہے جو مجھے چاہتا ہو۔''
''واہ!'' وہ پھر ہنسی۔ ''جو لڑکی بھی تمہیں چاہے گی، اسے خوب صورت کہو گے؟''
اب انور کو ہنس کر چپ ہو جانا پڑا۔ زنوبیا نے بات ہی ایسی کہی تھی جس کا جواب نہیں دیا جا سکتا تھا۔
''تمہارے پاس کمپیوٹر، مائک اور کیمرا تو ہوگا؟''
''یقیناً۔''
''میرے پاس بھی ہے۔ اب اسی پر بات کرو۔ میں تمہیں دیکھ سکوں گی، تم مجھے دیکھ سکو گے۔ یہاں تو میرے پاس کمپیوٹر نہیں ہے۔ میں یہاں لیپ ٹاپ اس لیے نہیں لاتی کہ ساری توجہ مصوری پر رہے۔ اب میں کل ہی یہاں سے گھر روانہ ہو جاؤں گی۔ کل تم مجھ سے اسکائپ پر بات کرنا۔''
اس کے بعد بھی زنوبیا بہت سی باتیں کرتی رہی۔ آٹھ سال پہلے کے بہت سے خوش گوار واقعات سناتی رہی۔ وہ واقعہ بھی جس کی وجہ سے اس کے دل میں انور کے لیے پسندیدگی کا جذبہ پیدا ہوا تھا جو بہت تیزی سے بڑھتے ہوئے محبت میں تبدیل ہو گیا۔
زنوبیا نے لفظ ''محبت'' استعمال کیا تھا لیکن انور نے محسوس کیا تھا کہ زنوبیا اس سے ''عشق'' کرنے لگی تھی۔ کسی دور چلے جانے والے کو آٹھ سال تک دل میں بسائے رکھنا، پھر ملنے پر خوشی اور دوبارہ بچھڑنے پر آنکھوں میں آنسو صرف محبت کی نہیں، عشق کی علامت تھے۔
وقت گزرتا رہا۔ زنوبیا اپنی اور انور اپنی زندگی کے مراحل طے کرتا رہا۔ ان دونوں میں ''اسکائپ'' کے ذریعے باتیں ہوتی رہیں، وہ اسکرین پر ایک دوسرے کو دیکھتے بھی رہے۔ وقت بھی طے تھا کہ رات کو وہ کس وقت بات کریں گے۔
کسی کی محبت فریق ثانی کے دل میں بھی محبت کا بیج ڈال دیتی ہے۔ ایسا ہی انور کے ساتھ بھی ہوا۔ اس کے دل میں بھی زنوبیا کے لیے جذبات شدت اختیار کرتے چلے گئے۔ زنوبیا کی طرح وہ بھی محسوس کرنے لگا کہ زنوبیا کے علاوہ کسی اور لڑکی کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی اب اس کے لیے ناممکن ہو چکا ہے اور زنوبیا تو آٹھ سال سے اس کے فراق میں تھی۔
محبتوں میں کوئی سرحد نہیں ہوتی مگر ان کے ملکوں میں تو سرحد تھی۔ حکومتوں کی کشیدگی بڑھنے کے بعد ویزے کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ نہ زنوبیا، انور سے ملنے آ سکتی تھی اور نہ وہ اس سے ملنے جا سکتا تھا۔
پھر کیا ہوگا؟
ان دونوں کی محبت کب تک رنگ لائے گی؟
اس بارے میں دونوں ہی کرب کا شکار تھے۔ دونوں ملکوں کے حالات کی بڑھتی ہوئی سنگینی کے باعث ان کی یہ امید دم توڑتی جا رہی تھی کہ وہ کبھی ایک دوسرے سے مل سکیں گے۔ دونوں عہد کر چکے تھے کہ ان کی زندگی اگر ساتھ نہ گزر سکی تو تنہا گزرے گی۔
انور ایک تجارت پیشہ شخص کا بیٹا تھا لیکن اس کا رجحان فوج کی طرف تھا۔ باپ نے بھی اس کی خواہش نظرانداز نہیں کی۔ وہ فوج میں ہو گیا۔ اس نے زنوبیا کو اس بات سے آگاہ نہیں کیا۔ اسے اندیشہ تھا کہ زنوبیا اس کی مخالفت کرے گی تو وہ اس کے سامنے بے بس ہو جائے گا اور زنوبیا سے جھوٹ بولنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔
کئی سال گزر گئے۔ انور فوج میں کیپٹن بن چکا تھا۔ دونوں ملکوں کی کشیدگی اب اتنی بڑھ چکی تھی کہ شاید ہی کوئی دن جاتا ہو جب کنٹرول لائن پر دونوں طرف سے ایک شدید جھڑپ نہ ہو جاتی ہو۔
عام لوگوں کو تعجب تھا کہ اتنے عرصے کی کشیدگی اور بڑھتی ہوئی کشیدگی کے باوجود دونوں ملکوں میں جنگ نہیں ہوئی تھی، بس جھڑپوں میں شدت آتی چلی گئی تھی۔
اس کا سبب یہ تھا کہ دو بڑی طاقتیں تو ان کو باقاعدہ جنگ کے شعلوں میں دھکیلنا چاہتی تھیں لیکن دنیا کے دیگر بڑے ممالک اس کے خلاف تھے۔ ان کی سفارتی سرگرمیوں کے باعث باقاعدہ جنگ نہیں چھڑی تھی لیکن سرحد پر روزانہ ہی دونوں ملکوں کے کچھ فوجیوں کی ہلاکتیں ہونے لگی تھیں۔ کبھی کبھی سرحد کے قریب غریب لوگوں کی بستیاں بھی گولوں کی زد میں آ جاتیں۔ دونوں ہی ملک اس کا الزام ایک دوسرے پر لگاتے۔
ایک وقت آیا جب انور کو بھی سرحد پر جانا پڑا۔ وہ لیپ ٹاپ ساتھ لے گیا تاکہ زنوبیا سے رابطہ قائم رہ سکے لیکن اس کا امکان تھا کہ اگر وہ کسی بڑی جھڑپ میں انگیج ہو گیا تو لیپ ٹاپ کا استعمال نہیں کر سکے گا اس لیے اس نے ایک نہایت قیمتی اسمارٹ موبائل بھی اپنے ساتھ رکھا۔ اس پر بھی وہ دونوں ایک دوسرے سے بات کر سکتے تھے اور ایک

دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔

اسکائپ کے بجائے موبائل؟

اس بارے میں انور نے ایک بہانہ سوچ لیا تھا۔

جب اسے سرحد پر بھیجا گیا تو اس نے محسوس کیا کہ معاملہ کسی چوکی کی حفاظت کا نہیں تھا۔ کوئی زیادہ بڑی بات ہونے والی تھی ورنہ پورے ایک بریگیڈ کی سرحد پر تعیناتی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سارا علاقہ پہاڑی تھا لیکن کہیں کہیں خودرو پودے بھی تھے۔

☆☆☆

ایک شام بریگیڈیئر شمس نے انور کو اپنے خیمے میں طلب کیا۔ تنہائی میں وہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ انور نے بریگیڈیئر کو خاصا متفکر پایا۔ انور کو بلانے کے بعد بھی وہ فوراً کچھ نہیں بولا۔ اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ کچھ لمحوں بعد انور کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں نے تمہیں ایک ایسے کام کے لیے بلایا ہے جو بہت اہم ہے، بہت ضروری ہے اور چوبیس سے چھتیس گھنٹوں کے اندر ہو جانا چاہیے۔ کام بھی ایسا ہے جسے کوئی اکیلا آدمی ہی کر سکتا ہے۔''

''سر!''

''مجھے تمہارے بارے میں رپورٹ ملی تھی کہ تم غیر معمولی طور پر پھرتیلے، بہترین نشانے باز اور تیزی سے فیصلہ کر کے قدم اٹھانے کی صلاحیت رکھتے ہو۔ اسی لیے میں نے اس کام کے لیے تمہارا انتخاب کیا ہے۔''

''کسی اہم کام کے لیے میرا انتخاب میرے لیے اعزاز ہے سر!''

بریگیڈیئر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ اب تک ان میں جو باتیں ہوئی تھیں، وہ بھی کھڑے کھڑے ہوئی تھیں۔ انور خاموشی سے بریگیڈیئر کے مزید بولنے کا منتظر رہا۔ اس کی نگاہیں بریگیڈیئر کے ٹہلنے کے ساتھ متحرک تھیں۔

''آج کے دور میں جبکہ سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے، یہ کام کسی آدمی سے لینا بہت عجیب سا ہے۔ کسی تک کوئی پیغام پہنچانے کے لیے بعض اوقات کچھ ایسی صورتِ حال بن جاتی ہے کہ وائرلیس یا موبائل فون کا استعمال مخدوش ہو جاتا ہے۔ تمہیں وہ پیغام ہی یہاں سے بیس میل دور کسی جگہ پہنچانا ہے۔''

''میں تیار ہوں سر! آپ مجھے بتائیے۔''

''تمہیں یہاں سے جنوب کی طرف لگ بھگ بیس میل دور جانا ہوگا۔ دو میل کے بعد تم دشمن کی سرحد میں داخل ہو چکے ہو گے۔ اس کے بعد تمہیں یہ احتیاط کرنی پڑے گی کہ تم کسی کی نظر میں نہ آسکو۔ اس راہ میں دو بستیاں بھی پڑیں گی۔ تمہیں ان سے بھی بچ کر نکلنا ہوگا۔ تمہیں تیسری بستی تک پہنچنا ہے۔ اس کی شناخت بہت آسان ہے۔ بہت بڑا گرجا ہے وہاں جو دور سے ہی نظر آجائے گا۔ باقی دونوں بستیوں میں تو کوئی گرجا سرے سے ہے ہی نہیں۔ پوری توجہ سے سُن رہے ہو نا؟''

''سر!'' انور نے جواب دیا۔ ''آپ کا ایک ایک لفظ میرے دماغ پر نقش ہوتا جا رہا ہے۔ آپ چاہیں تو مجھ سے سن لیں۔ آپ کی ساری باتیں لفظ بہ لفظ دہرا دوں گا۔''

''لفظ بہ لفظ؟'' بریگیڈیئر شمس کو حیرت ہوئی تھی۔

''جی سر۔''

''سناؤ۔''

انور نے بولنا شروع کیا اور بریگیڈیئر کا منہ حیرت سے کھلتا چلا گیا اور جب انور چپ ہوا تو بریگیڈیئر کے چہرے سے پہلی مرتبہ تفکر کے آثار غائب ہوئے اور ان کی جگہ کسی حد تک مسرت نے لے لی۔

''حیرت انگیز یادداشت۔'' وہ بولا۔ ''مجھے خود یاد نہیں کہ میں نے کیا لفظ استعمال کیے تھے لیکن یہ جانتا ہوں کہ میں نے یہی سب کچھ کہا تھا۔ تمہاری یہ صلاحیت تو میرے لیے بہت ہی مفید ہے۔ جو پیغام مجھے تحریری طور پر بھیجنا تھا، وہ اب تم ذہن نشین کر لینا تاکہ اگر کسی خطرے میں پڑو اور دشمن کے ہاتھ لگ جاؤ تو وہ پیغام دشمن کے ہاتھ نہ لگ سکے۔''

''کتنا بڑا پیغام ہے سر؟''

''تم نے میری جتنی باتیں دہرائی ہیں، اس سے کچھ زیادہ ہے۔ وہ میں لکھ بھی چکا ہوں جواب تمہیں پڑھوا دوں گا۔''

''وہ پیغام مجھے گرجا والی بستی میں کسے پہنچانا ہے سر؟''

''گرجا کے پادری سیموئل کو۔'' بریگیڈیئر نے جواب دیا۔ ''دراصل وہ ہماری فوج کی ایک ایجنسی کا جاسوس ہے۔ کرسچیانٹی پر اسے عبور حاصل ہے اس لیے وہاں کا پادری بننا اس کے لیے بہت زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔''

''اس کا اصل نام کچھ اور ہوگا لیکن میں یہی پوچھوں گا سر کہ پادری سیموئل کیا گرجا ہی میں ملے گا؟''

''ہاں، وہیں ملے گا۔ اب تم یہ پیغام دیکھ لو۔'' اس نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر انور کی طرف بڑھایا۔

انور نے وہ سطریں دو بار پڑھیں اور کاغذ بریگیڈیئر کو واپس کر دیا۔

''یاد ہو گیا تمہیں؟'' بریگیڈیئر نے پوچھا۔

''یس سر!''

''سناؤ۔''

انور نے بولنا شروع کیا۔ بریگیڈیئر کی نظریں اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ پر جمی ہوئی تھیں۔ انور کے خاموش ہوتے ہی وہ مسکرایا۔

''شاندار۔'' اس نے کہا۔ ''اب مجھے یقین کرنا پڑے گا کہ تم نے میری جو باتیں دہرائی تھیں، وہ یقیناً لفظ بہ لفظ دہرائی ہوں گی۔ اب ایک بات اور سنو! ہوسکتا ہے تمہیں سیموئل سے رابطہ کرنے میں دشواری ہو۔ ایسی صورت میں برگنزا سے مل لینا۔ اس کا گھر گرجا کے قریب ہی ہے۔ سرخ اینٹوں کا دو کمروں کا معمولی مکان۔ سرخ اینٹوں کا وہاں کوئی مکان نہیں ہے۔ برگنزا سے تمہیں صرف ''آپریشن بلو'' کہنا ہوگا۔ یہ کوڈ ورڈ ہے۔ وہ تمہاری ہر ہدایت پر عمل کرے گا۔''

''میں سمجھ گیا، اب اگر آپ پوچھنے کی اجازت دیں تو میں جاننا چاہوں گا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ پیغام سے میں نے یہ تو سمجھ لیا ہے کہ بہت سنگین صورتِ حال ہے لیکن میں وضاحت سے سمجھنا چاہتا ہوں اگر آپ مناسب سمجھیں۔''

''میں بتاتا ہوں تمہیں۔'' بریگیڈیئر نے قریب آکر انور کا شانہ تھپکا۔ ''دراصل گزشتہ دنوں دشمن نے ہماری تین چوکیوں پر قبضہ کرلیا ہے۔ اس سلسلے میں بین الاقوامی سطح پر شور مچانے اور احتجاج کرنے سے بھی معاملہ بدستور ہے لہٰذا حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کا بڑا بھرپور جواب دیا جائے گا۔ ہمیں دشمن کی کسی چوکی پر نہیں بلکہ اس کے ایک چھوٹے سے شہر پر قبضہ کرنا ہے۔ اس کے لیے جو منصوبہ بنایا گیا ہے، اس کے مطابق ہمارے بریگیڈ کے علاوہ ایک اور بریگیڈ شمال میں اس بستی سے چند میل دور ہے۔ پادری سیموئل وہ پیغام اس بریگیڈ تک پہنچا دے گا۔ اسے تم یہ پیغام لکھ کر دو گے۔ وہ تمہاری طرح اسے لفظ بہ لفظ یاد نہیں رکھ سکتا اور یہ ضروری ہے کہ پیغام لفظ بہ لفظ اس بریگیڈ تک پہنچے۔ یہ اشاراتی زبان ہے جس میں ایک لفظ کی غلطی بھی سارا معاملہ خراب کرسکتی ہے۔ وہ بریگیڈ اور ہمارا بریگیڈ مخصوص اوقات میں مخصوص سمتوں سے ایڈوانس کریں گے اور اس شہر پر قبضہ کرنے کے لیے ہمیں کچھ زیادہ قربانیاں بھی دینی پڑیں گی۔ ہمیں اپنی فتح کا مکمل یقین ہے۔''

''معاف کیجیے گا سر! کیا میں اس سلسلے میں اپنی کچھ تشفی کرلوں؟''

''ہاں، ہاں، پوچھو کیپٹن۔''

''چوکیوں پر قبضہ کرنا کوئی بہت بڑا معاملہ نہیں لیکن شہر پر قبضے کی صورت میں تو معاملہ بہت خراب ہوجائے گا۔ دونوں ملکوں میں باقاعدہ جنگ بھی چھڑ سکتی ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوتا کہ ہم اپنی ان چوکیوں ہی کو دشمن سے واپس لینے کی منصوبہ بندی کرتے؟''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ہمیں تو وہ کرنا ہے جس کا ہمیں حکم ملا ہے۔ یہ فیصلہ سول ملٹری اجلاس میں ہوا تھا۔ اس کا کوئی سیاسی پہلو ہے تو وہ ہماری حکومت ہی جانتی ہوگی اور اگر اس کے نتیجے میں باقاعدہ جنگ چھڑ سکتی ہے یا نہیں، یا اس کے کیا نتائج مرتب ہوسکتے ہیں، اس کی ذمے داری بھی حکومت پر ہے۔ ہمیں تو بس وہ کرنا ہے جس کا ہمیں حکم ملا ہے۔ بس، اب مزید کوئی سوال نہیں کرنا۔''

''اب کوئی سوال میرے ذہن میں نہیں ہے سر! ہاں ایک سوال ہے تو سہی لیکن اس کا جواب بھی ہے۔ یقیناً جی ایچ کیو اس سارے معاملے میں آپ سے رابطے میں ہوگا۔''

بریگیڈیئر خفیف سا مسکرا دیا لیکن کچھ بولا نہیں۔

''غالباً مجھے ابھی روانہ ہوجانا چاہیے؟'' انور بولا۔

''یقیناً۔'' بریگیڈیئر نے جواب دیا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ چوبیس سے چھتیس گھنٹوں میں یہ پیغام منزل تک پہنچ جانا چاہیے اور اس میں سے وہ وقت کم ہوچکا ہے جتنی دیر ہماری یہ باتیں ہوئی ہیں، اتنا اور کہوں گا کہ تمہیں اس سلسلے میں جو بھی تیاری کرنی ہے، خود ہی کرنی ہے۔ مجھے کوئی سروکار نہیں کہ تم کیا طریقہ اپناؤ گے، کس قسم کا لباس پہنو گے، کس قسم کے ہتھیار ساتھ لے جاؤ گے، وغیرہ وغیرہ۔''

انور اجازت لے کر اپنے خیمے میں آیا۔ سب سے پہلے اس نے زنوبیا سے موبائل فون پر رابطہ کیا حالانکہ دو گھنٹے پہلے وہ بات کرچکا تھا۔

''خیریت؟'' زنوبیا کے لہجے میں تشویش تھی۔ ''اتنی جلدی دوبارہ فون تم نے کبھی نہیں کیا۔''

''خیریت ہے زنوبیا!'' انور نے کہا۔ ''میں تمہیں یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ آئندہ چھتیس گھنٹے ایسے ہیں کہ مجھے مستقل ڈیڈی کے ساتھ رہنا ہے۔ ان کے سامنے میں تمہیں فون نہیں کرسکتا، نہ تم مجھے فون کرنا۔''

''اچھا ہوا تم نے مجھے بتادیا۔ کوئی ایمرجنسی ہے تو پھر ٹھیک ہے لیکن چھتیس گھنٹے بعد فون ضرور کرنا۔ مجھ سے تو بارہ پندرہ گھنٹے کا انتظار بھی نہیں ہوتا۔''

اس گفتگو کے بعد انور نے اپنی وردی کے اوپر ہی دیہاتیوں جیسا سادہ لباس پہنا۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ اس لیے کمبل بھی اوڑھا۔ ایک نائٹ وژن دوربین لی جو لباس میں چھپائی جاسکتی تھی۔ ہتھیاروں میں اس نے بریٹا کا نائن ایم ایم پسٹل منتخب کیا جس کی بیرل تین اعشاریہ زیرو سات اور اوورال ہائٹ چار اعشاریہ سات جس میں چھ راؤنڈ ہوتے ہیں۔ انور نے پسٹل بھر کر چھ اضافی راؤنڈ بھی لیے۔ زیادہ اسلحہ وہ اس لیے نہیں لے جاسکتا تھا کہ ساتھ میں خورونوش کا سامان بھی تھا۔ ویسے بھی بڑا ہتھیار پوشیدہ نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ دیہاتی لباس کا انتخاب اسے اس لیے کرنا پڑا کہ راہ میں پڑنے والی بستیوں کے کسی شخص سے آمنا سامنا ہوجائے تو کوئی پریشانی نہ ہو۔

لباس کے لیے اسے قریب کی ایک دیہی بستی تک جانا پڑا تھا اس لیے ساری تیاری میں ڈھائی گھنٹے گزر گئے جب وہ اپنی مہم پر روانہ ہوا تو پیغام پہنچانے کے لیے اس کے پاس تینتیس گھنٹے تھے۔

اس کے قریبی ساتھیوں نے اس کی تیاریوں کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پوچھ بیٹھے کہ کیا بی ایس ایچ صاحب کسی خفیہ مہم پر بھیج رہے ہیں؟

سارے بریگیڈ میں بریگیڈیئر شمس کو ''بی ایس ایچ'' کہا جاتا تھا۔

انور نے انہیں کوئی واضح جواب دینے کے بجائے ''اشارتاً'' کہہ دیا تھا کہ ان کی قیاس آرائی غلط نہیں۔

جب وہ تاریک سنگلاخ راستوں پر روانہ ہوا تو اس کے دیہی لباس کے نیچے فوجی وردی تو تھی لیکن پیروں میں فوجی جوتوں کے بجائے چپلیں تھیں۔ دیہی لباس کے ساتھ بوٹ پہننا مضحکہ خیز بات ہوتی اور بھیس بدلنا بے معنی ہو جاتا۔

موسم زیادہ سرد تو نہیں تھا لیکن اتنی ٹھنڈک ضرور تھی کہ کمبل اوڑھنا بے جواز نہیں تھا۔ سر پر اس نے مفلر بھی لپیٹ لیا تھا جو خاصا پرانا تھا۔

دو میل کے بعد اسے سرحد عبور کرنے کے لیے کوئی کانٹوں دار باڑھ عبور نہیں کرنی پڑی۔ البتہ وہاں پہرے داروں کی نظروں سے بچنے کے لیے احتیاط تو کرنا ہی پڑی۔ رات کی تاریکی بھی اس کی مددگار تھی۔ آسمان پر بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رواں دواں تھے۔ جب چاند کسی ٹکڑے کی آڑ میں چھپ جاتا تو وہ رینگتا ہوا آگے بڑھتا اور جب چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آتا تو وہ بے حس وحرکت ہوجاتا۔ تقریباً ایک میل تک وہ رینگتا ہوا ہی آگے بڑھا۔ اس مہم کے لیے اس نے لباس بھی ایسا منتخب کیا تھا جو مٹیالے رنگ کا بلکہ سیاہی مائل تھا۔

رینگنے کے بعد سیدھا کھڑا ہونے سے پہلے اس نے نائٹ وژن دوربین سے اطراف کا جائزہ لیا اور مطمئن ہونے کے بعد سیدھا کھڑا ہوا تھا۔

رات اپنے تیسرے پہر میں داخل ہوچکی تھی جب وہ ایک بستی کے قریب سے گزرا۔ اسے بریگیڈیئر شمس سے اس علاقے کا ہاتھ سے بنا ہوا ایک نقشہ بھی ملا تھا جس کے مطابق دوسری بستی تک وہ اس وقت پہنچتا جب دن کی روشنی پھیل چکی ہوتی۔ انور نے فیصلہ کیا تھا کہ سارا دن وہ کسی ٹیلے یا کسی بھی مناسب جگہ پر چھپا رہے گا۔ ویسے بھی رات بھر کے اس کٹھن سفر کے بعد اسے آرام کی ضرورت تھی۔

لیکن جب صبح ہوئی تو اسے کسی بستی کا نام ونشان تک نظر نہیں آیا۔ اس سے اس نے یہ نتیجہ خذ کیا کہ رات بھر میں اس نے جو سفر کیا تھا، وہ اس کے اندازے سے کم ہوسکا تھا۔ گویا اب رات کو جب وہ دوبارہ آگے بڑھنا شروع کرتا، تبھی اس بستی کے قریب سے گزرتا۔ دن میں سفر کرنا اس کے لیے مخدوش بھی ثابت ہوسکتا تھا۔

پہاڑی علاقے کے اس حصے میں کہیں کہیں گھاس بھی تھی لیکن انور نے دن گزارنے کے لیے جس جگہ کا انتخاب کیا، وہ نہایت پتھریلی تھی اور ہموار بھی نہیں تھی۔ وہاں لیٹ کر جسم کو مکمل آرام نہیں دیا جاسکتا تھا لیکن انور کے خیال کے مطابق وہ بہت محفوظ جگہ تھی۔ آس پاس سے کسی دیہاتی کا گزر ہوتا بھی تو وہ اس کی نظر میں نہیں آتا۔

کچھ کھا پی کر انور وہیں لیٹ گیا۔ آرام دہ جگہ نہ ہونے کے باوجود اسے آدھے گھنٹے میں نیند آگئی۔

پھر کسی قسم کی آوازیں تھیں یا کوئی اور بات کہ اس کی آنکھ کھلی۔ آنکھ کھلی اور چندھیا گئی کیونکہ سورج سر پر آچکا تھا۔ تیز دھوپ سے ہی اس کی آنکھیں چندھیائی تھیں۔ اس نے بکریوں کے ممیانے کی آوازیں سنیں۔ وہ اٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملنے لگا۔

''کدھر کا ہے بابے!'' بھاری بھرکم سی نسوانی آواز سنائی دی۔

انور نے چونک کر آنکھوں سے ہاتھ اٹھائے۔ وہ

قریب ہی کھڑی تھی جس نے غالباً اسی سے پوچھا تھا۔ وہاں کوئی اور تو تھا نہیں۔
اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ جسم خاصا بھاری ہو گیا تھا۔ اسی بھاری پن نے چہرے پر بھی اثر ڈالا تھا۔ ورنہ شاید اسے قبول صورت کہا جا سکتا۔ کھلتی ہوئی سانولی رنگت تھی۔ جسم پر رنگین لہنگا اور چولی تھی جو خاصی تنگ تھی۔ ایک ہاتھ میں وہ چھڑی لیے ہوئے تھی۔
انور نے اس طرف دیکھا جدھر سے بکریوں کے ممیانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اسے بکریاں نظر آئیں جو گھاس چر رہی تھیں۔
''ادھر کیا دیکھ رہا ہے، جواب تو دے بابے! کدھر کا ہے؟ یہاں کیوں پڑا تھا؟'' وہ پھر بولی۔
''ادھر ہی کہیں کا ہوں۔'' انور نے جواب دیا۔ وہ تیزی سے سوچ بھی رہا تھا کہ اپنے بارے میں کیا کہانی گڑھے! یہ اندازہ اس نے لگا لیا تھا کہ وہ چرواہن تھی۔
''ادھر ہی کا ہے!'' بھاری ہنسی۔ ''ادھر کدھر کا؟''
''چھوٹا تھا جب سوتیلی ماں کی وجہ سے شہر بھاگ گیا تھا۔'' انور نے کہانی گڑھ لی۔ ''سولہ سال بعد گھر کی یاد آئی تو ادھر آیا، پر پتا نہیں میرا گاؤں کہاں ہے۔ ایک گاؤں تو پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ وہ تو پہچان میں نہیں آیا تو آگے بڑھ آیا۔ بہت تھک گیا تھا۔ یہیں لیٹ گیا، نیند آ گئی۔''
''تو میرے ساتھ چل...... میرا گاؤں بھی دیکھ لے۔ وہاں سے تو نہیں بھاگا تھا؟''
''تم کون ہو؟''
''میں بکریاں چراتی ہوں۔''
''گاؤں کتنی دور ہے؟''
''تھوڑی دیر تو بکریوں کو چرنے دوں گی۔ بہت دیر سے ہوں ادھر۔ تھوڑی دیر بعد چلیں گے گاؤں کی طرف...... دیکھ لینا کتنی دور ہے۔''
انور نے سمجھ لیا کہ یہ عورت جس گاؤں کی ہے، اسی کے بارے میں بریگیڈیئر شمس نے بھی بتایا تھا اور نقشے میں بھی اسی کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ اس کے ساتھ نہ گیا تو وہ جانے کیا سمجھے۔
''اچھا چلوں گا تیرے ساتھ۔'' اس نے کہا۔
''تو ہے تو گبرو۔'' وہ انور کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جن میں پسندیدگی کے ساتھ ایک منفی جذبہ بھی تھا۔ انور کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بولی۔ ''بھوکا تو ہوگا تو؟''
''ہاں۔'' انور نے کہا۔ ''گاؤں میں کچھ خرید کر کھاؤں گا۔''
''میرے ساتھ کھا لے۔ کھانا تو میں لے کر آتی ہوں اپنا۔ آدھا آدھا کھا لیں گے۔ ابھی آتی ہوں لے کر۔'' اس نے انور کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور ایک جانب بڑھ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ پہاڑی علاقہ ایسی ہی بھول بھلیوں جیسا تھا کہ انسان پل میں سامنے اور پل میں غائب۔
انور سوچنے لگا، کسی ایسے چکر میں نہ پھنس جائے کہ معینہ وقت تک اپنا فرض پورا نہ کر سکے لیکن اس نے چپکے سے بھاگ نکلنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ اپنے گاؤں لوٹ کر وہ لوگوں سے اس کے بارے میں جانے کیا کہتی۔ گاؤں کا کوئی سمجھ دار آدمی سوچ سکتا تھا کہ ان کے علاقے میں پڑوسی ملک کا کوئی جاسوس تو نہیں گھس آیا ہے اور اس سوچ کے باعث وہ کسی پولیس چوکی کو بھی اس بارے میں اطلاع دے سکتا تھا۔
انور نے فیصلہ کیا کہ اسے اس عورت کے ساتھ جانا چاہیے لیکن اسے محتاط بھی رہنا ہوگا۔ اس عورت کا کردار اسے کچھ ٹھیک نہیں لگا تھا۔
نہ جانے کہاں سے وہ کھانے کی پوٹلی اور پانی کی ایک لٹیا سی لے کر آئی جو پیتل کی تھی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی چادر بھی تھی جو اس نے بچھا دی۔
''چل آ، کھا لے۔'' وہ چادر پر بیٹھ کر کھانے کی پوٹلی کھولنے لگی۔
ناچار انور چادر پر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔
''گاؤں کے لوگ تو کہتے ہیں کہ میں ساگ بہت اچھا پکاتی ہوں۔ آج وہی لائی ہوں۔ تو بھی کھا کے بتا، کیسا لگا۔''
ساگ کے ساتھ جو کی دو موٹی موٹی روٹیاں تھیں۔
کھانے کے پیکٹ انور کی واسکٹ کی جیبوں میں تھے لیکن اس عورت کے سامنے وہ نکالنا اس نے مناسب نہیں سمجھا۔
''تم بھوکی رہ جاؤ گی۔'' اس نے روٹی کا ایک نوالہ توڑا۔
''ارے تو گاؤں جا کے اور کھا لوں گی۔ ابھی تیری خاطر تھوڑی بھوکی رہ جاؤں گی تو مروں گی نہیں۔'' اس نے ایک بھدا سا قہقہہ لگایا، پھر بولی۔ ''تو مجھے بہت اچھا لگا ہے رے۔'' انور کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں پھر وہی کیفیت نظر آئی جس کی وجہ سے انور نے سمجھا تھا کہ وہ اچھے کردار کی عورت نہیں تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' انور نے پوچھا۔
''نام!'' وہ پھر ہنسی۔ ''نام کو تو چھوڑ، گاؤں میں سب مجھے مردمارو کہتے ہیں۔''
''مردمارو کیوں؟'' انور نے نظریں جھکالیں۔ ویسے اس نام کی وجہ سے وہ سمجھ گیا تھا کہ گاؤں والے بھی اس کے کردار کو اچھی طرح جان چکے تھے۔ اسی لیے اس کی عزت بھی نہیں کرتے تھے اور اسے ''مردمارو'' کہنے لگے تھے۔
''یہ تو گاؤں والوں سے ہی پوچھو۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''وہی بتائیں گے، میں مردمارو کیوں ہوں۔ کوئی الٹی سیدھی بات کرے تو اسی چھڑی سے اس کی خبر بھی لے لیتی ہوں جس چھڑی سے بکریاں ہانکتی ہوں۔'' اس نے چھڑی کی طرف اشارہ کیا جو اس نے اپنے قریب ہی رکھ لی تھی۔
''ساگ سچ مچ بہت اچھا ہے۔'' انور نے موضوع بدلا۔
''میری بنائی تو ہر چیز اچھی ہے۔ جو ایک بار چکھ لے، وہ بھولتا نہیں ہے۔''
''ہوں...... ہوں۔'' انور ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ایک غلط عورت سے ٹکرا گیا ہے لیکن یہ بھی طے تھا کہ وہ اس کے کچھ نہ کچھ کام ضرور آسکتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ دن میں بھی سفر کرکے گاؤں تک پہنچ سکتا تھا۔ گاؤں کے لوگوں کے لیے وہ اجنبی ہوتا لیکن اسے یقین تھا کہ یہ عورت جسے ''مردمارو'' کہا جاتا تھا، وہ انہیں یہی بتاتی کہ وہ اس کا پرانا جاننے والا ہے۔
اس کا خیال درست بھی ثابت ہوا۔ وہ اس کے ساتھ ہی گاؤں میں داخل ہوا۔ اِدھر اُدھر آتے جاتے گاؤں والوں نے ''مردمارو'' پر فقرے بازی بھی کی جس کے جواب میں انہیں گالیاں بھی سننی پڑیں۔
ایک فقرہ یہ بھی کسا گیا۔ ''کوئی نیا شکار پھانس لائی ہے؟''
''ارے یہ میرا پرانا جاننے والا ہے۔'' عورت نے جواب دیا۔ ''مجھے ہی ڈھونڈتا ہوا آیا تھا اِدھر۔ ارے جو کبوتر میری اٹریا پر ایک بار آبیٹھے، دوبارہ آنے کو اس کا دل ضرور کرے ہے۔''
گاؤں کے کچے پکے مکانات کسی سسٹم کے تحت نہیں تھے مگر ان کے درمیان راستے کشادہ تھے۔ ایک مکان قدرے بڑا اور پکا بنا ہوا تھا۔
''یہ کاکا چودھری کا گھر ہے۔'' مردمارو نے ہنس کر بتایا۔ ''مجھے ایک آنکھ نہ بھائے ہے لیکن میں اسے اچھی لگتی ہوں۔ جب وہ چاہتا ہے، میں انکار نہیں کرتی۔ اسی کی وجہ سے تو میں اس گاؤں میں ٹکی ہوئی ہوں۔ گاؤں کے بہت سے لوگ چاہتے ہیں، میں یہ گاؤں چھوڑ کر کہیں بھی چلی جاؤں۔'' اس نے منہ بنایا۔ ''بڑے شریف کے...... لگتے ہیں۔'' اس نے ایک گندی سی گالی بھی دے ڈالی۔
اس کا گھر خاصا صاف ستھرا تھا۔
''میرا یہ بستر کاکا چودھری کا تحفہ ہے۔'' وہ بولی۔ ''اچھا تو ذرا آرام کر یہاں۔ میں بکریاں چھوڑ کر ابھی آتی ہوں۔ پھر تجھے گاؤں میں گھماؤں گی۔ پہچان لینا، کہاں سے گیا تھا۔ ابھی تک تو کوئی ملا نہیں جسے تو نے پہچانا ہو۔''
اس نے انور کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور چلی گئی۔
انور سوچ رہا تھا کہ اسے یہ گاؤں جلد از جلد چھوڑ دینا چاہیے۔ اسے کچھ خطرہ اسی وقت محسوس ہوا تھا جب راستے میں فوج کا ایک سپاہی بھی ملا تھا۔
''کہاں سے آیا ہے یارا؟'' اس نے براہِ راست انور ہی سے پوچھا تھا۔
لیکن جواب اسے عورت نے دیا تھا۔ ''تجھ سے مطلب؟'' اس نے آنکھیں دکھائی تھیں۔ ''میرے مہمانوں سے مت کیا کر کوئی سوال۔ چل اپنا راستہ لے۔'' اس وقت انور جان بوجھ کر مسکرایا تھا۔ مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ مردمارو کے ساتھ بہت مطمئن ہے۔
''ارے یہ بہت اکڑو ہے۔'' عورت نے انور کو بتایا۔ ''چھٹی پر آیا ہوا ہے لیکن گاؤں میں بھی فوج کی ڈانگری پہنے پھرتا ہے۔'' اس نے فوجی وردی کو ''ڈانگری'' کہا تھا۔ ''ہر ایک پر رعب جماتا ہے لیکن میں تو اسے کڑوی کڑوی سنا دیتی ہوں۔ شادی ہوچکی ہے اس کی، ایک بچہ بھی ہے، پھر بھی مجھے اشارے کرتا رہتا ہے۔ میں اسے گھاس نہیں ڈالتی۔ کالیا کتا۔''
وہ کالا نہیں تھا۔ دبتی ہوئی سانولی رنگت تھی لیکن مردمارو اسے کالیا کہتی تھی۔ انور نے اس کے ہاتھ میں بڑا سا موبائل بھی دیکھا تھا۔
اس بارے میں مردمارو نے بتایا تھا کہ وہ اسے اپنے ہاتھ میں لیے پھرا کرتا تھا۔ مقصد گاؤں والوں پر اپنا رعب جمانا تھا۔ موبائل فون گاؤں کے بہت سے لوگوں کے پاس تھے لیکن وہ معمولی قسم کے تھے۔ جو فوجی کے ہاتھ میں تھا، وہ انور کے خیال کے مطابق اسمارٹ فون تھا۔
اس فون پر وہ فوجی جوان دنیا بھر کی خبریں سن سکتا تھا۔
''ارے یہ تو میرے پاس بھی آسکے ہے۔'' مردمارو

نے منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔ ''کاکا چودھری سے کہہ دوں تو ایک دن میں منگا دے گا شہر سے لیکن مجھے تو یہ جناتی چیز لگتی ہے۔ جانے کیا کیا بھرا ہوتا ہے اس میں۔ کالیے نے مجھ پر رعب جمانے کے لیے دکھایا تھا ایک بار۔''

ان باتوں سے خطرے کا کوئی اشارہ نہیں مل رہا تھا لیکن انور کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ بس وہ یہ اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا کہ وہ گڑبڑ کیا ہو سکتی ہے۔

ایک گھنٹے بعد وہ عورت انور کو گاؤں دکھانے کے لیے گھر سے نکلی۔ ہر جگہ اسے اور انور کو معنی خیز مسکراہٹوں کے ساتھ دیکھا گیا۔ گاؤں کی عورتیں کترا کر گزرتی رہیں۔ غالباً انہیں ان کے گھر والوں نے ہدایت کی ہوگی کہ وہ مرد مارو سے دور رہا کریں۔

انور نے ایک جگہ دیکھا کہ ایک ٹریلر پر بڑے بڑے ڈرم بار کیے جا رہے تھے۔ ان ڈرموں کی شکل کچھ بیضوی سی تھی۔ عورت نے بتایا کہ وہاں کچی شراب بنائی جا رہی تھی جو آس پاس کے دیہات میں بھی بھیجی جاتی تھی۔ وہ ڈرم اسی شراب کے تھے۔

پھر جب وہ دونوں گاؤں کے بڑے مکان کے پاس سے گزر رہے تھے تو ایک آدمی بڑی سنجیدگی سے قریب آ کر مرد مارو سے دھیمی آواز میں کچھ کہنے لگا۔ انور نہیں سن سکا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا لیکن عورت کا جواب سنائی دے گیا۔

''چل جا! آ رہی ہوں میں۔'' اس نے کہا۔

وہ آدمی فوراً واپس لوٹ گیا تو وہ انور سے بولی۔ ''یہیں رک! میں ابھی آتی ہوں۔''

''کہاں جا رہی ہو؟ کون تھا یہ؟ کیا کہہ رہا تھا؟'' انور نے بہ یک وقت کئی سوال کر ڈالے۔

''کاکا چودھری کا آدمی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''چودھری نے اپنی حویلی بلایا ہے مجھے، دو منٹ کے لیے۔ جانے کیا بات ہے...... کوئی خاص ہی ہوگی جو دو منٹ کے لیے بلایا ہے۔ زیادہ دیر میرے ساتھ رہنا ہو تو میرے ہی گھر آتا ہے۔ تو یہیں رک...... میں ابھی آتی ہوں۔''

اس نے جواب کا انتظار نہیں کیا اور تیزی سے اس مکان کی طرف بڑھ گئی جسے وہ حویلی کہتی تھی۔

انور متفکر ہو گیا۔ جی تو چاہا تھا کہ وہاں سے فوراً بھاگ نکلے لیکن اس طرح وہ یقینی طور پر مشکوک ہو جاتا۔

وہ پانچ منٹ بعد واپس آ گئی۔

''تیرے بارے میں پوچھ رہا تھا۔'' وہ آتے ہی بولی۔ ''گاؤں میں تو ہر خبر آگ کی طرح پھیلتی ہے۔ میں نے کہہ دیا اس سے کہ میں تجھے بہت پہلے سے جانتی ہوں۔ چٹلی گاؤں کا ہے تو۔ بہت دن بعد آیا ہے مجھ سے ملنے۔''

''بس یہ بات پوچھنے کے لیے بلایا؟''

''اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ اس کالیے نے لوگوں کو بتایا ہے کہ ہمارے علاقے میں کوئی اجنبی آ گھسا ہے جو شام کا جاسوس بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنے موبل پر خبریں سنی تھیں۔''

''موبل نہیں، موبائل۔'' انور نے کہا۔ اس کے ذہن میں خطرے کا الارم بج چکا تھا لیکن اس نے عورت کی تصحیح کی۔

''ہاں وہی۔'' وہ بولی۔ ''میں تو اسے موبل ہی کہوں ہوں۔''

''بس اب واپس چلو۔'' انور بولا۔ ''اب اندھیرا ابھی پھیلنے والا ہے۔ گاؤں تو خاصا دیکھ لیا۔ کوئی چیز پہچان میں نہیں آئی۔ بیس سال میں بہت کچھ بدل جاتا ہے، پھر بھی کوئی چھوٹی موٹی نشانی تو ملنی چاہیے تھی۔ میں اس گاؤں کا نہیں ہوں۔''

''چل پھر واپس چل۔'' وہ انور کا ہاتھ پکڑ کر بولی اور واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔

انور سوچ رہا تھا کہ وہ فوجی اپنی کمپنی یا پلاٹون کو یہ خبر دے سکتا تھا کہ اس کے گاؤں میں ایک اجنبی کو دیکھا گیا ہے۔ اس صورت میں فوج کی کوئی خفیہ ایجنسی حرکت میں آ سکتی تھی۔

''اب مجھے اپنے گاؤں کی تلاش میں آگے جانا ہو گا۔'' انور نے کہا۔

''ہاں ہاں، چلا جائیو! اب رات تو میرے گھر میں گزار لے، سویرے سویرے اٹھا دوں گی تجھے...... جگا دوں گی۔''

انور سمجھ رہا تھا کہ وہ اسے رات کے لیے کیوں روکنا چاہتی تھی لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ جلد از جلد اس گاؤں سے نکل جائے۔

''میری جان!'' انور نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر بے تکلفی کا مظاہرہ اس وقت کیا جب وہ گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ ''میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ میں جلد از جلد اپنا گاؤں تلاش کرنا چاہتا ہوں، اور وہ میں کر بھی لوں گا۔ میں تمہیں بھولوں گا نہیں۔ تم بھی اچھی لگی ہو مجھے۔ میں اپنے گاؤں میں زیادہ دن رکوں گا بھی نہیں۔ واپس شہر تو جانا ہو گا مجھے۔ جب واپس جاؤں گا تو تمہارے پاس ہوتا ہوا جاؤں

گا۔ ایک رات تمہارا مہمان بھی رہ لوں گا۔ ابھی تو تم مجھے جانے ہی دو۔''

''اندھیرے میں کہاں ٹھوکریں کھاتا پھرے گا۔'' اس نے اپنے گلے میں پڑا ہوا انور کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بڑی محبت سے کہا۔ ''میری بات مان، آج رات یہیں رک۔''

''بات سمجھ میری جان!'' انور نے دوسرے ہاتھ سے اس کا شانہ تھپکا۔ ''جب کسی کو برسوں بعد اپنے گھر کی، اپنے لوگوں کی تلاش ہو، اور وہ اسے نہ ملیں تو بہت گھبراہٹ ہوتی ہے۔ کسی ایک جگہ رکنا اس کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔''

''اندھیرے ہی میں ٹھوکریں کھانی ہیں تب بھی کچھ دیر تو رک میرے ساتھ۔''

''ہاں کچھ دیر تو رکوں گا۔ بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ کھانا کھلا دے مجھے۔'' انور نے اپنا ہاتھ اس کی گردن سے ہٹالیا۔

''اچھا!'' وہ کچھ مایوس ہوئی۔ ''نکالتی ہوں تیرے لیے کھانا۔''

کھانے کے دوران میں وہ نوالے بنا بنا کر اپنے ہاتھ سے انور کو کھلاتی اور خود بھی کھاتی رہی۔ وہ انور پر شدت سے فدا ہو چکی تھی۔

کھانے کے بعد وہ انور کو رخصت کرتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ ''ایک بار ذرا سا......'' اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر ''عمل'' آگے بڑھایا۔

انور کو مجبوراً وہ ناگوار اور کراہیت آمیز فریضہ انجام دینا ہی پڑا۔ اس کے بعد وہ گھر سے نکل آیا۔

گھر سے نکلتے وقت اس نے فضا میں گونج سنی اور ایک جانب ہیلی کاپٹر بھی دیکھ لیا جس کی روشنیاں جل بجھ رہی تھیں۔

''یہ تو آج کل ہوتا رہتا ہے۔'' مرد مار و بولی۔ ''جہاز بھی گزرنے لگے ہیں ادھر سے۔ سنا ہے جنگ چھڑ سکتی ہے۔'' اس کے لہجے میں پریشانی یا تشویش بالکل نہیں تھی۔ اس کا مزاج کچھ ایسا ہی تھا۔

انور کو شبہ تھا کہ یہ ہیلی کاپٹر گاؤں میں اترے گا بھی! اس نے تیزی سے ایک طرف قدم بڑھانا شروع کر دیے تھے۔ اگرچہ گاؤں کے کچھ گھروں میں بجلی تھی لیکن زیادہ تر میں مٹی کے تیل سے جلنے والے لیمپ وغیرہ تھے اس لیے گاؤں میں بھی تقریباً اندھیرا ہی تھا۔ پندرہ منٹ تک بہت تیزی سے چلنے کے بعد وہ مکمل تاریک ویرانے میں پہنچ گیا۔ نقشے کی مدد سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اسے کس سمت میں آگے بڑھنا ہے۔

کافی سوچ بچار کے بعد وہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ اس نے اس عورت کے ساتھ گاؤں جا کر غلطی کی تھی یا وہ اس کے لیے مجبور تھا!

اونچے نیچے سنگلاخ پہاڑی علاقے میں آگے بڑھتے ہوئے اس نے ان تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اب صرف اپنے مشن کے بارے میں سوچے۔ اسے مقررہ وقت تک پیغام ایک بستی کے گرجا کے پادری کو پہنچانا تھا۔ یہ بات یہاں کی حکومت کو معلوم ہو چکی تھی کہ ایک اجنبی سرحد پار کر کے اس علاقے میں داخل ہو چکا ہے جو جاسوس ہو سکتا ہے۔

انور کوئی جاسوس نہیں، محض ایک فوجی تھا لیکن اسے جو کام سونپا گیا تھا، وہ کسی خفیہ ایجنسی کے ایجنٹ ہی کا تھا۔ اس قسم کے کاموں کی تربیت دی جاتی ہے۔ وہ تو صرف اپنے بریگیڈیئر کی ہدایت پر اس کام کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ وہ کسی لمحے بھی کسی خطرناک صورتِ حال میں پھنس سکتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ گاؤں سے روانگی کے وقت اس نے جو ہیلی کاپٹر دیکھا تھا، اس میں ایسے ہی لوگ آئے ہوں گے جو اسے چیک کرتے۔ اگر وہ بروقت گاؤں سے نہ نکل گیا ہوتا تو اس وقت پھنس چکا ہوتا لیکن وہ یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اس کے نہ ملنے کے باعث وہ اطمینان سے واپس نہیں لوٹ جائیں گے۔ انہیں تشویش ہو گی کہ وہ اس ''اجنبی'' کو چیک نہیں کر سکے۔

تین گھنٹے مسلسل چلنے کے بعد وہ تھک کر ایک جگہ بیٹھا ہی تھا کہ اس نے فضا میں گونج سنی۔ اس نے چونک کر فضا میں ہر طرف نظریں دوڑائیں اور اس کا جسم سنسنا گیا۔ فضا میں چار ہیلی کاپٹر متحرک تھے اور ان کی فلیش لائٹس کے اسپاٹس سنگلاخ زمین پر حرکت کر رہے تھے۔ اس کا صریح مطلب یہی تھا کہ اس کی تلاش شروع ہو چکی تھی۔

انور نے تیزی سے اپنے آس پاس کے علاقے پر نظر دوڑائی۔ وہ کوئی ایسی جگہ دیکھنا چاہتا تھا جہاں وہ روشنی کے ان دائروں کی زد پر آنے سے محفوظ رہ سکتا۔ اسے قریب میں ایسی کوئی جگہ دکھائی نہ دی تو وہ اٹھ کر تیزی سے ایک طرف چل پڑا۔ ایک بار تو وہ جست لگا کر ایک جانب لڑھکتا نہ چلا گیا ہوتا تو ایک روشن دائرے کی زد پر آ ہی جاتا۔

یہ لڑھکنا ہی اس کے کام آ گیا۔ اسے وہاں ایک ایسی

کھوہ دکھائی دے گئی جس میں دبک کر وہ روشنی کے ان دائروں سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ اس نے ذرا بھی تاخیر کیے بغیر خود کو اس کھوہ میں چھپالیا۔

خاصا وقت اسی طرح گزرا اور پھر اس نے ہیلی کاپٹرز کی آوازوں کو دور جاتے ہوئے سنا۔ وہ واپس چلے گئے تھے یا کچھ اور آگے جا کر تلاش کی مہم جاری رکھی تھی، انور یہ اسی وقت جان سکتا تھا جب کھوہ سے باہر نکل کر فضا کا جائزہ لیتا۔

بصد احتیاط وہ اس کھوہ سے آہستہ آہستہ نکلا۔ احتیاط کی ضرورت اس لیے تھی کہ بعض ہیلی کاپٹروں کی آواز ہی نہیں ہوتی۔ عین ممکن تھا کہ ایسا کوئی ہیلی کاپٹر ابھی اس کے سر پر ہی منڈلا رہا ہو۔

لیکن ایسا نہیں تھا۔ انور نے دیکھ لیا کہ وہ ہیلی کاپٹرز اب چند میل آگے کا علاقہ چھان رہے تھے۔ یہ انور نے اسپاٹ لائٹ کے متحرک ہونے کی وجہ سے سمجھا تھا۔

فوری طور پر اس نے فیصلہ کیا کہ اسے آگے ہی بڑھنا چاہیے۔ کسی اور طرف جانے سے تو اس کی منزل دور ہو جاتی۔ اسے چوبیس سے چھتیس گھنٹے میں اپنی منزل تک پہنچنا تھا۔ روانگی سے قبل اس کے تین گھنٹے تیاری کرنے میں لگ گئے تھے۔ وہ رات کو دس بجے روانہ ہوسکا تھا اور اب ایک رات ایک دن گزرنے کے بعد دوسری رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ اب اس کے پاس ساڑھے گیارہ گھنٹے تھے جو گزرنے سے قبل اسے اپنی منزل تک پہنچنا تھا۔ کئی میل آگے روشنی کے متحرک دھبوں کو دیکھتا ہوا وہ اسی سمت میں آگے بڑھتا رہا۔ اس طرح کوئی آدھا گھنٹا گزرا تھا کہ وہ یکا یک روشنی کے ایک دائرے کی زد پر آگیا۔ اس کا یہ خیال ٹھیک ہی نکلا کہ ایک خاص قسم کے ہیلی کاپٹر کی آواز بالکل نہیں ہوتی۔ ایسا ہی کوئی ہیلی کاپٹر پیچھے آرہا تھا۔ اس سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ آگے بڑھتے ہوئے مڑ مڑ کر اپنے عقب کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اس نے کسی جاسوس کی طرح ہر لمحے اور ہر طرح سے چوکنا رہنے کی تربیت حاصل نہیں کی تھی۔

روشنی کے دائرے کی زد پر آتے ہی اس نے دوڑ کر اس دائرے سے باہر نکل جانا چاہا تھا لیکن اسی وقت ہیلی کاپٹر میں لگی ہوئی ہلکی مشین گن سے گولیاں برسنے لگیں لیکن اس طرح کہ وہ اس کے چاروں طرف سنگلاخ زمین سے ٹکرا کر چنگاریاں پیدا کر رہی تھیں۔ اسے براہِ راست کسی گولی کا نشانہ نہیں بنایا گیا تھا اور اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتے تھے۔

انور اپنی جگہ پر ساکت ہوگیا۔ دوسری صورت میں وہ کسی گولی کا نشانہ بن سکتا تھا۔

ہیلی کاپٹر آہستہ آہستہ نیچے آنے لگا۔ گولیاں اب بھی اس کے چاروں طرف برس رہی تھیں اور ان کی آوازوں کی وجہ سے اس کے کانوں میں شائیں شائیں ہونے لگی تھی۔

ہیلی کاپٹر خاصا نیچے آچکا تھا جب ایک مردانہ آواز سنائی دی جس کے لیے یقینی طور پر میگا فون کا استعمال کیا گیا تھا۔

''بھاگنے کی کوشش کرو گے تو مارے جاؤ گے۔ تم خود کو ہمارے حوالے کردو۔ اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو، ہم اسے تمہارا یہ جواب سمجھیں گے کہ تم اب بھاگنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ صرف اسی صورت میں گولیاں برسانا بند کر دی جائیں گی۔''

انور نے فوراً اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے ورنہ اندیشہ تھا کہ کوئی بھکی ہوئی گولی اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتی۔ اب گرفتار ہو جانے ہی میں عافیت تھی۔ زندہ رہنے کی صورت میں وہ ان لوگوں کی قید سے فرار بھی ہوسکتا تھا۔ اگرچہ اس کا امکان بہت کم تھا لیکن امید سے لو لگائے رکھنا انسانی فطرت ہے۔ اسی صورت میں وہ کسی طرح اپنی منزل تک پہنچ سکتا تھا ورنہ گولی کا نشانہ بننے کے بعد تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اس کے کام کی تکمیل ہوجاتی۔

ہیلی کاپٹر اور نیچے آنے لگا۔ اسی وقت کسی کیڑے نے اس کی پنڈلی میں کاٹا جو اس کے جوتوں پر چڑھ کر اوپر تک آگیا تھا۔ چبھن اتنی شدید ہوئی تھی کہ اس نے اپنی وہ ٹانگ بہت زور سے جھٹکی۔ اس صورت میں اس کا پیر بھی پھسلا۔ ہیلی کاپٹر والے جانے کیا سمجھے کہ اس پر گولیوں کا ہلکا سا برسٹ چلا دیا۔ چند گولیاں ادھر ادھر لگیں لیکن ایک گولی اس کی ران میں پیوست ہوئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ران میں پگھلی ہوئی آگ پھیلتی چلی گئی ہو۔ وہ ڈگمگا کر گر پڑا۔

''تمہیں بتا دیا گیا تھا کہ بھاگنے کی کوشش کرو گے تو مارے جاؤ گے۔'' میگا فون سے کہا گیا۔

انور جواب میں کیا کہہ سکتا تھا۔ وہ خاموش پڑا رہا۔ ران کی تکلیف کے باعث اس نے دانت پر دانت جما لیے تھے۔

سنگلاخ زمین اتنی اونچی نیچی تھی کہ ہیلی کاپٹر لینڈ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ آٹھ دس فٹ کی بلندی پر معلق ہوگیا اور اس

میں سے چار فوجی کود کر نیچے آ گئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں نہایت پاورفل ٹارچ تھی جس کی روشنی انور پر پڑ رہی تھی۔ ہیلی کاپٹر کا لائٹ اسپاٹ بند کیا جا چکا تھا۔ باقی تینوں فوجیوں میں سے دو کے ہاتھوں میں ریوالور اور ایک کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل تھی۔

وہ انور کے قریب آ گئے۔

''تمہاری ران سے خون بہہ رہا ہے۔'' ریوالور والا ایک فوجی بولا۔ ''ہم نے تمہیں وارننگ دے دی تھی کہ بھاگنے کی کوشش کرو گے تو......''

''میں بھاگا نہیں تھا۔'' تکلیف کی وجہ سے انور کی آواز کراہتی ہوئی سی تھی۔ ''میری ٹانگ میں کسی کیڑے نے......''

''تم شام کے جاسوس ہو؟'' انور کی بات کاٹتے ہوئے سخت لہجے میں سوال کیا گیا۔

''میں جاسوس نہیں ہوں۔ میں تو......''

''لے چلو اسے۔'' انور کی بات پھر کاٹ دی گئی۔ ''یہ آسانی سے تو کچھ نہیں بتائے گا۔''

''کھڑے ہو جاؤ۔'' دوسرے نے حکم دیا۔

انور کو کھڑے ہونے کے لیے خاصی کوشش کرنی پڑی۔ ران میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔

''چلو!'' ہیلی کاپٹر کی طرف اشارہ کیا گیا۔

انور کے لیے چلنے میں کھڑا ہونے سے بھی زیادہ دشواری تھی۔ تاہم وہ لنگڑاتا ہوا آگے بڑھا۔

''اس کتے کو سہارا دو۔'' ان میں سے ایک نے دانت پیستے ہوئے اپنے ایک ساتھی سے کہا۔

ایک ریوالور والا انور کے قریب آ گیا۔ اس نے انور کا ایک ہاتھ اپنے کندھے پر رکھا۔

''مجھ پر زور دے کر چلو۔'' وہ بولا۔

انور اس کے سہارے سے کسی نہ کسی طرح ہیلی کاپٹر تک پہنچا۔

وہ چاروں فوجی کود کر ہیلی کاپٹر سے اترے تھے لیکن جست لگا کر اوپر نہیں چڑھ سکتے تھے اس لیے ہیلی کاپٹر سے سیڑھی لگا دی گئی تھی۔

وہ چاروں انور کو لے کر سیڑھی کے ذریعے ہیلی کاپٹر میں پہنچے۔ سیڑھی کھینچ لی گئی اور ہیلی کاپٹر حرکت میں آ گیا۔

''تلاشی لے لو اس کی۔'' ایک نے کہا۔

انور کی تلاشی لی گئی۔

''ریوالور، گولیاں۔'' تلاشی کے بعد طنزیہ انداز میں کہا گیا۔ ''اور حلیہ ایسا جیسے دیہاتی ہو۔''

''سرحد پار سے آیا ہے۔ دشمن کا جاسوس ہے۔'' پھر ڈپٹ کر پوچھا گیا۔ ''کیوں بھیجا گیا ہے تمہیں؟''

''میں جاسوس نہیں ہوں۔'' انور اپنے ذہن میں ایک کہانی تیار کر چکا تھا۔ ''میں تمہارے شامی آرمی کا فوجی ہوں۔''

کیونکہ اب بھی انور کی تلاشی لی جا رہی تھی اس لیے اسے یقین تھا کہ دیہی لباس کے نیچے فوجی وردی دیکھ لی جائے گی۔

''فوجی!'' چونکی ہوئی آواز تھی۔

''ایسا تو ہوتا ہے۔'' دوسرا بولا۔ ''بعض اوقات فوجی بھی ریکی کرنے کے لیے آگے بھیجے جاتے ہیں۔''

''مجھے طبی امداد کی ضرورت ہے۔'' انور کی آواز اب بھی کراہتی ہوئی سی تھی۔ ''بہت سخت تکلیف میں ہوں۔ اس سے نجات پا کر سب بتا دوں گا تم لوگوں کو۔''

''ران میں گولی لگی ہے؟''

''ہاں۔''

''وہ کیمپ پہنچ کر ہی نکالی جا سکے گی۔''

انور نے کراہ کر آنکھیں بند کرتے ہوئے پشت گاہ سے ٹیک لگا لی۔

☆☆☆

بیس منٹ بعد ہیلی کاپٹر نے اس جگہ لینڈ کیا جہاں ان کی فوج پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ اسے ایک خیمے کے بستر پر لٹا دیا گیا۔ اس وقت تک اس کی تلاشی لے کر اس کی فوجی وردی بھی دیکھ لی گئی تھی۔

''ڈاکٹر کو اطلاع دی جا چکی ہے۔'' کسی نے انور کو بتایا۔ ''جلد ہی تمہاری ران سے گولی نکال لی جائے گی اس وقت تک اپنے بارے میں بتاؤ۔''

''تکلیف کی وجہ سے...... بولا نہیں...... جا رہا ہے۔'' انور نے کچھ اداکاری شروع کر دی۔

''فوجی ہو یا زنخے۔'' طنزیہ انداز میں کہا گیا۔

انور خاموش رہا۔ اسے سوچنا تھا کہ اس نے جو کہانی سوچی ہے، اس میں کوئی جھول تو نہیں ہے۔

کیونکہ اس کی تلاشی لے کر اطمینان کیا جا چکا تھا اس لیے خیمے میں اس وقت صرف ایک لیفٹیننٹ تھا۔ وہ انور کو گھورتا ہوا ٹہلنے لگا۔

ڈاکٹر کی آمد بیس منٹ بعد ہوئی اور اسے دیکھ کر انور چونک گیا۔ وہ زنوبیا تھی۔ انور کو دیکھ کر اس کے چہرے پر کسی

قسم کا تاثر نہیں اُبھرا۔ اس کے ساتھ دو نرسیں تھیں جو آپریشن کا سامان اٹھائے ہوئے تھیں۔
''کہاں گولی لگی ہے اسے؟'' زنوبیا نے انور کی طرف بڑھتے ہوئے لیفٹیننٹ سے پوچھا۔
''بائیں ٹانگ کی ران میں کیپٹن۔'' لیفٹیننٹ نے جواب دیا۔
''پینٹ کا بایاں پائنچا کاٹو۔'' زنوبیا نے ایک نرس کو حکم دیا۔
انور کا دیہی لباس پہلے ہی اتارا جاچکا تھا۔
زنوبیا اور فوج میں ڈاکٹر! انور کے دماغ میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ اس کا عہدہ کیپٹن کا تھا۔ یہ بات بھی اس کے لیے عجیب سی تھی کہ زنوبیا سے دوسری بار آمنا سامنا بھی حادثاتی طور پر ہوا تھا۔ اگر وہ فوج میں نہ ہوتا یا زنوبیا فوج میں نہ ہوتی تو یہاں ان کا آمنا سامنا نہیں ہوتا۔
نرس نے اس کی پینٹ کا پائنچا کاٹ دیا۔ دوسری نرس نے اس دوران میں آپریشن کا سامان قریب کی تپائی پر کسی ترتیب سے رکھ دیا تھا۔
''آپ کچھ دیر باہر رہیے لیفٹیننٹ۔'' زنوبیا نے کہا۔
لیفٹیننٹ کے جانے کے بعد زنوبیا، انور کے زخم کا جائزہ لینے لگی۔
''کافی خون نکل گیا ہے۔'' زنوبیا نے اچٹتی سی نظر کٹے ہوئے پائنچے پر ڈالتے ہوئے سرسری سے لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر اب بھی ایسا کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا کہ وہ انور کو جانتی ہے اور یہ ممکن نہیں تھا کہ اس نے انور کو پہچانا ہی نہ ہو۔ وہ یقیناً نرسوں کے سامنے بھی محتاط رہنا چاہتی تھی۔
انور کی ران کا آپریشن ہوا۔ گولی نکالنے کے بعد ڈریسنگ بھی کردی گئی۔
''اب تم آرام سے لیٹ سکتے ہو۔'' زنوبیا نے اس کا تکیہ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ ''تم خود بھی اسے اپنے آرام کے مطابق ٹھیک کر سکتے ہو بلکہ کر ہی لو۔'' آخر میں اس نے اپنے لہجے پر زور دیا تھا اور انور کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خفیف سا مسکرائی تھی۔ اس وقت دونوں نرسیں آپریشن کا سامان ٹھیک کرنے میں مصروف تھیں۔ ان کی توجہ زنوبیا اور انور کی طرف نہیں تھی۔
انور کی سمجھ میں آیا کہ زنوبیا نے اسے کسی قسم کا اشارہ کیا تھا۔ اس نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر اسے قدرے اوپر کھسکانا چاہا تو اس کا ہاتھ کسی کاغذ سے مس ہوا۔
اوہ! انور کا دل ایک بار تو زور سے دھڑک ہی گیا۔ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ زنوبیا نے اس کے لیے کوئی پرچہ چھوڑا تھا۔
زنوبیا نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگالیا اور آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''بس دیکھ لینا۔'' اس نے کہا، پھر اضافہ کیا۔ ''جس طرح چاہو، تکیہ ٹھیک کر لینا۔ اس حرکت سے تمہاری ران کے زخم پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔''
''بہت مہربان ڈاکٹر ہیں آپ۔'' انور نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں تو آپ کی فوج کا قیدی ہوں۔''
''ڈاکٹر کا فرض ہوتا ہے کہ وہ علاج کرے، اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ علاج کس کا کیا جارہا ہے۔'' زنوبیا نے کہا اور پھر نرسوں کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''چلیں۔''
''یس ڈاکٹر۔''
''پہلے تم باہر جاکر لیفٹیننٹ سے کہہ دو کہ اب وہ اندر آسکتا ہے۔'' زنوبیا نے ایک نرس سے کہا۔
نرس سر ہلا کر خیمے سے چلی گئی۔
اس مختصر دورانیے میں انور کا دماغ تیزی سے کام کرتا رہا تھا۔ اب اس کے پاس اپنا مشن مکمل کرنے کے لیے دس گھنٹے رہ گئے تھے۔ اسے یہ امید بھی ہوگئی تھی کہ زنوبیا اس کی مدد کرنا چاہتی ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کی کیا مدد کر سکے گی اور کس طرح کر سکے گی۔ ایک اہم سوال یہ بھی تھا کہ کیا وہ اتنی جلدی اس کے لیے کچھ کر سکے گی کہ وہ مقررہ وقت تک پادری سیموئل کے پاس پہنچ جائے؟
لیفٹیننٹ کے ساتھ دو اور فوجی بھی خیمے میں آئے۔
جاتے جاتے زنوبیا نے انور سے کہا۔ ''امکان نہیں ہے کہ اب تم کوئی تکلیف محسوس کرو تاہم اگر کوئی بات ہو تو ان لوگوں کو بتا دینا۔ یہ مجھے اطلاع دے دیں گے۔ میں آکر دیکھ لوں گی۔''
اس نے انور کے جواب کا انتظار نہیں کیا تھا اور دونوں نرسوں کے ساتھ خیمے سے چلی گئی تھی۔
نئے آنے والے فوجیوں میں ایک کرنل تھا۔ اس نے انور کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اب شروع ہو جاؤ۔ کیا بتانا چاہتے ہو اپنے بارے میں؟''
''میں فوج سے بھاگ کر ادھر آیا ہوں۔'' انور نے کہا۔
ان تینوں کے چہروں کے تاثرات عجیب سے ہو گئے۔
انور نے اپنی کہانی آگے بڑھائی۔ ''حالات بتا

رہے ہیں کہ دونوں ملکوں میں جنگ ہو کر رہے گی اور میں تم لوگوں سے جنگ نہیں لڑنا چاہتا تھا۔ جس طرح یہ وطن تمہارا ہے، اسی طرح میرا بھی ہے۔ میری پیدائش یہیں کی ہے۔ میرے والد کسی وجہ سے آٹھ سال پہلے یہاں سے اسی ملک میں جا بسے تھے جس کے سامنے اس وقت آپ لوگ صف آراء ہیں۔ مجھے اپنے والد کے ساتھ جانا پڑا تھا۔ وہیں میں فوج میں ہو گیا۔ اس وقت مجھے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ مجھے اپنے ہی وطن کی فوج کے خلاف ہتھیار اٹھانا پڑیں گے لیکن جب یہ نوبت آتی نظر آئی تو مجھے یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ فوج سے بھاگ کر اپنے وطن پہنچ جاؤں۔ میں خود بھی آپ لوگوں سے رابطہ کرنا چاہتا تھا لیکن کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اندیشہ یہ تھا کہ آپ لوگ مجھے مشکوک نہ سمجھ لیں۔''

یہ سب کچھ سُن کر وہ تینوں بہت سنجیدہ نظر آنے لگے تھے۔ کرنل نے ایک مرتبہ اچٹتی سی نظریں ڈال کر اپنے ساتھیوں کے تاثرات دیکھے، پھر انور کو گھورتا ہوا بولا۔ ''ہم اس بیان پر کیوں یقین کر لیں؟''

''یہی الجھن مجھے بھی تھی کہ میں آپ لوگوں کو یقین کس طرح دلاؤں گا۔ بس یہ سوچا تھا کہ اگر کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آسکی تو اپنے وطن میں کہیں روپوش ہونے کی کوشش کروں گا۔ مجھے کم از کم اپنے وطن کے خلاف تو نہیں لڑنا پڑے گا۔''

''کس پلٹن کے ہو؟''

''بریگیڈیئر شمس کا نام تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ میں انہی کے بریگیڈ میں تھا۔''

''کوئی...... کسی قسم کی معلومات دے سکتے ہو اس بریگیڈ کے بارے میں؟''

''جو کچھ جانتا ہوں، وہ تو بتا ہی دوں گا۔ اسلحہ کتنا ہے، انفنٹری کتنی ہے اور اسی قسم کی باتیں۔''

''بتاؤ۔''

انور کو یقین تھا کہ یہ لوگ اس بریگیڈ کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کر چکے ہوں گے اس لیے اس نے کسی جھجک کے بغیر سب کچھ بیان کر دیا۔

کرنل نے پُرخیال انداز میں سر ہلایا، پھر بولا۔ ''کوئی اہم بات بتاؤ۔ آخر یہ بریگیڈ سرحد پر کیوں بھیجا گیا ہے؟''

''اس بارے میں بس اندازہ ہی لگا سکتا ہوں کہ وہ کسی قسم کا آپریشن کرنے کے لیے کسی خاص موقع کی تلاش میں ہیں۔ یہ نہیں جانتا کہ وہ آپریشن کس قسم کا ہو گا۔ اس بارے میں بھی بس قیاس ہی کر سکتا ہوں۔ آپ لوگوں نے ان کی تین چوکیوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ وہ چوکیاں بریگیڈ سے بہت دور ہیں۔ اس لیے یہ تو نہیں سوچا جا سکتا کہ وہ ان چوکیوں کو واپس لینے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ ممکن ہے کہ وہ آپ کی اس سے زیادہ چوکیوں پر قبضہ کر کے حساب صاف کرنا چاہتے ہیں۔''

''تم فوج میں کیا ہو؟''

''کیپٹن۔''

''اس بات کا کوئی ثبوت کہ آٹھ سال پہلے تم ہمارے ہی ملک میں رہتے تھے جسے تم اپنا وطن کہہ رہے ہو؟''

''میں اپنے شہر کا اور اس گھر کا پتا بتا سکتا ہوں جہاں ہم رہتے تھے۔''

''بتاؤ!'' کرنل نے کہا اور پھر لیفٹیننٹ سے بولا۔ ''لکھو جو یہ بتائے۔''

لیفٹیننٹ نے فوراً کاغذ قلم سنبھال لیا۔

انور نے بریگیڈ کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دیا جو اس کے علم میں تھا۔ لیفٹیننٹ وہ سب نوٹ کرتا رہا۔

''تمہاری یہ اطلاعات تو بالکل درست ہیں۔'' کرنل نے کہا۔ ''لیکن صرف اس کی بنا پر ہم کیسے یقین کر لیں کہ اس ملک کو تم اپنا وطن سمجھتے ہو؟''

''میں اس شہر کا اور اس گھر کا پتا بتا چکا ہوں جہاں ہم رہتے تھے۔''

''گڈ! اس سے تمہاری باتوں پر خاصا یقین کیا جا سکتا ہے، اگر تمہارا بتایا ہوا پتا درست ثابت ہوا۔ ہم کل صبح ایک گھنٹے کے اندر اندر معلوم کر لیں گے کہ تم نے صحیح پتا بتایا ہے یا نہیں۔''

انور نے ایک شہر کا اور ایک مکان کا پتا بتا دیا جو اس حد تک درست تھا کہ ابتدا میں اس کے والد وہیں رہے تھے اور ایک سال بعد اس شہر میں منتقل ہو گئے تھے جہاں زنوبیا رہتی تھی۔ پہلا شہر ایک پُرفضا اور سرد شہر تھا جہاں اس کے والد گرمیوں کا زمانہ گزارا کرتے تھے۔ اپنے دونوں مکان انہوں نے اس وقت فروخت کیے تھے جب ملک چھوڑنے کا ارادہ کیا تھا۔ انور نے اس شہر اور اس گھر کا پتا نہیں بتایا جہاں اس کے پڑوس میں زنوبیا رہتی تھی۔ یہ احتیاط کرنا اس نے ضروری سمجھا تھا۔ اس طرح انہیں یہ خیال آسکتا تھا کہ وہ اور زنوبیا ایک دوسرے سے واقف ہوں گے۔

اس کا بتایا ہوا وہ پتا بھی نوٹ کر لیا گیا۔

کرنل بولا۔ ''صبح دس بجے تک مجھے اس بارے میں

رپورٹ مل جائے گی۔ اس کے بعد ہی تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ تمہاری اب تک کی باتوں سے میں خاصی حد تک مطمئن ہوں۔''

''شکریہ کرنل۔''

''اب تم آرام کرو۔ تمہارا ہر طرح سے خیال رکھا جائے گا۔''

''ایک بار پھر شکریہ۔''

''بس صرف یہ بات کھٹک رہی ہے کہ جب ہمارے ہیلی کاپٹروں نے تمہیں تلاش کرلیا تھا تو تم نے بھاگنے کی کوشش کیوں کی تھی؟''

''مجھے یقین تھا کہ مجھے گرفتار کرلیا جائے گا اور ہوا بھی وہی۔ دراصل میں ازخود آپ کے ہیڈکوارٹر میں پیش ہونا چاہتا تھا۔''

کرنل نے سر ہلایا اور پھر اپنے دونوں ساتھیوں کو آنکھوں سے اشارہ کر کے خیمے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ لوگ صبح دس بجے تک اس کی طرف سے مطمئن ہو سکتے تھے لیکن انور کو اپنا مشن دس بجے سے پہلے مکمل کرنا تھا جس کے لیے ضروری تھا کہ وہ یہاں سے جتنی جلدی ممکن ہو، فرار ہوسکے۔

کیا زنوبیا اسے یہاں سے فرار کرا سکے گی؟ کیا وہ اپنے ملک کو، اپنی فوج کو دھوکا دے سکتی تھی جس میں وہ خود بھی تھی۔

انور نے تکیے کے نیچے سے پرچہ نکال کر دوسری طرف کروٹ لی تاکہ اگر کوئی اچانک اس کے خیمے میں آئے تو اسے پرچہ پڑھتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔ کروٹ لینے سے اس کی ران میں تکلیف ہوئی تھی جسے اس نے برداشت کیا تھا۔

وہ زنوبیا کے ہاتھ کی تحریر تھی۔ لکھا تھا۔ ''میری زندگی! میری روح! کیا ستم ظریفی ہے قدرت کی کہ جب ہم ایک دوسرے کے سامنے ہوتے ہیں، حادثاتی طور پر ہی ہوتے ہیں۔ جب تمہیں یہاں لایا گیا تھا، اسی وقت میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ تمہاری زخمی ران سے گولی نکالنے کے لیے مجھے ہی بلایا جائے گا کیونکہ دوسری ڈاکٹر ایک مریض آفیسر کو دیکھنے گئی ہوئی ہے۔ اس کی واپسی دیر میں ہوگی۔ میں تم سے یہ شکایت نہیں کروں گی کہ تم نے فوج میں اپنی شمولیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ شکایت کا حق مجھے اس لیے نہیں پہنچتا کہ میں نے بھی تم کو یہ بات نہیں بتائی تھی کہ میں فوج میں ہوگئی ہوں۔ میرا خیال تھا کہ تم اس کی مخالفت کرو گے اور غالباً تم نے بھی یہی سوچا ہو گا۔ میں ایک آرٹسٹک ذہن کی مالک ہوں۔ فوج میں میری شمولیت غیر فطری ہے لیکن میں مجبور ہوگئی تھی۔ میں نے شاید تمہیں بتایا بھی تھا کہ میرے ایک قریبی عزیز فوج میں ہیں۔ انہوں نے میرے ڈیڈی سے کہا تھا کہ مجھے ڈاکٹر کی حیثیت سے فوج کی میڈیکل کور میں داخل کرادیا جائے۔ انہوں نے اس بارے میں ڈیڈی سے کیا کہا تھا، مجھے علم نہیں۔ مختصر یہ کہ ڈیڈی کے دباؤ پر میں فوج میں آگئی۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ ہم دوسری بار بھی حادثاتی طور پر ملیں۔ تم غالباً اپنی فوج کی کسی خفیہ ایجنسی میں ہو۔ تمہیں کسی خاص کام سے یہاں بھیجا گیا ہوگا۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم فوجی وردی میں کیوں تھے۔ جاسوسوں کو یہ لوگ چھوڑتے نہیں ہیں۔ میری جان! میں شدید الجھن میں ہوں کہ تمہیں یہاں سے بچا کر کس طرح نکال سکتی ہوں۔ اگر تمہارے ذہن میں کوئی تدبیر ہو تو مجھے بتاؤ۔ لکھ کر رکھ لینا۔ میں تمہاری ڈریسنگ کرنے کے بعد تم سے یہی کہہ کر جاؤں گی کہ امکان یہی ہے کہ تم اب تکلیف محسوس نہیں کرو گے لیکن اگر تمہارے ذہن میں کوئی تدبیر ہو یا تم کچھ سوچ سکو تو لکھ کر رکھ لینا۔ اس کے بعد کراہنا شروع کردینا، ظاہر کرنا کہ تم تکلیف محسوس کررہے ہو۔ مجھے یقیناً بلایا جائے گا لیکن میں یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ تم سے پوچھ گچھ تو کی جائے گی۔ ممکن ہے وہ تمہارے بیان سے مطمئن نہ ہوں اور تمہارے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کریں۔ کوشش کروں گی کہ تمہارے معاملات سے باخبر رہ سکوں مگر یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ کامیاب رہوں گی۔ اس پر تمہیں یقیناً حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ میں اس ملک کی فوج سے غداری کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے صرف تم عزیز ہو میری زندگی، میری روح۔ مجھے اس ملک اور اس کی فوج سے زیادہ تمہاری فکر ہے۔ میں تمہارے لیے اپنی جان کی بازی بھی لگا سکتی ہوں۔ میں اپنی حکومت کو اس لیے پسند نہیں کرتی کہ اس کی پالیسی تمہارے ملک کے خلاف جارحانہ ہے۔ دراصل موجودہ وزیراعظم امن پسند نہیں، جنگ جویانہ ذہنیت کا مالک ہے۔ اپنی تقریروں سے اس نے یہاں کے عوام کی اکثریت کو بھی اپنا ہمنوا بنالیا ہے۔ میں محسوس کرسکتی ہوں کہ بدنیتی کا نتیجہ اس ملک کے حق میں نہیں جائے گا۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ میں انتظار کروں گی کہ مجھے دوبارہ بلایا جائے۔

خط کے آخر میں زنوبیا نے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔

انور سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زنوبیا اس کی کیا مدد کر سکتی ہے اور کس طرح کر سکتی ہے۔ سوچنے کے لیے اس کے پاس زیادہ وقت بھی نہیں تھا۔ اب اس کے پاس صرف نو گھنٹے تھے۔ اگر کچھ کیا جا سکتا تھا تو ان نو گھنٹوں میں ہی کیا جا سکتا تھا اور نو گھنٹے بھی اس اعتبار سے نہیں تھے کہ فرار ممکن ہونے کے بعد پادری سیموئل تک پہنچنے میں بھی وقت لگتا اور کتنا وقت لگتا، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

اس نے جلدی جلدی چند سطریں لکھیں۔ ''زنوبی! میرے ذہن میں نہ تو کوئی تدبیر ہے اور میں سوچ بھی نہیں پا رہا ہوں۔ سوچ بھی کیسے سکتا ہوں، مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ تم مجھے یہاں سے کس طرح فرار کرا سکتی ہو۔ تمہیں ہی سوچنا ہوگا کہ کیا تدبیر ممکن ہے۔ یہ بھی بتا دوں کہ آٹھ گھنٹے کے اندر اندر کسی جگہ پہنچنا میرے لیے بہت ضروری ہے۔''

عبارت کے آخر میں انور نے بھی اپنا نام نہیں لکھا اور پرچہ تکیے کے نیچے رکھ کر آہستہ آہستہ کراہنے لگا۔ کوشش کر رہا تھا کہ چہرے پر تکلیف کا تاثر بھی لا سکے۔ دھیرے دھیرے اس نے کراہیں بلند کیں تو وہی لیفٹیننٹ اندر آیا۔

''کیوں شور کر رہے ہو؟'' وہ ڈانٹنے والے انداز میں بولا۔ ''گولی لگی ہے، کوئی پھول نہیں لگا ہے کہ تکلیف نہ ہو۔''

''کچھ زیادہ ہی تکلیف ہے بھائی۔'' انور نے لجاجت سے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحبہ کہہ کر گئی تھیں کہ اگر زیادہ تکلیف ہو تو انہیں بلوا لوں۔'' خاموش ہو کر وہ یکایک اس طرح کراہا جیسے زخم میں اچانک زوردار ٹیس اٹھی ہو۔

لیفٹیننٹ کے چہرے پر ناگواری کا تاثر قائم رہا اور وہ انور کو خشمگیں نظروں سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔

انور کو امید تھی کہ وہ جا کر زنوبیا کو اطلاع دے گا یا کسی سے اطلاع بھجوائے گا۔ وہ اپنے کرنل کی یہ بات نظرانداز نہیں کر سکتا تھا کہ انور کا خیال رکھا جائے۔

پندرہ منٹ بعد زنوبیا خیمے میں آئی۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ ایک ہی نرس تھی۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ ''کیا محسوس کر رہے ہو؟''

''ذرا ذرا دیر بعد ٹیس سی اٹھتی ہے۔'' انور نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

''تمہیں شوگر تو نہیں ہے؟'' زنوبیا نے اپنے لہجے میں تشویش پیدا کی۔

''ہے تو لیکن کچھ زیادہ نہیں۔''

''کم یا زیادہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہیں پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھا لیکن غلطی میری بھی ہے۔ ڈاکٹر کو ایسی باتیں خود پوچھنا چاہئیں۔ جو دوا میں نے لگائی ہے، وہ شوگر کے مریض کے زخم پر نہیں لگانی چاہیے۔'' پھر وہ نرس سے بولی۔ ''ڈریسنگ اتارو اور زخم صاف کرو۔''

لیفٹیننٹ اس وقت بھی خیمے میں موجود تھا اور اس مرتبہ اس کی نظر مسلسل انور پر تھی۔ ممکن نہیں تھا کہ انور، زنوبیا کو اشارہ کرتا کہ پرچہ تکیے کے نیچے ہے۔ وہ بے چینی محسوس کرنے لگا۔

نرس نے ڈریسنگ ختم کر کے زخم صاف کیا۔ پھر زنوبیا نے کوئی اور دوا یا شاید پہلے ہی والی دوا لگا کر ڈریسنگ کر دی۔

''اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''یکایک کچھ ٹھنڈک سی پڑ گئی ہے۔''

''مجھے یہی امید تھی۔'' زنوبیا نے کہا اور اس کا تکیہ ٹھیک کرنے لگی۔ وہ بہت ذہین تھی۔ اس نے خود ہی سمجھ لیا تھا کہ انور کا پرچہ تکیے کے نیچے ہوگا۔

''جب بھی کچھ محسوس کرو اور میری ضرورت ہو، لیفٹیننٹ کو بتا دینا۔'' زنوبیا نے کہا اور نرس کے ساتھ خیمے سے چلی گئی۔

''کھانا تو کھا کے چلے ہو گے تم اس مردمار عورت کے گھر سے؟'' لیفٹیننٹ نے چبھتے ہوئے سے لہجے میں کہا۔

انور کو یقین ہو گیا کہ اس نے ٹھیک سوچا تھا۔ گاؤں سے اس کے نکلتے وقت جو ہیلی کاپٹر دکھائی دیا تھا، وہ یقیناً اس گاؤں میں اترا تھا اور ان لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ انور کس کے گھر میں قیام کرنے کے بعد وہاں سے کہیں چلا گیا ہے۔

''ہاں۔'' انور نے کہا۔ ''لیکن چائے کی خواہش ہے۔''

''مل جائے گی۔'' لیفٹیننٹ نے کھردرے لہجے میں کہا اور خیمے سے چلا گیا۔

انور کو ابھی نیند تو نہیں آ رہی تھی لیکن سوچ سوچ کر دماغ بری طرح تھک گیا تھا۔ اسے واقعی چائے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ چائے پینے کے بعد بھی اس کو وقتی دماغی سکون تو ملا لیکن سوچ کا دھارا تو مسلسل بہہ رہا تھا۔ اسے یہ فکر لاحق تھی کہ زنوبیا ازخود اس کے لیے کچھ کر سکے گی یا نہیں؟ اور کر سکے گی تو کیا کر سکے گی۔

کچھ دیر بعد اس کے خیمے میں دوسرا لیفٹیننٹ آ گیا۔

''آج سونا شاید میرے مقدر میں نہیں ہے۔'' زنوبیا کے لہجے میں ناگواری تھی۔ وہ انور کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔''اب کیا ہوگیا؟''

انور نے اپنے گلے پر انگلی رکھی اور پھر اسی ہاتھ سے نفی کا اشارہ کیا۔

''بولا نہیں جارہا ہے؟'' زنوبیا نے پوچھا۔

انور نے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہ نرس کہاں مرگئی؟'' زنوبیا نے فوجیوں کی طرف دیکھتے ہوئے جھنجلائی سی آواز میں کہا۔

زنوبیا بالکل قریب آچکی تھی۔ یہ انور کے لیے بہترین موقع تھا۔ زنوبیا نے یقیناً جان بوجھ کر خود کو ایسی پوزیشن میں رکھا تھا کہ انور کو اپنے ''کام'' میں دشواری نہ ہو۔ اس نے لیفٹیننٹ کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ گرتے گرتے بچا اور پھر فوراً ہی زنوبیا کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایسا جھٹکا دیا کہ اس کی پشت انور کی طرف اور چہرہ فوجیوں کی طرف ہوگیا۔ ساتھ ہی اس نے ریوالور کی نال زنوبیا کی کنپٹی پر رکھ دی۔

''کرنل!'' انور نے ایسی آواز میں کہا جیسے غرایا ہو۔

کرنل کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔''دھوکا۔''

''جنگ میں یہ سب کچھ ہوتا ہے کرنل۔'' انور نے کہا۔''اور اب تم میری روانگی کے لیے ایک ہیلی کاپٹر کا بندوبست کرو۔ تمہاری یہ ڈاکٹر میرے ساتھ جائے گی۔ اس کام کے لیے میں تمہیں دس منٹ دے سکتا ہوں۔ اگر کسی چال بازی کی کوشش کی تو میں مرتے مرتے بھی تمہاری اس ڈاکٹر کو دوسری دنیا کی سیر کرادوں گا۔ اور ہاں! ہیلی کاپٹر میں دو پیراشوٹ بھی ہونے چاہئیں۔''

فوجی بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ انور کو یقین تھا کہ زنوبیا نے اپنے چہرے پر خوف کے تاثرات پیدا کرلیے ہوں گے۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔

''منہ کیا تک رہے ہو؟'' انور گرجا۔''دس منٹ کے اندر ہیلی کاپٹر چاہیے مجھے...... اس میں پانی کا بندوبست بھی ہونا چاہیے۔''

کرنل نے کیپٹن کو اشارہ کیا اور کیپٹن تیزی سے چلتا ہوا خیمے سے نکل گیا۔

خیمے میں چند لمحے تک مکمل سکوت رہا، پھر زنوبیا نے اپنا سر تھوڑا سا گھما کر کن انکھیوں سے انور کی طرف دیکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔''کیا میں نے تمہارے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا تھا؟''

''مجبوری ہے ڈاکٹر!'' انور نے کہا۔''اپنے فرار کے لیے کوئی اور تدبیر میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ اگر میں تمہارے بجائے اس لیفٹیننٹ کو یرغمال بناتا تو وہ زیادہ مؤثر اقدام نہ ہوتا۔ مہرہ شطرنج کی بساط کا ہو یا فوج کی بساط کا، ہر مہرے کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ تم ڈاکٹر بھی ہو اور کیپٹن بھی۔ لیفٹیننٹ کی بہ نسبت تمہاری اہمیت زیادہ ہے۔''

زنوبیا خاموش رہی۔

اسے ''بے بس'' کرنے اور لیفٹیننٹ کو دھکا دینے کے باعث انور کے زخم کی تکلیف بڑھ گئی تھی لیکن جب زندگی اور موت کا کھیل ہو رہا ہو تو ایسی تکلیفوں کی حیثیت ثانوی ہوجاتی ہے۔

انور کو یہ اندازہ بھی تھا کہ چلنے میں بھی اسے دشواری ہوگی۔ اسے زنوبیا کا سہارا اس طرح لینا پڑتا کہ اس پر اس کی گرفت بھی مضبوط رہے۔ وہ زنوبیا کی کمر جکڑے ہوئے تھا اور بستر پر بیٹھ بھی چکا تھا۔

مجھے ایک ریوالور اور چاہیے کرنل!'' انور بولا۔

کرنل نے ایک لیفٹیننٹ کو اشارہ کیا۔ وہ ہولسٹر سے ریوالور نکال کر انور کی طرف بڑھا۔

''آگے نہیں آؤ۔'' انور غرایا۔''ریوالور زمین پر رکھ کر اس طرح ٹھوکر مارو کہ یہ میرے قریب آجائے۔''

لیفٹیننٹ نے ایک مرتبہ کرنل کی طرف دیکھا اور پھر وہی کیا جو اس سے انور نے کہا تھا۔

ریوالور زنوبیا کے پیر کے قریب آکر رکا۔

''اسے میرے قریب سرکا دو ڈاکٹر۔'' انور نے حکم دینے والے انداز میں کہا۔

زنوبیا نے ایسا ہی کیا۔

ریوالور اٹھانے کے لیے انور کو تھوڑا سا جھکنا پڑا لیکن وہ براہِ راست ریوالور کی طرف دیکھنے کے بجائے کن انکھیوں سے فوجیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک لیفٹیننٹ نے اسے غافل سمجھ کر جلدی سے اپنا ریوالور نکالا لیکن ایک دھماکا ہوا اور ریوالور اس کے ہاتھ سے اچھل کر دور جاگرا۔ فائر انور ہی نے کیا تھا۔

''دیکھ لیا کرنل۔'' انور بولا۔''میرا نشانہ کتنا سچا ہے۔ میں گولی اس کے سینے میں بھی اتار سکتا تھا لیکن میں اس وقت ایسے موڈ میں نہیں ہوں۔''

حقیقت یہ تھی کہ انور ان لوگوں کو اپنی سچی نشانہ بازی سے مرعوب کرنا چاہتا تھا۔

لیفٹیننٹ کا وہ ہاتھ تھوڑا سا زخمی ہوگیا تھا جس سے

خون کے قطرے ٹپکنے لگے تھے۔

''تم جا کر کسی سے اپنی ڈریسنگ کرواؤ۔'' انور نے اسی سے کہا۔

لیفٹیننٹ نے کرنل کی طرف دیکھا۔ متفکر کرنل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ لیفٹیننٹ خیمے سے چلا گیا۔

اب انور کے بائیں ہاتھ میں بھی ریوالور تھا۔ گولی اس نے دائیں ہاتھ کے ریوالور سے چلائی تھی۔

دفعتاً زنوبیا بڑے جذباتی سے انداز میں بولی۔ ''مجھے مر جانے دیں کرنل! میری پروا نہ کریں۔ دشمن کو بچ کر نہیں نکلنا چاہیے۔''

''شٹ اَپ!'' انور نے کہتے ہوئے بائیں ہاتھ کے ریوالور کا دستہ زنوبیا کی کمر پر مارا۔ زنوبیا کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی۔ تکلیف انور کو بھی ہوئی تھی لیکن اس وقت کچھ ایسی ہی حرکت کرنے کی ضرورت تھی۔

اچانک زنوبیا نے مچل کر انور کی گرفت سے اس طرح نکلنا چاہا تھا کہ نکل نہ سکے۔

''گولی مار دوں گا میں تجھے ڈاکٹر!'' انور نے دانت پیسے۔

''کیپٹن زنوبیا!'' کرنل زور سے بولا۔ ''ایسی حرکتیں مت کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہ چاہتا کیا ہے۔''

''یہ فرار ہونا چاہتا ہے کرنل۔'' زنوبیا نے بناوٹی انداز میں ہانپتے ہوئے کہا۔ ''اور کیا چاہے گا یہ۔ اس نے دو پیراشوٹ مانگے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ مجھے بھی ہیلی کاپٹر میں اپنے ساتھ کہیں لے جانا چاہتا ہے۔''

''سمجھ رہا ہوں میں۔'' کرنل نے کہا۔ ''لیکن ایسی کوئی حرکت نہ کرو کہ ہم تمہیں فوری طور پر کھو دیں۔ بعد میں دیکھیں گے کہ یہ کیا کرے گا؟''

''اچار ڈالوں گا تمہاری ڈاکٹر کا۔'' انور اس انداز میں ہنسا جسے ہذیانی ہی کہا جا سکتا تھا۔

کرنل اسے گھور کر رہ گیا۔ انور نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ زنوبیا نے اپنے چہرے پر غصے کے تاثرات طاری کر لیے تھے۔ وہ اس وقت اداکاری کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ اگر اس کی اداکاری کچی بھی تھی تو اس کشیدہ ماحول میں کوئی اس پر توجہ نہیں دے سکا ہوگا۔

''دس منٹ ہو گئے کرنل۔'' انور نے غرانے کے انداز میں کہا۔ ''ہیلی کاپٹر......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر کیپٹن کو دیکھنے لگا جو اسی وقت خیمے میں داخل ہوا تھا۔ کرنل نے اسی کو ہیلی کاپٹر کا بندوبست کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اس نے کرنل کو بتایا کہ ہیلی کاپٹر تیار ہے۔

''کتنی دور ہے؟'' انور نے اسی سے پوچھا۔

''چالیس گز کے قریب۔''

''ٹھیک ہے۔ تم لوگ باہر نکلو۔'' انور نے کہا۔ ''میں تمہاری ڈاکٹر کے ساتھ بعد میں نکلوں گا۔ صرف ایک آدمی ہیلی کاپٹر تک میری رہنمائی کرے۔ کوئی اور پیچھے نہ آئے۔ کوئی شرارت کی تو سمجھ لو۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں مرنے سے پہلے تمہاری ڈاکٹر کے علاوہ بھی دو ایک کو ٹھکانے لگا دوں گا۔''

کرنل خیمے سے جانے کے لیے مڑ گیا۔ اس کے پیچھے دوسروں کے قدم بھی اٹھے۔

''کرنل!'' زنوبیا ایسے انداز میں بولی جیسے فریاد کر رہی ہو۔

''ہمت رکھو کیپٹن۔'' کرنل نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا اور پھر باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے باقی بھی چلے گئے۔

''اب تک سب ٹھیک جا رہا ہے۔'' زنوبیا نے سرگوشی میں انور سے کہا۔ ''تمہیں چلنے میں دشواری ہوگی۔ میرا سہارا لے کر چلنا۔''

''یہی کروں گا۔ بولو مت۔ کسی وقت دیواریں بھی سُن لیتی ہیں۔'' انور نے بھی سرگوشی ہی کی تھی۔

ایک منٹ بعد ہی انور اور زنوبیا بھی خیمے سے نکلے۔ زنوبیا بائیں جانب تھی۔ انور نے بایاں ہاتھ اس کے بائیں کندھے پر جما رکھا تھا۔ اسی ہاتھ میں وہ ریوالور بھی تھا جو انور نے بعد میں ایک لیفٹیننٹ سے لیا تھا۔ دائیں ہاتھ میں وہ ریوالور تھا جو اس نے چھینا تھا۔

کیپٹن قریب ہی موجود تھا۔ باقی فوجی خاصے فاصلے پر کھڑے تھے۔

انور نے ان لوگوں کو گھورتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ''تم سب میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ میں نے کسی کو بھی دیکھا تو میرے ریوالور سے شعلے اُبل پڑیں گے۔''

اس دھمکی کے بعد وہ سب اِدھر اُدھر کہیں غائب ہو گئے۔

کیپٹن نے ان کی رہنمائی کے لیے ٹارچ روشن کر لی تھی۔

انور ٹانگ کی تکلیف برداشت کرتا ہوا، زنوبیا کے سہارے آگے بڑھتا رہا۔ چالیس گز کا فاصلہ اس کے لیے چار فرلانگ جیسا ثابت ہوا۔ اس دوران میں زنوبیا سر موڑ

موڑ کر پیچھے دیکھتی رہی، جیسے اسے امید ہو کہ اس کی مدد کے لیے کوئی آئے گا لیکن دراصل وہ عقب سے باخبر رہنا چاہتی تھی۔

ہیلی کاپٹر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

فوجیوں میں سے کسی نے اب تک کوئی شرارت نہیں کی تھی۔

زنوبیا کو جکڑے ہوئے ہیلی کاپٹر پر سوار ہونا آسان نہیں تھا لیکن کسی نہ کسی طرح یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔

انور نے پائلٹ کی سیٹ سنبھالی تھی۔

''تم اڑانا جانتے ہو؟'' زنوبیا نے پوچھا۔

''میں بھی فوج میں ہوں زنوبی!'' انور نے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے انجن اسٹارٹ کیا۔ ''فون پر تم سے باتیں ہوتی تھیں تو میں نے اس لیے نہیں بتایا کہ شاید تم مخالفت کرتیں۔''

''اسی لیے میں نے بھی نہیں بتایا تھا۔'' زنوبیا پھیکے سے انداز میں مسکرائی، پھر چونکے ہوئے انداز میں بولی۔ ''فیول چیک کر لیا؟'' خود اس کی نظر بھی فیول بتانے والی سوئی کی طرف گئی تھی۔

''ہاں، فل ہے۔''

''تم آخر یہاں آئے کیوں تھے؟''

''کوئی پیام ہے میرے پاس جو مجھے نو دس بجے تک کسی کو پہنچانا ہے۔''

''ابھی تو خاصا وقت ہے۔ تمہاری ران کی کیا حالت ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ بینڈیج متاثر ہوئی ہے۔ خون رس رہا ہے لیکن یہ سب تو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔''

''میرے کوٹ کی جیبوں میں اس قسم کا کچھ سامان ہے کہ میں دوبارہ بینڈیج کر سکوں۔'' زنوبیا سفید کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ ''مجھے خیال تھا کہ ایسا ہو گا۔''

ہیلی کاپٹر اب زمین سے بلند ہونے لگا تھا۔

''تم کامیابی سے بچ نکلے ہو لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ سو فیصد کامیابی نہیں ہو گی۔ ہیلی کاپٹر ہمارا تعاقب ضرور کریں گے۔''

''ابھی تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا ہے۔''

''وہ کسی اور ہیلی پیڈ سے اڑیں گے۔''

''دیکھا جائے گا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہم دوسری بار بھی حادثاتی طور پر ملے اور اس مرتبہ بھی میں تمہیں زخمی ہی ملا۔''

''تمہیں دو پیراشوٹس کا خیال کیوں آیا تھا؟''

''میں اب تمہیں کھونا نہیں چاہتا زنوبی!'' انور نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''تم اب اپنی فوج میں واپس نہیں جاؤ گی۔ جینا ہو یا مرنا ہو، اب ہم ساتھ ہی رہیں گے۔ خیر، یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہیلی کاپٹر صحیح سمت میں جا رہا ہے یا نہیں۔ تم تو اس علاقے سے اچھی طرح واقف ہو گی۔ مجھے ایک ایسی بستی تک پہنچنا ہے جہاں ایک گرجا بنا ہوا ہے اور نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔''

''تب واقعی پرواز غلط سمت میں ہے۔'' زنوبیا نے کہا۔ ''پچھتر ڈگری کے زاویے سے دائیں جانب مڑو۔ میں نے دیکھی ہے وہ بستی۔ تمہیں وہاں کسی سے ملنا ہے؟ کوئی پیغام اس کو دینا ہے؟''

''ہاں، اوہ!''

''کیا ہوا؟''

''تمہارا خیال درست ثابت ہوا۔ دو ہیلی کاپٹر ہمارے تعاقب میں لگ چکے ہیں۔''

زنوبیا نے بے اختیار ایک طویل سانس لی۔

''پھر؟ اب کیا کرو گے؟''

''یہی سوچنا ہے۔''

''وہ ہم پر حملہ تو نہیں کریں گے، صرف نگرانی مقصد ہو گا ان کا۔ وہ جاننا چاہتے ہوں گے کہ تم مجھے کہاں لے جاتے ہو۔''

''یہی تو ان کو نہیں معلوم ہونا چاہیے۔''

''اوہ! تم رخ موڑ رہے ہو۔''

''ہاں۔'' انور نے کہا۔ ''ان کو یہ اشارہ بھی نہیں ملنا چاہیے کہ میں کہاں جانا چاہتا ہوں۔''

''اس طرح کیسے ہو گا؟''

''ہیلی کاپٹر کی تجویز تمہاری تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ تم بھی ہیلی کاپٹر اڑانا جانتی ہو۔''

''ظاہر ہے ورنہ میں یہ تجویز کیوں رکھتی۔''

''ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ......'' انور کچھ کہتے کہتے رکا، پھر اس نے پوچھا۔ ''تم ہیلی کاپٹر کو کم سے کم کتنی بلندی تک نیچے لا سکتی ہو؟''

''پائلٹ کی سیٹ تم مجھے دینا چاہتے ہو؟''

''ہاں، کیونکہ وہ ہمارا تعاقب کر رہے ہیں۔ اس لیے پیراشوٹ تو استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ ہم پیراشوٹ کے ذریعے کود جائیں گے اور ہیلی کاپٹر کسی چٹان سے ٹکرا کر تباہ ہو جائے گا لیکن اب ضروری یہ

ہے کہ تم ہیلی کاپٹر کو اتنا نیچے لے جاؤ کہ میں کود کر اُتر جاؤں۔ اسی طرح ان کی نظروں سے بچا جا سکتا ہے۔ تم ہیلی کاپٹر آگے نکال لے جانا لیکن......''

''لیکن؟ لیکن کیا؟''

''واپسی کے لیے میں تم سے رابطہ تو نہیں کر سکتا۔ بس یہ ممکن ہے کہ میں تمہیں کچھ ٹائم بتاؤں۔ اس ٹائم پر تم ہیلی کاپٹر اسی جگہ لے آؤ جہاں میں کود چکا ہوں گا لیکن اس میں بھی مشکل یہ ہے کہ میں ٹائم نہیں بتا سکتا۔ میں یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ مجھے اپنا کام مکمل کرنے میں کتنا وقت لگے گا۔''

''میں نے سوچ لیا تھا کہ ایسی کوئی ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' زنوبیا نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک موبائل نکال کر انور کی طرف بڑھایا۔ ''اس کے ذریعے تم میرے موبائل سے رابطہ کر سکتے ہو۔''

''گڈ!'' انور نے کہا۔ ''یہ تو بڑا اچھا کام ہو گیا۔''

''بس تو اب اس کے مطابق اپنا لائحۂ عمل بناؤ۔''

''کودنے سے میری ٹانگ پر کیا اثر پڑے گا؟'' انور نے متفکر لہجے میں کہا۔ ''میں چل بھی سکوں گا یا نہیں۔''

''یہ تو واقعی تشویش کی بات ہے، لیکن تم کودو کیوں؟ جب تمہیں ہیلی کاپٹر میں واپس آنے کے لیے سیڑھی کی ضرورت پڑے گی تو اترنے کے لیے بھی سیڑھی استعمال کی جا سکتی ہے۔''

انور نے قدرے طویل سانس لے کر کہا۔ ''سیڑھی کا خیال ہی نہیں آیا تھا مجھے۔ شاید ران کی تکلیف کی وجہ سے میرا دماغ ٹھیک سے کام نہیں کر رہا ہے۔''

''اوہ!'' زنوبیا کے منہ سے اچانک نکلا۔ ''تم نے ہیلی کاپٹر کا رخ پھر بستی کی طرف کیا ہے۔''

''ہاں۔'' انور نے کہا۔ ''جانا تو مجھے وہیں ہے۔ اگر میں کہیں زیادہ دور ہیلی کاپٹر سے اترا تو اتنی دور تک چلنا ممکن نہیں ہوگا۔ بستی کے قریب ہی کسی جگہ اترنا ضروری ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس بستی کی طرف جاتے جاتے ہم نے اپنا رخ بدلا تھا اور اب پھر اسی طرف جا رہے ہیں۔ وہ لوگ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ کدھر جانا چاہیے۔''

''اس بارے میں بھی سوچ لیا ہے میں نے۔ تعاقب کرنے والے ہیلی کاپٹر اتنے فاصلے سے تعاقب کر رہے ہیں کہ اگر ہم کسی بڑے ٹیلے یا کسی چٹان کی آڑ میں جا کر ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں تو اس جگہ تک پہنچنے میں انہیں کچھ وقت تو لگے گا۔ بس اسی وقت سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔ ہیلی کاپٹر کو بہت تیزی سے نیچے لے جا کر سیڑھی لٹکانا ہوگی۔ میرے اتر جانے کے بعد تم ہیلی کاپٹر کو پھر اوپر لے جانا۔ آڑ ہونے کی وجہ سے وہ دیکھ نہیں سکیں گے کہ میں ہیلی کاپٹر سے اُتر گیا ہوں۔''

''راہ میں چھوٹے موٹے پہاڑی سلسلے اور چٹانیں تو ہیں اور بستی بھی زیادہ دور نہیں ہے۔ اب ہیلی کاپٹر مجھے سنبھالنا چاہیے۔''

''یہی میں بھی کہنے والا تھا کہ اب تم میری سیٹ پر آجاؤ۔''

انہوں نے سیٹ تبدیل کی اور زنوبیا نے بے اختیار کہا۔ ''سیٹ تو تمہارے خون سے بھیگی ہوئی ہے انور۔'' اس کے لہجے میں بے حد تشویش تھی۔

''ہاں مجھے بھی محسوس ہو چکا ہے کہ خون اب کچھ تیزی سے رس رہا ہے۔ تکلیف بھی خاصی بڑھ گئی ہے لیکن مجھ میں قوتِ برداشت بہت ہے۔ تم نے میری آواز اور لہجے میں تکلیف نہیں محسوس کی ہوگی۔''

''محسوس نہ کرنا اور بات ہے۔ تکلیف میں تو ہو تم! بستی تک کا فاصلہ کیسے طے کرو گے؟''

''میں اپنا کام مکمل کرنے کے لیے اپنی جان پر بھی کھیل سکتا ہوں۔ تم جب اندازہ لگا لو کہ پہاڑی سلسلہ ختم ہونے والا ہے اور بستی قریب آگئی ہے تو تم ہیلی کاپٹر کو تیزی سے نیچے لے جانا۔ ایسی آڑ میں کہ وہ لوگ مجھے ہیلی کاپٹر سے اترتے نہ دیکھ سکیں۔''

''دو ڈھائی میل پیدل چلنا تمہارے لیے بہت مشکل ہوگا انور! تمہارا خون بہت رس رہا ہے۔ اس سے کمزوری بھی بڑھتی چلی جائے گی۔'' زنوبیا شدید تشویش میں مبتلا تھی۔

''بہت خون ہے میرے جسم میں، تم اس کی پروا نہ کرو۔''

اس جواب سے زنوبیا کی تشویش کم نہیں ہو سکی۔ اسی وقت اس نے ہیلی کاپٹر کو نیچے کرنا شروع کر دیا تھا۔

''کیا بستی قریب آگئی؟'' انور نے تیزی سے پوچھا۔

''ہاں۔'' زنوبیا نے کہا۔ ''اور یقیناً تمہاری کمزوری بڑھی ہے جس کا اثر تمہاری بصارت پر بھی پڑا ہے۔ تم دو جگنو سے چمکتے ہوئے نہیں دیکھ پا رہے ہو جو دراصل بستی کی روشنیاں ہیں۔''

انور نے اپنی آنکھوں پر زور دیا۔ اسے ''جگنو'' چمکتے

دکھائی دیے لیکن دوسرے ہی لمحے غائب بھی ہوگئے۔
''اوہ۔'' انور کے منہ سے نکلا۔''میں نے دیکھ لیا تھا لیکن......''
''اب وہ میری نظروں سے بھی اوجھل ہو چکے ہیں۔ ہم کافی نیچے آگئے ہیں۔'' زنوبیا نے جواب دیا۔
''تو اب میں سیڑھی کے ذریعے اترنے کے لیے تیار ہو جاؤں؟''
زنوبیا نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ یقیناً متفکر تھی اور کچھ سوچنے لگی تھی۔
ہیلی کاپٹر خاصا نیچے جا کر معلق ہوگیا۔
''نہیں انور۔'' زنوبیا بولی۔''میں کچھ اور سوچ رہی ہوں۔ ہم پیراشوٹ ہی کے ذریعے ہیلی کاپٹر سے چھلانگ لگائیں گے۔ ہیلی کاپٹر کسی چٹان سے ٹکرا کر تباہ ہو جائے گا۔ نیچے اتر کر میں پہلے تمہاری ران کی ڈریسنگ کروں گی، اس کے بعد تمہارے ساتھ ہی چلوں گی۔ میں تمہیں اس حالت میں نہیں چھوڑ سکتی۔ دو ڈھائی میل سے کم فاصلہ نہیں ہوگا یہاں سے بستی کا۔ تم اس حالت میں وہاں نہیں پہنچ پاؤ گے۔'' یہ سب کچھ اس نے بہت تیزی سے کہا تھا۔
ہیلی کاپٹر نے اوپر اٹھنا شروع کر دیا۔
''یہ کیا کر رہی ہو زنوبیا۔'' انور جلدی سے بولا۔
''ہم کسی اور جگہ آڑ میں جائیں گے۔ ہمیں پیراشوٹ کے ذریعے چھلانگ لگانے کے لیے بلندی درکار ہوگی۔''
''لیکن......''
''اوہ!'' زنوبیا کے منہ سے نکلا۔''یہ تو شاید قدرت ہماری مدد کرنا چاہتی ہے۔''
''کیا مطلب؟''
ہیلی کاپٹر اب اوپر اٹھنے کے ساتھ ہی ایک طرف بڑھنے بھی لگا تھا۔
''وقت بھی نہیں رہا تھا اُترنے کا۔'' زنوبیا بولی۔ ''میں اب ان دونوں ہیلی کاپٹروں کو دیکھ رہی ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا ہوگا۔''
انور جھنجلا سا گیا لیکن بولتے وقت اس نے اپنے لہجے پر قابو رکھا۔''تم نے باتوں میں کچھ وقت ضائع کر دیا۔''
''تم ہیلی کاپٹر سے اترنے کے لیے بے تاب ہو اس لیے یہ محسوس کیا ہے تم نے۔ وقت بالکل ضائع نہیں کیا میں نے۔''
''قدرت ہماری کیا مدد کرنا چاہتی ہے؟''
''جس جگہ ہیلی کاپٹر معلق تھا، اس کے آگے کے پہاڑ میں ایک بہت بڑا غار ہے۔ اتنا بڑا کہ ہیلی کاپٹر اس میں لے جایا جا سکتا ہے۔ میں ہیلی کاپٹر اسی میں لے جاتی لیکن اس وقت تک وہ دونوں ہیلی کاپٹر مجھے دکھائی دے گئے تھے۔ وہ ہیلی کاپٹر کو غار میں جاتے دیکھ لیتے۔''
''تو ادھر ادھر چکر لگا کر پھر ادھر ہی چلو...... میں اس کے حق میں نہیں ہوں کہ ہم دونوں پیراشوٹس کے ذریعے اتریں اور ہیلی کاپٹر تباہ ہو جائے۔ واپسی کے لیے کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے ہمارے پاس۔''
''میں بھی ارادہ بدل چکی ہوں۔ اِدھر اُدھر چکر لگا کر ہم پھر اسی جگہ جائیں گے اور میں ہیلی کاپٹر کو تیزی سے اس غار میں لے جاؤں گی۔ وہاں مجھے تمہاری ران کی ڈریسنگ کا موقع بھی مل جائے گا۔ میں تمہیں اس حالت میں تو نہیں جانے دوں گی بستی کی طرف! تم باہمت ضرور ہو لیکن ہر جگہ ہمت کام نہیں آتی۔''
''ڈریسنگ میں اور وقت ضائع ہوگا۔''
''اپنے کام کے معاملے میں جذباتی ہو رہے ہو تم! میں ڈریسنگ بہت پھرتی سے کروں گی۔ پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔''
''اچھا!'' انور نے طویل سانس لی۔''اب ہم کدھر جا رہے ہیں؟''
''اس بستی کی طرف نہیں جہاں تمہیں جانا ہے۔'' زنوبیا نے جواب دیا۔''پانچ چھ منٹ بعد ہم اپنا رخ بدلیں گے۔ مزید پانچ منٹ بعد پھر اسی مقام کی طرف بڑھیں گے جہاں میں نے وہ غار دیکھا ہے۔''
''کیا وہاں کی زمین اتنی مسطح ہوگی کہ ہیلی کاپٹر لینڈ کر سکے؟''
''اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ لینڈنگ کے وقت ہیلی کاپٹر معمولی سا ٹیڑھا ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ہیلی کاپٹر لڑھک جانے کا خطرہ ہوا تو میں وہاں لینڈ نہیں کروں گی۔''
''ایسی صورت میں وہاں سے نکلیں گے کیسے؟ کیا غار اتنا کشادہ ہے کہ ہیلی کاپٹر چکر لگا کر واپسی کے لیے مڑ سکے؟''
''اتنا کشادہ تو نہیں ہے لیکن اسے غار کہنا میری غلطی تھی۔ وہ سرنگ ہے۔ جہاں وہ ختم ہوتی ہے، وہاں مجھے ہلکی سی روشنی بھی دکھائی دی تھی۔''
''چاندنی؟''
''ظاہر ہے۔ وہاں الیکٹرک پولز تو نہیں ہوں گے۔

تمہارا دماغ واقعی صحیح طور پر کام نہیں کر رہا ہے۔ میں اب ہیلی کاپٹر کا رخ بدل رہی ہوں۔ سوچ سوچ کر ان لوگوں کا دماغ خراب ہو جائے گا کہ تم ہیلی کاپٹر کہاں لے جانا چاہتے ہو۔"

"ہاں اس طرح ادھر ادھر چکر لگانے سے وہ الجھ تو جائیں گے بُری طرح۔ اور یہی بات ہمارے حق میں جائے گی۔" انور نے کہا۔ "لیکن جب ہم اس غار میں جائیں گے تو غار انہیں بھی دکھائی دے جائے گا۔"

"اگر وہ اپنے ہیلی کاپٹر نیچے لائیں گے۔" زنوبیا نے جواب دیا۔ "میں یہ کام اتنی تیزی سے کروں گی کہ وہ ہمیں نیچے ہوتے ہوئے دیکھ ہی نہ سکیں اور جب ان کے ہیلی کاپٹر وہاں پہنچیں گے اور ہمارا ہیلی کاپٹر انہیں دکھائی نہیں دے گا تو وہ یہی سمجھیں گے کہ ہم کسی اور طرف جا کر کسی اور پہاڑ یا چٹان کی آڑ میں ہو گئے ہیں۔ وہ ادھر ادھر گھوم کر ہمیں تلاش کرنا چاہیں گے۔"

"بہت مناسب سوچ رہی ہو تم۔" انور پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ "ایسا معلوم ہونے لگا ہے کہ اس مشن پر مجھے نہیں، تمہیں بھیجا گیا ہے۔"

وہ دونوں اس حد تک مطمئن تھے کہ جب تک وہ ہیلی کاپٹر میں ہیں، اس وقت تک تو ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

"تمہارا مشن میرا ہی مشن ہے۔" زنوبیا نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "تمہاری خاطر میں کچھ بھی کر سکتی ہوں انور! فوج سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں فوج میں ڈیڈی کے دباؤ کی وجہ سے آئی تھی اور ڈیڈی پر اس کے لیے ہمارے ایک عزیز نے دباؤ ڈالا تھا۔ جب تم حادثاتی طور پر ہماری سرحد میں آ گئے تھے اور مجھے ملے تھے، اسی وقت میں نے تمہیں اپنے ان عزیز کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ اس وقت میجر جنرل ہیں۔ ان کو میرے اور تمہارے بارے میں اطلاع یقیناً ابتدا ہی میں مل گئی ہو گی۔ انہوں نے ہی کرنل کو ہدایت کی ہو گی کہ تمہیں گرفتار کرنے کے لیے میری زندگی کسی صورت بھی داؤ پر نہ لگائی جائے۔"

"اس کی اطلاع تمہارے ڈیڈی کو بھی ہو چکی ہو گی۔"

"ڈیڈی۔" زنوبیا نے ٹھنڈی سانس لی۔ "وہ کچھ دن ہوئے اس دنیا سے جا چکے ہیں۔"

"اوہ! اور تم نے مجھے اس بارے میں نہیں بتایا۔"

"اس خیال سے نہیں بتایا کہ تم میرے لیے پریشان ہو گے۔ سوچو گے کہ میں اکیلی رہ گئی ہوں۔"

"بیمار تھے وہ؟"

"نہیں، ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اچھا اب میں ہیلی کاپٹر کو اسی جانب موڑ رہی ہوں جہاں وہ سُرنگ ہے۔"

"تمہارے والد کے بارے میں سُن کر افسوس ہوا زنوبیا۔"

"سبھی کو کسی نہ کسی دن دنیا سے جانا ہوتا ہے انور۔" زنوبیا نے کہا، پھر بولی۔ "ہیلی کاپٹر کی اس حرکت پر ان لوگوں کا دماغ اور الجھ گیا ہو گا کہ آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو۔"

"ان کی یہ الجھن انہیں صحیح طور پر کچھ سمجھنے بھی نہیں دے گی۔"

"تمہارے زخم کی اب کیا حالت ہے؟"

"میں اب اس سیٹ پر بھی اپنے خون کی چپچپاہٹ محسوس کر رہا ہوں۔"

"مجھے بہت تشویش ہے اس کی بلکہ بڑھتی جا رہی ہے۔"

"تم صرف اس بات پر دھیان رکھو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ تعاقب میں آنے والے ہیلی کاپٹروں پر تو کڑی نظر رکھو۔"

"میں بے خبر نہیں ہوں۔"

"تمہارے پاس ریوالور ہے؟ شاید مجھے کسی وقت ضرورت پڑے۔"

"میں پوری تیاری کے ساتھ آئی ہوں انور! موبائل تو تمہیں دے ہی چکی ہوں۔ ریوالور بھی دو ہیں میرے پاس! لباس کے نیچے ہلکے قسم کا مردانہ لباس بھی ہے۔ ڈریسنگ کے بعد تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔"

"تم نے تو کمال کر دیا زنوبی۔"

"اب دیکھنا یہ ہے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے، اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔"

"میں نے مایوس ہونا نہیں سیکھا۔"

"کام مکمل ہونے کے بعد کیا کرنا ہے؟"

"واپس اپنے وطن، اور تم بھی میرے ساتھ ہو گی۔"

"اسی ہیلی کاپٹر میں؟"

"ابھی تو یہی ایک سبیل ہے۔" انور نے کہا۔ "اور اگر ضرورت پڑی تو ایک اور راستہ بھی نکالا جا سکتا ہے۔"

"وہ کیا؟"

انور نے اسے بتایا کہ اس کے دماغ میں کیا کیا خیالات چکرا رہے تھے۔ سب کچھ سُن کر زنوبیا نے بے

اختیار کہا۔ ''یہ تو خطرناک ثابت ہوسکتا ہے انور۔''

''اس وقت بھی ہم ایک خطرے سے کھیل رہے ہیں۔ زیادہ خطرہ بھی مول لینا پڑے گا اگر ضرورت پڑی تو۔''

ان باتوں کے دوران میں ہیلی کاپٹر اس جگہ پہنچ گیا جہاں زنوبیا اسے لے جانا چاہتی تھی۔ اس نے ہیلی کاپٹر کو نیچے کرنا شروع کیا اور جب سطح زمین سے اس کی بلندی دس بارہ فٹ رہ گئی تو اسے تیزی سے آگے بڑھایا۔ اس سے پہلے کہ تعاقب کرنے والے ہیلی کاپٹر سر پر آجاتے، ان کا ہیلی کاپٹر اس سرنگ میں داخل ہوگیا جو زنوبیا نے دیکھی تھی۔ کچھ ہی آگے نکلنے کے بعد اس نے ہیلی کاپٹر معلق کرتے ہوئے سطح زمین کا جائزہ لینے کے لیے اسپاٹ لائٹ نیچے ڈالی۔

''یہاں تو بہت اونچ نیچ ہے۔'' زنوبیا بڑبڑائی اور ساتھ ہی معلق ہیلی کاپٹر کو کم سے کم رفتار سے آگے بڑھانے لگی۔

''بڑی لمبی سرنگ ہے۔'' انور بولا۔ ''اور کشادہ بھی اتنی ہے کہ ہیلی کاپٹر پندرہ بیس فٹ اوپر بھی اٹھ سکتا ہے۔''

''مل گئی۔'' زنوبیا پُرمسرت انداز میں بولی۔ ''یہاں ہم لینڈ کرسکتے ہیں۔''

وہ نہایت مسطح زمین تھی جہاں زنوبیا نے ہیلی کاپٹر کو دوبارہ معلق کیا تھا۔

''میں نے کہا تھا نا۔'' زنوبیا پھر بولی۔ ''قدرت ہماری مدد کررہی ہے۔''

''جو اپنی سی کوشش کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے، قدرت ان کی مدد کرتی ہی ہے۔''

ہیلی کاپٹر اب آہستہ آہستہ نیچے ہورہا تھا۔ جلد ہی زنوبیا نے اسے بڑی مہارت سے زمین پر اتار دیا۔

انجن بند کرکے زنوبیا نے ہیلی کاپٹر کی سامنے کی لائٹ جلا دی۔ وہ اس روشنی میں انور کے زخم کی ڈریسنگ کرسکتی تھی۔

زخم کی وجہ سے تکلیف اتنی تھی کہ ہیلی کاپٹر سے اترنے میں بھی انور کو دانتوں پسینا آگیا، تاہم اس نے کوشش کی تھی کہ اس کے منہ سے ''اُف'' بھی نہ نکلے۔ نیچے اترنے کے بعد وہ فوراً ہی بیٹھ بھی گیا۔

''ہیلی کاپٹر کے آگے آؤ انور۔'' زنوبیا بولی۔ ''میں روشنی ہی میں تمہارے زخم کی ڈریسنگ کرسکوں گی۔'' اس نے انور کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور سہارے ہی سے ہیلی کاپٹر کے سامنے لے گئی۔ اس وقت واضح طور پر دکھائی دے گیا کہ اس کے لباس کا نچلا حصہ خون سے بڑی حد تک سرخ تھا۔

''یہاں لیٹ جاؤ۔'' زنوبیا نے کہا۔ ''تم کچھ مت کرنا، میں خود ہی سب کرلوں گی۔''

انور لیٹ گیا۔ زنوبیا نے اپنے کوٹ کی جیبوں سے وہ سب چیزیں نکالیں جو فوری طبی امداد کے لیے ضروری تھیں۔

'عمرو عیار کی زنبیل ہیں اس کے کوٹ کی جیبیں۔' انور کو خیال آیا۔

زنوبیا نے خود ہی انور کی وہ ٹانگ عریاں کی جو زخمی تھی۔ انور نے جھینپ محسوس کی کہ ایک لڑکی نے اس کی ٹانگ عریاں کی تھی۔ اس کی یہی کیفیت اس وقت بھی ہوئی تھی جب وہ قیدی تھا اور زنوبیا نے ایک نرس کے ساتھ اس کی ران کا آپریشن کیا تھا۔

''دو ڈھائی میل کا فاصلہ تم اس حالت میں ہرگز طے نہیں کرپاتے۔'' زنوبیا نے اس کی خون آلود بینڈیج کھولتے ہوئے کہا۔ ''کہیں نہ کہیں گر پڑتے۔''

انور آنکھیں بند کیے خاموش لیٹا رہا۔

زنوبیا نے سارا کام بڑی پھرتی اور بہت کم وقت میں کیا، پھر بولی۔ ''ابھی لیٹے رہو۔ میں تمہارے لیے لباس لاتی ہوں۔''

وہ ہیلی کاپٹر کے دوسری جانب چلی گئی۔ نیچے پہنا ہوا مردانہ لباس اتارنے کے لیے اسے پہلے تو اپنے ہی کپڑے اتارنے تھے۔ پھر انور کو اس کی مدد سے پہنانا بھی تھے۔

یہ کام بھی اس نے کم از کم وقت میں کیا۔

''تم اگر ڈریسنگ کروائے بغیر بستی تک چلے بھی جاتے تو جگہ جگہ خون کے دھبے چھوڑتے جاتے جو کسی وقت بھی فوجیوں کی نظر میں آسکتے تھے۔''

''ہوں۔'' انور نے بس اتنی ہی آواز نکالی۔

''ہم بارہ چودہ فٹ کی بلندی پر ہیں۔'' زنوبیا نے طبی امداد کا سامان واپس اپنی جیبوں میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے زخم کی حالت ایسی ہے کہ دوبارہ بھی اس سامان کی ضرورت پڑسکتی ہے۔''

''بارہ چودہ فٹ نیچے کس طرح اترا جائے گا؟'' انور نے پوچھا۔ ''کیا پتھروں کے ایسے ابھار ہیں کہ ان کے سہارے اُترا جاسکے۔''

''یہ میں اب جاکر دیکھتی ہوں۔'' زنوبیا نے کہا۔ ''تم لیٹے رہو۔ ابھی جتنا بھی آرام کرسکو، وہ تمہارے لیے بہتر ہے۔''

انور سوچنے لگا کہ وہ اپنی ران کے زخم کی وجہ سے کٹھ پتلی بن کر رہ گیا ہے۔ سب کچھ زنوبیا کر رہی تھی۔ اگر وہ اسے دشمن کی فوج میں نہ ملتی تو شاید اسے اپنے مشن کی تکمیل کے بارے میں سوچنا بھی مشکل ہوتا۔

زنوبیا غالباً دوڑتی ہوئی سرنگ کے دہانے تک گئی تھی کیونکہ واپسی پر انور نے اسے ہانپتا ہوا دیکھا۔

''نہیں۔'' وہ بولی۔ ''ایسے ابھار نہیں ہیں چٹان میں جن کی مدد سے اترا جا سکے۔''

''اوہ۔'' انور نے فکرمندی سے کہا۔

زنوبیا بھی فکرمند نظر آنے لگی تھی۔ ''ہمیں ہیلی کاپٹر ہی میں یہاں سے نکلنا پڑے گا۔''

''ہیلی کاپٹرز ہماری تلاش میں ہوں گے، وہ ہمیں دیکھ لیں گے۔''

''کوئی اور صورت دکھائی بھی نہیں دے رہی ہے۔'' زنوبیا نے کہا۔ ''میں اگر اکیلی ہوتی تو بارہ تیرہ فٹ کی بلندی سے بھی نیچے کودنے کی ہمت کر لیتی لیکن تمہارے لیے یہ ناممکن ہے۔ اس جھٹکے سے تمہاری ران کا زخم پھر قابو سے باہر آ جائے گا۔ ابھی جو ڈریسنگ کی ہے میں نے، وہ رائگاں جائے گی۔''

''ایک تدبیر ابھی میرے ذہن میں آئی ہے، اگر تم کر سکو۔''

''وہ کیا؟''

''پہلے یہ بتاؤ کہ سرنگ کے دہانے پر ایسا کوئی مضبوط ابھار ہے جس میں کوئی چیز پھنسا دی جائے اور ہم اس کے سہارے نیچے اتر سکیں؟''

''ہاں، ایسے تو کئی ابھار ہیں لیکن ہمارے پاس کوئی رسی نہیں ہے۔''

''کیا تم ہیلی کاپٹر کی سیڑھیاں ہیلی کاپٹر سے الگ کر سکتی ہو؟''

زنوبیا چونکی۔ ''تمہارے دماغ میں تدبیر تو اچھی آئی ہے لیکن ایسا کرنا آسان نہیں ہوگا۔''

''کیا ناممکن بھی ہوگا؟''

''ناممکن تو کچھ نہیں ہوتا، اگر انسان محنت کرے۔ ٹھیک ہے۔ میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔ کچھ وقت تو لگے گا اس میں، اگر میں کامیاب بھی ہوئی۔''

''میں تمہاری مدد کرنے کی کوشش......''

''نہیں۔'' زنوبیا نے اس کی بات کاٹی۔ ''پہلے میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔ دراصل مجھے اس کا علم نہیں کہ سیڑھی کس تکنیک سے ہیلی کاپٹر میں لگائی جاتی ہے۔ شاید بہت زیادہ محنت کر کے ہی کامیاب ہو سکوں۔ میں مجبوراً ہی تم سے مدد لوں گی۔''

وہ انور کے جواب کا انتظار کیے بغیر تیزی سے ہیلی کاپٹر کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ انور ایک ٹھنڈی سانس لے کر اسے ہیلی کاپٹر میں جاتے دیکھتا رہا۔ اپنی ران کے زخم کی وجہ سے وہ شدید بے بسی کا شکار ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد زنوبیا واپس لوٹی۔ ''میں کامیاب ہو گئی۔ سیڑھی نیچے گرا دی ہے میں نے۔'' اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

''میں نے کسی وزنی چیز کے گرنے کی آواز سنی تھی۔ خیال آیا تھا مجھے کہ تم کامیاب ہو گئی ہو۔''

''اب سیڑھی کھینچ کر سرنگ کے دہانے تک لے جانا ہے۔ پہلے میں اپنی سانس درست کر لوں۔''

''مجھے اپنی مدد کرنے سے نہ روکو زنوبی۔''

''جب کسی وقت مجبور ہو جاؤں گی تو مدد لینا ہی پڑے گی۔ سیڑھی کھینچ کر سرنگ کے دہانے تک لے جانا کچھ زیادہ محنت طلب کام نہیں ہے۔ بس ذرا سانس قابو میں آ جائے میری۔''

''تم شاید مجھ سے کہیں زیادہ باہمت ہو۔''

''ایسی کوئی بات شاید نہ ہو۔ صرف ران کا زخم تمہاری مجبوری بن گیا ہے۔''

''اور تم ایک لنگڑے کی لاٹھی بن گئی ہو۔'' انور پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔

''فضول باتیں نہ کرو۔''

چند منٹ رک کر زنوبیا ہیلی کاپٹر کے دروازے کی طرف گئی۔ انور ہیلی کاپٹر کی روشنی میں تھا لیکن ہیلی کاپٹر کے دروازے پر روشنی نہیں تھی۔ وہ زنوبیا کو ہیولے کے مانند دیکھ سکتا تھا۔ زنوبیا جب سیڑھی گھسیٹ کر سرنگ کے دہانے کی طرف لے جانے لگی تو سنگلاخ زمین پر اس کی رگڑ انور کو صاف سنائی دے رہی تھی۔

تھوڑی دیر میں زنوبیا واپس لوٹ آئی۔ اس کی سانس پھر پھولی ہوئی تھی۔ ''کامیاب ہو گئی ہوں۔'' اس کے لہجے میں مسرت تھی۔ ''سیڑھی لٹکا بھی دی ہے۔''

''تو اٹھوں؟''

''نہیں۔'' زنوبیا نے کہا۔ ''مناسب ہوگا کہ میں پھر اپنی سانسوں پر قابو پا لوں۔ تمہیں سہارا بھی دینا ہے تاکہ آسانی سے چل سکو۔''

''آسانی سے نہ سہی لیکن چل تو سکوں گا۔''
''تمہیں میری بات ماننی چاہیے۔ ڈاکٹر بھی ہوں تمہاری۔''
''میں چاہتا ہوں کہ وقت بالکل ضائع نہ ہو۔''
''ابھی خاصا وقت ہے۔ سات ساڑھے سات تک ہم بستی میں داخل ہو رہے ہوں گے۔ اتنا وقت بھی اس لیے لگے گا کہ تم تیزی سے نہیں چل سکتے۔''
''اس وقت تک روشنی بھی ہو چکی ہو گی۔'' انور کے لہجے میں تشویش تھی۔
''اب یہ تو مجبوری ہے۔'' زنوبیا نے کہا اور اپنی جیب سے اضافی ریوالور نکال کر انور کو دے دیا۔
کچھ دیر بعد جب اس کی سانسیں قابو میں آئیں تو اس نے سہارا دے کر انور کو اٹھایا اور سہارے ہی سے اسے سرنگ کے دہانے کی طرف لے جانے لگی۔
''میری چھٹی حس کہہ رہی ہے زنوبیا کہ ہم کسی خطرے سے ضرور دوچار ہوں گے۔''
''قبل از مرگ واویلا مت کرو۔ جب ایسی کوئی بات ہوگی تو دیکھا جائے گا۔'' وہ ہنسی۔ ''یہ کیوں بھول رہے ہو کہ میں تمہاری یرغمال ہوں۔ وہ لوگ تمہارے خلاف کوئی ایکشن لینے سے پہلے دس بار سوچیں گے۔''
''ہاں یہ ایک کمزور پہلو تو ہے ان کا جو دراصل کمزور نہیں ہے۔''
''اس وقت وہ لوگ سخت بوکھلائے ہوئے ہوں گے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہوگا کہ ہیلی کاپٹر زمین کھا گئی یا آسمان۔''
زنوبیا نے اس قسم کی باتیں جاری رکھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ زخم کی تکلیف سے انور کا دھیان بٹا رہے۔
آخر وہ سرنگ کے دہانے پر پہنچ گئے۔ انور نے دیکھا کہ زنوبیا نے سیڑھی بڑی مضبوطی سے ایک جگہ پھنسا کر نیچے لٹکائی تھی۔
''پہلے میں نیچے اُتروں گی تاکہ جب تم اترو اور اگر کہیں سلپ ہو جاؤ تو میں سنبھال سکوں تمہیں۔''
''اتنی طاقت ور تو نہیں ہو کہ مجھے سنبھال سکو۔''
''ہاں۔'' زنوبیا نے کہا۔ ''دونوں ہی گریں گے لیکن تمہارا زخم زیادہ جھٹکا کھانے سے بچ جائے گا۔''
''چلو اترو۔''
زنوبیا اتر گئی۔ ''اب آؤ تم، کوشش کرنا کہ زخم والی ٹانگ پر کم سے کم دباؤ پڑے۔''
انور نے اترنا شروع کیا۔
''تیرہ اسٹیپ ہیں۔'' زنوبیا نے کہا۔ ''کودنا نہیں پڑے گا۔ آسانی سے پیر زمین کو چھو لیں گے۔''
زخم کی تکلیف سے قطع نظر انور آسانی سے نیچے اتر گیا۔
''ایک کٹھن مرحلہ طے ہو گیا۔'' زنوبیا بولی۔ ''سیڑھی یوں ہی لٹکی رہے گی۔ ہمیں بہرحال واپس تو آنا ہے یہاں۔'' اس نے چلنے کے لیے انور کو سہارا دیا۔
''سمت کا صحیح اندازہ ہے نا؟ کہیں بھٹک نہ جائیں۔''
''بہت دھیان رکھا ہے میں نے، بھٹک نہیں پائیں گے۔''
باتیں کرتے یا اپنی اپنی جگہ خاموشی سے کچھ سوچتے ہوئے وہ اونچی نیچی سنگلاخ زمین پر آگے بڑھتے رہے۔ اپنے ماحول کی طرف سے بھی وہ پوری طرح ہوشیار تھے۔ زخم کی وجہ سے انور زیادہ تیز نہیں چل پا رہا تھا۔
سنگلاخ اونچی نیچی زمین سے گزر کر وہ اس پہاڑی علاقے کو عبور کر کے بڑی حد تک ہموار زمین تک پہنچ گئے۔ اب ہلکا ہلکا سا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ انور کو بستی کا بلند و بالا گرجا دکھائی دینے لگا اور اس نے سکون محسوس کیا۔ منزل قریب آ جائے تو تھکان بھی کم ہو جاتی ہے۔
''گرجا کے قریب سرخ اینٹوں کا ایک مکان ہے۔'' انور نے کہا۔ ''مجھے اسی مکان میں کسی سے ملنا ہے۔''
زنوبیا نے اب بھی اس سے اس کے ''مشن'' کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔
انور نے پادری سیموئل سے رابطہ کرنے سے پہلے برگنزا کا تعاون حاصل کرنا اس لیے ضروری سمجھا تھا کہ وہاں اسے اپنی زخمی ٹانگ کو آرام دینے کا موقع بھی مل جاتا۔ اگر اسے گولی نہ لگی ہوتی تو وہ براہِ راست پادری سیموئل ہی سے ملنے کی کوشش کرتا۔
پندرہ منٹ بعد وہ بستی میں داخل ہو رہے تھے۔ بستی میں دیہاتیوں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ وہ ان دونوں کو توجہ سے دیکھنے لگے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ زنوبیا کو سلام بھی کر رہے تھے۔ اگرچہ وہ سفید کوٹ پہنے ہوئے تھی لیکن اس کے نیچے وردی صاف نظر آ رہی تھی جو انہی کی فوج کی وردی تھی۔ سلام دراصل اس وردی ہی کو کیا جا رہا تھا۔ وہ کچھ متعجب اس بات پر تھے کہ وہ ایک لنگڑاتے ہوئے آدمی کو سہارا دیے ہوئے تھی۔
ان کے سلام کے جواب میں زنوبیا خفیف سا مسکرا

دیتی تھی۔ ان دونوں کے قدم گرجا ہی کی طرف بڑھ رہے تھے اور دیہاتیوں کا رخ بھی گرجا ہی کی طرف تھا جہاں وہ عبادت کرتے۔ اس بستی میں اکثریت دیسی عیسائیوں ہی کی تھی۔

گرجا کے قریب سرخ اینٹوں کا مکان مل گیا تو اس کے دروازے پر جا کر انور نے دستک دی۔ اندر سے کچھ بڑبڑانے کی آواز کے ساتھ ہی دروازے کی طرف آتے ہوئے قدموں کی آواز بھی سنائی دی۔

''کون ہے؟'' جھنجلائی ہوئی خرخراتی آواز تھی۔

''میں آج گرجا نہیں جاؤں گا۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

زنوبیا اور انور کچھ نہیں بولے۔ دروازہ کھولا گیا۔

''میں نے کہا نا کہ طبیعت.....'' وہ ان دونوں کو دیکھ کر نہ صرف چپ ہوا بلکہ زنوبیا کی وردی نے اسے چونکایا بھی۔

''آپریشن بلو۔'' انور نے دھیمی آواز میں کہا۔

اس بات پر وہ پہلے سے زیادہ چونکا۔ وہ ستر سال کا بوڑھا خاصا کمزور بھی تھا۔ اس نے جلدی سے پورا دروازہ کھول دیا تا کہ وہ دونوں اندر داخل ہو سکیں۔

''تم نے آپریشن بلو سنتے ہی دروازہ کھول دیا۔'' اندر داخل ہوتے ہوئے انور نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم برگنزا ہی ہو۔ اگر کوئی اور ہوتا تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ آپریشن بلو کیوں کہا گیا ہے۔''

بوڑھے برگنزا نے اثبات میں سر ہلایا اور دروازہ بند کر لیا۔ زنوبیا اور انور گھر میں داخل ہو چکے تھے۔

''بات بعد میں ہوگی۔'' زنوبیا نے اس سے کہا۔ ''پہلے تم میرے ساتھی کے لیٹنے کا کچھ بندوبست کرو۔''

اسی کمرے میں سال خوردہ سامان کے ساتھ ایک جانب بستر بھی لگا ہوا تھا۔

''بس یہی ہے۔'' اس نے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

زنوبیا نے انور کو لے جا کر بستر پر لٹایا۔ بستر میں انتہائی سی ناگوار بُو کے ساتھ شراب کی بو بھی تھی لیکن بے حد تھکی ہوئی زخمی ٹانگ کی وجہ سے وہ بستر بھی انور کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ہی تھا۔

''کچھ کھانے کا بندوبست ہے؟'' انور نے برگنزا سے پوچھا۔

''انڈے ہیں، ڈبل روٹی ہے۔ آملیٹ بنا دوں؟'' برگنزا نے پوچھا۔

''جو کچھ بھی ہے، لاؤ۔''

زنوبیا اور انور دونوں ہی بھوکے تھے۔ غلطی انور ہی سے ہوئی تھی۔ اس نے ہیلی کاپٹر میں پانی کی چھاگلیں تو رکھوالی تھیں لیکن کھانے کے لیے کہنے کا خیال نہیں رہا تھا۔

برگنزا سر ہلاتا ہوا اندرونی کمرے میں چلا گیا۔ اس نے اپنے کچن وغیرہ کا بندوبست اندرونی کمرے ہی میں کر رکھا ہوگا۔

''ہم دونوں ہی بھوکے تھے۔'' زنوبیا نے کہا۔ ''لیکن دونوں ہی نے ایک دوسرے سے اس کا اظہار نہیں کیا۔''

''حالات ہی ایسے تھے۔'' انور نے کہا، پھر بولا۔ ''اب تک تم نے مجھ سے میرے مشن کے بارے میں نہیں پوچھا۔''

''ضرورت نہیں سمجھی۔ بس یہ خیال تھا کہ جب تم مناسب سمجھو گے، بتا ہی دو گے۔''

''مجھے گرجا کے پادری سیموئل کو ایک پیغام پہنچانا تھا لیکن ٹانگ کے زخم کی وجہ سے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ پادری سیموئل ہی کو یہاں بلوا لوں۔''

''کیسے؟''

''برگنزا کے ذریعے۔ یہ ہمارا ہی آدمی ہے۔''

''تمہارے ملک کے جاسوس یہاں کافی پھیلے ہوئے ہیں۔''

''یہ تو میں نہیں جانتا کہ ہمارے کتنے جاسوس یہاں پھیلے ہوئے ہیں لیکن برگنزا اور سیموئل ہمارے آدمی ہیں۔''

''گویا تمہارا مشن اب مکمل ہونے کو ہے۔''

''اگر کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہوئی۔''

''ابھی تک تو معاملہ ٹھیک ہی جا رہا ہے۔''

''مجھے یہ اندیشہ ہے کہ میری تلاش میں وہ لوگ بستی بستی چھاننا شروع کر سکتے ہیں۔''

زنوبیا کچھ سوچنے لگی، پھر بولی۔ ''تمہارے زخم کی اب کیا حالت ہے؟''

''اتنا چلنا پڑا ہے۔ میرا خیال ہے کہ خون پھر رسنے لگا ہے۔ لیکن شاید زیادہ نہیں۔''

''اگر زیادہ نہیں تو دوسری ڈریسنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اسی پر مزید ڈریسنگ اتنی کس کے کر دی جائے گی کہ خونِ مزید نہ رسے۔ ہم اس مکان میں کب تک رک سکتے ہیں۔''

''اگر کوئی خطرہ پیش نہ آئے تو جب تک ہم چاہیں۔''

''اگر ایسا ہو تو بہتر ہے۔ چند دن میں تمہارا زخم مندمل ہو جائے گا۔ واپسی کا سفر اسی وقت شروع کیا جائے گا۔ تم اس وقت بالکل ٹھیک ہو گئے تو بہتر رہے گا۔''

اس وقت دوسرے کمرے سے آملیٹ بننے کی خوشبو آنے لگی تھی۔

☆☆☆

گرجا میں عبادت کا وقت ختم ہونے کے بعد سیموئل آ گیا۔ اسے برگنزا ہی بُلا کر لایا تھا۔ اس سے گفتگو کرنے سے پہلے انور نے برگنزا کو اندرونی کمرے میں بھیج دیا۔ اس کے سامنے بات کرنا اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔

''میں بریگیڈیئر شمس کا ایک پیغام لے کر آیا ہوں۔'' انور نے سیموئل سے کہا۔ ''وہ میں ابھی لکھ کر تمہیں دوں گا۔ وہ تم اس بریگیڈ تک پہنچاؤ گے جو شمال میں کسی جگہ ہے۔ کس جگہ ہے، یہ مجھے نہیں معلوم۔ بریگیڈیئر شمس نے مجھے اتنا ہی بتایا تھا کہ تم وہ پیغام اس بریگیڈ تک پہنچا سکتے ہو۔''

''یقیناً۔'' سیموئل نے کہا۔ ''میں پہنچا سکتا ہوں۔''

''وہ میں ابھی تمہیں لکھ کر دے دیتا ہوں۔ زبانی تو تم یاد نہیں رکھ سکو گے۔ یہ دس بجے سے پہلے پہنچ جانا چاہیے۔''

''پہنچ جائے گا۔''

ان باتوں کے دوران میں سیموئل بار بار کن انکھیوں سے زنوبیا کی طرف دیکھتا رہا تھا کیونکہ وہ اسی ملک کی فوجی وردی میں تھی۔

انور نے پیغام لکھ کر سیموئل کو دیا اور رخصت کر دیا۔ اس کا مشن مکمل ہو چکا تھا۔ اس نے بہت سکون اور تازگی محسوس کی۔

زنوبیا بولی۔ ''اگر وہ پیغام یہاں کے لوگوں کے ہاتھ لگ جائے تو؟''

''تو وہ اسے سمجھ نہیں سکیں گے۔ کوڈ ورڈز میں ہے جن کا مطلب میں بھی نہیں جانتا۔ جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ وہ پیغام یہاں کے لوگوں کے ہاتھ لگ سکتا ہے، تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہوگا۔ جو کام میرے سپرد کیا تھا، وہ میں سرانجام دے چکا ہوں۔ بریگیڈیئر صاحب کو بھروسا اور یقین تو ہوگا سیموئل پر۔''

''میں تمہیں مبارک باد دیتی ہوں کہ تمہارا فرض ادا ہوا۔''

''اس میں پچاس فیصد کی شریک تم بھی ہو۔''

''ان دونوں ملکوں کے معاملات سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے جو کچھ کیا، تمہاری محبت میں کیا۔ اچھا اب میں تمہاری ڈریسنگ پر مزید پٹیاں کس دوں۔ برگنزا کو بلا کر اس سے کہہ دو کہ وہ اس وقت ادھر نہ آئے۔''

انور نے برگنزا کو آواز دے کر بُلایا۔

''تم نے کہا تھا کہ تم بیمار ہو۔ اب طبیعت کیسی ہے؟''

''جیسی تھی، ویسی ہی ہے۔ بدن ٹوٹ رہا ہے۔ ہلکا سا بخار بھی ہے شاید۔''

زنوبیا نے اس کی بیماری سے متعلق چند سوال کیے، پھر اسے چار ٹیبلیٹ دیں اور ہدایت کی کہ دو دو گھنٹے کے وقفے سے کھاتا رہے، ٹھیک ہو جائے گا۔

''میں نے تمہیں بتایا ہے کہ ہمیں چند دن یہاں رکنا ہوگا۔ کیا تم اپنے سونے کا بندوبست اندر کے کمرے میں کر لو گے؟'' انور بولا۔

''وہ سب ہو جائے گا، اس کی فکر نہ کریں۔''

''لیکن جب اس کمرے میں آنا تو کھٹکھٹا کر آنا۔''

''اتنا تو میں خود بھی سمجھ سکتا ہوں۔'' برگنزا نے جواب دیتے ہوئے ایک اچٹتی سی نظر زنوبیا پر ڈالی۔

''کیا یہاں ایک اور بستر کا بندوبست ہو سکتا ہے؟'' زنوبیا نے پوچھا۔

''بازار سے لانا پڑے گا۔''

زنوبیا نے کچھ کرنسی نکال کر اسے دی اور کہا۔ ''شام تک تمہاری طبیعت خاصی بہتر ہو جائے گی۔ اس وقت لے آنا۔''

''حالت اتنی زیادہ خراب نہیں ہے۔ فادر کو بلانے بھی تو گیا تھا۔ بستر میں ابھی خرید لاتا ہوں۔''

''کتنا وقت لگے گا؟''

''ایک گھنٹا تو لگ ہی جائے گا۔''

''بس تو لے آؤ۔''

برگنزا کے جانے کے بعد زنوبیا نے انور کی ڈریسنگ پر مزید پٹیاں کسیں۔

''یہ زخم کب تک ٹھیک ہو جائے گا زنوبی؟''

''روزانہ ڈریسنگ کرنا ہو گی۔ اتنا سامان میرے پاس نہیں ہے۔ برگنزا ہی کسی میڈیکل اسٹور سے لا سکتا ہے۔ اگر اس بستی میں نہ ملا تو اسے شہر جانا ہوگا۔ پرسوں کی ڈریسنگ کے بعد میں اندازہ لگا سکوں گی کہ زخم ٹھیک ہونے میں کتنے دن لگ سکتے ہیں۔''

برگنزا ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت میں گدا، چادر، تکیہ اور اوڑھنے کے لیے ایک کھیس لے آیا۔ اس طرح اسی کمرے میں زنوبیا کے آرام کرنے کا بندوبست بھی ہو گیا۔

ایک دن چھوڑ کر زنوبیا نے انور کی ڈریسنگ کرتے وقت کہا۔ ”ہیلنگ تیزی سے ہو رہی ہے۔ بعض لوگوں کے ایسے زخم زیادہ دن میں ٹھیک ہوتے ہیں۔ تمہارا زخم پانچ چھ دن میں پوری طرح مندمل ہو جائے گا۔“

”یعنی ہم زیادہ سے زیادہ چھ دن میں واپسی کا سفر شروع کر سکتے ہیں؟“

”یقیناً۔“ زنوبیا نے جواب دیا۔

پانچویں دن زنوبیا نے کہا۔ ”کل کی ڈریسنگ کے بعد ضرورت نہیں رہے گی۔ میں سوچ رہی ہوں کہ آج ذرا سرنگ کی طرف ایک چکر لگا آؤں۔ اطمینان ہو جائے گا کہ وہ لوگ ہمارا ہیلی کاپٹر تلاش نہیں کر سکے ہیں۔“

”کیا اس کا امکان ہے؟“

”خدشہ تو ہے۔“

”میں بھی چلوں گا۔“

”فضول بات۔“ زنوبیا نے محبت آمیز غصے سے کہا۔ ”تم جتنا زیادہ آرام کرلو، تمہارے لیے بہتر ہے۔“

”بہت اچھا ڈاکٹر صاحبہ۔“ انور نے مسکرا کر کہا۔ ”لیکن اندھیرا ہونے کے بعد جانا۔“

ان پانچ دنوں میں اسمارٹ فون کے ذریعے وہ چینلز کی خبریں بھی سنتے رہے تھے اور انہوں نے تین دن پہلے یہ خبر سنی تھی کہ انور کے ملک کی فوجوں نے اپنے دشمن کے ایک چھوٹے شہر پر قبضہ کرلیا تھا۔

پہلی بار خبر میں بتایا گیا تھا کہ شہر پر اچانک حملہ دو بریگیڈز نے مختلف سمتوں سے کیا تھا اور اس کے لیے بڑی غیر معمولی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔

اس خبر کو سن کر زنوبیا نے کہا تھا۔ ”اس کا مطلب شاید یہ ہے کہ تم نے جو پیغام پہنچایا تھا، وہ اسی کی منصوبہ بندی کے سلسلے میں ہوگا۔“

”شاید ایسا ہی ہو۔“

”بین الاقوامی سطح پر اس کے کیا اثرات پڑیں گے؟ میرا خیال ہے کہ دونوں ملکوں میں اب باقاعدہ جنگ کسی وقت بھی چھڑ سکتی ہے۔ اس کے کیا نتائج ہوں گے؟“

”میں ان دونوں ہی معاملوں پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکتا۔ اگر میرے ملک پر کوئی منفی اثر پڑتا ہے تو اس کی ذمے داری مجھ پر یا میری فوج پر عائد نہیں ہوتی۔ تم جانتی ہو، فوج کا کام حکومت کے حکم پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا نتائج کی ذمے داری بھی حکومت پر ہوگی۔ فوج کو اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔“

بعد کی خبروں سے ظاہر ہوا تھا کہ بڑی طاقتوں میں خاصی ہلچل مچ گئی تھی۔ زنوبیا کے ملک نے انور کے ملک کو شہر چھوڑنے کے لیے چوبیس گھنٹے کا الٹی میٹم دے دیا تھا جسے بڑی طاقتوں نے دباؤ ڈال کر واپس کروایا۔ بڑی طاقتوں کو خوب اندازہ تھا کہ ان دونوں ممالک کی جنگ سارے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ اسرائیل بھی زنوبیا کے ملک کا اتحادی بن سکتا ہے۔ اس کے نتائج بھی ہولناک نکل سکتے تھے اس لیے سپر پاورز چاہتی تھیں کہ اس معاملے کو مذاکرات کی میز پر حل کیا جائے۔

یو این او نے بھی سلامتی کونسل کا ہنگامی اجلاس طلب کر لیا تھا۔ اس میں ملوث ملکوں کے وزرائے خارجہ اور وزرائے دفاع بھی شریک ہوئے۔ نہایت گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ انور کے ملک کا موقف یہ تھا کہ اس کی تین نہایت اہم فوجی چوکیوں پر جو قبضہ کیا گیا تھا، وہ واپس کر دی جائیں تو اس کا شہر بھی چھوڑ دیا جائے گا۔

دلائل زنوبیا کے ملک نے بھی جھوٹے لیکن مضبوط دیے۔ دیگر ممالک کے پاس کوئی جواز نہیں تھا کہ وہ ان دلائل کو جھوٹ قرار دے۔

اس اجلاس کا کوئی نتیجہ نکلتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان حالات میں ایک سپر پاور نے دباؤ ڈالا کہ دونوں ملکوں کے سربراہ اس کے دارالحکومت اگر ون او ون مذاکرات کریں اور اگر چاہیں تو سپر پاور بھی ان مذاکرات میں مبصر کی حیثیت سے شامل ہو جائے گی، یا ثالث کا کردار بھی ادا کر سکتی ہے۔

اس دن دونوں ملکوں کے سربراہوں کی ملاقات ہونی تھی جس رات زنوبیا ہیلی کاپٹر کا جائزہ لینے کے لیے سرنگ کی طرف گئی۔ جنگ چھڑ جانے کی صورت میں یہاں سے نکل کر اپنے ملک جانا تقریباً ناممکن سا ہو جائے گا، انور بستر پر لیٹا سوچتا رہا۔ فضاؤں میں دونوں ملکوں کے جنگی طیارے پرواز کر رہے ہوں گے جن سے ایک ہیلی کاپٹر کا بچ نکلنا ایک معجزہ ہی ہوتا۔ انور ہی کے ملک کا کوئی طیارہ ان کے ہیلی کاپٹر کو مار گراتا کیونکہ اس پر زنوبیا کے ملک کا نشان موجود تھا۔

اس کے علاوہ یہ بھی یقینی تھا کہ حالات کی کشیدگی کے باعث دونوں ہی ملکوں کے جنگی طیاروں نے سرحد پر پٹرولنگ تو شروع کر ہی دی ہوگی۔ ان حالات میں وہ جب ہیلی کاپٹر کو اپنے ملک کی طرف لے جانا چاہتا تو کچھ قیاس نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ردِعمل کیا ہوتا۔ جنگی طیارے ہیلی کاپٹر کو اس طرف جانے سے روکنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے۔

اس وقت شاید یہ پروا بھی نہ کی جاتی کہ انہی کی فوج کے ایک کیپٹن کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔

اس سوچ بچار میں نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا کہ زور زور سے بیرونی دروازہ پیٹا گیا۔

انور چونک پڑا۔ یہ خدشہ بہرحال تھا کہ دشمن انہیں تلاش کرتا ہوا اس بستی میں بھی پہنچ سکتا تھا اور بستی کے لوگوں سے معلومات حاصل کر کے وہ برگنزا کے گھر کا رخ کر سکتے تھے۔

برگنزا دروازہ پیٹے جانے کی آواز سن کر اپنے کمرے سے نکلا۔

''اس طرح کون دروازہ پیٹ سکتا ہے؟'' انور کی طرف دیکھتے ہوئے برگنزا کے چہرے سے اس کی تشویش صاف ظاہر تھی۔

ایک بار دروازہ پیٹے جانے کے بعد باہر خاموشی چھا گئی تھی۔ دروازہ کھلنے کا انتظار کیا جارہا ہوگا۔ لیکن اگر دروازہ نہ کھولا جاتا تو وہ اندر آنے کے لیے دروازہ توڑ بھی سکتے تھے۔

''دروازہ کھول دو۔'' انور نے برگنزا سے کہا۔

برگنزا دروازے کی طرف بڑھا۔ انور نے ریوالور نکال لیا۔ اس نے کسی بھی سمت سے فرار ہونے کے بارے میں ذرا بھی نہیں سوچا تھا۔ یہ بات اس کی دانست میں یقینی تھی کہ گھر کو چاروں طرف سے گھیرا بھی جاچکا ہوگا۔ اسی لیے اس نے فوری طور پر فیصلہ کیا تھا کہ گرفتاری کے بعد اذیتیں برداشت کرنے سے بہتر ہے کہ اسی وقت زندگی اور موت کا فیصلہ ہوجائے۔ وہ تیزی سے فائرنگ کر کے دو تین کو تو ہلاک کر ہی دیتا اور جوابی فائرنگ اس کا جسم بھی چھلنی کر دیتی۔ ریوالور نکالنے کے ساتھ ہی وہ بستر سے اٹھ بھی گیا تھا۔

برگنزا نے دروازہ کھولا اور انور نے جو کچھ دیکھا، اس کے نتیجے میں بستر پر گر سا پڑا۔ اندر آنے والی زنوبیا تھی۔

''اس طرح دروازہ پیٹنے کی کیا ضرورت تھی؟'' اس کے منہ سے نکلا لیکن زنوبیا کی حالت دیکھ کر اسے جواب کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔

زنوبیا نہ صرف پریشان تھی بلکہ اس کے چہرے کا رنگ بھی اڑا اڑا سا تھا۔ سانس بھی اتنی پھولی ہوئی تھی جیسے وہ بہت دور سے دوڑتی ہوئی آئی ہو۔

''دروازہ میں نے اس لیے پیٹا کہ برگنزا دروازہ کھولنے میں دیر نہ لگائے۔'' زنوبیا نے تیزی سے انور کے قریب آتے ہوئے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا، پھر برگنزا کی طرف دیکھا جو دروازہ بند کرنے کے بعد اسی کی طرف متوجہ تھا۔ زنوبیا نے اس سے کہا۔ ''تم اندر اپنے کمرے میں جاؤ۔''

''آخر ہوا کیا ہے؟'' انور بولا۔ ''تم بہت گھبرائی ہوئی ہو اور سانس بھی اتنی پھولی ہوئی ہے جیسے......''

''گھبراہٹ ہی میں زور سے دروازہ پیٹ ڈالا تھا۔'' زنوبیا نے جواب دیتے ہوئے برگنزا کی طرف دیکھا جو اندرونی کمرے کی طرف جارہا تھا۔

انور سمجھ گیا کہ جو بات بھی تھی، وہ زنوبیا، برگنزا کے سامنے نہیں کہنا چاہتی تھی۔

پھر جیسے ہی برگنزا نے اندرونی کمرے میں جانے کے بعد دروازہ بند کیا، زنوبیا بول پڑی۔ ''زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ بعد ہم خطرے میں ہوں گے انور! وہ لوگ سراغ رساں کتوں کے ساتھ بستی کی طرف آرہے ہیں۔ انہیں ہمارا سراغ سرنگ سے ہی لگا ہوگا۔ ہماری تلاش میں وہ سرنگ تک پہنچ ہی گئے ہوں گے۔ اب اگر ہم یہاں سے کہیں بھاگیں گے بھی تو جائیں گے کہاں؟ ہیلی کاپٹر تو ہمارے ہاتھ سے نکل ہی گیا۔'' وہ تیزی سے بولتی ہی چلی گئی تھی۔

''ہوں۔'' انور اس کا منہ تکتا رہ گیا لیکن اس کا دماغ تیزی سے مختلف پہلوؤں پر غور کررہا تھا۔

''یہ ریوالور کیوں ہے تمہارے ہاتھ میں۔''

''میں سمجھا تھا کہ دشمن سراغ لگا کر یہاں پہنچ گیا ہے۔ گرفتار ہو کر ناقابلِ برداشت اذیت سہنے سے بہتر یہی تھا کہ میں دو ایک کو ٹھکانے لگا کر ان کی فائرنگ سے یہیں مارا جاؤں۔''

''ٹھیک فیصلہ کیا تھا تم نے مگر اب کیا کیا جائے؟ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے انور۔''

''ہیلی کاپٹر تو ہمارے ہاتھ سے نکل ہی گیا۔''

''ہاں، وہ تو گیا۔''

''نہ جاتا تو بھی بیکار تھا۔''

''کیوں؟''

زنوبیا کے آنے سے پہلے انور نے جو کچھ سوچا تھا، اس نے اس کا اظہار کیا، پھر بولا۔ ''اب ایک اور بات میرے دماغ میں آرہی ہے۔''

''جلدی بتاؤ انور! جلدی۔'' زنوبیا کی سانس اب قدرے قابو میں آگئی تھی۔

''تم بدستور میری یرغمالی بنی ہوئی ہو۔'' انور خفیف سا مسکرایا۔

''میں تمہارا مطلب سمجھ گئی۔ اب تم ان سے کیا مطالبہ کرو گے؟''
''کیا تم طیارہ اڑانا بھی جانتی ہو؟''
''نہیں۔ تو کیا طیارے کا مطالبہ کرو گے؟''
''پہلے میرے سوال کا جواب دو۔''
''نہیں۔ میں نہیں جانتی۔''
''لیکن میں جانتا ہوں۔ فوج میں آنے سے پہلے میں ایک فلائنگ کلب کا ممبر رہا ہوں۔ جہاز اڑانا سیکھ لیا تھا میں نے۔''
''تو اب طیارے کی ڈیمانڈ؟''
''ہاں، اور وہ بھی جیٹ طیارے کی، فائٹر طیارے کی۔''
زنوبیا حیرت سے بولی۔ ''کیا فلائنگ کلب میں فائٹر طیاروں کی ٹریننگ بھی دی جاتی ہے؟''
''نہیں۔ اس کی تربیت تو نہیں دی جاتی لیکن اس موقع پر ہمیں جیٹ فائٹر ہی کی ضرورت ہے۔''
''کیوں؟''
''میں ابھی ہیلی کاپٹر کے بارے میں جس خطرے کا ذکر کر چکا ہوں، وہی خطرہ طیارے کو بھی پیش آئے گا۔ ہمیں ان طیاروں سے لڑنا پڑ سکتا ہے۔''
''تم نے جیٹ طیارے کی بھی ٹریننگ نہیں لی اور طیاروں سے لڑنے کی بات بھی کر رہے ہو۔ کیا یہ ایک خواب نہیں؟''
''جب زندگی میں ایسا کوئی موقع آ جائے تو خواب ہی دیکھنا پڑتا ہے۔''
''لیکن......''
انور نے اس کی بات نہیں سنی اور برگنزا کو آواز دی۔ برگنزا فوراً ہی دروازہ کھول کر باہر آیا۔
''کوئی ڈوری مل جائے گی؟'' انور نے اس سے پوچھا۔ ''اگر ریشمی ہو تو اچھا ہے۔ بس چھ سات فٹ کی۔''
''ریشمی ڈوری تو ہے لیکن زیادہ لمبی ہے۔''
''قینچی ہو تو اسے کاٹا جا سکتا ہے۔''
برگنزا سر ہلا کر چلا گیا، پھر جلد ہی لوٹا۔ اس کے ہاتھ میں ریشمی ڈوری اور قینچی تھی۔ انور نے ڈوری کاٹتے ہوئے کہا۔ ''برگنزا! ہم اب خطرے میں ہیں۔ دشمن کسی وقت بھی یہاں پہنچ سکتا ہے۔ تمہیں یہاں سے فوراً کہیں چلا جانا چاہیے بلکہ بہتر ہے کہ فادر سیموئل کے پاس جاؤ۔ اسے بھی خطرے سے آگاہ کر دو۔ بستی کے لوگوں نے اسے یہاں آتے اور تمہیں گرجا جاتے دیکھ لیا ہوگا۔ وہ بتا دیں گے ہمارے دشمن کو۔ تم دونوں ہی کو اب اپنی جان بچانی چاہیے۔ فرار ہو جاؤ یہاں سے کہیں بھی۔''
برگنزا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ''اور...... آپ لوگ؟''
''ہم بھی کچھ کریں گے۔ تم تو یہاں سے نکلو، فوراً۔''
''اتنا وقت ہے کہ میں اپنا ضروری سامان لے لوں؟''
''میرا خیال ہے کہ زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ ہیں۔'' انور نے ضروری سمجھا کہ اسے کم وقت دے۔ زنوبیا کے اندازے کے مطابق تو ابھی دس بارہ منٹ باقی تھے۔
برگنزا تیزی سے اندرونی کمرے میں چلا گیا۔
''یہ ڈوری......'' زنوبیا کا ذہن الجھ رہا تھا۔
''اس سے تمہارے ہاتھ باندھوں گا۔'' انور نے جواب دیا۔ ''اب دشمن پر ظاہر کروں گا کہ تم میری باقاعدہ قیدی بن چکی ہو۔''
''جیٹ فائٹر کے بارے میں تم کیا سوچ رہے ہو؟''
انور اسے وضاحت سے بتانے لگا کہ وہ کیا سوچ چکا ہے۔ سب کچھ سننے کے بعد زنوبیا پریشان نظر آئی اور بولی۔
''تمہاری یادداشت کتنی ہی اچھی سہی لیکن یہ معاملہ ایسا نہیں کہ یادداشت پر مکمل بھروسا کیا جا سکے۔ ذرا سی بھی بھول ہم دونوں کی ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے۔''
''کیا ہم ساتھ جینے اور مرنے کی بات نہیں کر چکے۔''
انور نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ہاں اگر تمہارے دماغ میں کوئی اور تدبیر ہو تو بتاؤ۔''
''میرا دماغ تو اس وقت شل ہو گیا ہے۔''
اسی وقت برگنزا اپنے کمرے سے نکلا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی۔ وہ ان دونوں کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے رخصت ہو گیا۔ انور کے کہنے پر زنوبیا نے بیرونی دروازہ بند کر لیا۔
''اب تمہارے ہاتھ باندھ دیتا ہوں۔'' انور نے کہا۔ ''اتنی سختی سے نہیں باندھوں گا کہ تمہیں تکلیف ہو۔''
زنوبیا خاموش رہی۔ وہ فکرمند دکھائی دے رہی تھی۔ انور نے منصوبہ بنایا تھا، وہ بے حد خطرناک تھا۔ انور نے اس کے ہاتھ اس کی گردن کی پشت پر رکھ کر ڈوری سے باندھ دیے۔
''تکلیف تو نہیں ہو رہی؟''
''نہیں۔'' زنوبیا کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''اب ہمیں ان کا انتظار کرنا ہے۔'' انور نے کہا ہی تھا کہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

انور نے طویل سانس لی۔ ''آ گئے۔''

''کاش ایک دن اور مل جاتا۔'' زنوبیا کی آواز اب بھی بھرائی ہوئی تھی۔ ''تمہارا زخم بالکل ٹھیک ہو چکا ہوتا۔''

کتوں کی آواز اب بالکل قریب آ چکی تھی۔

''میں نے چل کر دیکھا تھا۔ بہت معمولی سی تکلیف ہوئی۔ قابلِ برداشت ہے۔''

''زیادہ حرکت سے زخم کھل بھی سکتا ہے۔''

اس وقت کتوں کی آواز مکان کے دروازے پر آ چکی تھی۔ پھر دروازہ پیٹا گیا، ساتھ ہی آواز آئی۔ ''دروازہ کھولو! ہم نے تمہیں ڈھونڈ لیا ہے۔ تم اس طرح کب تک، کہاں تک بھاگو گے۔''

انور، زنوبیا کے ساتھ دروازے کے قریب گیا۔

''مت بھولو کہ تمہاری کیپٹن اب بھی میرے قبضے میں ہے۔'' انور نے کہا۔ ''میں خود چاہتا ہوں کہ تم سے بات کروں۔ دروازہ کھول رہا ہوں۔''

اس نے دروازہ اس طرح کھولا کہ زنوبیا کو خود سے قدرے آگے رکھا اور اس کی کمر اپنے بائیں ہاتھ سے جکڑے رکھی۔ جس ہاتھ سے دروازہ کھولا تھا، اسی ہاتھ میں ریوالور بھی تھا۔

جو چند افراد دکھائی دیے، وہ فوجی وردی میں ملبوس نہیں تھے۔ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ وہ اس ملک کی کسی خفیہ ایجنسی کے ہوں گے۔

''دیکھ رہے ہو تم لوگ؟'' انور بولا۔ ''تمہاری کیپٹن اب بھی میرے قبضے میں ہے۔ تم میں سے کون بات کرے گا مجھ سے؟''

''کیپٹن کو چھوڑ دو۔ ہم تمہیں جانے دیں گے۔ میں میجر ہوں۔ یہ وعدہ پوری ذمّے داری سے کر رہا ہوں۔''

''میں بے وقوف نہیں ہوں کہ تمہاری ذمّے داری سمجھ نہ سکوں۔'' انور نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ''میں اس بستی کے مکان میں اس لیے آیا تھا کہ آرام کر کے اپنے زخم کو ٹھیک ہونے کا وقت دوں۔ اس کے بعد میں پھر ہیلی کاپٹر کی طرف جاتا لیکن تم لوگوں نے غالباً ہیلی کاپٹر ڈھونڈ لیا ہے۔''

کتے اب بھی بھونک رہے تھے، زنوبیا اور انور پر جھپٹ پڑنا چاہتے تھے لیکن ان کے گلے میں بندھے ہوئے پٹے سے منسلک زنجیر کھینچ کر انہیں قابو میں رکھا جا رہا تھا۔ وہ پانچ افراد تھے جن میں سے ایک نے خود کو میجر بتایا تھا۔

''تم اِدھر اُدھر کیوں بھٹک رہے ہو؟'' میجر بولا۔ ''آخر چاہتے کیا ہو؟''

''میں فوری طور پر تم لوگوں سے مطالبہ کرتا کہ مجھے اپنے پرائم منسٹر سے ملاؤ لیکن زخم کی وجہ سے میرے لیے ضروری تھا کہ وہ ٹھیک ہو جائے۔ اب میں ٹھیک ہوں اور اپنا نیا مطالبہ تمہارے سامنے رکھ رہا ہوں۔''

''کیا تم پاگل ہو؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ پرائم منسٹر تم سے ملنے کے لیے آئیں۔''

''میں تو جا سکتا ہوں تمہارے دارالحکومت تک۔''

''کیا تم پھر ہیلی کاپٹر کا مطالبہ کرو گے؟''

''نہیں۔ اب مجھے جیٹ فائٹر کی ضرورت ہے۔'' انور نے کہا۔ ''وہاں تک پہنچنے میں جیٹ کو بھی پونے دو گھنٹے لگیں گے۔''

''تم جیٹ اڑا سکتے ہو؟''

''جیٹ کے ساتھ مجھے اس کے پائلٹ کی بھی ضرورت ہے۔ جیٹ میں میزائل، مشین گن، سب کچھ ہونا چاہیے۔ یہ میں اس لیے چاہتا ہوں کہ اگر مجھے گھیرے کی کوشش کی گئی تو میں ان سے لڑ مروں گا۔''

''ہمارا پائلٹ فائر کیسے کھول سکتا ہے؟''

''اسے وہ سب کچھ کرنا پڑے گا جو میں اس سے کہوں گا۔ دوسری صورت میں اس کی زندگی ختم کی جا سکتی ہے۔''

''طیارہ بھی تباہ ہو جائے گا۔ تم بھی مارے جاؤ گے اور ہماری کیپٹن بھی۔''

''تمہاری کیپٹن کی زندگی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر تم لوگ اسے زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو وہ کرو، جو میں چاہتا ہوں۔ رہی میرے مر جانے کی بات تو اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ جب میں تمہارے ملک میں آیا تھا، تبھی سوچ چکا تھا کہ زندہ واپس لوٹنا شاید مشکل ہو۔ بس ایک پیغام پہنچانا ہے تمہارے پرائم منسٹر کو۔ انہیں مجھ سے ملنے ائرپورٹ تک آنے کی زحمت تو کرنا ہی پڑے گی۔''

''بہتر ہوگا کہ تم اپنی بچت کا کوئی ایسا راستہ سوچو جو ہمارے لیے قابلِ قبول ہو۔''

جو میں کہہ چکا ہوں، اس کے سوا کچھ نہیں۔'' انور نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اپنے بڑوں سے مشورہ کر لو۔ اس کے لیے میں تمہیں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں دوں گا۔''

پھر انور نے اسے اپنا موبائل نمبر بتا کر جواب کا

انتظار کیے بغیر دروازہ بند کرلیا اور چٹخنی لگالی۔ وہ زنوبیا کے ساتھ بستر تک لوٹا۔

''ان لوگوں کا جواب ملنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ اتنی دیر کے لیے میں تمہارے ہاتھ تو کھول دوں۔'' انور نے اس کے ہاتھوں پر بندھی ڈوری کھولتے ہوئے کہا پھر بولا۔ ''انہیں میرا مطالبہ تو ماننا ہی پڑے گا۔ پرائم منسٹر والی بات بھی فوری طور پر تو وہ مان لیں گے اس دوران میں منصوبہ بندی کرتے رہیں گے مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی۔''

''بہت غیر یقینی حالات ہیں انور۔'' زنوبیا بہت پریشان نظر آرہی تھی۔

''وہ تو مجھے بھی اندازہ ہے، مگر ان حالات سے گزرنا تو ہوگا۔'' انور نے کہا۔ ''اب ان کی کال کا انتظار کرنا ہے۔ نمبر تو دے دیا ہے انہیں۔''

بیس منٹ بعد کال آگئی۔ ''میجر بول رہا ہوں۔'' آواز آئی۔ ''تمہارا مطالبہ مان لیا گیا ہے۔ ائرپورٹ پر جیٹ تمہارے لیے تیار ہے اور اس کا پائلٹ بھی۔ جیٹ میں میزائل وغیرہ سب کچھ ہے۔''

''ائرپورٹ کتنی دور ہے؟''

''تمہارے لیے کار بھی تیار ہے جو تمہیں ائرپورٹ لے جائے گی۔''

انور نے موبائل کا اسپیکر آن کر دیا تھا تاکہ زنوبیا بھی وہ گفتگو سن سکے اور زنوبیا نے قلم کاغذ بھی سنبھال لیا تھا تاکہ اگر انور کو کسی قسم کا مشورہ دینے کی ضرورت پیش آئے تو وہ لکھ کر مشورہ دے سکے۔ اگر وہ بولتی تو اس کی آواز دوسری طرف سُن لی جاتی۔

''کار تو یقیناً تیار کروائی ہوگی تم لوگوں نے۔ میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ ائرپورٹ کتنی دور ہے۔''

''ایک گھنٹے کا راستہ ہے۔''

''یعنی شہری ائرپورٹ؟''

''ہاں۔''

اس اثنا میں زنوبیا نے جلدی سے یہ جملہ لکھ لیا تھا۔ ''یہاں سے چار پانچ فرلانگ دور بھی ایک ائرپورٹ ہے۔''

انور نے وہ تحریر پڑھ کر کہا۔ ''طیارہ مجھے قریبی ائرپورٹ پر چاہیے۔ ایک گھنٹے کا سفر میں نہیں کروں گا۔''

زنوبیا نے مزید لکھا تھا۔ ''فوج کا چھوٹا سا ائرپورٹ ہے۔''

''یہی ائرپورٹ قریب ہے۔'' جواب آیا۔

''جھوٹ بول رہے ہو۔'' انور نے زنوبیا کی تحریر پڑھ کر غصہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ''یہاں آنے سے پہلے مجھے اس علاقے کی ہر بات سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ یہاں سے چار پانچ فرلانگ کے فاصلے پر بھی ایک چھوٹا سا ائرپورٹ بنایا گیا ہے تاکہ تمہاری فوج اسے ہنگامی حالات میں استعمال کر سکے۔''

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ یہ بھی محسوس ہوا کہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ لیا گیا تھا۔

''مشورہ ہو رہا ہوگا۔'' انور نے بھی ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر زنوبیا سے کہا۔

زنوبیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

قدرے رک کر دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''اس ائرپورٹ کی مرمت ہو رہی ہے۔''

''جھوٹ بول رہے ہو۔ تم مجھ سے طویل فاصلہ طے کروانا چاہتے ہو۔ کوئی منصوبہ بنایا ہوگا مجھ پر ہاتھ ڈالنے کے لیے۔ نہیں میجر! بے وقوف مت سمجھو مجھے۔ اگر اس ائرپورٹ کی مرمت بھی ہو رہی ہے تو اسے آدھے گھنٹے کے اندر مکمل کرواؤ اور اس طیارے کو یہاں لاؤ جو تم نے ایک گھنٹے کے فاصلے پر تیار کروایا ہے میرے لیے۔ صرف آدھا گھنٹا۔ میں اب تمہاری آواز سنوں گا تو صرف یہ کہ طیارہ یہاں آگیا ہے۔''

انور نے دوسری طرف کی کوئی اور بات سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا اور زنوبیا کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''فی الحال تو ان کا باپ بھی میری بات مانے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے چہرے سے پریشانی کا تاثر ختم نہیں ہو رہا ہے۔''

''میں فوج میں سہی لیکن بہرحال، تم مرد ہو۔ اپنے ذہن پر دباؤ نہ لینا بہت مشکل ہوتا ہے عورتوں کے لیے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض عورتوں نے اپنی باجبروت حکمرانی کی تاریخ رقم کی ہے۔ میں بدقسمتی سے اس قسم کی نہیں ہوں۔ مجھے ڈر صرف یہ ہے کہ تمہیں کچھ ہوگیا تو میں کیسے سانس لے سکوں گی۔''

''زنوبی!'' انور نے پیار سے کہا۔ ''حالات ایسے ہیں کہ صرف مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ جو کچھ بھی ہوگا، دونوں کے ساتھ ہوگا۔ یہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں، ہم اب ساتھ جئیں گے، ساتھ مریں گے۔''

''میری شدید خواہش ہے کہ ایسا ہی ہو۔''

''ایسا ہی ہوگا۔''

آدھے گھنٹے بعد میجر کی کال آگئی۔ ''ائرپورٹ بھی

ٹھیک کر دیا گیا ہے اور طیارہ بھی آ گیا ہے۔ تمہارے لیے گاڑی گھر کے دروازے پر آ چکی ہے۔ ڈرائیور بھی ہے۔‘‘

’’مجھے ڈرائیور کی ضرورت نہیں۔‘‘

’’ائر پورٹ کا راستہ جانتے ہو؟‘‘

’’مجھے یقین تھا کہ تمہاری کیپٹن ڈاکٹر کو اس ائر پورٹ کا راستہ ضرور معلوم ہوگا۔ میں نے اس سے پوچھا تو اثبات میں جواب دینا ہی اس نے اپنے من میں بہتر سمجھا۔ وہ مجھے کوئی ایسا موقع نہیں دینا چاہتی کہ میں اس کے ساتھ زیادتی کروں۔ میں نے اسے اب تک اس کے علاوہ کوئی تکلیف نہیں دی ہے کہ تم لوگوں کا سامنا ہونے کے باعث اس کے ہاتھ باندھ دیے تھے جو تم سے بات کرنے کے بعد کھول بھی دیے۔ اب گاڑی وہی چلائے گی۔ میں اس کے ساتھ دو تین منٹ بعد باہر نکلوں گا۔ اس کے ہاتھ پھر باندھنا ہیں۔‘‘

’’بندھے ہاتھوں سے وہ ڈرائیو کیسے کر سکیں گی؟‘‘

’’یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔‘‘ انور نے جواب دیا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

’’گردن پر ہاتھ بندھے ہوں گے تو ڈرائیو کیسے کروں گی؟‘‘ زنوبیا بولی۔

’’اب ہاتھ سامنے ہی سے باندھوں گا انور نے ڈوری سنبھالتے ہوئے کہا۔ ’’دیکھتی جاؤ، میں کس طرح باندھتا ہوں۔‘‘

زنوبیا نے ہاتھ آگے بڑھا دیے۔

اس مرتبہ انور نے اس کے ہاتھ اس طرح باندھے کہ دونوں ہاتھوں کے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ وہ اسٹیئرنگ سنبھال سکتی تھی۔

’’بروقت تدبیر آ جاتی ہے تمہارے دماغ میں۔‘‘ زنوبیا نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ’’تمہاری اس صلاحیت کی وجہ سے میں امید رکھ سکتی ہوں کہ ہم کامیاب ہوں گے۔‘‘

’’یقیناً۔‘‘ انور نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ’’میں ناکامی کا خیال اپنے ذہن میں بہت کم لاتا ہوں۔‘‘

اس کے ساتھ زنوبیا بھی کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ دونوں دروازے کی طرف بڑھے۔ جب انہوں نے دروازہ کھول کر باہر قدم رکھا تو زنوبیا کی کمر انور کی گرفت میں تھی۔

سامنے ہی لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ میجر اور اس کے ساتھی بھی وہیں تھے۔ ان میں سے کوئی ایک کتوں کو لے جا چکا تھا۔

’’گڈ!‘‘ انور نے لینڈ کروزر پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ’’عقل مند ہو تم میجر!...... عام قسم کی کار تو اس پہاڑی علاقے میں چل بھی نہیں سکتی تھی۔ تمہیں واضح ہدایت کرنے کا خیال نہیں رہا تھا مجھے لیکن تم نے خود ہی صحیح فیصلہ کیا کہ لینڈ کروزر کا بندوبست کیا۔‘‘

میجر خاموش رہا۔ نہ صرف اس کا بلکہ اس کے ساتھیوں کے چہرے بھی سپاٹ تھے۔

زنوبیا کے ساتھ انور لینڈ کروزر کی طرف بڑھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ریوالور اس وقت بھی تھا۔ اگر وہ کرنل بھی وہاں ہوتا جس نے انور کو قید کیا تھا، تو وہ یہ دیکھ کر چونک جاتا کہ انور کے پاس ریوالور کہاں سے آ گیا لیکن اگر ایسی کوئی صورتِ حال ہوتی تو انور یہی ظاہر کرتا کہ وہ ریوالور اپنے اس آدمی سے ملا تھا جس کے گھر میں اس نے قیام کیا تھا۔

پہلے انور لینڈ کروزر میں بیٹھا۔ بیٹھتے وقت ریوالور کی نال زنوبیا کی طرف رہی تھی۔

’’اب تم بھی آ جاؤ کیپٹن۔‘‘ وہ زنوبیا سے بولا۔

زنوبیا نے ایک مرتبہ میجر اور اس کے ساتھیوں کی طرف اس طرح دیکھا جیسے حد درجہ بے بسی محسوس کر رہی ہو۔ پھر وہ لینڈ کروزر کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ انور برابر کی سیٹ پر کھسک گیا تھا۔

وہاں انور نے ایک اور لینڈ کروزر بھی کھڑی دیکھی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ میجر بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کے پیچھے آتا۔ وہ ان دونوں کی نگرانی تو لازمی کرتے۔ انور کو یہ بھی یقین تھا کہ طیارہ جب پرواز میں ہوگا تو دو تین طیارے اس کا تعاقب بھی کریں گے۔

یہ خیال درست بھی ثابت ہوا۔ جب طیارہ انہیں لے کر اڑا تو دو طیارے تعاقب میں بھی تھے۔

انور نے کو پائلٹ کی سیٹ سنبھالی تھی۔ زنوبیا کو بھی اپنے برابر میں بٹھا لیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اب بھی بندھے ہوئے تھے۔

پائلٹ کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ جب اس نے طیارہ اسٹارٹ کر کے ٹیکسی کرانا شروع کی تھی تو انور کی ساری توجہ اس کی حرکات و سکنات پر مرکوز رہی تھی۔ وہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہتا تھا کہ عام طیارے اور جیٹ کی پرواز کے طریقۂ کار میں فرق ہے۔

طیارے کی ہر جنبش کے ساتھ وہ پائلٹ کی حرکات و سکنات پر گہری نظر رکھتا رہا۔ وہ سب کچھ اس کے دماغ میں اس طرح محفوظ ہوتی رہیں جیسے کوئی بات کمپیوٹر میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ یہ اس کی ایسی حیرت انگیز صلاحیت تھی جس پر

بریگیڈیئر شمس بھی حیران رہ گیا تھا۔ ایسی یادداشت بہت کم، برائے نام انسانوں میں دیکھی گئی ہے۔
طیارہ جب ایک مخصوص بلندی پر پہنچ کر سیدھی پرواز کرنے لگا تو انور نے پائلٹ کو حکم دیا۔ ''واپس پہاڑی علاقے کی طرف موڑ دو۔''
''مجھ سے تو کہا گیا تھا کہ......''
''تم سے جو کچھ کہا گیا تھا، وہ میں نے نہیں کہا تھا لیکن اب جو کہا گیا ہے، وہ میں نے کہا ہے۔'' انور نے ریوالور کی نال اس کے پہلو میں زیادہ زور سے گڑاتے ہوئے کہا۔
''مجھے مارو گے تو یہ طیارہ بھی تباہ ہو جائے گا۔'' پائلٹ نے کہا۔ ''تم بھی ختم ہو جاؤ گے اور ہماری کیپٹن زنوبیا بھی۔''
''اس ڈاکٹر کی زندگی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' انور نے کہا۔ ''رہی میری بات تو میں بہرحال ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ یہ خیال دل میں نہ لاؤ کہ میں نے تمہیں مار دیا تو یہ طیارہ تباہ ہو جائے گا۔ میں نے کسی مصلحت سے غلط بیانی کی تھی۔ میں طیارہ اڑانا جانتا ہوں۔ تم کو میں نے کسی اور سبب سے ساتھ لیا ہے۔ اگر تم میری بات نہیں مانو گے تو تمہاری زندگی میرے لیے بیکار ہوگی۔ ختم کر دوں گا میں تمہیں......! طیارہ خاصی بلندی پر ہے۔ تمہیں ختم کر کے مجھے اتنی مہلت آسانی سے مل جائے گی کہ طیارے کا کنٹرول سنبھال سکوں۔''
''تم مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔ تمہارا تعلق بری فوج سے ہے۔ تم طیارہ نہیں اڑا سکتے نہ ہی سنبھال سکتے ہو۔''
''کیا میں تمہیں بتاؤں کہ جیٹ کس طرح اڑایا جا سکتا ہے؟''
پائلٹ خاموش رہا۔
''مجھے امتحان دینے کی ضرورت تو نہیں لیکن کیونکہ میں تمہیں زندہ رکھنا چاہتا ہوں اس لیے تمہیں زبانی بتائے دیتا ہوں کہ جیٹ کس طرح اڑایا جا سکتا ہے۔''
پائلٹ اب بھی خاموش رہا تھا۔ انور نے بتانا شروع کیا کہ انجن کیسے اسٹارٹ کیا جاتا ہے۔ طیارے کو ٹیکسی کس طرح کرائی جاتی ہے...... رفتار میں بتدریج اضافہ کیسے کیا جاتا ہے اور کتنی رفتار حاصل کرنے کے بعد طیارہ فضا میں بلند ہونا شروع کرتا ہے پھر اس کو زیادہ بلندی تک لے جانے کے لیے کس اسٹک سے کام لیا جاتا ہے۔
پائلٹ کے ساتھ ہی زنوبیا بھی خاموشی سے وہ سب کچھ سنتی رہی تھی۔
''میں اس طیارے کے ہر کل پرزے سے واقف ہوں مسٹر پائلٹ!'' انور نے سب کچھ بیان کرنے کے بعد کہا۔ ''غالباً اب تمہیں یقین آگیا ہوگا کہ تمہیں ختم کرنے کے بعد میں طیارہ سنبھال سکتا ہوں۔''
''میں رخ موڑ رہا ہوں۔'' پائلٹ کی آواز اس مرتبہ بھرائی ہوئی تھی۔
''شاباش! اچھے بچے ہو۔'' انور نے خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا۔
زنوبیا نے اس وقت اپنا چہرہ سپاٹ کر رکھا تھا۔
طیارے کا رخ مڑتے ہی ٹرانسمیٹر پر سگنل موصول ہوا۔
پائلٹ سوالیہ نظروں سے انور کی طرف دیکھنے لگا۔
انور بولا۔ ''وہ جاننا چاہتے ہوں گے کہ طیارے کا رخ کیوں موڑا گیا ہے۔ بات کرو۔ انہیں بتاؤ کہ یہ میرے حکم سے کیا گیا ہے۔''
پائلٹ نے ٹرانسمیٹر آن کیا۔ ''وامق دس انڈ، اوور۔''
''طیارہ واپس کیوں موڑا گیا ہے؟'' آواز آئی۔ ''اوور۔''
پائلٹ کے بجائے انور بول پڑا۔ ''میں نے حکم دیا ہے، اوور۔''
اس کی آواز سن کر دوسری طرف دو تین پل کے لیے سناٹا چھا گیا، پھر آواز آئی۔ ''مقصد؟ تم تو......''
''ہاں۔'' انور نے ہی جواب دیا۔ ''میری منزل وہی ہے جو میں نے بتائی تھی۔ بس ذرا دیر کے لیے پہاڑوں کے اوپر دو ایک چکر لگانے ہیں۔ اوور۔''
''مقصد؟'' پھر پوچھا گیا۔ ''اوور۔''
انور نے جواب دینے کے بجائے ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔
''بس کافی ہے۔'' انور نے پائلٹ سے کہا۔ ''تم وہ کرتے رہو جو میں کہتا ہوں۔''
پائلٹ خاموش رہا۔
جلد ہی طیارہ پہاڑوں کے اوپر اڑ رہا تھا۔
''وہ پہاڑ دیکھ رہے ہو؟'' انور نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ''اس پر جگہ جگہ سبز دھبے ہیں۔''
''ہاں۔''
''بالکل اوپر ایک ہی دھبا ہے۔''
''ہاں۔''

''اس پر ایک میزائل فائر کرو۔''
''کیوں؟'' پائلٹ چونکا۔
''میں اپنا اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔'' انور نے کہا۔
''میں نے کہا تھا کہ یہ طیارہ میزائل اور مشین گن وغیرہ سے خالی نہ ہو۔ اس کے میکنزم میں بھی کوئی ایسی خرابی نہیں ہونی چاہیے کہ نشانہ خطا جائے۔ مجھ سے سوالات مت کیا کرو۔ جو میں کہوں، وہ کرتے رہو۔'' آخری جملے میں انور کا لہجہ بہت سخت ہو گیا۔
پائلٹ نے طویل سانس لی۔ ''ہم آگے نکل آئے ہیں۔ واپس لوٹنا ہوگا۔''
''جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔''
پائلٹ نے طیارہ راؤنڈ میں گھما کر واپس لوٹایا۔ اسی وقت ٹرانسمیٹر پر پھر سگنل آیا۔
''کوئی ضرورت نہیں بات کرنے کی۔'' انور بولا۔
''پائلٹ کو ٹرانسمیٹر کے سگنل نظرانداز کرنے پڑے۔ جلد ہی وہ پہاڑ اور خودرو گھاس کے دھبے دکھائی دینے لگے۔
''فائر کرو۔'' انور نے حکم دیا۔
''ذرا سا رک کر۔ ابھی وہ نشانے پر نہیں آیا۔''
انور غور سے چیک کر رہا تھا کہ پائلٹ کی نظر کہاں ہے۔ پھر جب فائر کیا گیا تب بھی انور نے دیکھا کہ وہ عمل کس طرح ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی پائلٹ نے طیارے کو تیزی سے بلند کیا۔ اس کا مقصد انور کی سمجھ میں آ گیا۔ میزائل ٹکرانے سے جو چھوٹے بڑے پتھر ٹوٹ کر اڑیں، ان میں سے کوئی ٹکرا طیارے سے نہ ٹکرا سکے۔
''شاباش! پیارے پائلٹ وامق۔'' انور بولا۔
''وامق نام ہے نا تمہارا؟''
پائلٹ نے سر ہلانے پر اکتفا کی تھی۔
ٹرانسمیٹر کے سگنل بند ہو گئے تھے جو اس وقت پھر آنے لگے۔ میزائل فائر کرنے کا یہ ردِعمل ہونا ہی چاہیے تھا۔
اس مرتبہ پائلٹ کے بجائے انور ہی نے بات کی اور میزائل فائر کرنے کا وہی مقصد بتایا جو پائلٹ وامق کو بتا چکا تھا۔ اس نے آخر میں یہ بھی کہا۔ ''ابھی ایک میزائل اور داغا جائے گا۔ اوور......''
''آخر......'' دوسری طرف سے نہ جانے کیا کہنا چاہا گیا تھا۔
انور نے سننے کی ضرورت نہیں سمجھی اور ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔ وہ اس وقت ماسٹر آف سچویشن بنا ہوا تھا۔

جلد ہی اس نے ایک اور جگہ میزائل فائر کروایا اور دیکھا کہ وامق کی حرکات و سکنات وہی تھیں جو پہلا میزائل فائر کرنے پر تھیں۔
اس مرتبہ ٹرانسمیٹر پر سگنل نہیں آیا۔ انور پہلے ہی بتا چکا تھا کہ ابھی وہ ایک میزائل اور فائر کرائے گا۔
''پہاڑوں کے اوپر ہی چکر لگاتے رہو۔'' انور نے وامق سے کہا۔
وامق اب خاموشی سے اس کے احکام کی تعمیل کر رہا تھا۔
ایک جگہ انور نے اشارے سے کہا۔ ''ٹھیک اسی جگہ مشین گن سے فائرنگ کرو۔ زیادہ گولیاں چلانے کی ضرورت نہیں۔ بس ہلکا سا برسٹ۔''
وامق نے اس حکم کی بھی تعمیل کی۔
انور نے اس کے علاوہ بھی ایک جگہ فائرنگ کروائی اور سمجھ لیا کہ مشین گن کا استعمال کس طرح کیا جاتا ہے۔
''بس اب اپنی منزل کی طرف چلو۔'' انور نے کہا۔
''طیارہ انتہائی بلندی تک لے جاؤ۔''
وامق نے یہ بھی کیا۔ پرواز جاری رہی۔ زنوبیا، انور کی ہدایت کے مطابق سب کچھ خاموشی سے دیکھتی اور سنتی رہی تھی۔
جب آدھے گھنٹے کا سفر باقی رہ گیا تو انور نے وامق سے کہا۔ ''اب تم خود ٹرانسمیٹر پر اپنے لوگوں سے رابطہ کرو۔ مجھے کچھ بات کرنی ہے۔''
وامق نے اس کی بات بھی کروا دی۔
انور بولا۔ ''میں نے کہا تھا کہ مجھے تمہارے پرائم منسٹر سے ملنا ہے۔ امید ہے کہ اسے بتا دیا گیا ہوگا......اوور۔''
''وہ نہیں مل سکیں گے۔ تم وہاں وزیرِ داخلہ سے بات کر سکتے ہو، اوور۔''
''صرف پرائم منسٹر۔'' انور نے غصے کا اظہار کیا۔
''کیا تمہیں کیپٹن زنوبیا کی زندگی عزیز نہیں؟......اوور۔''
''مجبوری ہے۔'' جواب آیا۔ ''پرائم منسٹر اپنے طے شدہ شیڈول کے مطابق جنوبی سرحد پر اگلے مورچوں کا معائنہ کرنے کے لیے روانہ ہو چکے ہیں، اوور۔''
''چال چلی جا رہی ہے۔'' انور غرایا۔ ''کیا تم لوگ یہ سمجھ رہے ہو کہ میں تمہارے پرائم منسٹر کو گولی مار دوں گا......؟ اوور۔''
''تمہیں بتا دیا گیا ہے کہ پرائم منسٹر کا یہ دورہ شیڈول

کے مطابق تھا، اوور۔"
"چلو یوں بھی سہی۔" انور نے کہا۔ "میں وہاں مل لوں گا پرائم منسٹر سے۔ طیارے کا رخ اب اس طرف موڑنا ہوگا۔ پرائم منسٹر کی لینڈنگ کا ہوائی اڈا؟" انور نے سوالیہ انداز میں کہنے کے بعد "اوور" کہا۔
"وہاں تین ہوائی اڈے ہیں۔ سیکیورٹی کے پیشِ نظر یہ بات راز میں رکھی گئی ہے کہ وہ کس ہوائی اڈے پر اتریں گے۔ ہمیں بھی اس کا علم نہیں، اوور۔"
"ٹھیک ہے۔" انور نے کہا۔ "طیارہ انہی میں سے کسی ہوائی اڈے پر اتار لیا جائے گا۔ پرائم منسٹر کو اطلاع کر دی جائے کہ میں وہاں پہنچ رہا ہوں، اوور۔"
"ٹھیک ہے۔ اطلاع کر دی جائے گی، اوور۔"
انور نے ٹرانسمیٹر بند کیا اور بولا۔ "اس طرف چلو وامق۔"
"مجھے ان میں سے کسی ہوائی اڈے کا علم نہیں۔"
"ہوسکتا ہے تم جھوٹ بول رہے ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ سچ بول رہے ہو۔ جنوبی سرحد کی طرف چلو...... نیچی پرواز کریں گے تو کوئی ہوائی اڈا نظر آ ہی جائے گا۔"
وامق نے طیارے کا رخ موڑا۔
انور مطمئن تھا کہ سب کچھ اس کی توقع کے مطابق ہو رہا ہے۔ اس نے روانگی سے چند ہی منٹ پہلے خبریں سن لی تھیں جن میں پرائم منسٹر کے اس دورے کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ ٹرانسمیٹر پر جھوٹ بولا گیا تھا کہ سیکیورٹی کے پیشِ نظر پرائم منسٹر کے دورے کو خفیہ رکھا گیا ہے۔ انور کو پہلے ہی معلوم تھا کہ پرائم منسٹر سے ملاقات نہ ہونے کی کیا وجہ بتائی جائے گی۔ خبر سنتے ہی اس کے دماغ میں یہ بات آ گئی تھی کہ قدرت اس موقع پر بھی اس کی مددگار ہے۔
ایک گھنٹے بعد وامق نے بتایا کہ اب طیارہ جنوبی سرحد کے اگلے مورچوں کے اوپر چکر لگا رہا ہے۔
"ہوائی اڈا تلاش کرنے کے لیے نیچی پرواز کرنی ہو گی۔" انور نے کہا۔ اس کا اندیشہ تو نہیں ہے کہ نیچے سے کوئی طیارے پر فائر کھول دے گا۔ اس پر تمہارے ملک کا نشان موجود ہے اس کے علاوہ تمام فوجی ادارے اس صورتِ حال سے باخبر ہو چکے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میڈیا کو بھی خبر مل گئی ہو۔ اس وقت تمہارے سارے ملک میں اس بات سے ہیجان پھیلا ہوا ہوگا کہ فضا میں اس وقت کیا کھیل ہو رہا ہے۔"
وامق خاموش رہا۔ وہ طیارے کی بلندی کم کرتا جا رہا تھا۔ خاصی بلندی کم کرنے کے بعد اس نے سیدھی پرواز کرتے ہوئے ایک مخصوص علاقے میں چکر کاٹنا شروع کیے۔ جلد ہی انہیں ایک رن وے نظر آ گیا۔ اس کے قریب ہی فوجی کیمپ بھی تھا۔ کچھ فوجی دوربین لگائے طیارے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقیناً علم ہو چکا تھا کہ اس طیارے میں کیا کھیل ہو رہا ہے۔
"کیا لینڈ کروں؟" وامق نے انور سے پوچھا۔
"نہیں۔" انور نے کہا۔ "رن وے پر ایک بھی طیارہ کھڑا نظر نہیں آیا۔ کم از کم پرائم منسٹر کا طیارہ تو نظر آتا، اگر وہ یہاں اترا ہوتا۔ ہمیں دوسرے ہوائی اڈے تلاش کرنے ہوں گے۔"
وامق نے طیارہ ایک جانب بڑھا دیا۔ جلد ہی انہوں نے دوسرا ہوائی اڈا بھی دیکھ لیا۔ وہاں بھی کچھ فوجی دوربینیں لگائے دکھائی دیے۔ خبر یقیناً آگ کی طرح ہر طرف پھیل چکی تھی۔
"چھوٹے موٹے تین طیارے کھڑے ہیں یہاں۔ پرائم منسٹر کا طیارہ نہیں ہے۔ میں نے اس کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہے۔ اس کی تصویریں بھی دیکھی ہیں۔ بہت شاندار طیارہ ہے وہ۔ تیسرا ہوائی اڈا تلاش کرو۔ تمہارا پرائم منسٹر وہیں اترا ہوگا۔"
جلد ہی تیسرا ہوائی اڈا بھی دیکھ لیا گیا۔ وہاں تین طیارے کھڑے دکھائی دیے۔ ایک طیارہ غیر فوجی اور شاندار تھا۔
"یہی ہے۔" انور بولا۔ "پہچان لیا میں نے اسے۔"
"تو یہاں لینڈ کروں؟"
"نہیں۔ بلندی پر لے جاؤ۔"
"کیا یہاں بھی لینڈ نہیں کرنا؟"
"یہیں لینڈ کرنا ہے لیکن پہلے میں بلندی تک جانا چاہتا ہوں۔ یہ مت پوچھنا کہ کیوں جانا چاہتا ہوں۔"
وامق خاموشی سے طیارے کو بلندی تک لے جانے لگا۔
"بلندی پر جب عمودی پرواز ہو تو طیارے کو آٹو پر کر دینا۔" انور نے مزید کہا۔
اب فیصلہ کن وقت قریب تھا۔ انور کے اعصاب میں کچھ تناؤ آ گیا۔
طیارہ جب بلندی کی طرف جا رہا تھا تو ٹرانسمیٹر پر سگنل آیا۔
انور نے خود ہی بات کی۔ "اب کیا پوچھنا ہے؟" اس

نے نہایت خشک لہجے میں کہا۔ ”اوور۔“
”تم نے تینوں ہوائی اڈے دیکھ لیے۔ وہ بھی جہاں پرائم منسٹر کا طیارہ کھڑا ہے۔ اب تم لینڈ کیوں نہیں کر رہے ہو؟ اوور۔“
”کوئی وجہ ہے جو ابھی نہیں بتائی جا سکتی۔ میں پندرہ منٹ بعد لینڈ کروں گا، اوور۔“
پھر اس نے مزید کچھ سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔
دو طیارے برابر ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔
”اب؟“ وامق نے بلندی تک آنے کے بعد پوچھا۔
”کچھ دور سیدھے چلو، پھر واپس لوٹنا ہے۔“
”اس طرف زیادہ آگے نہیں جایا جا سکتا۔ ہم تمہارے ملک کی سرحد میں داخل ہو جائیں گے۔“
”اوہ! تو دائیں جانب موڑ لو۔“
طیارہ ایک چھوٹا سا چکر لگاتا ہوا دائیں جانب بڑھا۔
شروع سے تقریباً بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی زنوبیا نے اس طرح پہلو بدلا جیسے کچھ بے چین ہو گئی ہو۔ اس کے علم میں تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ انور اسے اپنا سارا منصوبہ بتا چکا تھا۔
اس منصوبے پر عمل اس طرح ہوا کہ انور نے اپنے ریوالور کا دستہ پوری طاقت سے وامق کے سر پر مارا۔
یہ تربیت اس نے فوج میں ہی حاصل کی تھی کہ کسی کی کنپٹی پر کس زاویے سے کوئی بھاری چیز ماری جائے تو وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔
وامق ایک طرف ڈھلک گیا۔ اس کے ڈھلکتے ہی طیارہ تیزی سے نیچے جانے لگا۔ وامق نے انور کی ہدایت کے مطابق طیارے کو ”آٹو“ پر نہیں کیا تھا ورنہ یہ صورت نہ بنتی۔
انور نے تیزی سے وامق کو اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔ ”ہاتھ کھول لو زنوبی۔“
زنوبیا اس کی بات سننے سے پہلے ہی دانتوں سے ڈوری کی گرہ کھول چکی تھی۔ انور نے ڈیڑھ گرہ اسی لیے لگائی تھی کہ وقت آنے پر زنوبیا خود ہی اپنے ہاتھ آزاد کرا لے۔
انور نے پائلٹ کی سیٹ سنبھالی اور تھروٹل کے ذریعے، نیچے جاتے ہوئے طیارے کو پھر بلندی کی طرف لے جانے لگا۔
وامق کا بے حس و حرکت جسم زنوبیا پر لد سا گیا تھا۔ زنوبیا بمشکل اسے سیٹ کے پچھلے حصے میں دھکیل سکی۔

”شاندار۔“ زنوبیا نے انور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے مشاہدہ کر کے ہی سب کچھ سیکھ لیا ہے۔“
”کم از کم اتنا تو سمجھ ہی لیا ہے کہ اس خطرناک صورت حال سے نکلا جا سکے۔“ انور نے جواب دیتے ہوئے طیارے کو بائیں جانب گھمایا۔ اسے اب طیارے کو سرحد پار اپنے ملک کی حدود میں لے جانا تھا۔ خود اسے بھی کچھ اندازہ تھا کہ سرحد کس طرف ہو گی لیکن وامق بھی یہ بات اس وقت بتا بیٹھا تھا جب بلندی پر آنے کے بعد انور نے اس سے سیدھا چلنے کے لیے کہا تھا۔
اس طرف جانے سے بچنے کے لیے وامق نے طیارہ دائیں جانب گھمایا تھا اس لیے اب انور کے لیے ضروری تھا کہ اسے بائیں جانب موڑے اس لیے اس نے ایسا ہی کیا بھی تھا۔
جب طیارے نے نیچے جانا شروع کیا تھا، اسی وقت ٹرانسمیٹر پر سگنل آنے لگے تھے۔ وہ لوگ جاننا چاہتے ہوں گے کہ ایسا کیوں ہوا لیکن انور نے سگنلز کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ اب اسے ان لوگوں سے بات کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔
اس کا منصوبہ یہی تھا کہ طیارہ حاصل کرنے کے بعد تیزی سے اپنے ملک کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ پرائم منسٹر سے ملاقات کی بات اس نے ان لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے کی تھی۔ وہ طیارے کو اس ملک کے دارالحکومت کی طرف لے جا بھی رہا تھا لیکن اسے توقع تھی کہ ائرپورٹ پہنچنے کے بعد اسے بتایا جاتا کہ پرائم منسٹر جنوبی سرحد کی طرف جا چکا ہے۔
اگر اسے وہاں پہنچنے کے بعد یہ بات بتائی جاتی تو اسے جنوبی سرحد تک پہنچنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ لگ سکتا تھا لیکن اسے یہ بات پہلے ہی بتا دی گئی تھی۔
انور نے خبروں میں یہ بات سن بھی لی تھی اور اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ وہاں سے اپنے ملک کی سرحد تک پہنچنے میں اسے چند منٹ لگتے۔
مگر یہ چند منٹ گزارنا بھی اس کے لیے آسان ثابت نہیں ہوا۔

☆☆☆

اس وقت دونوں ہی ملکوں میں نہ صرف سرکاری سطح پر بلکہ عوامی سطح پر بھی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ کسی ایک ٹی وی چینل کو کسی طرح یہ خبر مل گئی تھی کہ پڑوسی ملک کے جس جاسوس کو پکڑا گیا تھا، اس نے کیپٹن زنوبیا کو یرغمال بنا کر طیارہ

حاصل کرلیا تھا۔

اس چینل کے ذریعے دوسرے چینلز بھی واقف ہو گئے۔ ان میں سے جن کے تعلقات کچھ فوجی افسروں سے تھے، انہوں نے فوجی افسروں سے اور جن کے تعلقات ائرفورس کے افسران سے تھے، انہوں نے ان افسران سے رابطہ قائم رکھا اور انہیں کچھ نہ کچھ اطلاعات ملتی رہیں جو وہ نشر بھی کرتے رہے۔ اسی لیے وہاں کے عوام کی اکثریت کو اس وقت صرف ٹی وی دیکھنے سے دلچسپی رہ گئی تھی۔

اس ملک کے چینلز کی وجہ سے انور کے ملک کے ٹی وی چینلز بھی باخبر ہو گئے اور وہی خبریں نشر کرنے لگے جو زنوبیا کے ملک کے چینلز سے نشر کی جارہی تھیں اور جلد ہی یہ خبر بی بی سی سے اس وقت نشر ہو گئی تھی جب ان لوگوں کی دانست میں جاسوس، طیارے کو جنوبی سرحد کی طرف لے جارہا تھا جہاں وہ اس ملک کے پرائم منسٹر سے کوئی بات کرنا چاہ رہا تھا۔

یہ بات ممکن ہی نہیں تھی کہ اتنی ہلچل مچ جانے کے باوجود بریگیڈیئر شمس اس صورتِ حال سے بے خبر ہوتا۔ اس نے فوراً اپنے کمانڈر انچیف سے رابطہ کر کے بتایا کہ وہ اس کے بریگیڈ کا کیپٹن انور گل زاد ہی ہوگا جو طیارے کو اپنے ہی ملک میں لانا چاہتا ہوگا۔ پرائم منسٹر سے ملنے کی بات صرف دھوکا دینے کے لیے کی گئی ہوگی۔

بریگیڈیئر شمس کو بہت وضاحت سے سب کچھ بتانا پڑا۔

''پرائم منسٹر سے ملاقات۔'' کمانڈر انچیف نے کہا۔ ''آخر اس میں کیا مصلحت ہوگی؟ دراصل وہ کیا سوچ رہا ہو گا؟''

اسی وقت ایک آفیسر نے قریب آ کر بریگیڈیئر شمس کو سرگوشی میں بتایا۔ ''وہاں کا پرائم منسٹر اپنی جنوبی سرحد کے اگلے مورچوں کا معائنہ کرنے گیا ہے اور کیپٹن گل زاد کی اس سے ملاقات وہیں ہوسکتی ہے۔ اب طیارے کا اور اس کا تعاقب کرنے والے طیاروں کا رخ اسی طرف ہے۔''

فون پر کمانڈر انچیف نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ چپ کیوں ہو گئے بریگیڈیئر؟''

''سوری سر!'' بریگیڈیئر نے کہا۔ ''ابھی ابھی ایک اطلاع آئی ہے۔ وہ سننے لگا تھا۔'' اور پھر اس نے کمانڈر انچیف کی کوئی بات سنے بغیر اسے بھی تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔

کمانڈر انچیف نے سب کچھ سن کر کہا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اس طرح ان لوگوں کو دھوکا دے کر اپنے ملک کی سرحد میں آنا چاہتا ہو۔ وہ جگہ سرحد سے کچھ زیادہ دور نہیں ہو گی۔''

''یہی ہوسکتا ہے سر! ہمیں کسی صورت اس کی مدد کرنی چاہیے۔ وہ اس وقت ہمارے ملک کا ہیرو بن چکا ہے۔ صرف اسی کی کامیابی سے ہم دشمن کے ایک شہر پر قابض ہو چکے ہیں۔''

''یقیناً اسے مدد کی ضرورت پڑے گی۔ جب وہ سرحد کا رخ کرے گا تو وہ لوگ سمجھ جائیں گے کہ انہیں دھوکا دیا گیا ہے۔ اس صورتِ حال میں وہ کسی قیمت پر بھی اسے روکنے کی کوشش کریں گے۔ اس وقت طیارے کے پائلٹ کے علاوہ کیپٹن زنوبیا کی زندگی کی اہمیت بھی ان کے لیے کم ہوجائے گی۔ وہ طیارے کو تباہ بھی کرسکتے ہیں۔''

''اسے بچانے کے لیے فضائیہ کی مدد لینا ہوگی۔''

''یہی بات میرے ذہن میں تھی۔''

''میں ابھی ائر مارشل سے بات کرتا ہوں۔''

بریگیڈیئر شمس کی کوئی بات سنے بغیر رابطہ منقطع کردیا گیا۔

دوسری طرف زنوبیا کے ملک میں بھی عسکری سطح پر ہلچل بہت زیادہ ہوگئی جب انہیں یہ اطلاع ملی کہ طیارے کو جاسوس اپنے ملک کی طرف لے جارہا ہے۔ فوراً ائرفورس کو ہدایت کی گئی کہ خواہ کچھ بھی ہو، وہ اپنے ملک میں جانے نہ پائے۔ یہ بھی کہا گیا کہ پائلٹ وامق اور کیپٹن زنوبیا کو بچانے کی کوشش ضرور کی جائے لیکن اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو طیارے کو تباہ کردیا جائے۔ یہ بڑی ذلت کی بات ہوگی کہ ہمارا طیارہ ہمارے دو فوجیوں سمیت دشمن کے قبضے میں چلا جائے۔

یہ ہدایات ان دونوں طیاروں کو دے دی گئیں جو انور کے تعاقب میں لگے ہوئے تھے۔

''وہ ایف سولہ طیارے ہیں۔'' انور نے زنوبیا سے کہا۔ ''ان کی رفتار ہمارے طیارے سے کہیں زیادہ ہے۔ اب وہ یقیناً بڑی تیزی سے ہمارے قریب آئیں گے۔ انہوں نے سمجھ لیا ہوگا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ وہ ہمیں ہر قیمت پر روکنے کی کوشش کریں گے اور کوشش میں ناکامی کی صورت میں وہ ہم پر میزائل بھی فائر کرسکتے ہیں۔ موجودہ صورتِ حال میں ان کے لیے پائلٹ کی یا تمہاری زندگی کی پروا نہیں رہے گی۔''

''اسے ابھی ہوش نہیں آیا۔'' زنوبیا نے پائلٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے ابھی اور اس پندرہ منٹ تک ہوش نہیں آسکتا جبکہ میرے ملک کی سرحد میرے اندازے کے مطابق پانچ سات منٹ کے فاصلے پر ہے۔ اتنا وقت گزرنے سے پہلے ایف سولہ ہمارے سروں پر پہنچ چکے ہوں گے۔" اس نے اسکرین پر دیکھا کہ ایف سولہ بڑی تیز رفتاری سے قریب آتے چلے جارہے تھے۔ "یہ اس مہم کا آخری اور فیصلہ کن معرکہ ہوگا جو ہمیں سر کرنا ہے۔"

"ایف سولہ...... اور وہ بھی دو۔" زنوبیا نے کہا۔ "کیا ان کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے؟"

"مجھ سے جو کچھ ممکن ہے وہ تو میں کروں گا۔ یہ تو میں نے سمجھ لیا ہے کہ میزائل کس طرح فائر کیے جاتے ہیں اور مشین گن کس طرح چلائی جاتی ہے۔" انور کے چہرے پر کھنچاؤ کا تاثر تھا۔ صورتِ حال ہی ایسی تھی کہ اعصاب میں تناؤ آنا قدرتی امر تھا۔

خود زنوبیا بھی اعصابی تناؤ کا شکار ہوچکی تھی۔ یہ زندگی اور موت کی جنگ کا فیصلہ کن معرکہ ہوتا۔

سرحد جب بہت قریب آچکی تھی، ایف سولہ طیارے سر پر آگئے۔ ان میں سے ایک آگے نکل کر ان کے طیارے کی سیدھ میں آیا اور اپنی رفتار کم کرنے لگا۔ مقصد یہی ہوگا کہ وامق طیارے کی رفتار کم کرے اور اترنے پر مجبور ہو۔ ان لوگوں کو یہ علم تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اب پائلٹ کی سیٹ انور نے سنبھال رکھی تھی۔

انور نے طیارے کو غوطہ دے کر بچنے کی کوشش نہیں کی، پرواز سیدھی رکھی۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" زنوبیا چیخ پڑی۔ "تصادم ہو جائے گا۔"

لیکن انور یہی چاہتا تھا کہ دونوں طیاروں کی قربت اتنی بڑھ جائے کہ اس کا نشانہ خطا نہ ہو چنانچہ اس نے پے در پے دو میزائل فائر کیے۔ ان میں سے ایک میزائل ایف سولہ کے فیول ٹینک میں یا نہ جانے کس جگہ لگا تھا کہ دھماکے کے ساتھ اس کے ٹکڑے اڑ گئے۔

انور نے بڑی تیزی سے اپنے طیارے کا تھروٹل دبایا۔ طیارہ تیزی سے مزید بلندی کی طرف جانے لگا۔ اگر انور ایسا نہ کرتا تو تباہ ہونے والے طیارے کے جلتے ہوئے ٹکڑے اس کے طیارے سے بھی ٹکرا سکتے تھے۔

"بریوو۔" زنوبیا کی آواز خوشی سے کانپ گئی۔ "بریوو انور...... مگر اس نے زد پر آنے کی حماقت کیوں کی؟"

"سمجھا تو یہ جارہا ہوگا کہ وامق اپنے ملک کے طیارے کو میزائل کا نشانہ نہیں بنائے گا۔" انور نے جواب دیا۔ "اب دوسرا طیارہ ہمیں ہٹ ضرور کرنا چاہے گا۔ جلدی سے پیراشوٹ باندھ لو۔ شاید ہمیں طیارے سے چھلانگ لگانی ہی پڑے۔"

طیارہ تیز پرواز کر کے انتہائی بلندی پر آگیا تھا۔ جہاں سے اب اس کی ہموار پرواز شروع ہوئی۔

دوسرے ایف سولہ نے اپنے ساتھی طیارے کی تباہی دیکھ کر اس کے اڑتے ہوئے شعلہ نما ٹکڑوں سے بچنے کے لیے غوطہ لگایا تھا۔ رفتار بھی بہت تیز رکھی اور ان ٹکڑوں سے بچنے میں کامیاب رہا لیکن اس طرح وہ کافی آگے نکل گیا تھا۔ دوبارہ انور کے طیارے کے قریب پہنچنے کے لیے اس نے چکر لگاتے ہوئے واپس عمودی پرواز کی اور انور کے طیارے کے پیچھے آگیا۔

"اب ہم اس کی زد پر ہیں، وہ فائر ضرور کرے گا۔" انور نے کہتے ہوئے غوطہ لگایا۔

جو میزائل فائر کیا گیا تھا، وہ سیدھا نکل گیا۔

"تم اس وقت ایک ماہر پائلٹ معلوم ہو رہے ہو۔"

ایف سولہ اپنی تیز رفتاری کے باعث آگے نکل گیا تھا۔

"ابھی وہ پھر پلٹے گا۔" انور نے کہا۔

اس میں ایف سولہ کو جو وقت لگتا، اس سے انور نے یہ فائدہ اٹھایا کہ طیارے کو "آٹو" پر لاکر پیراشوٹ باندھنے لگا۔ "ناتجربہ کاری کی وجہ سے غلطی ہوگئی تھی۔" اس نے کہا۔ "وامق کو بے ہوش کرنے کے بعد ہی ہمیں پیراشوٹ باندھ لینے چاہیے تھے۔"

"خیر! بروقت کام ہوگیا۔ تم اس وقت ایک ماہر پائلٹ نظر آرہے ہو انور۔" اس نے دوبارہ کہا۔

"موت سر پر کھڑی نظر آجائے تو انسان وہ سب کچھ بھی کر گزرتا ہے جو وہ نہیں جانتا۔" انور نے جواب دیا۔

"دوسرا طیارہ اب پھر ہماری طرف آرہا ہے۔"

فضا میں ہونے والے اس معرکے کی خبر اس وقت تک دنیا کے تمام ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں پھیل چکی تھی۔ تمام ٹی وی چینلز سے خبر نشر ہوچکی تھی۔

اس وقت ایک سپر پاور کے دارالحکومت میں دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم میں مذاکرات بھی جاری تھے جو اس واقعے کے بعد زنوبیا کے ملک کے وزیراعظم نے ختم کر دیے۔ وہ نہایت غصے میں مذاکرات کی میز سے اٹھ گیا تھا۔

انور ان حالات سے بے خبر تھا لیکن باخبر بھی ہوتا تو اسے اس کے نتائج کی پروانہ ہوتی، یہ سب کچھ سوچنا اس کی

حکومت کے اکابرین کا کام تھا۔

اِدھراُدھر کا کوئی خیال ذہن میں لائے بغیر انور اپنی ساری توجہ طیارے پر مرکوز کیے ہوئے تھا۔

''اوہ'' انور کے منہ سے نکلا۔ ''سامنے سے کچھ طیارے آرہے ہیں۔ ہماری ہی ائرفورس کے ہوں گے۔ انہیں بھی کسی طرح علم ہو چکا ہوگا حالات کا۔ وہ یقیناً ہماری مدد کے لیے آرہے ہیں۔''

اس وقت ایف سولہ برابر میں آچکا تھا۔ اس مرتبہ اس نے آگے نکلنے کی کوشش کرنے کے بجائے پہلو ہی سے میزائل فائر کیا۔ انور کو اس کا یقین تھا اس نے فوراً طیارے کو غوطہ دیا۔ اس کے باوجود میزائل نے اس کے طیارے کی ٹیل (دم) کا ''روڈر'' اور ''ایلی ویٹر'' اڑا دیا تھا۔ طیارہ بہت تیزی سے ایک جانب جھکتا چلا گیا کیونکہ اس کا توازن بگڑ چکا تھا۔

''اب میں طیارہ نہیں سنبھال سکتا زنوبیا۔'' انور تیزی سے بولا۔ ''ہمیں کود جانا چاہیے۔''

اس وقت وہ اتنی بلندی پر تھے کہ طیارے کے باہر چھلانگ لگا دینا ان کے لیے خطرناک ثابت نہیں ہوسکتا تھا۔ اگر بلندی کم ہو تو پیراشوٹ کھلنے سے پہلے ہی کودنے والا زمین سے جاٹکراتا ہے۔

ان دونوں نے طیارے سے چھلانگیں لگا دیں۔ وہ دونوں تیزی سے نیچے جارہے تھے لیکن جب پیراشوٹ کھلے تو ان کی تیز رفتاری ختم ہوگئی۔ وہ فضا میں ہلکورے لیتے ہوئے آہستہ آہستہ نیچے ہونے لگے۔

انور نے دیکھا کہ ایف سولہ پھر ان کی طرف آرہا تھا۔ اب ان پر مشین گن کا فائر کھولتا لیکن اس وقت تک انور کے ملک کے طیاروں کا اسکواڈرن وہاں پہنچ چکا تھا۔ انہیں دیکھ کر ایف سولہ کے پائلٹ کو بھاگ نکلنے ہی میں اپنی عافیت نظر آئی لیکن وہ فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اسکواڈرن کے دو طیارے اس کی طرف لپکے تھے اور اسے تباہ کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

آخر زنوبیا اور انور کے پیروں نے زمین چھو لی۔ انہوں نے فوراً پیراشوٹس سے نجات حاصل کی اور ایک دوسرے کی طرف دوڑے۔ ہوا نے انہیں کافی دور کر دیا تھا۔

''تم جیت گئے انور۔'' زنوبیا خوشی سے چلّائی۔

اس وقت فضا میں کئی پیراشوٹس کھلتے نظر آئے۔ ائرفورس کے وہ لوگ اسکواڈرن کے طیاروں سے کودے تھے۔

زنوبیا اور انور ایک دوسرے کے قریب پہنچ گئے۔ وہ اتنے جذباتی ہوگئے تھے کہ ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ دونوں جسمانی طور پر اتنے قریب ہوئے جیسے ایک جان دو قالب ہوگئے ہوں۔

''تمہیں اپنے ملک کا کوئی بہت بڑا اعزاز ملنا چاہیے۔'' زنوبیا نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔

''تم مجھے مل گئیں۔ میرے لیے اس سے بڑا اعزاز کوئی نہیں ہوسکتا۔''

وہ دونوں ان پیراشوٹس کی طرف دیکھنے لگے جو زمین پر آچکے تھے۔ جلد ہی ائرفورس کے پانچ جوان ان کے قریب تھے۔

''کیپٹن گل زاد!'' ایک بولا۔

''یس۔'' انور نے کہا۔

''اور یہ کیپٹن زنوبیا۔'' ہاتھ کے اشارے سے کہا گیا۔ ''تعلق دشمن کی فوج سے، اور آپ کی یرغمال بھی لیکن آپ دونوں کا انداز ایسا ہے جیسے آپ ایک دوسرے کے دوست ہوں۔''

''یہ زنوبیا ہی کی تجویز تھی کہ میں اسے یرغمال بنا لوں۔ یعنی دشمن پر یہ ظاہر کیا جائے کہ اب ان کی کیپٹن میری یرغمال بن چکی ہے۔ اگر زنوبیا نے میرا ساتھ نہ دیا ہوتا تو میں اس وقت بھی دشمن کی قید میں ہوتا یا مارا جا چکا ہوتا۔''

''آپ کو کامیابی مبارک ہو۔''

''آپ لوگوں کو کیسے معلوم ہوا کہ میں......''

اس کی بات کاٹ دی گئی۔ ''جب سے آپ ان کے طیارے میں سوار ہوئے ہیں، بین الاقوامی سطح پر ہلچل مچی ہوئی ہے۔ ہر جگہ سے خبریں نشر کی جارہی ہیں۔ دشمن ملک کے علاوہ ہمارے ٹی وی چینلز بھی لائیو نشریات کر رہے ہیں۔ مختلف ذرائع سے انہیں ہر بات کی خبر مل رہی ہے تو ہم کیسے بے خبر رہ جاتے۔''

''اب یہاں سے ہم کس طرح روانہ ہوں گے؟'' انور نے پوچھا۔

''آپ کے لیے ایک ہیلی کاپٹر آرہا ہے۔''

بیس منٹ میں ہیلی کاپٹر آ گیا۔ ان دونوں کو اس میں سوار کیا گیا۔

ہیلی کاپٹر پرواز کر رہا تھا جب بریگیڈیئر شمس نے ٹرانسمیٹر پر انور سے بات کی اور اسے زبردست الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس وقت زنوبیا کی آنکھیں خوشی سے چھلک رہی تھیں۔



ایچ اقبال

جنون

محبوب کی بانہوں میں جان سے گزر جانا کسی بھی محب کے لیے ایسا اعزاز ہوتا ہے جس کی تمنا میں وہ کئی بار جان کی بازی لگانے پر آمادہ رہتا ہے۔ اسی خواہش کے پیروکار محبت زدگان کا فسانہ۔

دل کے ٹکڑے کرتی محبت کی داستانوں میں سے ایک دل فگار کہانی

دو کمروں کے فلیٹ کی اس خواب گاہ کے قیمتی سازوسامان اور نہایت اعلیٰ قسم کی آرائشی چیزوں کو دیکھ کر کوئی گمان تک نہیں کرسکتا تھا کہ اس خواب گاہ میں سونے والا نوجوان، خوب صورت نیا نیا شادی شدہ جوڑا کسی مالی پریشانی سے دوچار ہوگا لیکن حقیقت یہی تھی۔ قدرت کی ستم ظریفی نے حالات کے رنگ یکایک اور نہایت تیزی سے تبدیل کیے تھے کہ سفیان کو تو ایسا ہی محسوس ہوتا تھا جیسے خواب تھا جو کچھ بھی دیکھا، جو سنا، افسانہ تھا۔

معصوم حسن کا پیکر فریال بے چینی سے اس خواب گاہ میں ٹہل رہی تھی۔ اسے اپنے شوہر سفیان کا انتظار تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ بھی دوسرے کمرے میں بھی چلی جاتی جو دراصل اس فلیٹ کا پہلا کمرا اس لحاظ سے تھا کہ فلیٹ کا داخلی دروازہ اسی کمرے میں تھا۔

اس کمرے کے دو تہائی حصے کا سازوسامان دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ اس فلیٹ کا ڈرائنگ روم تھا۔ وہیں ایک خوب صورت شیلف میں میڈیکل کے کورس کی نصابی کتابیں رکھی ہوئی تھیں لیکن اس کمرے کا باقی ایک تہائی حصہ کسی مصور کا اسٹوڈیو معلوم ہوتا تھا۔ اس حصے میں ایزل، کینوس، برش، رنگ اور وہ تمام اشیا تھیں جو کسی مصور کے اسٹوڈیو میں ہونا چاہئیں۔

فریال اسی کمرے سے منسلک کچن میں داخل ہوئی اور اپنے لیے چائے بنانے لگی۔ سفیان کا انتظار کرتے کرتے اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق سفیان کی واپسی میں زیادہ دیر ہو چکی تھی۔ سر کے درد کا سبب وہ

تاخیر ہی تھی۔

چائے بنا کر وہ پیالی ہاتھ میں لیے کچن سے نکلی اور ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے اس کی نظریں بار بار گھڑی کی...... طرف بھی اٹھتی رہیں۔ ایک بج چکا تھا۔ فریال کو بھوک لگنے لگی تھی لیکن یہ ناممکن تھا کہ وہ سفیان کے بغیر اکیلی ہی کھانا کھالیتی۔

چائے پی کر وہ پھر کچن میں گئی۔ سنک میں پیالی دھو کر اس نے ایک طرف رکھی ہی تھی کہ کال بیل کی آواز سنائی دی۔ فریال کا چہرہ کھل اٹھا۔ فکر و تردّد کے جو بادل اس کے چہرے پر چھائے ہوئے تھے، یکا یک صاف ہوگئے۔ وہ کچن سے نکل کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھولنے پر اسے سفیان ہی نظر آیا۔

''ارے!'' فریال کے منہ سے بے ساختہ نکلا ''تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں سفیان!''

''نہیں تو! ہوائیاں کیوں اڑیں گی!'' سفیان اندر آتا ہوا مسکرایا لیکن فریال نے محسوس کیا کہ جبراً مسکرایا تھا ''میں بس پریشان ہوں فری!'' وہ کہتا ہوا خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

فریال کو ذرا بھی شبہ نہیں ہوا کہ سفیان اس وقت ذہنی طور پر بہت منتشر تھا ورنہ بیرونی دروازہ وہ خود ہی بند کرتا۔ معمول یہی تھا کہ اس کی آمد پر فریال دروازہ کھولا کرتی تھی لیکن اسے بند خود سفیان ہی کیا کرتا تھا اور پھر فریال کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے ساتھ لیے ہوئے خواب گاہ کی طرف بڑھتا تھا۔

☆☆☆

خواب گاہ میں سفیان نے خود کو ایک کرسی پر جیسے گرا دیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اتنی زور سے آنکھیں بھینچیں جیسے وہ آنکھوں میں شدید جلن محسوس کر رہا ہو۔ پھر وہ آنکھیں کھولتا ہوا اس وقت سیدھا ہو کر بیٹھا جب خواب گاہ میں فریال کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے پھر مسکرایا تاہم ہونٹوں تک مسکراہٹ لانے کے لیے اسے خاصی کوشش کرنا پڑی تھی۔ اس کے دل میں کچھ عجیب سے جذبات کا سمندر متلاطم تھا اور اسے بھرپور جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی کہ کوئی سرکش لہر اس کی آنکھوں تک نہ آجائے۔

فریال قریب آئی اور سفیان کی گردن میں اپنا ایک بازو حمائل کرتی ہوئی بولی ''سچ بتاؤ سفیان! آخر بات کیا ہے؟''

''بتایا تو ہے میری جان کہ میں پریشان ہوں۔''

''مگر کیوں؟''

''آج بھی کسی سے معاملہ طے نہیں ہوسکا۔''

''آج نہیں ہوا تو کل ہوجائے گا۔ کل بھی نہیں ہوا تو دو چار دن بعد طے ہوجائے گا۔ اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟''

''پریشانی کی بات یہ ہے کہ آمدنی کا ایک معقول راستہ اچانک بند ہوگیا۔''

''یہ بات تو کل ہی سامنے آگئی تھی لیکن کل تم اتنے پریشان نہیں تھے۔''

''کل میں اس خیال سے پریشان نہیں تھا کہ معاملہ کہیں اور طے ہوجائے گا لیکن آج مجھے کئی جگہ مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔''

''یہ بہت بڑا شہر ہے سفیان! کہیں نہ کہیں بات بن ہی جائے گی۔ پہلے دن کی ناکامی سے تمہیں اتنا مایوس ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔''

''میری ہمت بندھاتے رہنا تو تمہیں خوب آتا ہے۔'' سفیان نے پھر مسکرانے کی کوشش کی۔

''اچھا اب یہ باتیں چھوڑ دو۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے تبدیل کرلو۔ میں کھانا نکالتی ہوں۔'' فریال نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ خاصا وقت ہوگیا ہے۔'' سفیان نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا ''ویسے بھی تم بھوک کے معاملے میں بہت کچی ہو!''

''اتنی کچی بھی نہیں ہوں کہ تمہارے بغیر کھانا کھالیتی۔'' فریال نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ''تم رات تک نہ آتے تو بھی میں اکیلی کھانا نہیں کھاتی۔''

''مجھے اندازہ ہے اس کا!''

''اچھا اب جلدی سے تیار ہوجاؤ۔ میں کھانا لاتی ہوں۔''

فریال خواب گاہ سے چلی گئی اور سفیان نے خواب گاہ سے منسلک باتھ روم کا رخ کیا۔ واش بیسن کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے دیوار گیر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ ابھی اس کی آمد پر فریال نے جو باتیں کی تھیں، وہ اس کے ذہن میں گونجنے لگیں اور دل میں متلاطم سمندر کی ایک لہر یکا یک اس کی آنکھوں تک آگئی۔ اس نے جلدی سے نل کھول کر اپنے منہ پر پانی کا چھپکا مارا اور آنکھوں میں آنے والی لہر، پانی کے ساتھ بہہ گئی۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ اور فریال کھانا کھا چکے اور فریال برتن، کچن میں رکھ آئی تو سفیان نے کہا ''اب کچھ دیر آرام کرلیا جائے!''

''ہاں۔'' فریال نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا ''کچھ دیر آنکھیں بند کر کے لیٹنا تو میں بھی چاہتی ہوں۔ شاید اسی سے سر کا درد کچھ کم ہو!''

''سر میں درد ہے تمہارے!'' سفیان جیسے تڑپ گیا۔ اسے فریال سے بے انتہا محبت تھی بلکہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو بہت شدت سے چاہتے تھے۔

فریال دھیرے سے ہنس پڑی ''تم تو اس طرح بولے ہو جیسے میرے سر میں درد نہیں بلکہ......''

''زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔'' سفیان نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ''میری پریشانی پر تم نے پریشانی کا اظہار تو نہیں کیا لیکن اتنی فکر مند ہو گئی ہو کہ سر میں درد کر بیٹھی ہو۔''

''نہیں سفیان! درد تو تمہارے آنے سے بھی پہلے ہو رہا ہے۔ میں نے چائے بھی بنا کر پی لی تھی لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ بعض اوقات کھانا کھانے سے بھی، سر کا درد ختم ہو جاتا ہے لیکن اس وقت ایسا بھی نہیں ہوا۔''

''سر کے درد کی کوئی گولی تو لی نہیں ہو گی! دوا کھانے کی تو تم ہمیشہ سے چور ہو!''

''کیا کروں، گھبراہٹ سی ہونے لگتی ہے گولی کھانے کے خیال سے۔''

''میں تمہاری یہ گھبراہٹ ختم کروا کے مانوں گا۔'' سفیان نے بے ساختہ کہا اور پھر کسی خیال سے اس کا وجود اندر سے لرز اٹھا۔ اس نے جلدی سے اس شیلف کا رخ کیا جس میں عام قسم کی دوائیں رکھی رہتی تھیں۔ اس نے جلدی سے اپنا رخ اس لیے بدلا تھا کہ اگر اس وقت اس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی آئی ہو تو وہ فریال کی نظر میں نہ آ سکے۔

''نہیں نہیں، میں کوئی گولی وولی نہیں کھاؤں گی۔''

فریال برابر کہتی رہی لیکن سفیان اسے سر درد کی دو گولیاں کھلائے بغیر نہ مانا۔ پھر پانی کا گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھ کر اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا ''اب ایک کپ چائے اور پی لو۔ میں بنا کے لاتا ہوں۔ ایک کپ میں بھی پیوں گا۔''

''ارے نہیں، چائے میں خود بنا لاتی ہوں۔ تم تو کھانے کے بعد چائے پیتے بھی نہیں ہو۔''

''اس وقت تمہارے ساتھ پی لوں گا۔''

''اچھا ٹھیک ہے لیکن بنا کے تو میں ہی لاؤں گی۔''

فریال نے بستر سے اٹھنا چاہا تھا لیکن سفیان نے اسے زبردستی لٹا دیا اور بولا ''خبردار جو اب اٹھیں۔ اس وقت تمہارے لیے چائے میں ہی بنا کر لاؤں گا۔''

فریال اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی مسکرا کر رہ گئی اور سفیان کمرے سے نکل آیا۔

چائے بنانے میں چھ سات منٹ لگے تھے۔ چائے کی دونوں پیالیاں ایک چھوٹی ٹرے میں رکھ کر اس نے کچن سے باہر جھانکا، پھر اپنی جیب سے ایک پڑیا نکالی۔ اس پڑیا میں کسی سفوف کی قلیل سی مقدار تھی۔ وہ سفوف ایک پیالی میں ڈالتے وقت اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور آنکھوں میں اتنی نمی آ گئی تھی کہ جیسے درد کا سمندر ابل پڑنے کے لیے تلا ہوا ہو۔ اسے بھی گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کسی دن فریال کو سلو پوائزن (SLOW POISON) دینا شروع کرے گا۔

چائے بنانے کا موقع تو اسے اتفاق سے مل گیا تھا ورنہ وہ اس کا آغاز کسی اور وقت، کسی اور انداز میں کرتا۔

☆☆☆

چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی فریال نے ذائقے میں

خفیف سی تبدیلی محسوس کی لیکن اندازہ نہیں لگا سکی کہ چائے بنانے میں سفیان سے کیا گڑبڑ ہوئی ہوگی!

''چائے کا مزہ کچھ عجیب سا ہے۔'' سفیان نے اپنی پیالی سے ایک گھونٹ لے کر کہا ''شاید مجھے چائے بنانا بھی کبھی نہیں آئے گی۔''

''ارے نہیں۔'' فریال نے ہنس کر کہا ''مزہ تو ٹھیک ہے۔'' سفیان نے اس کے لیے اتنی محبت سے چائے بنائی تھی کہ وہ چائے کے نقص کا اظہار کرنے میں سفیان کا ساتھ نہیں دینا چاہتی تھی۔

''تم میرا دل رکھنا چاہتی ہو!'' سفیان نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ خود تمہارے منہ کا مزہ ہی کچھ خراب ہوگا۔'' فریال نے کہا۔

''اگر تم یہ سمجھتی ہو تو میں مانے لیتا ہوں۔''

چائے پی کر وہ دونوں لیٹ گئے۔

سفیان نے کہا ''اگر نیند نہ آئے تو بھی ایک گھنٹے تک آنکھیں بند کیے لیٹی رہو۔''

فریال نے مسکرا کر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ اسے سفیان سے محبت ہوئی جو اسے اتنی ہی شدت سے چاہتا تھا جتنی شدت سے وہ اسے چاہتی تھی۔ اس کا اب دنیا میں سفیان کے سوا کوئی تھا بھی نہیں اور یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ سفیان کے لیے بھی اب صرف وہی تھی۔ اب انہیں ایک دوسرے کے لیے ہی جینا تھا۔

فریال کے ماں باپ اس کے بچپن ہی میں مرگئے تھے۔ بہن بھائی کوئی تھا نہیں۔ اس کی پرورش اس کے ماموں نے کی تھی۔ آٹھ سال کی عمر سے لے کر اٹھارہ سال کی عمر تک وہ ماموں ہی کے زیرِ سایہ رہی تھی۔ وہ اسے اپنی دونوں بیٹیوں ہی کی طرح چاہتے تھے لیکن ممانی سے فریال کو کبھی محبت نہیں ملی تھی۔ اگر اس عورت کے اختیار میں ہوتا تو وہ فریال کو تعلیم بھی حاصل نہیں کرنے دیتی لیکن گھر پر فریال کے ماموں کا ایسا رعب و دبدبہ تھا کہ وہ چوں بھی نہیں کرسکتی تھی۔

جب فریال میٹرک کے بعد کالج میں پہنچی تو پہلی بار اس نے اور سفیان نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ایک دوسرے پر ان کی محبت آشکار ہوگئی۔ اگر زیادہ عرصہ گزر جاتا تو بات شاید عہد و پیماں تک پہنچ ہی نہیں پاتی کیونکہ سفیان نے اسی سال کالج چھوڑ دیا تھا۔ سفیان کے والد اسے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے لیکن اس شہر میں کوئی میڈیکل کالج نہیں تھا۔ اس کے لیے سفیان کو اپنے شہر سے سو میل دور ایک بڑے شہر کا رخ کرنا پڑا۔ وہاں اس کے والد نے اسے دو کمروں کا ایک فلیٹ خرید کر اسے ڈیکوریٹ بھی کروادیا تھا۔

سفیان کے والد ایک بڑی کاروباری شخصیت تھے۔ اپنی صلاحیتوں اور محنت ہی سے انہوں نے اپنے کاروبار کو ترقی دی تھی لیکن دو سال قبل بیوی کی وفات کے بعد ان کے مزاج میں آنے والی تبدیلی ان کے کاروبار کو متاثر کرنے لگی تھی۔ وہ شراب نوشی کے عادی ہوگئے تھے۔ ان کی عدم توجہی کے باعث کاروبار زوال پذیر ہونے لگا۔ اسے سنبھالنے کے لیے انہوں نے بینکوں سے قرض لیے۔ قرض سے کاروبار کو سنبھالا جا سکتا تھا لیکن اسی صورت میں جب وہ خود کو بھی سنبھال لیتے اور ایسا وہ کر نہیں سکتے تھے جس کا نتیجہ ان کی مکمل تباہی کی صورت میں سامنے آیا۔

حکومت نے جب ''نادہندگان'' کے خلاف مہم چلائی تو وہ بہت بری طرح اس کی زد میں آئے۔ ان کے اکاؤنٹ ''سیز'' کردیے گئے اور کاروبار سمیت ان کا سب کچھ اس طرح ضبط ہوا کہ وہ کوڑی کوڑی کے محتاج ہوگئے۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ صدمے سے ان پر ہارٹ اٹیک ہوا جس نے ان کی زندگی کا چراغ گل کردیا۔

سفیان میڈیکل کالج میں صرف ایک سال پڑھ سکا۔ باپ کی موت پر اسے اپنے شہر لوٹنا پڑا۔ یہاں سے وہ کروڑپتی باپ کے بیٹے کی حیثیت سے گیا تھا لیکن واپس آکر اسے اپنے قلاش باپ کے جنازے کو کاندھا دینا پڑا۔

دنیا سفیان کی آنکھوں میں اندھیر ہوچکی تھی۔ جب وہ تنہائی میں فریال سے ملا تو اس کی گود میں سر رکھ کر رو پڑا۔

فریال اس وقت دوہرے صدمے سے دوچار تھی۔ ایک طرف سفیان پر گزرنے والے سانحے کا غم تھا تو دوسری طرف یہ صدمہ کہ ٹریفک کے ایک حادثے میں اس کے ماموں کی ایک ٹانگ ضائع ہوگئی تھی جس کے باعث ملازمت بھی جاتی رہی تھی اور وہ خاصی مالی مشکلات سے دوچار ہوگئے تھے۔

انہی حالات کے باعث جب سفیان نے فریال کے ماموں سے اس شرط پر فریال کا ہاتھ مانگا کہ رخصت کے وقت فریال کے ساتھ ان کپڑوں کے سوا کچھ نہ ہو جو اس کے جسم پر ہوں تو یہ رشتہ بے حد آسانی سے اس لیے بھی طے پا گیا کہ فریال کی ممانی کو بڑی آسانی کے ساتھ ایک ''بوجھ'' سے چھٹکارا مل رہا تھا۔

لیکن فریال کے ماموں نے بہرحال اپنی بھانجی کو چند ملبوسات اور کچھ ہلکے پھلکے زیور دینے کا بندوبست کیا البتہ ان دونوں کا نکاح چند افراد کی موجودگی میں بڑی سادگی سے

ہو گیا۔

شادی کے بعد سفیان، فریال کو اسی شہر میں لے آیا جہاں اس نے میڈیکل کالج میں ایک سال تعلیم حاصل کی تھی۔ اب میڈیکل کالج کی طرف رخ کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا لیکن یہاں رہائش کی پریشانی اس لیے نہیں تھی کہ دو کمروں کا ایک فلیٹ اس کے پاس پہلے ہی سے تھا جو اسی کے نام سے خریدا گیا تھا۔ اس کے مرحوم والد اس کے تعلیمی اخراجات کے علاوہ اس کی ذاتی ضروریات کے لیے خاصی معقول رقم بھیجا کرتے تھے اس میں سے ایک تہائی رقم بڑی آسانی سے بچ جایا کرتی تھی۔ گو کہ سال بھر میں مجموعی طور پر کوئی بہت بڑی رقم پس انداز نہیں ہوئی تھی لیکن اتنی ضرور تھی کہ تین چار ماہ تک گھریلو ضروریات پوری ہو سکتی تھیں۔

اپنے مزاج کی وجہ سے سفیان کا خیال تھا کہ وہ کوئی ملازمت نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس نے سوچا کہ وہ فلیٹ بیچ کر رہنے کے لیے کرائے کی کوئی جگہ لے کر فروخت شدہ فلیٹ سے کوئی کام شروع کرے گا لیکن فریال نے اس کی شدید مخالفت کی۔ اس کا خیال تھا کہ سفیان کا مزاج کاروباری بھی نہیں ہے لہٰذا وہ اس میں بھی ناکام ہی رہتا اور سر چھپانے کی ایک جگہ بھی ہاتھ سے نکل جاتی۔

سفیان کو اس کی یہ بات کچھ غلط نہیں معلوم ہوئی۔

فریال نے ایف اے تک پڑھا تھا۔ وہ کوئی چھوٹی موٹی ملازمت تلاش کرنے کی خواہاں تھی لیکن یہ سفیان نے گوارا نہیں کیا۔ اس کی نظر میں ایک راستہ یہ بھی تھا کہ وہ اپنے شوق کو اپنا ''پیشہ'' بنا لے۔

مصوری کا شوق اسے بچپن ہی سے تھا۔ اسکول کی ابتدائی کلاسوں میں تھوڑی بہت ڈرائنگ سیکھی بھی تھی۔ اسی کی بنیاد پر وہ اپنے شوق کے باعث اچھی خاصی تصویریں بنانے لگا تھا لیکن وہ تصویریں اتنی اچھی بھی نہیں ہوتی تھیں کہ وہ ایک مصور کی حیثیت سے تھوڑا بہت ہی نمایاں مقام حاصل کر سکتا۔

میڈیکل کالج میں پڑھتے ہوئے بھی اس نے اپنا یہ شوق جاری رکھا تھا۔ ڈرائنگ روم ہی کے ایک حصے میں وہ تمام چیزیں موجود تھیں جن سے اس کے شوق کی تکمیل ممکن ہوتی تھی۔ اس وقت تک اس نے جو کچھ بنایا تھا، ان میں سے زیادہ تر اپنے دوستوں کو تحفے کے طور پر دے چکا تھا لہٰذا اپنے شوق کو پیشہ بنانے کے لیے اس نے نئے سرے سے کام کرنا شروع کیا۔

شہر کے ایک فیشن ایبل بازار میں ایسی دکانیں تھیں جہاں گھریلو ڈیکوریشن کی دیگر اشیا کے ساتھ ہاتھ کی بنائی ہوئی پینٹنگز بھی فروخت ہوتی تھیں جو زیادہ تر صرف مڈل کلاس کے لوگ خریدا کرتے تھے۔

انہی دکانوں میں سے ایک بڑی دکان کا مالک سفیان کے والد کے ابتدائی زمانے میں ان کا بہت اچھا دوست رہا تھا۔ سفیان مختلف اقسام کی دو تین تصاویر بنا کے اس کے پاس لے گیا تو اسے خاصی پزیرائی حاصل ہوئی۔

یہ سلسلہ چل پڑا تو کم از کم اتنی ماہانہ آمدنی ہونے لگی کہ گھریلو اخراجات میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا لیکن دھیرے دھیرے سفیان کے کام میں نکھار آیا تو اس کی بنائی ہوئی تصویریں قدرے زیادہ قیمت میں فروخت ہونے لگیں۔ اسی لیے اس کے معاوضے میں بھی اتنا اضافہ ہوا کہ وہ فریال کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے بھی گھر سے نکلنے لگا۔ ٹیکسیوں کے کرائے دینا بھی اس کے لیے ممکن ہو گیا تھا۔ پہلے تو وہ گھر سے اس لیے نہیں نکلتے تھے کہ سفیان کو اپنی محبوب بیوی کے ساتھ بسوں میں دھکے کھانا گوارا نہیں تھا۔

فریال سوچا کرتی تھی کہ سفیان کی محنت اور لگن کسی روز اسے ایک بڑا مصور بھی بنا سکتی ہے مگر اچانک یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس دکان دار کا انتقال ہو گیا جو سفیان کی بنائی ہوئی تصویریں خریدا کرتا تھا۔ اس کے بیٹے نے دکان سنبھالی تو سفیان کی تصویریں لینے سے انکار کر دیا۔

''اس کی وجہ بھی میں نے معلوم کر لی ہے۔'' سفیان نے فریال سے کہا تھا ''اس لڑکے کا کوئی دوست بھی تصویریں بناتا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میری بنائی ہوئی تصویریں زیادہ اچھی ہوتی ہیں لیکن وہ لڑکا ناتجربہ کاری کے باعث دوست نواز بن گیا ہے۔''

''تو اب کسی اور دکان دار سے بات کرو۔''

''یہی کرنا پڑے گا۔''

لیکن اس روز جب اس نے واپسی پر اپنی ناکامی اور پریشانی کا اظہار کیا تھا، تبھی فریال نے اس سے یہ بات کہی تھی کہ یہ بہت بڑا شہر ہے سفیان! کہیں نہ کہیں بات بن جائے گی، پہلے دن کی ناکامی سے تمہیں اتنا مایوس ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

☆☆☆

دوسرے دن سفیان اسی سلسلے میں گھر سے نکلا جو تیار شدہ تصاویر اس کے گھر میں موجود تھیں، اس نے ان کے فوٹو گراف بنوا لیے تھے جن کی چھوٹی سی البم اس کے پاس تھی۔ وہی دکھا کر وہ کسی اور دکان سے معاملہ طے کر سکتا تھا۔

گزشتہ روز تو اس نے اس سلسلے میں کوئی پیش رفت کی

ہی نہیں تھی۔ ایک اور ہی معاملے سے دوچار ہونے کے بعد اس نے اپنا خاصا وقت ایک پارک میں بیٹھے بیٹھے گزار دیا تھا اور واپسی پر جب فریال نے اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھی تھیں تو اسے پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے اس جھوٹ کی آڑ لینا پڑی تھی کہ کسی اور دکان دار سے معاملہ طے نہیں ہوسکا۔

دوسرے دن اس نے واقعی اس فیشن ایبل بازار کا رخ کیا جہاں اس قسم کی دکانیں تھیں جن میں سے کسی کے مالک سے..... سفیان کا معاملہ طے ہوسکتا تھا اور معاملہ طے ہو بھی گیا۔ بس معاوضے کے سلسلے میں دکان کے مالک نے کچھ خصاصت دکھائی تھی یا یہ کہا جاسکتا تھا کہ وہ ان کاروباریوں میں سے ایک تھا جو کام کرنے والوں کی محنت نظر انداز کر کے اپنے لیے زیادہ سے زیادہ فائدے کی راہ نکال لینے ہی کو ''کامیاب کاروباری انداز'' سمجھتے ہیں۔

سفیان نے معاملہ یہ سوچ کر طے کرلیا کہ بعد میں وہ کسی اور سے بھی رابطہ کرسکتا ہے۔

☆☆☆

اس روز تنہائی میں فریال زیادہ بے چین نہیں ہوئی۔ سفیان کے انتظار میں ایک دن بے چین رہنے کے بعد اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے اپنی یہ فطرت بدلنا ہوگی۔ زندگی کی راہیں دشوار گزار ہوں تو مرد کو زیادہ دیر تک گھر سے باہر رہنا ہی پڑتا ہے لہٰذا بیوی کو اس کا عادی ہونا چاہیے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ذہنی انتشار میں مبتلا رہنے کے باعث اس کی طبیعت خراب رہنے لگے۔ اسے ہر قیمت پر خود کو صحت مند رکھنا تھا تاکہ سفیان کا اچھی طرح خیال رکھ سکے جو کبھی کبھی رات کو زیادہ دیر تک جاگ کر کام کیا کرتا تھا۔ اس وقت اسے چائے وغیرہ کی ضرورت ہوتی تھی جس کے لیے فریال جاگتی رہتی تھی۔ سفیان تو اس سے کہتا تھا کہ وہ خود چائے بنالیا کرے گا، وہ سوجایا کرے لیکن اس نے سفیان کی یہ بات کبھی نہیں مانی تھی۔ اس نے تو شادی کے وقت ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ زندگی کی جدوجہد میں سفیان کے شانہ بشانہ رہے گی۔ اب کیا وہ اتنا بھی نہ کرتی کہ جب سفیان رات گئے تک کام کرے تو وہ اس کی ضروریات کا خیال رکھنے کے لیے جاگتی ہی رہے!

ان کو صرف ایک دوسرے کے لیے جینا تھا۔ دنیا میں ان کا کوئی تھا بھی نہیں۔ سفیان کے کچھ عزیز و اقارب تھے تو سہی لیکن وہ اس ملک میں نہیں تھے البتہ فریال کے عزیزوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ سات آٹھ گھر تو ہوں گے ہی لیکن فریال ان سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ ان کی طرف سے اس کا دل اس لیے کھٹا ہوگیا تھا کہ نہایت آسودہ حال ہونے کے باوجود انہوں نے اس وقت اس کے سر پر ہاتھ نہیں رکھا تھا جب وہ باپ کے سائے سے محروم ہوئی اور ماں شدید بیمار تھیں۔ اس وقت اس کے صرف ماموں ہی نے بہن اور بھانجی کا ہر ممکن خیال رکھا تھا اور جب اس کی ماں بھی چل بسی تھیں تو ماموں ہی اسے اپنے گھر لے گئے تھے۔ اسے انہوں نے بالکل اپنی ان دونوں بیٹیوں کی طرح چاہا تھا جو فریال کی شادی کے وقت دس اور بارہ سال کی تھیں۔

ماموں ملازمت پیشہ تھے اور انہیں متوسط طبقے کا آدمی کہا جاسکتا تھا لہٰذا ان سے بھی دیگر عزیزوں نے بس اس حد تک تعلق رکھا تھا جیسے کسی سے معمولی سی رسم و راہ ہوتی ہے۔

فریال کو صرف انہی سے محبت تھی اور ہونا بھی چاہیے تھی۔ اسی لیے وہ شادی کے بعد ایک بار پھر ان سے ملنے بھی گئی تھی۔ سفیان تو چاہتا تھا کہ وہاں چند گھنٹے سے زیادہ نہ گزارے جائیں لیکن ماموں نے اصرار کیا کہ وہ دونوں ایک رات کے لیے تو رکیں۔

ماموں کی صحت بھی بہت جلد خاصی خراب ہوگئی تھی۔ اس کا سبب ان کے تفکرات تھے۔ مالی مشکلات میں گھر جانے کے بعد انہیں ہر وقت یہ خیال ستاتا رہتا تھا کہ چند سال بعد جب ان کی بیٹیاں جوان ہوں گی تو وہ ان دونوں کے سلسلے میں اپنی ذمّے داریوں سے کس طرح عہدہ برا ہوسکیں گے!

حالات ہی کی وجہ سے گھر پر ان کا پہلے جیسا دبدبہ بھی نہیں رہا تھا۔ فریال کی ممانی ان پر چھا گئی تھیں۔ ان کے نشتر جیسے جملے بھی ماموں کا دل چھلنی کرتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی ممانی کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں جب ماموں نے ان دونوں کو ایک رات کے لیے روکا تھا۔

محبت آمیز اصرار پر وہ دونوں رک تو گئے تھے لیکن ممانی کے رویے کے باعث شدید کوفت میں مبتلا رہے تھے۔ انہوں نے جیسے تیسے وہ رات گزاری تھی اور دوسرے دن واپسی پر خود فریال نے سفیان سے کہہ دیا تھا کہ اب وہ ماموں کے گھر کا رخ کبھی نہیں کرے گی۔

ماموں سے محبت کے باوجود اس کے فیصلے میں کبھی لچک نہیں آئی لیکن اس نے ان سے خط و کتابت ضرور جاری رکھی۔ ہفتے میں ایک خط تو ضرور ہی لکھتی تھی۔ ماموں جواب بھی دیتے تھے۔ ان کے خطوط کے ایک ایک لفظ سے ان کی محبت بھی ٹپکتی تھی لیکن پھر کبھی انہوں نے فریال کو بلایا نہیں۔ اس کا سبب فریال نے بھی سمجھ لیا تھا اور سفیان نے بھی لہٰذا ماموں سے کسی قسم کی شکایت ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

''تمہارے دوسرے عزیزوں کو تو ان حالات میں

تمہارے ماموں کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔'' صرف ایک مرتبہ سفیان نے یہ بات کہی تھی۔

جواب میں فریال نے کہا تھا ''اندھیرے میں تو سایہ بھی جدا ہو جاتا ہے سفیان! وہ امیر لوگ ایک غریب کا خیال کیوں رکھنے لگے! ماموں بتا رہے تھے کہ ان کی ٹانگ ضائع ہونے کے بعد تو کسی نے بھولے بھٹکے ان کے گھر میں جھانکا تک نہیں تھا۔''

انہی حالات کے باعث فریال نے سمجھ لیا تھا کہ اب اسے اور سفیان کو صرف ایک دوسرے کے لیے جینا ہے۔

سفیان کے عزیز و اقارب تو اس ملک میں تھے ہی نہیں لیکن میڈیکل کالج کے جولڑکے اس کے ''قریبی دوست'' بن گئے تھے، انہوں نے بھی سفیان کے حالات کی تبدیلی کے باعث گریز کی راہیں تلاش کر لی تھیں اور سفیان بھی اتنا خوددار تھا کہ اس نے ''جھک'' کر کسی سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے بھلا دیا تھا کہ کبھی کسی سے اس کی دوستی تھی!

''بلکہ وہ دوستی تھی ہی نہیں۔'' سفیان نے ایک مرتبہ فریال سے کہا تھا ''وہ روپے سے روپے کا تعلق تھا اور روپیا اب میرے پاس ہے نہیں۔''

☆☆☆

اس روز سفیان جلد ہی گھر لوٹا اور اس نے بتایا کہ ایک جگہ معاملہ طے ہو گیا ہے۔

فریال نے مسکرا کر کہا ''میں تمہاری طرح پریشان ہوئی بھی نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی راستہ کھل ہی جائے گا۔''

یہ یقین سفیان کو بھی تھا لیکن وہ فریال کو نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کی پریشانی کا اصل سبب کیا تھا۔

فریال کو سلو پوائزن (SLOW POISON) دینے کا سلسلہ اس نے بلاناغہ جاری رکھا۔ وہ سفوف کی بہت قلیل سی مقدار ہوتی تھی مگر چونکہ پہلی ہی مرتبہ فریال نے چائے میں ذائقے کی تبدیلی محسوس کر لی تھی اس لیے سفیان نے وہ سفوف بھی تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ چوبیس گھنٹوں میں وہ تین ایسے مواقع نکال ہی لیتا تھا کہ فریال کے کھانے کی کسی چیز میں وہ سفوف ملا سکے۔

دو ماہ گزر گئے۔ اسی دوران میں سفیان نے اپنی بنائی ہوئی تصاویر کے معقول معاوضے کا ذریعہ بھی نکال لیا مگر نہ جانے کیوں فریال کو اس سے بے خبر رکھا۔ معاوضے میں... جتنی رقم کا اضافہ ہوا تھا، وہ بینک اکاؤنٹ میں جاتی رہی۔ گھر میں جو کچھ آتا تھا اس سے بہ مشکل ہی گزر اوقات ہو پاتی تھی۔

دو ماہ بعد فریال نے ایک روز اس سے کہا ''سفیان! تم مجھ میں کسی قسم کی تبدیلی محسوس کر رہے ہو؟''

سفیان کا دل دھڑک اٹھا۔ اس نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا ''تم کچھ کمزور ہو گئی ہو۔ میں نے یہ محسوس کر لینے کے باوجود تم سے اس لیے نہیں کہا کہ تم پھر اس کو زیادہ ہی شدت سے محسوس کرنے لگتیں۔''

رات خاصی ہو چکی تھی۔ وہ دونوں بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ سفیان نے کروٹ لے رکھی تھی اور فریال کا سر اس کے بازو پر تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی ''مالی دباؤ کو تم بہت شدت سے محسوس کر رہی ہو جو تمہاری اس کمزوری کا سبب بنا ہے۔''

''نہیں سفیان! میں کسی دباؤ کا شکار نہیں ہو رہی ہوں۔ میں نے یہ خیال اپنے ذہن میں بٹھا لیا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے یا جو کچھ ہونا ہے، وہ ہمارا مقدر ہے لہٰذا اس بارے میں کم از کم میرا کچھ سوچتے رہنا فضول ہی ہوگا۔ حالات میں کوئی تبدیلی صرف تمہاری محنت ہی سے آسکتی ہے جو تم کر رہے ہو۔ اب بھی اگر حالات نہیں سنورتے تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ خدا ہی کو ہمارا امتحان مقصود ہے۔''

''کل میں تمہارے لیے کچھ وٹامنز خرید لاؤں گا۔''

''کہاں سے خرید کر لاؤ گے۔ گھریلو اخراجات کے بجٹ میں تو اس کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔''

''میں اپنے اوقات کار میں ایک گھنٹے کا اضافہ اور کر لوں گا۔''

''اس کا اثر تمہاری صحت پر بھی پڑ سکتا ہے۔ خدانا خواستہ تم بیمار پڑ گئے تو اتنا بھی نہیں رہے گا جتنا ہے۔''

''اگر میری صحت پر کچھ اثر پڑا تو پھر احتیاط برتنے لگوں گا۔ فی الحال تو کچھ کرنا ہوگا۔'' سفیان نے کہا، پھر ایک ٹھنڈا سانس لے کر بولا ''تمہیں یاد تو ضرور ہوگا۔ جب والد کے انتقال کے بعد حالات نے مجھے آسمان سے زمین پر پٹخ دیا تھا تو میں نے تم سے کہا تھا کہ اب تم مجھ سے...... یعنی ایک ایسے شخص سے شادی نہ کرو جس کا مستقبل غیر یقینی اور اندھیرے میں ڈوبا ہوا نظر آنے لگا ہے لیکن تم نے میری کسی بات پر کان نہیں دھرے تھے۔''

''دھرتی بھی کیوں!'' فریال نے اس کی طرف کروٹ لیتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا ''میرے لیے اس سے زیادہ گھاٹے کا سودا کوئی نہیں ہوتا کہ میں تمہاری آغوش میں نہ مرتی۔''

سفیان نے بے چین ہو کر اسے اپنے دونوں بازوؤں

میں کس لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔
''یہ آغوش ہی تو میرے لیے سکون کی ایک جگہ ہے۔''
فریال نے سرشاری کی کیفیت میں کہا لیکن اس وقت چونک پڑی جب سفیان کا ایک آنسو اس کی گردن پر ٹپکا۔ اس نے جلدی سے خود کو سفیان کے بازوؤں کے حلقے سے نکالا۔ سفیان نے اس سے اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کی۔
''یہ کیا بچوں کی طرح رونے لگے!'' وہ ہنس کر بولی ''کبھی مجھے بھی روتے ہوئے دیکھا ہے؟ بس جس طرح گزرنا ہے، گزر جائے گی۔ مجھ سے غلطی ہوئی کہ اپنی کمزوری کا ذکر چھیڑ بیٹھی۔''
''ذکر چھیڑنے سے کچھ نہیں ہوا فری! تمہاری گرتی ہوئی صحت کا احساس مجھے خود بھی تھا۔ یہ تو میری بے بسی ہے جو آنسو بن کر میری آنکھوں میں آ گئی۔ کاش میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا!'' سفیان جذباتی انداز میں اپنا ہونٹ کاٹنے لگا۔
''تم میرے لیے سب کچھ کر سکتے ہو۔ ابھی تم خود کہہ چکے ہو کہ ایک گھنٹے زیادہ کام کیا کرو گے لیکن یہ تو میں خود نہیں چاہتی کہ تمہاری صحت پر کوئی برا اثر پڑے۔ اگر میں بیمار پڑوں تو تم کسی نہ کسی طرح کچھ کر ہی لو گے لیکن خدانخواستہ اگر تمہیں کچھ ہو جائے تو میں......'' فریال کی آواز اس کے حلق میں گھٹنے لگی ''میں تو کچھ بھی نہیں کر سکوں گی۔''
سفیان نے جذبات کی شدت سے بے قابو ہو کر فریال کو ایک بار پھر اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔
☆☆☆
دوسرے دن سفیان بازار سے کچھ وٹامنز خرید لایا اور اسی دن سے رات کو ایک گھنٹے زیادہ کام کرنا بھی شروع کر دیا۔
فریال اس کا خیال رکھنے کے لیے حسبِ معمول جاگتی رہی۔ سفیان کو چائے پلا کر جب وہ کمرے میں لوٹتی تو اس کے چہرے پر تفکر کے آثار نمایاں ہو جاتے۔ وہ سوچنے لگتی کہ سفیان پہلے ہی خاصا وقت کام کرتے ہوئے گزارتا تھا، اب اس میں ایک گھنٹے کا اضافہ فریال کے اس خدشے کی بنیاد بن رہا تھا کہ کہیں سفیان کی طبیعت خراب نہ رہنے لگے۔ وہ سفیان کے سامنے خود کو ہشاش بشاش ظاہر کرتی تھی لیکن تنہائی میں وہ ہمیشہ خود کو تفکرات کے نرغے میں پاتی۔ وہ اپنی صحت کی خرابی کا سبب بھی اسے ہی سمجھ رہی تھی لیکن سفیان کے سامنے اس نے اقرار نہیں کیا تھا کہ وہ حالات کے دباؤ کا شکار تھی۔
پندرہ دن گزر گئے۔ اب فریال کو ایک اور پریشانی لاحق ہو گئی۔ ان دنوں میں اس کے ماموں کا ایک خط بھی نہیں آیا تھا۔ اسے خیال آیا کہ وہ کچھ زیادہ بیمار نہ پڑ گئے ہوں!

فریال کو اپنی ممانی سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اسے خط لکھ کر ماموں کی بیماری سے آگاہ کرتی۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے پڑوس کی ایک لڑکی کو خط لکھا اور لفافے میں جوابی لفافہ بھی رکھ دیا کیونکہ اس لڑکی سے اس کی معمولی سی علیک سلیک رہی تھی۔ ممانی کی وجہ سے کبھی یہ ممکن نہیں ہوا تھا کہ وہ آس پاس کے گھروں کی لڑکیوں یا عورتوں سے تعلقات بڑھا سکتی۔
تین دن بعد جواب آ گیا۔ جس نے فریال کو بلک بلک کر رونے پر مجبور کر دیا۔ معلوم ہوا تھا کہ اس کے ماموں دو ماہ بیمار رہنے کے بعد دنیا سے چل بسے تھے۔
سفیان بہ مشکل تمام ہی فریال کو سنبھال سکا۔
''کتنے اچھے تھے میرے ماموں!'' فریال نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا ''وہ دو مہینے بیمار رہے اور مجھے برابر خط لکھتے رہے لیکن کبھی اپنی بیماری کے بارے میں اس لیے نہیں لکھا کہ میں ان کے لیے پریشان اور دکھی ہو جاتی۔''
''بلاشبہ وہ بہت اچھے انسان تھے۔'' سفیان نے کہا۔
فریال کا سر اس کے سینے پر تھا۔ ''میں یہ تو جانتی تھی کہ خدانخواستہ کوئی بات ہو جائے تو وہ میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے لیکن بس ایک احساس رہتا تھا کہ اس دنیا میں تمہارے علاوہ میرے ایک ماموں بھی ہیں۔ آج وہ احساس بھی ختم ہو گیا۔''
سفیان اس کی پیٹھ تھپکتا رہا۔ ایسے موقعوں پر الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔
☆☆☆
اگر حالات خراب ہوں تو ان میں مزید کوئی خرابی پیدا نہ ہونے کے باوجود انسان پر یکایک گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے اور ذہنی خلفشار بڑھ جاتا ہے۔ ایک روز فریال نے کچھ ایسا ہی محسوس کیا تو اپنا دھیان بٹانے کے لیے گھر کی غیر معمولی صفائی میں مصروف ہو گئی لیکن اس مصروفیت میں بھی اس نے وہ کام فراموش نہیں کیے جو وہ سفیان کے لیے کرتی تھی۔
وٹامنز کا استعمال جاری رہنے کے باوجود اس کی صحت پر کوئی خاص مثبت اثر نہیں پڑا تھا اس لیے دو گھنٹے میں ہی وہ شدید تکان کا شکار ہو گئی اور پھر یکایک اس نے اپنے دل کی دھڑکنوں میں غیر معمولی اضافہ محسوس کیا۔ اس نے جلدی سے ٹھنڈے پانی کا گلاس پیا لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ دھڑکنیں تیز سے تیز تر ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ گھبرا کر وہ چیخ پڑی ''سفیان!''
سفیان دوڑا دوڑا باورچی خانے میں پہنچا۔ وہ اس وقت

وہیں تھی اور منہ کھولے لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پسینہ چمک رہا تھا حالانکہ وہ گرمیوں کے دن نہیں تھے۔ وہ سفیان کو بہ مشکل تمام اپنی کیفیت سے آگاہ کرسکی۔

''میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ اتنا کام نہ کرو۔'' سفیان بولا۔

''میرا جسم...... بے جان سا ہو رہا ہے۔'' وہ بڑی دقت سے کہہ سکی۔

سفیان اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر خواب گاہ میں لے گیا اور اسے بستر پر لٹاتا ہوا بولا ''آرام کرو اور اسی طرح لمبی لمبی سانسیں لیتی رہو۔'' وہ بستر پر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

فریال کے دل کی دھڑکنیں بتدریج قابو میں آ گئیں۔ پانچ منٹ بعد وہ معمول کے مطابق سانس لے رہی تھی لیکن اس کا چہرہ اس طرح سفید پڑ گیا تھا جیسے کسی نے اس کے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا ہو۔

معمول پر آ جانے کے بعد کسی خیال سے فریال کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سفیان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور گلوگیر آواز میں بولی ''سفیان! اگر کبھی میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہو جائے اور شاید میں بے ہوش ہو جاؤں تو مجھے کسی اسپتال میں داخل نہ کرا دینا۔ مجھے اسپتال سے بہت ڈر لگتا ہے۔ اسپتالوں میں تو موت کے فرشتے کی آمدورفت ایک معمول ہوتی ہے۔ وہاں تو یہ خوف ہی مجھے مار ڈالے گا۔''

''یہ تو تم نے مجھے شادی سے پہلے بھی بتایا تھا کہ تمہیں اسپتال سے بہت ڈر لگتا ہے لیکن اب تمہاری طبیعت اتنی خراب رہنے لگی ہے کہ کسی ڈاکٹر کو دکھانا تو پڑے گا۔''

''میں محسوس کر رہی ہوں، مجھ میں اب اتنی سکت بھی نہیں رہے گی کہ کسی ڈاکٹر کے مطب تک جا سکوں۔''

''تو ڈاکٹر کو یہاں بلانا پڑے گا۔''

''مگر اس کی فیس؟''

''کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ اب یہ تو نہیں ہو سکتا نا کہ تم بیمار رہو اور میں تمہیں ڈاکٹر کو بھی نہیں دکھاؤں!''

فریال رونے لگی۔ یہ پہلا موقع تھا جب اسے احساس ہوا کہ وہ اچانک مکمل طور پر ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔

☆☆☆

سفیان نہیں چاہتا تھا کہ کوئی تجربہ کار ڈاکٹر صرف معائنہ ہی کر کے اس ''گڑبڑ'' کے بارے میں شبہے کا شکار ہو جائے جسے راز رکھنا سفیان کے لیے ضروری تھا اس لیے وہ قریب ہی کے ایک نئے اور ناتجربہ کار ڈاکٹر کو لے آیا۔ وہ فریال کے دل میں یہ خیال بھی نہیں آنے دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کے علاج سے گریز کرنا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر نے معائنہ کر کے اپنے پاس سے کچھ دوائیں دیں اور بلڈ ٹیسٹ کے لیے ایک پرچہ لکھ کر دیا۔

''اس کی فیس کتنی تھی؟'' ڈاکٹر کے جانے کے بعد فریال نے دریافت کیا۔

''تم اس بارے میں نہ سوچو۔''

''کیسے نہ سوچوں سفیان! جب دماغ ہے تو ذہن میں اس قسم کے سوال تو ابھریں گے نا!''

''جو فیس بھی تھی، وہ میں نے ادا کر دی ہے۔ ابھی بلڈ ٹیسٹ بھی کروانا ہے لیکن اس کے لیے تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ ایک سال کا تو میں بھی میڈیکل کا طالب علم رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ٹیسٹ کے لیے کتنے خون کی ضرورت ہے۔ میں ابھی سرنج لا کر تمہارا خون لیے لیتا ہوں۔ خود ہی لیبارٹری جا کر خون دے بھی دوں گا۔ جو بھی رقم خرچ ہوگی، وہ میں ان صاحب سے ایڈوانس لے لوں گا جن کو تصویریں فروخت کرتا ہوں۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ میری یہ بیماری طول پکڑے گی۔ وہ صاحب تمہیں کہاں تک ایڈوانس دیتے رہیں گے۔''

''یہ بعد کی بات ہے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

سفیان اسی وقت بازار جا کر سرنج لے آیا۔ اس نے خود ہی فریال کا خون نکالا اور پھر بولا ''میں اسی وقت جا کر اسے لیبارٹری میں دے آتا ہوں تاکہ کل تک رپورٹ مل جائے۔ تم بستر سے نہ اٹھنا۔ ڈاکٹر بھی کہہ گیا ہے کہ تمہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ میں سرنج لینے گیا تھا تو بھی دروازہ باہر سے مقفل کر دیا تھا اور اب بھی کرتا جاؤں تاکہ میری آمد پر تمہیں دروازہ کھولنے کے لیے اٹھنا نہ پڑے۔''

''اتنا آرام آخر کیسے ممکن ہے؟ کھانا پکانا اور......''

''وہ سب کام میں کرلوں گا۔''

فریال کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ سفیان اس کا گال تھپتھپا کر جلدی سے دروازے کی طرف مڑ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فریال ان آنسوؤں کو دیکھ لے جو اس کی آنکھوں سے بھی ابلنے ہی والے تھے۔

گھر سے کچھ دور آنے کے بعد اس نے وہ سرنج ایک گٹر میں پھینک دی جس میں فریال کا خون نکال کر لایا تھا۔ سرنج پھینکتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے دونوں ہاتھوں سے اس کا دل مسل ڈالا ہو۔ درد کی ایک لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی تھی۔

دوسرے دن بھی اسے ڈراما ہی کرنا پڑا۔ گھر سے یہ کہہ کر نکلا کہ لیبارٹری جارہا ہے۔ اس نے ایک میڈیکل اسٹور سے عام قسم کی بے ضرر سی کچھ دوائیں خرید لیں۔ میڈیکل اسٹور سے ہی چھوٹے چھوٹے براؤن لفافے بھی لیے اور ایک پارک میں جا بیٹھا۔ وہاں اس نے خرید کردہ دوائیں ان کے پتوں سے نکال کر مختلف لفافوں میں ڈالیں اور قلم سے ان لفافوں پر لکھ دیا کہ دن میں ان کی کتنی ڈوز لینا ہیں۔''

ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ گھر لوٹا۔

''رپورٹ لے کر سیدھا ڈاکٹر کے پاس چلا گیا تھا۔'' اس نے فریال سے کہا ''رپورٹ دیکھ کر وہ ذرا بھی فکرمند نہیں ہوا۔ ویسے خود میں نے بھی وہ رپورٹ سمجھ لی تھی۔ خون میں بس سرخ ذرات کی کمی ہوگئی ہوگی۔ وہ کمی غیر معمولی ضرور ہے لیکن تشویش کی بات نہیں۔ ان دواؤں کے استعمال سے سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

☆☆☆

فریال کی حالت گرتی ہی چلی گئی۔ دوائیں اسے مل ہی نہیں رہی تھیں لیکن ''دواؤں'' کے بہانے سفیان کو اسے سلو پوائزن دینے میں پہلے سے زیادہ آسانی ہوگئی۔

فریال کی یہ حالت ہوگئی کہ باتھ روم وغیرہ جانے کے لیے بھی اسے سفیان کے سہارے کی ضرورت پڑتی تھی۔ گھر کی صفائی وغیرہ سفیان خود کرنے لگا تھا۔ کھانا بازار سے لے آیا کرتا۔ فریال بھی وہی کھاتی۔ سفیان نے اسے بتایا کہ ڈاکٹر نے اس کے لیے کسی قسم کے پرہیز کی ہدایت نہیں کی تھی۔

ایک روز سفیان نے اسے باتھ روم سے کمرے میں لے جا کر بستر پر لٹایا تو دماغ میں آنے والے خیالات سے اس کا دل بھر آیا۔

''کیا بات ہے سفیان!'' فریال نے اپنا لاغر ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا ''کیا مجھے سہارا دیتے دیتے تھکنے لگے ہو؟''

''ایسی باتیں نہ کرو فری!'' سفیان کی آواز کانپ گئی۔

''تو پھر تمہاری آنکھوں میں آنسوؤں کا مطلب یہ ہوا کہ تم بھی میری زندگی کی طرف سے مایوس ہو چکے ہو!''

''میری آنکھیں کسی اور خیال سے بھر آئی تھیں فری!''

''کس بات سے؟''

''تم جس ڈاکٹر کے زیرِ علاج ہو، وہ شاید تمہارا مرض سمجھ ہی نہیں سکا ہے لیکن تمہیں کسی بڑے اور تجربہ کار ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے میرے پاس فیس نہیں ہے اور اسپتال میں تم داخل ہونا نہیں چاہتیں۔''

فریال کے خشک سے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری

''خدا میری یہ خواہش پوری کرنا چاہتا ہے کہ میں تمہاری آغوش میں جان دوں۔ اگر تمہارے پاس پیسے ہوتے اور تم مجھے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاتے تو میری حالت کو سمجھتے ہوئے بھی وہ یہی مشورہ دیتا کہ مجھے کسی اسپتال میں داخل کرا دیا جائے۔ اس طرح میں تمہاری آغوش کے بجائے اسپتال میں مرتی۔''

لیکن سفیان اس وقت اس خیال سے رویا تھا کہ بینک میں اس کے پاس اتنی رقم تھی کہ وہ ایک دو بار تو فریال کے سلسلے میں کسی بڑے ڈاکٹر سے رجوع کر ہی سکتا تھا مگر اس نے فریال سے وہ رقم چھپائی ہی یہ جواز پیدا کرنے کے لیے تھی کہ وہ اسے کسی بڑے ڈاکٹر کو نہیں دکھا سکتا۔

کوئی بھی بڑا ڈاکٹر اگر صرف معائنے سے معاملے کی تہ تک نہ پہنچ پاتا تو کچھ ٹیسٹ کروانے کے بعد یہ بات اس کے علم میں آجاتی کہ فریال کو دھیرے دھیرے زہر دیا جاتا رہا تھا۔

☆☆☆

آخر وہ دن آ ہی گیا جب فریال کی حالت سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اب وہ دوسرے دن کا سورج نہیں دیکھ سکے گی۔ اس کی سانسیں رک رک کر آرہی تھیں۔ نبض دھیمی پڑ چکی تھی۔ بولتے ہوئے زبان لکنت کا شکار ہو رہی تھی۔ سفیان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ فریال کو آغوش میں لیے بیٹھا تھا۔ اس کے ہونٹ بڑی شدت سے کپکپا رہے تھے۔ فریال بڑی مشکل سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنی اسی خوشی کا اظہار کر چکی تھی کہ آج اس کی خواہش پوری ہو رہی ہے۔

''فری!'' سفیان گلوگرفتہ آواز میں بولا ''مجھے معلوم ہے کہ اب تم جارہی ہو، یہ شاید تمہاری زندگی کا آخری گھنٹا ہے۔ میں اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم اب بولنے میں بہت دقت محسوس کر رہی ہو اس لیے سب کچھ میں خود ہی کہے دیتا ہوں۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔'' سفیان کی آواز کی لرزش بڑھتی چلی جارہی تھی۔ ''جہاں تک میرا خیال نہیں بلکہ یقین ہے کہ تم مجھ سے انتہائی شدید محبت کرتی ہو۔ اگر میں تم سے پہلے مرجاتا تو تم سے برداشت نہیں ہوتا۔ تم اس صدمے سے پاگل ہوجاتیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تمہارا ہارٹ فیل ہوجاتا، اور اگر تم زندہ رہتیں تو تمہاری باقی زندگی بڑی اذیت میں گزرتی۔ ایک بار میں نے تمہارا منہ دبا کر تمہاری بات پوری نہیں ہونے دی تھی لیکن تم نے کہا یہی تھا کہ میں اگر پہلے مرگیا تو تمہاری باقی زندگی بڑی اذیت ناک ہوگی اس لیے تمہاری خواہش ہے کہ تم مجھ سے پہلے مرجاؤ۔ کہا تھا نا تم نے!''

''ہاں۔'' فریال کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ سفیان بہ مشکل سن سکا۔

''اسی لیے میں نے تمہیں قتل کیا ہے فری؟'' سفیان کے آنسو زیادہ تیزی سے بہنے لگے۔ میں تمہیں دھیرے دھیرے زہر دیتا رہا ہوں۔ میں یہی چاہتا تھا کہ تم مجھ سے پہلے مر جاؤ۔ میری زندگی بھی اب زیادہ دیر نہیں رہی ہے فری! مجھے بلڈ کینسر ہے۔''

فریال کا منہ کچھ کھل گیا اور آنکھیں پھیل گئیں۔ شاید وہ بیک وقت حیرت اور صدمے سے دوچار ہوئی تھی۔

''ہاں فری!'' سفیان کی آواز گھٹنے لگی تھی ''تمہیں وہ دن یاد ہوگا جب میرے گھر لوٹنے پر تم نے پوچھا تھا کہ میرے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں۔ اس کا سبب یہی تھا فری کہ اسی دن ڈاکٹر نے مجھے یہ بتایا تھا کہ موت میری زندگی کے دروازے پر دستک دے چکی تھی۔ ان دنوں میں اپنی طبیعت کچھ گری گری سی محسوس کرنے لگا تھا لیکن تمہیں اپنی طبیعت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا کہ تم پریشان ہوگی جو ڈاکٹر میرا علاج کر رہا ہے اسے شبہ ہوا تو اس نے میرے کچھ ٹیسٹ کروائے۔ اسی سے یہ بات سامنے آگئی کہ مجھے بلڈ کینسر ہے۔ اگر کسی مریض کا کوئی وارث نہ ہو تو ڈاکٹر ایسی خوف ناک باتیں بھی مریض کو بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ اگر میں یورپ یا امریکا جا کر اپنا علاج کرا سکوں تو زندگی کے کچھ امکانات ہیں ورنہ میں آٹھ دس ماہ سے زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکوں گا۔''

اب فریال کی پلکیں تک نہیں جھپک رہی تھیں۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں سفیان کا منہ تکے جا رہی تھی۔

سفیان بھرائی ہوئی آواز میں کہتا رہا۔ ''زندگی کے امکان کی بات صرف تسلی دلاسے ہی کے لیے ہوگی لیکن اگر ایسا نہیں بھی تھا تو میرے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ میں باہر جا کر اپنا علاج کرا سکتا۔ یہ فلیٹ بیچ کر بھی وہ اخراجات پورے نہیں کیے جا سکتے تھے۔ مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا لیکن مجھے اپنے مرنے کی نہیں، اس بات کی فکر لاحق ہو گئی کہ میرے بعد تمہارا کیا ہوگا۔ میرا فوری فیصلہ یہ تھا کہ تمہیں مجھ سے پہلے مر جانا چاہیے۔ میں نے تمہیں دھیرے دھیرے زہر دینا شروع کیا۔ میں چاہتا تھا، تم اتنے عرصے تو زندہ رہو کہ میری موت کا وقت قریب آ جائے اور وہ آ چکا ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے کچھ علامات بتائی تھیں جو ظاہر ہونے کے بعد میری زندگی بہت کم رہ جاتی اور آج سے وہ علامات ظاہر ہونے لگی ہیں۔ صبح سے اب تک دو مرتبہ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا چکا ہے۔ اگر دوسری دنیا میں، محبت کرنے والوں کا ملاپ ممکن ہے تو میں بہت جلد تم سے آملوں گا۔ مجھے بتاؤ میری جان! میری پیاری فری! کیا تم مجھے معاف کر دو گی کہ میں نے تمہیں قتل کیا؟''

فریال کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو، سفیان کے اس بازو پر ٹپکنے لگے جس پر فریال کا سر تھا۔ اس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ اسے رک رک کر بولنا پڑ رہا تھا لیکن یہ صرف خود اس کا خیال تھا کہ وہ بول رہی تھی۔ اس پر اتنی نقاہت طاری ہو چکی تھی کہ آواز نکلنا ممکن نہیں رہا تھا۔ سفیان نے صرف ہونٹ ملتے ہوئے دیکھے، آواز نہیں سنی لیکن فریال نے کہا تھا ''اگر روح بھی دکھی ہو سکتی ہے تو میری روح کو ہمیشہ یہ دکھ رہے گا کہ تم نے میری محبت پر بھروسا نہیں کیا۔ میرے سفیان! تم مجھے حقیقت بتا دیتے، میری محبت کو آزما تو لیتے! تمہارے ہاتھوں سے میں خوشی خوشی زہر کھاتی رہتی۔ بہرحال..... تم نے جو کچھ کیا، اچھا کیا۔ تمہارے بعد تو زندگی میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی۔ خدا کرے ڈاکٹر کا خیال غلط ثابت ہو اور تم طویل عرصے تک میری قبر پر آتے رہو۔''

''اب تو تمہاری آواز بھی نہیں نکل رہی ہے۔'' سفیان نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا تو اس کے اپنے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے ہونٹوں کی نمی اس کی زبان کو نمکین کرنے لگی ''لیکن تمہارے تاثرات سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ زندگی کے آخری لمحوں میں اس خیال نے تمہارے دل میں میرے لیے نفرت نہیں پیدا کی کہ میں تمہارا قاتل ہوں۔ خدا گواہ ہے میری فری کہ میں نے جو کچھ کیا، اسے محبت کے جنون کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں تمہیں ایک بات اور بھی بتا دوں۔ شاید تمہارے ساتھ ہی مجھے موت آ جائے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اگر کبھی کسی صدمے سے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا تو مجھ پر بے ہوشی بھی طاری ہو سکتی ہے جو علاج نہ ہونے کی صورت میں مجھ پر موت تک طاری رہے گی۔

فریال کو ایک ہچکی آئی۔

''فری!'' سفیان تڑپ گیا۔

''فریال نے دوسری ہچکی لی اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

''فری!'' سفیان چیخ پڑا اور ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔



پُرخار راستے

ایچ اقبال

بعض اوقات خواہش کی لہریں حقیقت کے ساحل سے ٹکراتی رہتی ہیں اور جھاگ کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا... دریا متلاطم رہے اور دستِ ساحل خالی... محبت... شناخت اور انتقام کی تکون کے حامل ایک ایسے ہی نوجوان کی داستانِ حیات... تعمیر اور تخریب کی خرابیاں اسے مسلسل گردش میں رکھے ہوئے تھیں... کبھی یہاں... کبھی وہاں... دنیا کے ہجوم میں اسے اپنے بھی ملے اور پرائے بھی... دوست بھی اور دشمن بھی... بس وہی مل کے نہیں دے رہی تھی... جسے حاصل کرنا اس کی زندگی تھی... اس کا وجود بے وجودی کا شکار ہو رہا تھا۔ وہ آباد ہونا چاہتا تھا... مگر برباد ہونا شاید اس کی تقدیر میں لکھا جا چکا تھا...

رات اپنے دوسرے پہر میں داخل ہونے کو تھی۔

تاجو نے لینڈ کروزر مرکزی شاہراہ سے اس طرف موڑی جہاں شیریں کا گھر تھا اور اس طرف مڑتے ہی چونک گیا۔ شیریں کے گھر کے قریب ہی تین افراد دکھائی دیے تھے جن کی وضع قطع کچھ ایسی تھی کہ اپنے تجربے کے سبب وہ تینوں تاجو کو مشکوک معلوم ہوئے۔

وہ کھڑے آپس میں گپ شپ کر رہے تھے، جیسے کہیں قریب ہی رہتے ہوں یا سرِ راہ مل گئے ہوں۔ ان میں سے ایک آدمی کا رخ تاجو کی لینڈ کروزر کی طرف تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کیے ہوئے تھے، جیسے کمر پر باندھ لیے ہوں۔ اس طرح کھڑا ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن تاجو کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا کہ اس طرح کوئی چیز چھپائی گئی تھی اور وہ چیز کسی قسم کا اسلحہ ہی ہو سکتی تھی۔

سڑک پر اِکّا دُکّا گاڑیوں کی آمدورفت جاری تھی۔ چوکیدار قسم کے کئی افراد مختلف بنگلوں کے پھاٹکوں پر بھی کھڑے نظر آ رہے تھے۔

تینوں مشکوک آدمیوں کو دیکھتے ہی تاجو نے بریک لگائے۔ اس طرف مڑتے ہوئے لینڈ کروزر کی رفتار بہت کم تھی اس لیے بریک لگاتے ہی ایک

ہلکے سے دھچکے کے ساتھ رک گئی۔ تاجو نے ریورس گیئر لگایا اور لینڈ کروزر کو پیچھے کی طرف دوڑا دیا۔ اسی وقت پے در پے دو فائر ہوئے۔ ایک گولی ونڈ اسکرین کا شیشہ توڑتی ہوئی اس کے بائیں بازو کو زخمی کرتی ہوئی، نشست کے عقبی حصے میں دھنس گئی اور دوسری اس کے سینے پر لگی۔

تاجو نے دیکھ لیا کہ فائر کرنے والا وہی شخص تھا جو اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کیے کھڑا ہوا تھا لیکن اب اس کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل دکھائی دے رہی تھی۔ فائر اسی رائفل سے کیے گئے تھے۔

سینے پر لگنے والی گولی سے تاجو کو کسی قسم کا ضرر نہیں پہنچا کیونکہ وہ کوٹ کے نیچے بلٹ پروف جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ کہیں بھی باہر نکلتے وقت وہ اس وقت سے بلٹ پروف جیکٹ پہننے لگا تھا جب سے حکومت نے اس کے سر کی قیمت پچاس لاکھ روپے لگائی تھی۔ اس کا شمار حد درجہ خطرناک مجرموں میں کیا جانے لگا تھا۔

جب تیسری گولی چلائی گئی، اس وقت لینڈ کروزر مرکزی شاہراہ پر مڑ رہی تھی اس لیے اس گولی کا نشانہ خطا گیا۔

تاجو نے بریک لگا کر فرسٹ گیئر لگایا اور لینڈ کروزر تیزی سے دوڑادی حالانکہ اس سڑک پر اچھا خاصا ٹریفک تھا۔

فوراً ہی پے در پے کئی فائر ہوئے جو لینڈ کروزر کے عقبی حصے میں لگے۔ تاجو نے عقب نما آئینے میں دیکھا کہ اس کے عقب میں ایک پولیس موبائل تھی۔ فائر یقیناً اسی سے کیے گئے ہوں گے۔

مخبری، تاجو نے دانت پیستے ہوئے سوچا۔

پولیس موبائل اس کے پیچھے لگ چکی تھی۔ اس کا صریح مطلب یہی تھا کہ اسے گرفتار کرنے یا ختم کرنے کے لیے باقاعدہ تیاری کی گئی تھی اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ اس کا شیریں کے گھر کی طرف جانا پولیس کے علم میں آچکا تھا۔

گولیاں چلنے کی آوازوں سے اس سڑک پر چلنے والی گاڑیوں کے ڈرائیور بھی گھبرا گئے۔ کسی نے اچانک بریک بھی لگائے اور اسی وجہ سے لینڈ کروزر ایک گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ یہ تاجو کی ماہرانہ ڈرائیونگ تھی کہ حادثہ نہ ہوسکا۔

ٹریفک کے باوجود تاجو لینڈ کروزر کو لہراتے ہوئے دوڑا رہا تھا۔

پولیس موبائل اب سائرن بجانا بھی شروع کر چکی تھی تاکہ سڑک پر چلتی ہوئی دوسری گاڑیاں اس کے راستے میں نہ آئیں۔

فائرنگ دوبارہ نہیں کی گئی کیونکہ اس کی زد میں کوئی دوسری کار بھی آسکتی تھی۔

تاجو کو اس وقت زخمی بازو کی تکلیف کا دھیان ہی نہیں رہا تھا کیونکہ معاملہ تو اب زندگی بچانے کا تھا۔ اس کے دماغ نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے یقین کے مطابق تعاقب میں آنے والی پولیس کا وائرلیس بھی اب کام کرنے لگا ہوگا۔ دوسری پولیس موبائلوں سے رابطہ کیا جارہا ہوگا تاکہ ان کے ذریعے تاجو کو ہر طرف سے گھیرا جاسکے۔

پولیس کو اس طرح کامیابی ہوسکتی تھی اس لیے ضروری تھا کہ تاجو لینڈ کروزر سے اتر کر کسی طرف فرار ہونے کی کوشش کرے۔ اس نے گاڑی بائیں جانب کی ایک سڑک پر موڑتے ہوئے زخمی بازو والے ہاتھ ہی سے موبائل بھی نکال لیا تھا۔

پولیس موبائل بھی اس کے تعاقب میں اسی طرف مڑی تھی۔ اس سڑک پر گاڑیاں بھی اِکا دُکا ہی آجارہی تھیں۔ پولیس موبائل سے اس پر پھر فائرنگ کی جاسکتی تھی۔

''بلیک برڈ کالنگ۔'' اس نے ماؤتھ پیس میں تیزی سے کہا۔ ''فیئر فور، لائٹ آف۔'' اور موبائل بند کرتے ہوئے اپنی گود ہی میں گرا کر اس ہاتھ سے بھی اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

سائرن کی آواز کے ساتھ فائرنگ پھر شروع کر دی گئی۔ کچھ گولیاں لینڈ کروزر کی باڈی میں پیوست ہو رہی تھیں اور کچھ عقبی شیشہ توڑ کر لینڈ کروزر کے اندر بھی آرہی تھیں۔ اس لیے تاجو نے اپنا سر، اسٹیئرنگ پر جھکا لیا تھا اور آنکھوں کے ڈھیلے اوپر اُٹھا کر سامنے دیکھ رہا تھا۔ اسے سامنے سے آتی ایک پولیس موبائل نظر آگئی۔ یقینی طور پر اسے گھیرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔

سامنے سے آنے والی پولیس موبائل سے کی جانے والی فائرنگ اس کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی تھی۔ بلٹ پروف جیکٹ کی وجہ سے اس کا سینہ تو محفوظ تھا لیکن کوئی گولی سر میں بھی لگ سکتی تھی۔

دائیں جانب ایک پتلی سی گلی نظر آئی تو تاجو نے لینڈ کروزر اس طرف موڑ دی اور اسی وقت سارا علاقہ تاریکی میں ڈوب گیا۔

تاجو نے بریک لگائے۔ لینڈ کروزر ایک دھچکے سے رکی۔ تاجو دروازہ کھول کر باہر کود گیا لیکن کودنے سے پہلے وہ اپنا موبائل جیب میں ڈالنا اور پہلو کی نشست پر رکھا ہوا فور بیرل پسٹل اٹھانا نہیں بھولا تھا۔

اس نے گلی در گلی بھاگنا شروع کیا۔ اس کے پیروں میں کریپ سول جوتے تھے اس لیے اس کے قدموں کی آواز نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے بائیں بازو سے خون رس رہا تھا جو اس کی جیکٹ اور اس کے نیچے قمیص کی آستین میں جذب ہو رہا تھا۔ خون رسنے کی رفتار اتنی تیز نہیں تھی کہ وہ زمین پر ٹپکنا شروع ہو جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو پولیس ٹارچ کی روشنی میں خون کے دھبے دیکھتی ہوئی اس کا تعاقب جاری رکھ سکتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی خالی لینڈ کروزر دیکھ کر پولیس نے سمجھ لیا ہوگا کہ وہ گاڑی چھوڑ کر بھاگ نکلا ہے۔

گلی در گلی مڑنے کے باعث اسے بڑی حد تک اطمینان ہو چکا تھا کہ وہ پولیس کو ڈاج دینے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اگر اس نے علاقے میں اندھیرا نہ کروا دیا ہوتا تو ممکن تھا کہ اسے بھاگ نکلنے میں دشواری پیش آتی۔ یہ بندوبست اس نے کچھ عرصے پہلے کیا تھا کہ پاور ہاؤس اور علاقائی سب اسٹیشن پر اس کے کارندوں میں سے کوئی نہ کوئی ڈیوٹی پر ہوتا تھا۔ انہی کی وجہ سے تاجو نے کئی موقعوں پر اندھیرا کروا کے اس کا فائدہ اٹھایا تھا۔

وہ اس علاقے کے کمرشل ایریا میں پہنچ گیا جہاں سہ منزلہ عمارتوں میں اپارٹمنٹس بنے ہوئے تھے۔ یہ کمرشل ایریا اس علاقے میں نہیں تھا جہاں اس نے اندھیرا کروایا تھا لیکن اس علاقے میں اس وقت لوڈشیڈنگ شروع ہو چکی تھی۔ اندھیرا اسے وہاں بھی مل گیا اور وہ جانتا بھی تھا کہ اس وقت اس علاقے میں تاریکی ہوگی۔

اب اس نے دوڑنے کے بجائے عام رفتار سے لیکن قدرے تیزی سے چلنا شروع کر دیا تھا۔

اس علاقے کی ساری دکانیں اس وقت بند نہیں ہوتی تھیں لیکن جب سے لوڈشیڈنگ کے وقت میں تبدیلی کی گئی تھی، لوگ ساڑھے گیارہ بجے دکانیں بند کر جاتے تھے۔ اِکّا دُکّا صرف وہ دکانیں کھلی رہتی تھیں جنہوں نے جنریٹر کا انتظام کر لیا تھا۔ تاجو نے ایسے راستے اختیار کیے تھے کہ اسے ان دکانوں کے سامنے سے نہ گزرنا پڑے۔

بعض اپارٹمنٹس میں بھی جنریٹر یا یو پی ایس کا بندوبست تھا مگر ان کی روشنی اتنی نہیں ہوتی تھی کہ علاقہ روشن ہو سکے۔

تاجو کسی قدر آڑ میں ایک جگہ رکا۔ اس کمرشل ایریا میں آنے کے بعد اس نے خود کو محفوظ سمجھتے ہوئے اپنا فور بیرل پسٹل پینٹ کی جیب میں ٹھونس لیا تھا۔ اب اس نے اپنی جیب سے ایک پنسل ٹارچ نکال کر اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے کے بعد روشنی میں اپنا بازو دیکھا۔ رائفل کی گولی جس جگہ سے اس کے جیکٹ کی آستین پھاڑتے ہوئے اس کا بازو زخمی کر گئی تھی، وہاں سے رستا ہوا خون اب کہنی سے نیچے تک آ چکا تھا۔ یہ نوبت نہیں آئی تھی کہ خون کے قطرے ٹپکنے لگتے۔ تاجو نے مزید اطمینان کے لیے ٹارچ کی روشنی زمین پر بھی ڈالی۔ اسے اردگرد کوئی ایسا دھبا نظر نہیں آیا جسے خون کا دھبا سمجھا جا سکتا۔ اس نے ٹارچ جیب میں رکھ کر موبائل نکالا اور اسے کھولا۔ بند اس کال کے بعد کر دیا تھا جو اس نے بجلی کے سلسلے میں اپنے ایک کارندے کو کی تھی۔ موبائل کھلا رکھنا اس نے اس لیے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ شیریں پریشان ہو کر اسے فون کر سکتی تھی۔ اس کا پریشان ہونا لازمی امر تھا کیونکہ جس وقت تاجو کو اس کے گھر پہنچنا تھا، اسی وقت اس نے فائرنگ کی آواز سنی ہوگی۔

تاجو اس ہنگامی صورتِ حال میں اس کی کال ریسیو نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب اسے موبائل کھولنے کی ضرورت اس لیے تھی کہ اسے پروین کو فون کرنا تھا۔

پروین نے فوراً اس کی کال ریسیو کی۔

''یس باس!'' اس کی آواز سنائی دی۔

''تم اپنے شوہر کا کوئی کوٹ لے کر نیچے آؤ۔'' تاجو نے کہا۔ ''اور ہاں، کوٹ کسی چیز میں چھپا کر لانا، چوکیدار کی نظر کوٹ پر نہیں پڑنی چاہیے۔ میں پچھلی گلی میں کھڑا ہوں۔ فوراً آؤ۔''

''میں آ رہی ہوں باس۔'' جلدی سے جواب دیا گیا۔

تاجو نے پھر موبائل بند کر دیا اور محتاط نظریں اِدھر اُدھر دوڑائیں۔ وہاں پھیلا ہوا مکمل سناٹا اس کے لیے اطمینان بخش تھا۔

پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ پروین آتی دکھائی دی۔ اندھیرے میں اسے اس کی چال سے ہی پہچانا جا سکتا تھا۔ وہ تاجو کے قریب آ گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں خاصی بڑی باسکٹ تھی۔ اس نے اس میں سے کوٹ نکال کر تاجو کو دیا۔ تاجو نے وہ جیکٹ کے اوپر ہی پہن لیا۔ پروین کا شوہر بھاری جسم کا مالک تھا اس لیے جیکٹ پر اس کا کوٹ آسانی سے آ گیا۔

''آؤ۔'' تاجو نے کہہ کر قدم بڑھائے۔

پروین کی سمجھ میں نہیں آ سکا ہوگا کہ تاجو نے جیکٹ پر کوٹ کیوں پہنا تھا لیکن وہ اس بارے میں سوال کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔

تاجو عمارت کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ پروین اس کے ساتھ تھی۔ چوکیدار نے ان کی طرف دیکھا لیکن کوئی توجہ نہیں دی۔

زینے طے کر کے وہ دونوں دوسری منزل پر پہنچے۔ پروین کا اپارٹمنٹ اسی منزل پر تھا۔

''جوزف کیا کر رہا ہے؟'' تاجو نے پروین سے اس کے شوہر کے بارے میں پوچھا۔

''بے تحاشا پی رہا ہے۔'' پروین کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ اپنے شوہر سے شدید نفرت کرتی ہو۔

دروازہ کھول کر وہ دونوں اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ یو پی ایس کا بندوبست ہونے کی وجہ سے وہاں روشنی تھی۔ تاجو ڈرائنگ روم ہی میں رک گیا۔ اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ وہاں پہلی بار نہیں آیا تھا۔

''تمہارے پاس فرسٹ ایڈ کا سامان تو نہیں ہوگا؟'' تاجو نے پروین کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''نہیں باس!......وہ تو......''

تاجو نے اس کی بات کاٹی۔ ''ڈیٹول اور کوئی صاف کپڑا ہے؟''

''یہ چیزیں تو ہیں باس۔''

''لے آؤ۔'' تاجو نے کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔

پروین تیزی سے اندرونی دروازے کی طرف گئی۔

جب وہ ڈیٹول کی شیشی اور ایک صاف کپڑا لے کر آئی تو چونک پڑی۔ تاجو کا اوپری جسم برہنہ تھا۔ اس کے بازو کی کہنی سے خون اب ٹپکنے لگا تھا لیکن وہ سرخ دھبے اس نے فرش پر نہیں آنے دیے تھے۔ اپنی جیکٹ اس نے جس طرف ڈالی تھی، کہنی اسی طرف کیے ہوئے تھا۔

''یہ کیا باس؟'' پروین چونک گئی۔

''گولی لگی ہے۔ پولیس نے گھیر لیا تھا۔ کسی نے مخبری کی ہے۔ پتا لگا لوں گا اس کا۔'' تاجو نے سرسری لہجے میں کہا، پھر رکے بغیر بولا۔ ''تم اس کپڑے کو پھاڑ کر اس کی پٹیاں بناؤ۔'' اس نے پروین کے ہاتھ سے ڈیٹول کی شیشی لے لی تھی۔

پروین جلدی جلدی کپڑا پھاڑ پھاڑ کر پٹیاں بنانے لگی۔ تاجو اس دوران میں ایک پٹی کو ڈیٹول سے بھگو کر اپنے بازو کا زخم صاف کرنے لگا۔

پروین کے چہرے پر تشویش اور فکرمندی تھی جس کا سبب شاید تاجو کے بازو کا زخم ہی ہو۔ وہ پٹیاں بناتے ہوئے تاجو کے جسم کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ اتنا خوب صورت مردانہ جسم اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ خصوصاً بازوؤں کی مچھلیاں دیکھ کر تو اس کو جھرجھری سی آنے لگی تھی۔

''بس کافی ہے۔'' تاجو نے پٹیاں دیکھ کر کہا۔ ''کیا تم یہ میرے زخم پر باندھ سکو گی؟ میں خود ایک ہاتھ سے کس کر نہیں باندھ سکوں گا اور خون روکنے کے لیے کس کر باندھنا ضروری ہے۔''

''خون کافی بہہ گیا ہے۔'' پروین بولی۔

''کچھ خاص نہیں۔'' تاجو نے بے پروائی سے کہا۔ اس کے چہرے سے بھی ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ تکلیف محسوس کر رہا ہوگا۔

پروین اس کے بازو پر پٹیاں باندھنے لگی۔

''اور کس کے۔'' تاجو بولا۔

پروین کو پٹی باندھنے کے لیے تاجو کا بازو پکڑنا بھی پڑا تھا اور اس لمس سے اس کے سارے جسم میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ بازو پر پٹی باندھنا اس کے لیے ایک امتحان تھا جس سے وہ کسی نہ کسی طرح گزر رہی گئی۔

''یہ سب جلا دینا۔'' تاجو نے فرش کی طرف اشارہ کیا جہاں اس کی خون آلود جیکٹ، قمیص، بنیان اور جوزف کا کوٹ پڑا تھا۔

بلٹ پروف جیکٹ اس کے پہلو ہی میں رکھی ہوئی تھی۔ اسی کے ساتھ پسٹل بھی! ''لیکن پہلے جوزف کا ایک کوٹ اور لے آؤ۔'' تاجو نے بات مکمل کی۔

پروین پھر تیزی سے چلی گئی۔ تاجو بلٹ پروف جیکٹ پہننے لگا۔ اسی وقت اندر سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی چیز گری ہو، پھر پروین کی آواز۔ ''غدار، احسان فراموش، ذل......'' ایسا معلوم ہوا جیسے کسی وجہ سے اس کی آواز گھٹ گئی ہو۔

تاجو لپک کر اندر پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ جوزف، پروین کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ پروین کی پیٹھ دیوار سے لگی ہوئی تھی۔

''جوزف!'' تاجو ان دونوں کی طرف لپکا۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ پروین کو جوزف کی گرفت سے چھڑاتا، پروین نے خود ہی اپنے آپ کو آزاد کرا لیا۔ اس نے اپنا گھٹنا جوزف کے جسم کے کسی ایسے حصے پر مارا تھا کہ نہ صرف پروین کی گردن سے اس کے ہاتھوں کی گرفت ختم ہوئی بلکہ وہ کراہ کے ساتھ الٹ کر گرا۔

''باس!'' پروین ہانپتی ہوئی بولی۔ ''یہی ہے غدار!......اسی نے مخبری کی ہوگی۔ ابھی یہ موبائل فون پر بھی کسی کو بتا رہا تھا کہ آپ یہاں آ گئے ہیں۔ میں نے موبائل اس

سے چھین کر فرش پر پٹخ دیا۔''
موبائل فون کے کئی حصے فرش پر اِدھر اُدھر پڑے تھے۔
جوزف اب کھڑا ہو گیا تھا۔ تاجو کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں، سارا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔
تاجو نے تیزی سے اس کے قریب جا کر دائیں ہاتھ سے اس کی گردن دبوچی اور پھر اپنی ایک ٹانگ جوزف کی ٹانگوں پر اس طرح ماری کہ وہ کھڑا نہ رہ سکا۔ وہ فرش پر گرا تو تاجو اس کے اوپر تھا۔
''کسے بتا رہا تھا میرے بارے میں؟'' تاجو نے اس کی گردن پر دباؤ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ اس کے لہجے میں بلا کی سفاکی تھی۔
جوزف خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ اپنی گردن سے تاجو کی گرفت ختم کر سکتا۔
''اس نے...... پولیس ہی کو اطلاع دی ہوگی باس۔''
پروین کی سانس اب بھی پھولی ہوئی تھی۔ ''آپ کو یہاں سے فوراً نکلنا چاہیے۔ ختم کر دیں اس غدار کو۔''
تاجو کی گرفت سخت ہوتی چلی گئی اور پھر اس نے جوزف کی گردن کو ایسا جھٹکا دیا کہ ہڈی ٹوٹنے کی آواز بھی سنائی دی۔ جوزف بے حس و حرکت ہو گیا۔
''یہ آپ نے اچھا کیا۔'' پروین پھر بولی۔ ''غدار کی سزا موت ہی ہونا چاہیے۔''
تاجو اب سیدھا کھڑا ہو چکا تھا۔
پروین جھپٹ کر ایک الماری تک گئی۔ اس میں سے ایک کوٹ نکال کر تاجو کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ ''یہ پہنیں اور نکلیں یہاں سے۔''
''تمہارا شوہر تھا یہ۔'' تاجو نے کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔
''نفرت ہو گئی تھی مجھے اس سے، برداشت کر رہی تھی۔''
''تم بھی اب یہاں نہیں رک سکتیں۔ میرے ساتھ ہی نکل چلو۔''
پروین اگر وہاں رکتی تو پولیس اسے ہرگز نہیں چھوڑتی۔
تاجو لپک کر اس کمرے کی بالکونی میں گیا جو سڑک کی طرف تھی۔ نیچے ایک پولیس موبائل رکتی نظر آئی۔ تاجو تیزی سے مڑا۔
''پولیس آ گئی ہے۔ جلدی نکلو میرے ساتھ۔''

فائر اسکیپ ان کے کام آیا ورنہ انہیں پولیس کا سامنا کرنا پڑتا۔
''پارکنگ لاٹ اسی طرف ہے۔'' فائر اسکیپ سے اترتے ہوئے پروین نے کہا۔
''مجھے معلوم ہے۔''
''گاڑی کی چابی بھی لے لی ہے میں نے۔''
''گڈ!''

☆☆☆

شیریں بے چینی سے اپنی خواب گاہ میں ٹہل رہی تھی۔ اس کی وضع قطع سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی الٹرا ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ بنیان، چست پتلون اور اونچی ایڑی کے سینڈل اسی کی علامت تھے۔ وہ دس دس پندرہ منٹ کے بعد اپنے موبائل فون پر تاجو سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ ہر مرتبہ اسے تاجو کا موبائل بند ملا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی پریشانی بڑھتی رہی تھی۔ یہ تو اسے یقین تھا کہ تاجو گرفتار نہیں ہوا ہوگا۔ گرفتار ہوتا تو اس کا موبائل فون پولیس یقینی طور پر استعمال کرتی، اس پر آنے والی کال ضرور ریسیو کی جاتی۔ اسی لیے وہ کوئی اندازہ ہی نہیں لگا پا رہی تھی کہ تاجو سے رابطہ کیوں نہیں ہو رہا تھا۔
ٹہلتے ٹہلتے وہ اس وقت چونکی جب کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔
''کون؟'' اس نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔
''میں ہوں۔'' باہر سے اس کے باپ شیخ جواد کی آواز آئی۔
شیریں کی نظر فوراً گھڑی پر گئی، پھر وہ تیزی سے بستر کے قریب راکنگ چیئر پر جا بیٹھی۔ وہ باپ پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ اس وقت ٹہل رہی تھی۔
''آ جائیے ڈیڈی۔'' اس نے کہتے ہوئے قریب کی تپائی پر رکھی ہوئی ایک کتاب اٹھالی۔
اس نے خواب گاہ کا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔
شیخ جواد دروازہ کھول کر اندر آیا۔ وہ شب خوابی کے لباس پر نائٹ گاؤن پہنے ہوئے تھا۔
باپ کو دکھانے کے لیے شیریں اب کتاب تپائی پر رکھتے ہوئے اٹھی۔
''خیریت ڈیڈی؟'' وہ بولی۔ ''اس وقت؟ آپ جاگ رہے ہیں؟''
''یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتا ہوں۔'' شیخ جواد

اسے گھورتا ہوا آگے آیا۔ ''تم بھی جاگ ہی رہی ہو۔ لباس تک ایسا پہنے ہوئے ہو جیسے کہیں جانا ہے۔''

''وہ بس یہ کتاب پڑھنے بیٹھ گئی تھی۔'' شیریں نے کتاب کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کی دلچسپی میں ایسی کھوئی کہ لباس بدلنے کا بھی خیال نہیں رہا۔''

''خوب!'' شیخ جواد کی سنجیدگی میں غصے کی رمق بھی تھی۔ ''اس دلچسپی کی وجہ سے تم فائرنگ کی آواز بھی نہیں سن سکی ہوگی؟''

''وہ تو سنی تھی ڈیڈی! خاصی دیر ہوگئی، اب یہ کوئی خاص بات تو رہی نہیں ہے۔ کہیں بھی، کسی وقت بھی گولیاں چلنے کے واقعات ہونے لگے ہیں۔''

''یعنی تمہیں یہ نہیں معلوم کہ فائر کیوں ہوئے تھے، کس نے کیے تھے، کس پر کیے تھے؟'' شیخ جواد کا لہجہ چبھتا ہوا سا تھا۔

شیریں جواب میں کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے باپ کی طرف دیکھتی رہی، جیسے چاہتی ہو کہ وہی مزید کچھ کہے۔

''جس پر فائر کیے گئے تھے، وہ بچ نکلا۔'' شیخ جواد ہی بولا۔ ''اور وہ بچ نکلنے والا تاجو تھا۔''

''اوہ!'' شیریں نے جان بوجھ کر کچھ اور کہنے سے گریز کیا۔

''آج اُس سے ملنے کا پروگرام تھا نا تمہارا؟'' شیخ جواد نے تیز لہجے میں کہا۔ ''وہ گھر کے قریب کسی جگہ گاڑی روک کر تمہیں فون کرتا۔ تم گھر سے نکل کر اس کی گاڑی میں جا بیٹھتیں۔''

شیریں اب بھی خاموش رہی۔ اس نے نظریں جھکا لی تھیں۔

شیخ جواد نے جو قیاس کیا تھا، وہ کم ہی کیا تھا۔ شیریں تو اس رات کچھ اور ہی فیصلہ کر چکی تھی۔

''اب تو میں تمہاری منگنی بھی کر چکا ہوں۔'' شیخ جواد بولا۔ ''میرا خیال تھا کہ اس کے بعد تو تم صورتِ حال سے سمجھوتا کر ہی لوگی۔'' شیریں نظریں جھکائے خاموش کھڑی رہی۔

''بولتی کیوں نہیں ہو؟'' شیخ جواد چیخ پڑا۔

شیریں چونک پڑی لیکن فوراً ہی اس کا چہرہ سپاٹ ہوگیا۔

''کیا بولوں ڈیڈی؟'' اس کا لہجہ بھی سپاٹ ہی تھا۔

''چھ دن بعد تمہاری شادی ہونا ہے۔ اگر تمہارے منگیتر کو یہ سب کچھ معلوم ہوگیا تو کیا ہوگا؟''

''میں یہ شادی نہیں کروں گی ڈیڈی!'' شیریں نے پھر نظریں جھکا لیں۔ ''اگر شادی کروں گی تو صرف تاج ور سے۔''

''تاجو ہے اب وہ۔'' شیخ جواد نے زور دے کر کہا۔

''پہلے تو تاج ور ہی تھا ڈیڈی......! تاجو تو اسے ہمارے آج کے معاشرے نے بنایا ہے۔''

''فلسفہ بولوگی؟'' شیخ جواد کے لہجے میں تلخی تھی۔

''فلسفہ میں نے کبھی پڑھا بھی نہیں ڈیڈی......بس سیدھی سادی بات کہی ہے۔ وہ تو ایک غریب لیکن شریف گھر کا پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ بی اے کرنے کے بعد بھی ملازمت کے لیے ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ ملازمت تو اسے کیا ملتی، حوالات نصیب ہوگئی اُسے۔ اس پر جو الزام لگایا گیا، وہ بھی جھوٹ تھا۔ اس پر تشدد بھی کیا گیا۔ یہ سب کچھ بتا چکی ہوں میں آپ کو۔ اس کے والدین ایک حادثے کا شکار ہو کر دنیا سے چل بسے لیکن وہ ان کے جنازے میں بھی شریک نہیں ہوسکا۔ مرنے سے پہلے اس کے باپ کو بھی پولیس نے تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ آخر وہ......''

شیریں جذبات میں بہتی چلی جا رہی تھی کہ شیخ جواد بول پڑا۔ ''کیوں دہرا رہی ہو یہ سب کچھ۔'' لہجے میں تندی تھی۔ ''میں نے پہلے بھی فرض کرلیا تھا کہ جو کچھ تم کہہ رہی ہو، وہ بھی ٹھیک ہوگا لیکن تم اس باپ کی بیٹی ہو جس کا شمار ملک کے پچیس امرا میں ہوتا ہے۔ میں تمہیں ایسے گھر کی بہو کیسے بنا سکتا ہوں جہاں تمہیں ڈھنگ کا ایک بیڈ روم بھی نصیب نہیں ہوگا۔ میرے حلقے کے لوگ کیا سوچیں گے، کیا باتیں بنائی جائیں گی۔''

''لوگ جو کچھ سوچیں گے غلط سوچیں گے۔'' شیریں نے سکون سے کہا۔ ''انہیں اس صورت میں یہ سوچنا چاہیے کہ میری شادی جس گھر میں ہوئی ہے، اس گھر کے لوگوں نے ناجائز طریقے سے دولت نہیں جمع کی ہے اور نہ انہوں نے منی لانڈرنگ کی ہے، وہ قوم کے مجرم نہیں ہیں۔ ہمارے ملک میں شاید ہی کوئی ایسا امیر ہو جس کی دولت مندی کا سبب ناجائز طریقے نہ ہوں۔''

''تم مجھے قوم کا مجرم کہہ رہی ہو؟'' شیخ جواد نے تلملا کر شیریں کے گال پر اتنی زور کا طمانچہ رسید کیا کہ اس کا منہ پھر گیا۔ بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے گال پر پہنچ گیا اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

''شکریہ ڈیڈی!'' شیریں کی آواز میں لرزش تھی۔ ''زندگی میں مجھے آپ سے بہت کچھ ملتا رہا ہے۔ جو نہیں ملا تھا، وہ آج مل گیا۔ یہ کمی بھی پوری ہوگئی۔ اب کوئی گلہ نہیں

رہے گا مجھے آپ سے۔‘‘
شیخ جواد کے ہونٹ بھنچ گئے اور وہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ شیریں اپنے گال پر ہاتھ رکھے، نظریں جھکائے کھڑی رہی۔ اس وقت نہ جانے کیوں اسے اپنی مرحوم ماں کی یاد آ گئی تھی۔
’’تم۔‘‘ شیخ جواد نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر شیریں کی طرف دیکھا اور پھر کچھ رک کر بولا۔ ’’تمہیں آج میری وجہ سے اور کیا ملا ہے، یہ بھی تم کو بتا دوں۔ اس وقت تم قانون کے سامنے جواب دہ ہوتیں کہ ایک مجرم سے تمہارے تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ محض میری وجہ سے ایس پی نادر نے تمہارے خلاف اب تک کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اسے کسی مخبر نے اطلاع دی تھی کہ آج اتنی رات کو تاجو تم سے ملنے کے لیے یہاں آ رہا ہے۔ اسی لیے سادہ لباس میں پولیس کے لوگ موجود تھے۔ تاجو کسی سے چھینی ہوئی لینڈ کروزر میں یہاں آیا تھا۔ پولیس کے لوگوں کو اس نے نہ جانے کیسے پہچان لیا اور بھاگ نکلا۔ گیا بھی وہ اسی شخص کے گھر جس نے اس کے خلاف مخبری کی تھی۔ ابھی نادر نے مجھے فون پر بتایا ہے کہ اس نے مخبر کو قتل کر دیا اور اس کی کرسچن بیوی کو بھگا لے گیا۔‘‘
شیریں نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا۔ وہ اس پر تو یقین کر سکتی تھی کہ تاجو نے کسی کو قتل کیا ہوگا لیکن یہ اس کے لیے ناقابلِ یقین تھا کہ وہ کسی عورت کو بھگا لے گیا ہو۔
شیخ جواد کہتا رہا۔ ’’کیونکہ مخبر کی یہ اطلاع سو فیصد درست ثابت ہوئی تھی کہ تاجو اس وقت یہاں آئے گا اس لیے اسے یہ بھی یقین ہے کہ تم سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ نادر نے مجھ سے فون پر کہا ہے کہ میں تم سے تاجو کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اُسے بتاؤں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تمہارے موبائل میں تاجو کا موبائل نمبر ضرور فیڈ ہوگا۔ کیا یہ غلط ہے؟‘‘
شیریں چپ رہی۔
’’جواب دو۔‘‘ شیخ جواد تیزی سے اس کے قریب آیا۔
’’میں آپ کا دوسرا طمانچہ کھانے کے لیے تیار ہوں ڈیڈی۔‘‘
’’لیکن جواب نہیں دو گی؟‘‘ شیخ جواد نے غصے سے کہا۔
’’مجھے قتل ہو جانا گوارا ہوگا لیکن میں تاج ور کا نمبر نہیں بتاؤں گی۔‘‘
’’اچھا۔‘‘ شیخ جواد نے کہا۔ ’’تو پھر اس وقت کا انتظار کرنا جب قانون تم پر ہاتھ ڈالنے کے لیے مجبور ہو جائے۔‘‘ پھر وہ شیریں کے جواب کا انتظار کیے بغیر تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔
شیریں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے بستر کے قریب گئی۔ بستر پر بیٹھ کر اس نے اپنا موبائل نکالا۔ تاجو کا نمبر اس نے ڈیلیٹ کر دیا تھا مگر نمبر اسے ذہن نشین ہو چکا تھا۔
نمبر ڈیلیٹ کرنے کے بعد اس نے پھر تاجو سے رابطہ کرنا چاہا لیکن اس وقت بھی ناکام رہی۔
’’تم کہاں ہو تاجور!‘‘ وہ جذباتی انداز میں بڑبڑائی۔
جھنجلاہٹ میں ایک بار تو اس کا جی چاہا تھا کہ موبائل فون دیوار پر دے مارے لیکن یہ اقدام احمقانہ ہی ہوتا۔ وہ بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے اب بھی کپڑے تبدیل نہیں کیے تھے، بس سینڈلیں اتار دی تھیں۔
لگ بھگ پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ موبائل کی اسکرین پر تاجو کا نمبر دکھائی دیا تو اس نے بے تابی سے کال ریسیو کی اور بول پڑی۔ ’’تم کہاں ہو تاج ور؟‘‘
’’میں اپنے علاقے میں ہوں۔ میں آیا تھا شیریں لیکن وہاں پولیس......‘‘
’’وہ سب کچھ معلوم ہو چکا ہے مجھے۔‘‘ شیریں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ’’میں اس دوران میں مسلسل کوشش کرتی رہی ہوں تم سے رابطہ کرنے کی لیکن......‘‘
تاجو نے بھی اس کی بات کاٹ دی۔ ’’میں نے اپنا فون بند کر رکھا تھا۔ میں کچھ ایسے حالات سے گزرا ہوں کہ اس وقت فون بند رکھنا ہی میں نے مناسب سمجھا تھا۔ اب میں اپنے علاقے میں ہوں جہاں مجھ پر کوئی آنچ نہیں آ سکتی۔ مجھ سے غلطی ہو گئی کہ میں تمہیں لینے پہنچا تھا۔ جلد ہی میں تمہیں کسی جگہ بلوا لوں گا۔‘‘
’’کوئی ایس پی نادر ہے۔‘‘ شیریں نے بتایا۔ ’’اسے کسی نے تمہارے یہاں آنے کے علاوہ میرے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ نادر نے ڈیڈی سے کسی تعلق کے باعث ابھی مجھ سے رابطہ نہیں کیا ہے لیکن ڈیڈی سے کہا تھا کہ وہ مجھ سے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ وہ ابھی گئے ہیں میرے پاس سے۔‘‘
’’کیا باتیں ہوئیں؟‘‘ تاجو نے پوچھا۔
شیریں نے خاص خاص باتیں بتا دیں، طمانچہ کھانے کا ذکر نہیں کیا، پھر بولی۔ ’’میں یہ تو مان سکتی ہوں تاج ور کہ تم نے کسی کو قتل کیا ہوگا۔ قتل تو تم نے اتنے کیے ہیں کہ...... خیر

چھوڑو! اس بات پر مجھے یقین نہیں کہ تم اس شخص کی کرسچن بیوی کو بھگا لے گئے ہو۔''

''اس میں آدھا سچ ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''اس کا تعلق میرے ہی گروہ سے ہے۔ میں اُسے وہاں سے اس لیے نکال لے گیا کہ قتل کا الزام اسی پر لگتا۔ پولیس اسے گرفتار کر لیتی۔ میرے گروہ میں ایسی اور بھی کئی عورتیں ہیں۔''

''خیر چھوڑو۔'' شیریں نے بے تابی سے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ اب کیا کرنا ہے؟''

''بتاؤں گا۔ کل تک انتظار کرو۔''

''اچھا۔'' شیریں نے کہا۔ ''اب شاید نیند آجائے مجھے، میرے تو اعصاب ٹوٹنے لگے تھے تم سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے۔''

''سو جاؤ۔ میں فون بند کرتا ہوں۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

☆☆☆

رابطہ منقطع کرتے وقت تاجو بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر صرف پتلون اور بنیان تھی۔ اس کے بازو پر باقاعدہ ڈریسنگ بھی ہو چکی تھی۔

''ہوں۔'' تاجو نے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھی پروین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب بتاؤ، یہاں پہنچتے ہی...... تم نے دیکھا ہی ہے، میں اپنے لوگوں سے کچھ ضروری باتوں میں اُلجھ گیا تھا۔ شیریں سے بھی اب بات کر چکا ہوں۔ جوزف کو شیریں کے بارے میں کیسے معلوم ہو گیا تھا۔''

''میری غلطی تھی باس۔'' پروین نے شرمندگی سے جواب دیا۔

''کیسے؟''

''کچھ دن سے اُسے شبہ ہونے لگا تھا مجھ پر؟''

''کیسا شبہ؟ پوری بات بتاؤ۔''

''وہ سمجھنے لگا تھا کہ...... کہ...... آپ سے...... میرے...... میرا مطلب ہے......''

''ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا، آگے کہو۔''

''نشے میں وہ اس قسم کی باتیں بہت کرنے لگا تھا۔ دو مرتبہ تو اس نے مجھے مارا بھی۔ میں برداشت کر گئی۔ پھر میں ایک مرتبہ اسے بتا بیٹھی کہ آپ شیریں سے محبت کرتے ہیں جو مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے اور گیارھویں اسٹریٹ پر رہتی ہے جہاں بہت دولت مند لوگوں کے گھر ہیں۔''

''ہوں۔'' تاجو نے طویل سانس لی۔ ''تو پھر...... پہلی غلطی تو میں نے ہی کی۔ میں نے ہی تمہیں شیریں کے بارے میں بتایا تھا اور اس لیے بتایا تھا کہ......'' تاجو نے پروین کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ ''تم میرے بارے میں اپنے جذبات ختم کر دو تو بہتر ہے۔''

پروین نے نظریں جھکا لیں۔ وہ واقعی شیریں سے زیادہ خوب صورت نہیں تھی مگر کم از کم اس شہر کی مقامی کرسچن لڑکیوں یا عورتوں میں وہ سب سے زیادہ خوب صورت تھی۔ نہایت متناسب جسم کی مالک بھی!

''لیکن......'' تاجو بولا۔ ''اسے یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ میں آج شیریں کے پاس جا رہا ہوں؟''

''میں اس بارے میں صرف قیاس ہی کر سکتی ہوں۔ لینڈ کروزر کی چوری آپ نے مجھ سے ہی کروائی تھی اور جب آپ اس کی چابی لینے گھر آئے تھے تو میں آپ سے پوچھ بیٹھی تھی کہ اس لینڈ کروزر سے آپ کیا کام لینا چاہتے ہیں۔ آپ نے بتایا تھا کہ اسی لینڈ کروزر پر آپ شیریں سے ملنے جائیں گے۔ اس وقت بھی جوزف برابر کے کمرے میں موجود تھا۔ اس نے ہماری باتیں سن لی ہوں گی۔''

تاجو نے سر ہلایا۔ ''یہی ہو سکتا ہے۔ تم پر تو مجھے پورا بھروسا ہے۔ اسی لیے وہاں پولیس کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ مخبری ہوئی ہے لیکن میرا ذہن الجھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مخبری کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔''

شیریں چپ رہی۔

تاجو پھر بولا۔ ''میں نے تمہارے سامنے جوزف کو مار ڈالا۔ وہ بہرحال تمہارا شوہر تھا۔ تم اسے برداشت بھی کرتی رہیں۔ پھر جب میں نے اس کا گلا گھونٹا تو تمہارے کیا احساسات تھے؟''

''شاید اس وقت آپ نے میری بات سنی نہ ہو۔ میں نے کہا تھا کہ غداری کرنے والے کی سزا موت ہی ہونا چاہیے۔''

''ہوں۔ اچھا، اب تم آرام کرو۔ ایکس نے تمہیں بتا دیا ہوگا کہ تمہیں کہاں رہنا ہے۔''

تاجو کے گروہ میں اس کے نائب کو ''ایکس'' ہی کہا جاتا تھا۔

پروین کے جانے کے بعد تاجو نے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ سوچتے سوچتے اس نے اپنا موبائل اٹھایا اور شیریں سے رابطہ کیا۔

''ہاں تاج ور! خیریت؟'' شیریں کی بھرائی ہوئی

آواز میں تشویش بھی تھی۔

''میں نے تمہاری نیند خراب کر دی۔ اب خیال آرہا ہے کہ میں کل صبح بھی فون کر سکتا تھا۔ ایسی بات نہیں تھی جو کل نہ کی جا سکتی۔''

''کیا بات ہے؟''

''معلوم کرنا تھا۔ کیا تمہارے ڈیڈی نے ایس پی نادر سے اقرار کر لیا ہے کہ تم سے میرا کوئی تعلق ہے؟''

''ان کی باتوں سے تو یہی ظاہر ہوا تھا۔ وہ سب میں نے تمہیں بھی بتائی تھیں۔''

''ذہن منتشر سا تھا۔ مجھے سب باتیں یاد نہیں رہیں، اسی لیے بس تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ بس اب سو جاؤ۔''

''ایک بات اس وقت پھر دہراؤں گی۔ جلد از جلد کچھ کرنا ہوگا تاج ور! چھ دن باقی ہیں میری شادی میں۔''

''میں نے کہا تھا نا، کل تک انتظار کرو۔''

''جب تک تمہارا فون نہیں آئے گا، بے چین رہوں گی۔''

''زیادہ انتظار نہیں کراؤں گا ڈیئر۔''

تاجو نے جواب دے کر رابطہ منقطع کیا اور پھر دوسرا موبائل اٹھایا۔ اس کے پاس دو موبائل تھے اور ہر موبائل میں چار چار ''سم'' تھیں۔ ایک ''سم'' کا نمبر وہ تھا جو اس نے صرف شیریں سے بات کرنے کے لیے مخصوص کی تھی۔

دوسرے موبائل کی سم میں شہر کے تمام پولیس آفیسروں کے نام، ان کا عہدہ اور موبائل فون نمبر فیڈ تھے۔ اس نے ایس پی نادر کا نمبر نکالا اور اس سے رابطہ کیا۔

''کون ہے؟'' ایس پی نادر کی آواز جھنجلائی ہوئی تھی۔ وہ کئی گھنٹوں کے بعد نیند سے جاگا تھا۔

''ایس پی نادر؟''

''بول رہا ہوں۔'' جھٹکے سے کہا گیا۔

''تم تاجو کا فون نمبر معلوم کرنا چاہتے ہو نا؟''

''ہاں۔'' ایس پی نے جلدی سے کہا۔ ''تم کون ہو؟''

''جس نمبر سے میں بات کر رہا ہوں، یہی نمبر ہے تاجو کا۔''

''کیا مطلب؟''

''میں تاجو ہی بول رہا ہوں ایس پی۔''

دوسری طرف سکوت چھا گیا۔ ایس پی نادر کے ذہن کو خاصا جھٹکا لگا ہوگا۔ یہ اُس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ تاجو اسے فون کرے گا۔

''ہیلو!'' تاجو سکون سے بولا۔

''اس کا یقین میں کیسے کرلوں کہ تم تاجو ہو؟''

''میں نے جو کچھ کہنے کے لیے فون کیا ہے، وہ سن کر تمہیں یقین آجائے گا۔ میں تمہیں وارننگ دے رہا ہوں ایس پی...... شیریں کے لیے کسی قسم کی پریشانی مت کھڑی کرنا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں تمہارا تبادلہ کسی ایسے علاقے میں کروا دوں گا جہاں تمہیں رشوت کے نام پر ایک دھیلا نہ مل سکے۔ اس علاقے میں تو تم خوب کما رہے ہوگے، مجھے اندازہ ہے۔''

ایس پی نادر نے سب کچھ خاموشی سے سن لیا، پھر تلخ لہجے میں بولا۔ ''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟''

''میں دھمکیاں نہیں دیتا۔ جو کر سکتا ہوں، وہی کہتا ہوں۔'' تاجو کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کوئی خوشگوار گفتگو کر رہا ہو۔

''میں جانتا ہوں کہ تم میرا تبادلہ کرا سکتے ہو۔'' ایس پی نادر نے تلخی سے کہا۔ ''لیکن اگر تم نے ایسا کیا تو میں اپنی جگہ آنے والے دوسرے ایس پی کو تمہارے اور شیریں کے بارے میں بتا دوں گا۔''

''اس صورت میں یہ زمین تمہارا بوجھ برداشت نہیں کرے گی۔''

''تم مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دے رہے ہو؟''

''تمہاری یادداشت بہت کمزور ہے ایس پی، ابھی کہا تھا میں نے کہ میں دھمکیاں دینے کا عادی نہیں۔ جو کر سکتا ہوں، وہی کہتا ہوں۔''

''میں اُن پولیس افسروں میں سے نہیں ہوں جو تم سے ڈرتے ہیں۔''

''میں مان لیتا ہوں کہ تم بہت بہادر ہوگے۔ میں چاہتا بھی نہیں ہوں کہ تمہاری زندگی ختم کروں۔ تم سے میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ جن سے دشمنی تھی، ان میں سے تو اب دو ایک ہی زندہ ہیں۔ انہیں ختم کرنے کے بعد میرا وہ مشن ختم ہو جائے گا جس پر میں کام کر رہا ہوں۔ فی الحال میرا مسئلہ یہ ہے کہ تم شیریں کے لیے پریشانی کا سبب نہ بنو۔''

''تم اُس کے عاشق ہو؟'' ایس پی نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں۔'' تاجو نے کہا۔ ''یہ کہہ سکتے ہو تم، وہ مجھے اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔''

''اور وہ بھی تمہیں......''

''فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کرو ایس پی، میں

جو کہہ رہا ہوں، بس اس پر عمل کرنا ہے تمہیں۔‘‘

’’میں کل شام سے پہلے پہلے ایسا بندوبست کرلوں گا کہ اسے پولیس اسٹیشن طلب کرلوں۔ میں نے یہ گفتگو ریکارڈ کرلی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوگیا ہے کہ شیریں کا تعلق ایک ایسے مجرم سے ہے جس کے سر کی قیمت لگی ہوئی ہے۔‘‘

’’یہ بہت اچھا ہوا کہ تم نے مجھے اپنے ارادے سے باخبر کردیا۔ تم کل شام سے پہلے اس علاقے کے ایس پی نہیں رہو گے، اور جیسا میں کہہ چکا ہوں، اگر تم نے اپنی جگہ آنے والے ایس پی کو کچھ بتایا تو میں اس سے بھی بات کرلوں گا لیکن تم پھر اس دنیا میں نہیں رہو گے۔ تم نے میری باتیں بھی ریکارڈ کرلی ہیں اور میرا فون نمبر بھی تمہیں معلوم ہوگیا ہے۔ میرے خلاف جو کچھ کرسکتے ہو، کرلینا۔‘‘

پھر تاجو نے جواب سنے بغیر سلسلہ منقطع کیا اور ایک ایم این اے خواجہ صدیق کا نمبر ملایا۔ اس مرتبہ اس نے اپنے موبائل کی دوسری سم استعمال کی تھی۔

کئی گھنٹیوں کے بعد دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی۔ ’’ہیلو! کیا بات ہے تاجو؟ اتنی رات کو؟‘‘

’’کام کچھ ایسا ہی ہے۔‘‘ تاجو نے کہا۔ ’’تمہیں کل صبح ہی حرکت میں آنا ہوگا۔ کوئی ایس پی نادر ہے گیارھویں اسٹریٹ کے علاقے کا۔ دوپہر تک اس کا تبادلہ کسی ایسے علاقے میں کروادو جہاں رشوت کا بازار کچھ ٹھنڈا رہتا ہو۔ یہ مت پوچھنا کہ میں یہ کام کیوں کروانا چاہتا ہوں۔‘‘

’’ارے یہ چھوٹا سا کام تو تم انوار سے بھی کرواسکتے تھے۔‘‘

’’وہ ایم پی اے ہے۔ کام تو اس کے ذریعے بھی ہوسکتا ہے لیکن اس میں دیر لگ سکتی ہے۔ میں چاہتا ہوں، یہ کام کل دوپہر تک ہوجائے، اور ایسا تم آسانی سے یوں کرواسکتے ہو کہ وزیر داخلہ تمہارے گھر کا آدمی ہے۔‘‘

’’لیکن میں بتاؤں کیا کہ اس آفیسر کا تبادلہ کیوں کروانا چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میں تمہارا نام نہیں لے سکتا۔‘‘

’’یہ تمہارا دردِسر ہے کہ تم اسے کیا بتاؤ گے۔ کل دوپہر تک اس کا تبادلہ ہوجانا چاہیے۔‘‘ دوسرا جملہ تاجو نے زور دے کر کہا تھا اور پھر جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کردیا۔

☆☆☆

جنید نے حیرت سے راجن کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’کیا بک رہے ہو تم؟‘‘

’’ہاں صاحب!‘‘ راجن نے کہا۔ ’’یہ بات غلط نہیں ہوسکتی۔‘‘

’’تمہیں کیسے معلوم ہوا؟‘‘

’’ایک پولیس افسر ہے صاحب! اسے معلوم تھا کہ میں آپ کا خادم ہوں۔ اس نے مجھے اسی لیے بتایا کہ آپ کو خبر دے دوں۔‘‘

’’وہ پولیس آفیسر کیوں چاہتا تھا کہ مجھے پتا چل جائے؟‘‘

’’جانے کیسے اسے معلوم ہوگیا کہ آپ کی اس سے شادی ہونے والی ہے۔‘‘

’’لیکن اس نے یہ کیوں ضروری سمجھا کہ مجھے اس کا علم ہوجائے؟...... میں تو کسی پولیس آفیسر کو جانتا بھی نہیں۔‘‘

’’اگر وہ آپ کو جانتا ہوتا تو آپ ہی کو بتاتا۔‘‘

’’لیکن اس نے یہ کیوں چاہا؟ اسے مجھ سے کیا ہمدردی ہوسکتی ہے؟‘‘

’’آپ سے ہمدردی کی بات نہیں صاحب! ہوا یہ ہے کہ آج اس کا تبادلہ کردیا گیا ہے۔ اس نے مجھے سب کچھ تو نہیں بتایا لیکن مجھے لگتا ہے کہ اس میں شیریں ہی کا ہاتھ ہے۔‘‘

’’کیا شیریں اتنی بااختیار ہوسکتی ہے؟‘‘ جنید کے لہجے میں حیرت تھی۔

’’اب یہ تو مجھے نہیں پتا۔ بس جو میرے دماغ میں آئی، وہ کہہ دی میں نے۔‘‘

’’اچھا ٹھیک ہے۔ میں خود بھی کچھ معلوم کروں گا۔ تم مجھ سے رابطے میں رہنا۔‘‘

اسی گفتگو کی روشنی میں جنید نے اپنے باپ سیٹھ ابراہیم سے بات کی۔

’’ہوں۔‘‘ سیٹھ ابراہیم نے سر ہلایا۔ ’’یہ شبہ مجھے بھی آج ہوا تھا کہ کوئی بات ہے۔ شیخ جواد نے فون کیا تھا کہ شادی کی تاریخ کسی وجہ سے آگے بڑھادی جائے لیکن میں یہ کہہ کر ٹال گیا کہ پھر میں دو ماہ کے لیے انگلینڈ چلا جاؤں گا لیکن تم یہ سب کچھ اتنے یقین سے کیسے کہہ رہے ہو؟‘‘

’’مجھے جس نے بتایا ہے، میں اسے جھوٹا نہیں سمجھتا۔‘‘

’’یہ تو بڑی تشویش کی بات ہوگی بیٹا!...... اگر شیخ جواد کا سہارا نہ ملا تو بہت خراب صورتِ حال ہوجائے گی۔ میں چند مہینے میں دیوالیا ہونے والا ہوں۔ شیخ جواد کی مدد حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔‘‘

’’آپ نے بتایا تھا مجھے۔ اسی لیے میں بھی پریشان

ہو گیا ہوں۔‘‘

’’وہ کون ہے جس سے شیریں شادی کرنا چاہتی ہے اور اگر اُس نے اپنے باپ کا دباؤ تسلیم نہیں کیا تو وہ اس شخص کے ساتھ بھاگ جائے گی یا اس سے سول میرج کر لے گی۔‘‘

’’اس کا نام تو مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔‘‘

’’اگر نام وغیرہ معلوم ہو جاتا تو اس شخص کو راستے سے ہٹایا جا سکتا تھا۔‘‘ سیٹھ ابراہیم نے کہا۔ اس کے علم میں تھا کہ اس کے بیٹے کے تعلقات کچھ جرائم پیشہ افراد سے بھی ہیں۔

’’کوشش کروں گا اس کے بارے میں معلوم کرنے کی لیکن اگر کچھ پتا نہ چل سکا تو پھر ایک دوسرا کام بھی ہو سکتا ہے۔‘‘

’’وہ کیا؟‘‘

’’شیریں کو اس قابل نہ رہنے دیا جائے کہ وہ اس شخص سے شادی کر سکے۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’وہ مجھ سے شادی کے لیے مجبور ہو جائے۔‘‘

سیٹھ ابراہیم نے اس طرح جنید کی طرف دیکھا جیسے اس کی اشاروں میں کہی ہوئی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

’’کچھ بھی کرو، ہاتھ پیر بچا کے کرنا۔‘‘

’’اس کی آپ فکر نہ کریں۔‘‘

سیٹھ ابراہیم نے پھر سر ہلانے پر اکتفا کی۔ اس مرتبہ اس کا انداز متفکرانہ تھا۔

پانچ منٹ بعد ہی جنید اپنے کمرے سے راجن کو فون کر رہا تھا۔

’’میں اس شخص کا نام جاننا چاہتا ہوں جس سے شیریں شادی کرنا چاہتی ہے۔‘‘

’’میں اس پولیس آفیسر سے معلوم کرنے کی کوشش کروں گا لیکن مجھے امید نہیں کہ وہ بتائے۔ اگر بتانا ہوتا تو اسی وقت بتا دیتا۔ مجھے لگا تھا کہ وہ جان بوجھ کر نام بتانے سے بچا تھا۔‘‘

’’اگر اس نے جان بوجھ کر نام بتانے سے گریز کیا ہے تو پھر اب بھی نہیں بتائے گا۔‘‘

’’میرا بھی یہی خیال ہے صاحب۔‘‘

’’تو پھر کچھ اور کرنا پڑے گا۔ اگر شیریں سے میری شادی نہ ہو سکی تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔‘‘ جنید اصل بات راجن کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔

’’اور کیا کیا جا سکتا ہے صاحب؟‘‘

’’میں اُسے اس قابل نہ رہنے دوں کہ وہ میرے علاوہ کسی سے شادی کر سکے۔‘‘

’’یہ کس طرح؟‘‘

’’اسے اغوا کرنا پڑے گا۔‘‘

’’یہ تو کوئی بہت مشکل کام نہیں ہے صاحب لیکن اس میں وقت لگے گا۔‘‘

’’وقت ہی تو نہیں ہے میرے پاس۔ شادی کی تاریخ میں اب صرف پانچ دن رہ گئے ہیں۔ یہ کام جلد از جلد ہونا چاہیے۔ اس کے لیے تم اپنے دو ایک ساتھیوں سے بھی کام لے سکتے ہو۔ اس سلسلے میں اخراجات کی پروا نہ کرنا۔‘‘

’’ایک بندہ ہے اس کام کا ماہر لیکن وہ تین لاکھ سے کم نہیں مانگے گا۔‘‘

’’اس کے لیے تم مجھ سے آج ہی چیک لے سکتے ہو۔‘‘

’’آپ جانتے ہیں صاحب! اس قسم کے کاموں میں کوئی بھی چیک نہیں لیتا۔‘‘

جنید نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ پھر بولا۔ ’’ڈھائی بجے بینک کھل جائیں گے۔ تم مجھ سے وہیں ملو۔ میں کیش دے دوں گا لیکن پہلے اس آدمی سے بات کر لو۔ میں چاہتا تو یہ ہوں کہ یہ کام آج ہی ہو جائے۔ چڑیا کسی وقت بھی ہاتھ سے نکل سکتی ہے۔‘‘

’’اس سے تو میں ابھی فون پر بات کر لیتا ہوں۔ پندرہ منٹ میں ہی آپ کو بتا دوں گا۔‘‘ راجن بولا۔ ’’لیکن صاحب! میں نے ابھی جو نئی گاڑی خریدی ہے تو بالکل قلاش ہو چکا ہوں۔‘‘

’’دو لاکھ تمہیں بھی دے دوں گا لیکن کام ہونے کے بعد۔‘‘

’’کئی دن بعد دے دیجیے گا صاحب! آپ بات کے پکے ہیں، یہ تو میں جانتا ہوں۔‘‘

’’اپنے ساتھی سے بات کر کے مجھے ابھی بتاؤ۔‘‘

’’ابھی کہا تھا نا میں نے۔ بس پندرہ منٹ میں فون کرتا ہوں آپ کو۔‘‘

’’میں بہت بے چینی سے انتظار کروں گا۔‘‘

رابطہ منقطع کرنے کے بعد جنید کمرے میں ٹہلنے لگا۔ فکر مند وہ بھی تھا۔ باپ کے دیوالیا ہونے کی صورت میں خود اس کا مستقبل بھی تاریک ہو سکتا تھا۔ یکایک اسے خیال آیا کہ ایک بار وہ خود بھی شیریں کو فون کرے اور اس کے اندازِ گفتگو سے کچھ اندازہ لگائے۔

''ڈیڈی!'' اس نے اسی وقت سیٹھ ابراہیم کو فون کیا۔ ''یہ ممکن ہے کہ مجھے شیریں کا موبائل نمبر مل جائے۔''

''اس کا نمبر تو ہے میرے پاس۔ کسی وجہ سے ایک مرتبہ بات کی تھی میں نے اُس سے۔''

''وہ نمبر آپ مجھے دیجیے۔ میں ابھی آتا ہوں آپ کے کمرے میں۔''

''میں اب گھر پر نہیں ہوں۔ دفتر جارہا ہوں۔ راستے میں ہوں۔''

''تو اس کا نمبر مجھے میسج کر دیجیے۔''

''وہ میں ابھی کر دیتا ہوں لیکن تم کو اس کے نمبر کی کیا ضرورت پڑ گئی؟''

''میں خود اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے رویّے سے بھی کچھ اندازہ تو ہو جائے گا۔''

''اس کا مطلب ہے، تمہیں جو اطلاع ملی ہے، اس پر تمہیں مکمل یقین نہیں ہے؟''

''مجھے جس ذریعے سے اطلاع ملی ہے، اس پر تو مجھے مکمل بھروسا ہے۔ ہاں اگر اس سے کسی نے جھوٹ بولا ہو تو دوسری بات ہے لیکن یہ بھی سوچ چکا ہوں کہ کسی پولیس آفیسر کو اس قسم کا جھوٹ بولنے کی ضرورت کیا ہے۔ اگر اس کا سبب انتقام ہے تو بھی تعجب کی بات ہے۔ شیریں اتنی بارسوخ کیسے ہو گئی کہ کسی پولیس آفیسر کا تبادلہ کرا سکے اور اسے تبادلہ کروانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔''

''یعنی تذبذب میں تم بہرحال ہو۔''

ہاں کچھ تذبذب تو ہے۔ اسی لیے میں خود بھی اس سے بات کر کے......''

سیٹھ ابراہیم نے اس کی بات کاٹی۔ ''میں اس کا نمبر تمہیں ابھی میسج کیے دیتا ہوں۔ دیکھ لو بات کر کے۔''

تین منٹ بعد ہی سیٹھ ابراہیم کا میسج آ گیا۔

جنید نے میسج سے ملا ہوا نمبر اپنے موبائل سے ملایا۔ کئی گھنٹیوں کے بعد بھی دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں کی گئی تو جنید نے سمجھ لیا کہ شیریں اجنبی نمبروں کی کال ریسیو نہیں کرتی ہو گی چنانچہ اس نے میسج کیا۔

''آپ شاید اجنبی نمبر کی کال ریسیو نہیں کرتیں۔ یہ اچھی بات ہے، بلکہ مجھے خوشی ہوئی کہ میری ہونے والی بیوی محتاط مزاج رکھتی ہے۔ میں جنید ہوں۔ اسی نمبر سے آپ کو پھر فون کروں گا۔''

میسج بھیجنے کے تین منٹ بعد جنید نے پھر شیریں کا نمبر ملایا۔ اس مرتبہ کال ریسیو کر لی گئی۔

''جی! کہیے!'' شیریں کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''بس یوں ہی دل چاہا کہ آپ سے بات کروں۔ ایک ہی ملاقات ہوئی ہے آپ سے جب آپ کے والد نے مجھے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میں اپنے والد کے ساتھ آیا تھا۔ آپ سے وہی ایک ملاقات ہوئی ہے لیکن فون پر میں آپ کی آواز پہچان گیا۔ کیسی ہیں آپ۔'' جنید ہنسا۔ ''ابھی تو ذرا تکلف ہی سے بات کرنی پڑے گی۔''

''اچھا ہوا کہ آپ نے مجھے فون کر لیا۔ اگر میرے پاس آپ کا نمبر ہوتا تو میں خود آپ سے رابطہ کرتی۔ ڈیڈی سے میں نے آپ کا نمبر پوچھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ آپ کو میرا نمبر غالباً اپنے والد سے ملا ہو گا۔''

''جی ہاں، اور یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے کہ آپ مجھ سے بات کرنا چاہتی تھیں۔''

''آپ کی خوشی ختم ہو جائے گی۔'' شیریں کا لہجہ سپاٹ ہی رہا۔ ''میں آپ کو فون کر کے یہ کہنا چاہتی تھی کہ آپ مجھ سے شادی نہ کیجیے، انکار کر دیں۔''

''تو ٹھیک ہی اطلاع ملی ہے۔' جنید نے سوچا۔

''ہیلو!'' شیریں کی آواز پھر آئی۔

''جی!'' جنید نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''یقیناً آپ نے میری خوشی ختم کر دی۔ آپ کیوں چاہتی ہیں کہ میں شادی سے انکار کر دوں؟''

''وجہ بتانا میں ضروری نہیں سمجھتی۔''

''کیا آپ کسی اور کو پسند کرتی ہیں؟''

جنید کو اپنے سوال کا جواب نہیں ملا۔ دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا۔

جنید نے موبائل کان سے ہٹا کر اپنے چہرے کے سامنے کر لیا اور اسے گھورتا ہوا زیرِلب بڑبڑایا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ مجھے صحیح اطلاع ملی ہے۔ تو ٹھیک ہے شیریں! میں تمہیں اس قابل نہیں رہنے دوں گا کہ تم میرے علاوہ کسی کی ہو سکو۔''

جنید پھر ٹہلنے لگا۔ چند منٹ بعد ہی اس نے راجن کی کال ریسیو کی۔

''بات ہو گئی ہے صاحب!...... شیریں کا پتا بتا دیجیے...... اس کی تصویر بھی چاہیے ہو گی۔''

''تصویر ہے میرے پاس۔'' جنید نے کہا۔ ''ڈھائی سے تین کے درمیان مجھ سے بینک کے پاس ملو۔ میری کار کے پاس رکنا۔ تمہیں رقم بھی دے دوں گا، تصویر بھی اور پتا بھی۔''

''ٹھیک ہے صاحب! آتا ہوں میں۔''
جنید نے پہلا کام یہ کیا کہ شیریں کی تصویر اسکین کر کے اپنے کمپیوٹر میں ڈالی، پھر اس کا ایک پرنٹ بھی نکال لیا۔
وہی پرنٹ اس نے راجن کو دیا جو پونے تین بجے اس کے بینک کے باہر اس کی کار کے پاس موجود تھا۔ اسے رقم اور شیریں کا پتا بھی دے دیا۔
''ایک بات اور کہہ دینا اپنے ساتھی سے۔'' جنید نے راجن سے کہا۔ ''اگر وہ آج ہی شیریں کو اغوا کرنے میں کامیاب ہوجائے تو میں اسے ایک لاکھ روپیا اور دے دوں گا۔''
''موقع ملنے کی بات ہے صاحب! اگر آج موقع ملا تو آج ہی کام ہوجائے گا۔ بس یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ اپنے گھر سے کب کہیں جاتی ہے، کیا کرتی ہے، وغیرہ وغیرہ!''
''سارا دن وہ گھر پر تو نہیں رہتی ہوگی۔''
''اسے لے جانا کہاں ہوگا؟''
''اپنے گھر لے جانا اور مجھے اطلاع دے دینا۔''
وہ دونوں اس وقت کار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جنید اسے بہت کم رفتار سے چلا رہا تھا۔
''ٹھیک ہے صاحب!'' راجن نے کہا۔ ''اب گاڑی واپس موڑ لیں۔ مجھے بینک پر ہی اتار دیں۔ میری گاڑی وہیں کھڑی ہے۔''
''مجھے معلوم ہے، لیکن یہ مناسب نہیں ہوتا کہ ہم کار میں وہیں رکتے۔'' جنید نے راجن کو بینک پر لے جا کر ہی اپنی کار سے اتارا۔

☆☆☆

شہر کے سب سے بڑے میموریل ہال میں ایک بڑے آرٹسٹ کی یاد میں تقریب تھی جو دس بجے رات کو شروع ہوئی تھی اور قیاس کیا جا رہا تھا کہ وہ ایک بجے سے پہلے ختم نہیں ہوسکے گی۔
اس ہال میں صرف بڑی بڑی تقریبات منعقد ہوتی تھیں اور ہال میں گنجائش بھی بہت زیادہ لوگوں کی رکھی گئی تھی۔ اسی لیے پارکنگ لاٹ بھی بہت بڑا تھا جو انڈر گراؤنڈ بنایا گیا تھا جہاں ڈیڑھ سو کاریں بھی پارک کی جا سکتی تھیں۔
شیریں بھی وہاں پہنچی تھی لیکن اس تقریب کی وجہ سے نہیں بلکہ تاجو کے کہنے پر! اس نے فون پر کہا تھا۔
''امکان ہے کہ گیارہ بجے تک لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہے گا۔ تقریب ایسی ہے کہ اختتام تک شاید ہی کوئی وہاں سے اٹھے۔ تم وہاں سے ساڑھے گیارہ بجے اٹھ جانا۔ پارکنگ لاٹ میں اس وقت یقینی طور پر سناٹا ہوگا۔ تم اپنی کار تک پہنچو گی تو میں تمہیں وہیں مل جاؤں گا۔ تم جو قدم اٹھانے کا فیصلہ کرچکی ہو، وہ قدم آج تو نہیں اٹھایا جاسکتا۔ ہم اس کے صرف نتائج کے بارے میں گفتگو کریں گے۔ ڈرائیونگ تم ہی کرو گی۔ کسی ویران سڑک کی طرف نکل چلنا۔ گفتگو کے بعد میں کہیں بھی تمہاری کار سے اتر جاؤں گا۔ تم اپنے گھر چلی جانا۔ گفتگو ہی میں ہم فیصلہ کریں گے کہ وہ فیصلہ کن قدم کب اٹھایا جائے۔''
فون پر باتیں تو خاصی ہوئی تھیں لیکن بنیادی بات یہی تھی کہ ان دونوں کی ملاقات اس طرح ہوگی چنانچہ شیریں ساڑھے گیارہ بجے ہال سے اٹھ گئی۔
تاجو کے خیال کے مطابق پارکنگ لاٹ میں سناٹا تھا۔ شیریں بے چینی سے اس طرف بڑھنے لگی جہاں اس نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔
کاروں کی قطاروں کے درمیان اتنی جگہ چھوڑ دی گئی تھی کہ کوئی بھی کار وہاں سے بہ آسانی نکل سکتی تھی۔ شیریں اپنی کار تک پہنچنے کے لیے اسی راستے پر چل رہی تھی۔ تاجو کی طرف سے تاخیر پر وہ کسی قدر جھنجلاہٹ میں مبتلا تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ تاخیر بالکل نہ ہو لیکن تاجو فیصلہ کن اقدام سے پہلے اس کے نتائج پر گفتگو کرنا چاہتا تھا۔
جو بھی نتائج ہوں، شیریں کو اس کی بالکل پروا نہیں تھی۔ اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ تاجو کو فوری طور پر قدم اٹھانے کے لیے مجبور کرے گی۔
دفعتاً ایک کار کا انجن اس وقت اسٹارٹ ہوا جب شیریں اس کے عقب میں تھی۔ کار کا انجن نہ صرف اسٹارٹ ہوا بلکہ وہ تیزی سے پیچھے بھی آئی۔ شیریں نے تقریباً دوڑ کر خود کو اس کی زد پر آنے سے بچایا اور پھر رک کر غصے سے کار کی طرف دیکھنے لگی جو رک گئی تھی۔
''آئی ایم سوری محترمہ!'' کار کی ڈرائیونگ سیٹ سے بہ سرعت اتر کر ایک شخص نے شیریں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''میں بے حد معافی چاہتا ہوں۔ بس پیر پھسل گیا میرا ایکسلیریٹر سے۔''
''میری ہڈی پسلی ایک ہوجاتی، تب بھی آپ سوری کرتے۔'' شیریں نے بگڑ کر کہا۔
''پلیز!'' اس شخص نے دونوں ہاتھ جوڑے۔ ''میرے پاس الفاظ نہیں کہ آپ سے مزید کچھ کہہ سکوں۔''
شیریں اس شخص کو خاصا آڑے ہاتھوں لیتی لیکن اسے اپنی کار تک پہنچنے کی جلدی تھی اس لیے اس نے بات

بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔
''آئندہ احتیاط برتیے گا، انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے۔'' شیریں نے کہا اور مڑ کر اس طرف قدم بڑھایا جدھر وہ جا رہی تھی۔
لیکن وہ دوسرا قدم نہیں اٹھا سکی تھی کہ عقب سے اس شخص نے اسے نہ صرف دبوچ لیا بلکہ اپنا ایک ہاتھ بھی اس کے منہ پر اتنی سختی سے رکھا کہ وہ چیخ نہ سکے۔ وہ اتنا طاقتور بھی تھا کہ اس نے شیریں کو اٹھا بھی لیا اور تیزی سے اپنی کار کی طرف بڑھا۔
سب کچھ نہایت سرعت سے اور اتنا اچانک ہوا تھا کہ شیریں کا دماغ شل ہو کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ ہوا کیا تھا۔
کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر اب کوئی دوسرا شخص تھا جس نے پچھلی نشست کا دروازہ کھولتے ہوئے انجن دوبارہ اسٹارٹ کیا تھا۔
شیریں کو کار کی پچھلی سیٹ پر ڈالتے ہوئے اس شخص نے ایک ریوالور کا رخ اس کی طرف کر دیا۔
''ذرا بھی آواز نکالی تو گولی مار دوں گا۔'' بڑا سفاک لہجہ تھا۔
پھر وہ خود بھی اسی نشست پر آ بیٹھا اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ ''بس نکل چلو راجن!''
کار فوراً حرکت میں آ کر ٹرن لینے کے بعد سیدھی ہوئی اور پھر آگے بڑھنے لگی۔
شیریں کار کی نشست پر کروٹ سے پڑی ہوئی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو غرا کر کہا گیا۔ ''لیٹی رہو۔''
شیریں جانتی تھی کہ اس طرح اغوا کی جانے والی لڑکیوں کی آبرو ریزی تو یقینی طور پر کی جاتی ہے اور اسے اس طرح برباد ہو جانا گوارا نہیں تھا۔ وہ اس وقت یقیناً مدد کے لیے چیخ پڑتی جب کار نکاسی کے راستے سے باہر نکل رہی تھی۔ وہاں موجود پہرے دار یقیناً اس کی آواز سن لیتے۔ چیخنے کی صورت میں قوی امکان تھا کہ اس پر گولی چلا دی جاتی۔ اپنی عزت بچانے کے لیے شیریں اپنی جان دینے کو تیار ہو جاتی لیکن اسے یقین تھا کہ تاجو اس صورتِ حال سے بے خبر نہیں رہا ہوگا۔ وہ یقیناً اسے ان لوگوں سے بچا لے گا۔
کار جب نکاسی کے راستے سے نکل رہی تھی تو وہ شخص شیریں پر چھا گیا تھا اور اس نے ایک چادر بھی اوڑھ لی تھی۔ اگر پہرے داروں کی نظر کار کی پچھلی نشست پر پڑی بھی ہو گی تو وہ یہ نہیں سمجھ سکے ہوں گے کہ اس چادر کے نیچے جوڑ ھیر

تھا، وہ دو انسانوں کا تھا۔
ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے راجن نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال کر دوسرے ہاتھ سے موبائل نکالا۔
شیریں نے اس کی آواز سنی۔ وہ کسی کو اطلاع دے رہا تھا۔ ''ہم نے اسے اٹھا لیا ہے صاحب...... جی ہاں صاحب!......بس مل گیا موقع، ہم تو انتظار کر رہے تھے کہ وہ تقریب ختم ہونے پر کہاں جائے گی۔ ہم اس کا تعاقب کرتے اور موقع ملنے پر کوئی قدم اٹھاتے لیکن اتفاق سے پارکنگ لاٹ میں ہی موقع مل گیا۔ ہم کار میں ہی بیٹھے اس کے باہر آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ تقریب ختم ہونے پر ہی باہر آئے گی لیکن جانے کیوں وہ جلدی اٹھ آئی۔ وہ اپنی کار کی طرف جانے کے لیے جب ہماری کار کے پیچھے سے نکل رہی تھی تو جبران کو ایک تدبیر سوجھ گئی۔''
اس نے کسی کو وضاحت سے بتایا کہ شیریں کو کس طرح اغوا کیا گیا تھا۔ وہ سب کچھ سنتے ہوئے شیریں نے یہ تو سمجھ لیا کہ یہ دونوں آدمی صرف آلۂ کار ہیں، اسے اغوا کسی اور نے کروایا ہے لیکن یہ بات اس کے ذہن میں نہیں آ سکی کہ اسے اغوا کروانے والا جنید تھا۔
شیریں نے راجن کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا۔ ''آپ کب آئیں گے صاحب!'' اور پھر اس نے قدرے رک کر کہا۔ ''ٹھیک ہے صاحب۔''
کار کس سڑک پر دوڑ رہی تھی؟ اس کا شیریں کو بالکل اندازہ نہیں تھا کیونکہ اسے اٹھنے نہیں دیا گیا تھا لیکن اب وہ شخص سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔
''اس کے ساتھ کوئی اور زیادتی نہ کر بیٹھنا جبران۔'' راجن بولا۔ ''صاحب نے مجھے تاکید کی تھی۔''
''بتا چکے ہو تم مجھے۔'' جبران نے جواب دیا۔ ''لیکن جتنی زیادتی کی جا چکی ہے، وہ تو ضروری تھی۔''
''تم لوگ بہت جلد اس کا خمیازہ بھگتو گے۔'' شیریں نے بڑے سکون سے کہا۔
''خاموش پڑی رہو۔'' جبران غرایا۔
شیریں نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔ وہ کیوں ان شہدوں کی بکواس سنتی۔ اسے یقین تھا کہ یہ کرائے کے غنڈے تھے۔ تاجو کے سامنے ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی، تاہم یہ سوال اس کے ذہن میں چکرا تا رہا کہ تاجو اسے اس مصیبت سے کب اور کس طرح چھڑائے گا؟
پون گھنٹے بعد کار کی رفتار سست ہونے لگی۔

''میں اسے تمہارے گھر پر چھوڑ کر فوراً چلا جاؤں گا۔'' جبران بولا۔ ''کام بہت جلدی ہو گیا ہے۔ مجھے مزید رقم کب ملے گی؟''

''کل ہی مل جائے گی۔'' راجن نے جواب دیا۔ ''صاحب کبھی جھوٹا وعدہ نہیں کرتے۔''

کار رک گئی۔ راجن نے انجن بند نہیں کیا اور دروازہ کھول کر کار سے اتر گیا۔ جبران کار میں ہی بیٹھا رہا۔ شیریں نے ایسی آواز سنی جیسے پھاٹک کھولا گیا ہو۔ چند لمحے بعد راجن پھر کار میں آبیٹھا۔ کار حرکت میں آئی اور آہستگی سے کچھ آگے بڑھ کر رک گئی۔ وہاں مکمل تاریکی تھی۔ اب راجن نے کار کا انجن بند کیا اور کار سے اترتا ہوا بولا۔

''ایک منٹ! میں پھاٹک بند کر دوں۔''

شیریں نے قدرے توقف سے پھاٹک کی آواز سنی جو بند ہونے ہی کی ہو سکتی تھی۔ راجن یہی کہہ کر کار سے اترا تھا۔

''اب لے آؤ اِسے جبران۔'' راجن نے پچھلی نشست کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

جبران نے ریوالور کا رخ بدستور شیریں کی طرف رکھا اور ایک ٹانگ کار سے باہر رکھتے ہوئے بولا۔ ''اب تم بھی خاموشی سے نیچے اتر آؤ۔''

یہ حکم شیریں کے لیے تھا۔ جبران کے بعد وہ کار سے نکلی۔ اس نے دیکھا کہ وہ ایک چھوٹا سا مکان تھا جس میں پھاٹک کے بعد اتنی ہی گنجائش تھی کہ ایک کار کھڑی کی جا سکے۔

برآمدے میں چڑھنے کے لیے دو سیڑھیاں تھیں۔ وہاں راجن نے کوئی دروازہ کھولا۔

جبران نے اب ریوالور کی نال شیریں کی کمر سے لگا رکھی تھی۔

''چلو آگے بڑھو!'' اس نے شیریں سے کہا۔

جب آگے پیچھے وہ تینوں اندر داخل ہو گئے تو شیریں نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ وہاں بھی مکمل تاریکی تھی لیکن دروازہ بند ہونے کے بعد ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی بٹن دبایا گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہاں روشنی ہو گئی۔ شیریں نے دیکھا کہ وہ نشست کا کمرا تھا۔

''بس اب تم سنبھالو اِسے۔'' جبران نے کہا۔ ''میں اب جاتا ہوں۔''

''اسے میرے بیڈ روم تک تو پہنچا دو۔'' راجن نے کہا۔ ''تم اپنی کار بھی تو لے جاؤ گے! پھاٹک بند کرنا ہوگا مجھے۔''

''اچھا!'' جبران نے ایک طویل سانس لی۔

شیریں کو راجن کے بیڈ روم میں لے جایا گیا۔ وہاں کی تاریکی بھی راجن نے ختم کی تھی۔

''اب تم چاہو تو فی الحال میرے بستر پر لیٹ کر آرام کر سکتی ہو۔'' راجن نے شیریں کی طرف دیکھتے اور مسکراتے ہوئے کہا۔

''اب مجھے اُلجھن ہو رہی ہے راجن!'' جبران بولا۔ ''یہ لڑکی بہت مطمئن نظر آ رہی ہے۔''

''میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں۔'' شیریں بولی۔ ''تم دونوں کو بہت جلد اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔''

اب راجن کے چہرے پر پہلی مرتبہ تشویش نظر آئی۔ ''ہاں۔'' وہ جبران کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ ''میں نے اب غور کیا ہے۔''

''ڈرائیونگ تم کر رہے تھے۔'' جبران کچھ غصے سے بولا۔ ''کسی نے ہمارا تعاقب تو نہیں کیا؟''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔''

''میں اب فوراً جاؤں گا یہاں سے۔'' جبران نے کہا۔ ''پھاٹک بند کر لو تم۔'' وہ جانے کے لیے تیزی سے مڑا۔

''اگر تم چاہتی ہو کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو، تو خاموش رہنا۔ شور مچاؤ گی تو یہ تمہارے لیے اچھا نہیں ہو گا۔'' راجن نے شیریں کو گھورتے ہوئے کہا اور کمرے سے چلا گیا۔ جبران اس سے پہلے ہی جا چکا تھا۔

شیریں نے باہر سے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ وہ بستر پر بیٹھ گئی۔ اب بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے اغوا کروانے والا کون ہو سکتا ہے۔

دفعتاً وہ چونکی۔ اس نے دروازے پر بہت ہلکی سی ''کھٹ کھٹ'' سنی تھی۔ اس نے دیکھا کہ دروازے کی نچلی درز سے ایک چھوٹا سا پرچہ اندر آ گیا تھا۔ شیریں نے بے اختیار لپک کر وہ پرچہ اٹھایا اور ایک سطری تحریر پڑھ کر ایک طویل سانس لی جو اطمینان کی سانس تھی۔

''میں قریب ہوں، گھبرانا مت۔ مجھے کچھ انتظار ہے۔ تاج ور۔''

یہ سطر شیریں کے لیے ''ریسکیو لائن'' تھی۔ اسے شروع ہی سے یقین تھا کہ تاج ور اس صورتِ حال سے بے خبر نہیں ہوگا۔

باہر سے کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور

دور ہوتی چلی گئی۔

جلد ہی راجن لوٹ آیا۔ اس نے اطمینان سے بیٹھی ہوئی شیریں کو گھور کر دیکھا، پھر بولا۔ ''کیا تم سمجھتی ہو کوئی یہاں بچانے آجائے گا؟''

''دیکھتے رہو، کیا ہوتا ہے۔'' شیریں نے جواب دیا۔

راجن اُسے گھورتا رہا، پھر اپنا موبائل نکال کر اس نے کسی سے رابطہ کیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، باہر سے ہارن کی مدھم سی آواز تین مرتبہ آئی۔ راجن نے جلدی سے فون بند کیا اور تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ دروازہ باہر سے بند کرنا وہ اس وقت بھی نہیں بھولا تھا۔

ہارن کا تین مرتبہ مدھم آواز میں بجنا، اشارہ ہی ہوسکتا تھا۔ اس سے شیریں نے یہی سمجھا کہ وہ شخص آگیا تھا جس نے اسے اغوا کروایا تھا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ تاجو یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے کس نے اغوا کروایا ہے۔

جلد ہی باہر سے قدموں کی آواز آئی۔ وہ دو آدمیوں کے چلنے کی تھی۔ پھر باہر سے دروازہ کھولا گیا۔

''تم باہر ہی رکو۔'' راجن سے دھیمی آواز میں کہا گیا تھا لیکن شیریں نے آواز پہچان لی۔ وہ جنید کی آواز تھی۔

کمرے میں داخل ہونے والا جنید ہی تھا۔ اس نے دروازہ بھیڑ دیا لیکن اندر سے بند کرنا ضروری نہیں سمجھا اور مسکراتا ہوا شیریں کی طرف بڑھا۔ شیریں بستر سے کھڑی ہو گئی تھی۔

''امید ہے کہ تمہیں ان دونوں نے کوئی تکلیف نہیں پہنچائی ہوگی۔'' جنید بولا۔ ''میں نے ہدایت کر دی تھی کہ......''

شیریں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''مقصد کیا ہے تمہارا؟''

''مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم شادی سے پہلے ہی کہیں چلی جاؤ گی۔ مجھے تم نے آگاہ کر دیا تھا کہ تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ مجبوراً مجھے یہ قدم اٹھانا پڑا۔ میں اس بستر پر تمہارے ساتھ کچھ وقت گزاروں گا جس کے بعد تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔ امید ہے کہ میرے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد پھر تم مجھ سے ہی شادی کرو گی۔''

''غلط فہمی ہے تمہاری کہ تم میرے ساتھ کوئی زیادتی کرنے میں کامیاب ہوسکتے ہو۔''

جنید اس کے بالکل قریب آکر رک چکا تھا۔ ''تم اتنی طاقت ور نہیں ہو کہ میرے مضبوط بازو تمہیں بے بس نہ کر سکیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ میری ہونے والی بیوی حالات سے سمجھوتا کرلے اور ہم ایک گھنٹا خوش گوار انداز میں گزار لیں۔''

شیریں کا دایاں ہاتھ بڑی تیزی سے گھوما۔ جنید کے گال پر تڑاخ سے ایک طمانچہ پڑا۔

جنید کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ اس نے جھپٹ کر شیریں کو دبوچ لیا۔

دروازہ آہستگی سے کھلا اور تاجو اندر آگیا۔ جنید کے بازوؤں میں مچلتی ہوئی شیریں نے اسے دیکھا۔ دروازے کی طرف جنید کی پشت تھی۔

''کسے دیکھ رہی ہو؟' جنید ہنسا۔ ''دھوکا دہی کا یہ طریقہ اب بہت گھس پٹ چکا ہے۔''

اسی وقت تاجو نے اس کی گردن پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا اور اس کی کمر پر اتنی زور سے گھٹنا مارا کہ وہ کراہ کر ایک طرف گرا۔

''کون ہو تم؟'' جنید نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے تاجو کو گھورتے ہوئے کہا۔

''تمہاری شامت۔'' تاجو نے کہا اور جنید کے قریب پہنچ گیا جو کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ اسے یہ اندازہ تو قطعی نہیں ہوگا کہ اس کے مقابل کون ہے۔

تاجو نے گھونسوں اور لاتوں سے اس کی پٹائی اس طرح شروع کی کہ اسے کوئی جوابی حملہ کرنا تو درکنار، اپنے بچاؤ کا موقع بھی نہیں مل سکا۔ پھر دفعتاً وہ چیخا۔ ''راجن!''

''باہر اُس کی لاش پڑی ہے بے وقوف!'' تاجو نے کہا۔ ''یہاں تیری مدد کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔'' جملہ ختم کرتے ہی اس نے لڑکھڑاتے ہوئے جنید کے جبڑے پر اتنی زور کا گھونسا مارا کہ وہ دیوار سے جا ٹکرایا۔

''ختم کر دو اِسے بھی۔'' شیریں دانت پیستے ہوئے بولی۔

''نہیں۔'' تاجو نے کہا۔ ''اسے بس ادھ مرا کر کے چھوڑنا ہے۔ یہ زندگی بھر یاد تو رکھے کہ اس نے تمہارے ساتھ کیا کرنا چاہا تھا جس کی اِسے یہ سزا ملی۔''

اس وقت تک جنید لہولہان ہو چکا تھا۔ چہرے پر نیل پڑ گئے تھے اور پھٹے ہوئے ہونٹوں سے خون رس رہا تھا۔ سر کے بال بکھر گئے تھے۔ وہ بدستور تاجو کے گھونسوں، تھپڑوں اور لاتوں کی زد پر تھا اور کمرے میں اِدھر سے اُدھر گرتا پڑتا پٹے جا رہا تھا لیکن آخر کار ایسا ڈھیر ہوا کہ پھر نہ اٹھ سکا۔ تاجو

نے جھک کر اسے دیکھا، پھر بڑبڑایا۔ ''بے ہوش ہو گیا ہے لیکن اسے کچھ زیادہ دیر بے ہوش رکھنا ضروری ہے۔'' اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی جس سے جنید کی ناک پر ہلکا سا اسپرے کر دیا۔ ''اب یہ گھنٹا بھر سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔'' تاجو سیدھا کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ اس نے شیشی جیب میں رکھ لی تھی۔ وہ شیریں کے قریب آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بستر کے قریب لے گیا۔

''بیٹھو!'' اس نے کہا۔ '' ہم یہیں وہ باتیں کر لیں گے جو آج کرنی ہیں۔''

''ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے تاج ور۔'' شیریں نے کہا۔

''کوئی ضرورت نہیں اس کی۔ یہ اب ہمارے لیے بہت محفوظ جگہ ہے۔ باہر اس کے ساتھی کی لاش پڑی ہے۔ اس کی گردن کی ہڈی تو ڑنی پڑی تھی۔ جنید کو میں اس لیے بھی زندہ چھوڑنا چاہتا ہوں کہ اگر قتل کر دیا تو پولیس اس معاملے میں تمہارے لیے پریشانی کا سبب بنے گی اور اگر اس کو مار کر لاش کو غائب کروا دوں تو بھی تمہیں پولیس کی پوچھ گچھ کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔''

''میں واپس گھر جانا ہی نہیں چاہتی۔'' شیریں نے کہا۔

''جنید اب تم سے شادی کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا۔''

''اس صورت میں بھی ڈیڈی میرا رشتہ کسی اور سے کریں گے۔''

''اس میں ابھی کچھ دن اور لگیں گے۔ انتظار کے لیے اب خاصا وقت ہوگا۔ چار دن میں تو تمہارا رشتہ کسی اور سے نہیں ہوگا۔''

''مہینا بھی لگ جائے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ میری شادی تو کریں گے، ہر صورت میں، ہر قیمت پر!''

''ایک مہینا بھی بہت ہوتا ہے کچھ تیاری کرنے کے لیے۔''

''تیاری سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''بس کچھ ہے۔ میرا کام بھی بیس پچیس دن میں مکمل ہو جائے گا۔''

''کیا کام کرنا ہے تمہیں؟''

''کچھ ہے۔ تمہیں سمجھنا چاہیے کہ میں بھی تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔ میں کسی فلمی ہیرو کی طرح یہ ہرگز نہیں سوچ رہا ہوں کہ تم میرے ساتھ غائب ہو گئیں تو تمہارے خاندان کی بدنامی ہوگی یا تمہارے والد کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔''

''یہ نہیں سوچ رہے ہو تو پھر کیا سوچ کر دیر لگا رہے ہو۔ میں اسی وقت تمہارے ساتھ چلی جانا چاہتی ہوں۔''

''یہ بالکل مناسب نہیں ہوگا مائی ڈیئر!'' تاجو نے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرا کر بولا۔ ''ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔''

''تمہاری باتیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی ہیں۔'' شیریں کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں آنسوؤں سے چمکنے لگیں۔ ''میں تمہارے بغیر ایک سانس بھی نہیں لے سکتی تاج ور۔''

''ایک مہینے کی سانسیں تم سے کوئی نہیں چھینے گا اور ایک ماہ بعد تمہاری ہر سانس میری سانس کے ساتھ ہوگی۔''

شیریں کی آنکھوں سے دو آنسو نکلے مگر اس سے پہلے کہ وہ ٹپک جاتے، تاجو نے انہیں اپنے ہونٹوں میں جذب کر لیا۔

''زیادہ رات گزرنے سے پہلے تمہیں اپنے گھر پہنچ جانا چاہیے۔ وہ تقریب اب ختم ہونے والی ہوگی جہاں تم گئی تھیں۔ تم اپنے ڈیڈی سے کہہ سکتی ہو کہ تقریب ختم ہونے کے بعد سیدھی گھر آ گئی ہو۔ چلو اٹھو، میں تمہیں اس جگہ تک پہنچا دوں گا جہاں تمہاری کار ہے۔''

''کار تو وہیں ہے جہاں......''

''وہاں اب نہیں ہے۔'' تاجو نے اس کی بات کاٹی۔ ''وہ میرے ایک آدمی نے کسی اور جگہ لے جا کر کھڑی کر دی ہے، چلو اٹھو۔'' تاجو نے نہ صرف کہا بلکہ شیریں کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑا بھی کر دیا۔

''تم مجھے بہت مایوسی کی حالت میں واپس بھیج رہے ہو مگر یقین کر لو کہ اب میں کوئی ایسا قدم اٹھاؤں گی کہ تم بے بس ہو جاؤ گے۔''

''ایسا کیا قدم اٹھانے کے بارے میں سوچ بیٹھی ہو؟'' تاجو اس کا ہاتھ پکڑے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''یہ بتانا میں ابھی مناسب نہیں سمجھتی۔ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔''

تاجو ہنس پڑا۔ ''میرے ہی الفاظ مجھ پر لوٹا رہی ہو۔''

شیریں کچھ نہیں بولی۔ تاجو نے بھی دوبارہ سوال نہیں کیا۔ وہ دونوں راجن کے گھر سے نکل آئے۔

''میری کار قریب کی گلی میں ہے۔'' تاجو نے اس وقت کہا جب وہ دونوں پھاٹک سے نکلے تھے۔

شیریں اب چپ رہی۔

''کیا سوچنے لگیں؟'' تاجو نے تاریکی میں ایک طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''جو سوچ رہی ہوں، وہ بتانے کا ابھی وقت نہیں آیا۔''

''کوئی بے وقوفی مت کر بیٹھنا میری جان۔''

وہ دونوں گلی میں داخل ہو چکے تھے جہاں ایک کار کھڑی تھی۔

کار اسٹارٹ ہونے کے بعد بھی شیریں خاموش رہی تھی۔ ڈرائیونگ تاجو خود کر رہا تھا۔ وہ اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی۔

''یہ کار میں نے کل ہی منگائی ہے۔'' تاجو نے کہا۔ ''میری پہلی کار تو شہری پولیس کی نظر میں آچکی ہے۔''

''شہری پولیس؟ کیا مطلب؟''

''تم جانتی ہو۔ میرا علاقہ شہری حدود میں شمار نہیں کیا جاتا۔''

''ہوں۔''

''تم نے کیا سوچنا شروع کر دیا ہے؟''

''کہا نا کہ مناسب وقت پر بتاؤں گی اب میں بھی۔''

''کچھ غصہ آگیا ہے تمہیں۔'' تاجو ہنسا۔ ''اور میں بھی پھر کہوں گا کہ کوئی بے وقوفی نہ کر بیٹھنا۔''

شیریں کچھ نہیں بولی۔ اس کے اس انداز سے تاجو کچھ متفکر ہو گیا لیکن پھر اس نے اپنی کوئی بات نہیں دہرائی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ شیریں بھی اب وہ بات نہیں بتائے گی جو اس کے ذہن میں کلبلا رہی تھی۔

ایک قدرے ویران سڑک پر تاجو نے کار اس جگہ روکی جہاں شیریں کی کار کھڑی تھی۔

''جاؤ!'' تاجو نے کہا۔ ''چابی کار میں ہی لگی ہے۔''

''اوہ...... تمہیں یہ خیال نہیں آیا کہ شہر میں کار چوری کی وارداتیں آج کل خاصی بڑھی ہوئی ہیں۔''

''یہ مت سمجھو کہ یہاں سناٹا ہے۔ اس سناٹے میں کہیں میرے دو آدمی بھی موجود ہیں۔ اگر کوئی تمہاری کار اُڑا لے جانے کے لیے تمہاری کار کے قریب جاتا تو اس کی ہڈی پسلی ایک کر دی جاتی۔''

شیریں تاجو کی کار سے اتر کر اپنی کار کی طرف بڑھی۔ تاجو نے اس کی روانگی کا انتظار نہیں کیا۔ اس کی کار فراٹے بھرتی ہوئی آگے نکل گئی تھی۔

شیریں نے اپنی کار کا انجن اسٹارٹ کیا تو اُس کے ذہن میں وہ منظر ابھر آیا جب تاجو جنید کو بری طرح پیٹ رہا تھا۔ تاجو کے اس روپ کے بارے میں وہ خبریں سنتی اور پڑھتی تو رہی تھی لیکن وہ روپ اپنی آنکھوں سے آج پہلی بار دیکھا تھا۔

جب وہ اپنے گھر پہنچی تو اس کے دماغ میں یہ سوال بھی تھا کہ پولیس کو راجن کی لاش کب ملے گی اور پھر اس کے بارے میں پولیس کی تفتیش کا انداز کیا ہوگا۔ اس کا تو اسے یقین تھا کہ جنید ہوش میں آنے کے بعد وہاں سے فوراً ہی اپنے گھر کا رخ کرے گا۔ اس کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ راجن کی لاش کہیں ٹھکانے لگانے کے بارے میں کچھ کرتا۔

☆☆☆

تاجو اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو رات خاصی گزر جانے کے باوجود اسے جلدی نیند نہیں آسکی۔ وجہ اس کا احساسِ بے بسی تھا اور اس کی وجہ وہ نظامِ حکومت جس نے اسے ایسی جگہ پہنچا دیا تھا جہاں کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو شرافت کی زندگی گزارنا چاہتا تھا لیکن اس ملک میں غریب کا شرافت سے زندگی گزارنا بہت مشکل ہو چکا تھا۔

اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسے شدت سے روزگار کی تلاش تھی کیونکہ گھر میں غربت سسک رہی تھی۔ اس کے والد اس دن بستر پر ڈھیر ہو گئے تھے جب اسے بی اے کی ڈگری ملی تھی۔ اس سے پہلے وہ بیٹے کی تعلیم مکمل کرانے کے لیے اتنی ہی زیادہ محنت کرتے رہے تھے کہ اپنے مقصد کی تکمیل کے بعد ان کی ہمت فوراً ہی جواب دے گئی تھی۔ اس کے بعد ان کی حالت گرتی ہی چلی گئی تھی۔

حصولِ تعلیم کے دوران تاجو کو والد کی بے انتہا محنت کا احساس بھی تھا لیکن کوششوں کے باوجود اسے کوئی پارٹ ٹائم جاب بھی نہیں مل سکی تھی۔

پھر گھر کے خرچ اور والد کے علاج کے لیے گھر کا سامان بکنا شروع ہوا۔ مکان کرائے کا تھا جو عدم ادائیگی کے سبب کرایہ بڑھتا چلا گیا۔ تین چار ماہ اسی طرح گزر گئے۔ شیریں نے اس دوران میں اس کی مالی مدد کرنی چاہی تھی لیکن تاج ور کی حمیت نے اسے گوارا نہیں کیا تھا۔

ایک روز وہ کہیں سے گھر لوٹ رہا تھا کہ اُس نے دیکھا ایک شہدا نوجوان اس کے محلے کی ایک لڑکی کو چھیڑ رہا تھا جو اپنے اسکول سے گھر لوٹ رہی تھی۔ چھیڑے جانے پر وہ بدحواس ہوئی تو تاج ور اُس شہدے کے قریب گیا اور

اُسے سمجھانے کی کوشش کی تو شہدے نے اس پر طنز کیا۔
''تو یار ہے کیا اس لونڈیا کا؟''
اس پر تاج ور کو اس پر غصہ آ گیا۔ وہ اس شہدے پر ہاتھ چھوڑ بیٹھا۔ ان کے مابین باقاعدہ ہاتھا پائی ہو جاتی لیکن لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔
اس شہدے کا تعلق کسی مال دار گھرانے سے تھا۔ وہ لڑکی اپنے اسکول سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی تو ایک کار اس کے قریب آ کر رکی۔ اسے وہی شہدا ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے لڑکی کو ''لفٹ'' دینا چاہی لیکن وہ نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی۔ اس کے بعد بھی شہدے کی کار اس کے پیچھے لگی رہی۔ اس نے اس بس کا بھی تعاقب کیا جس میں وہ لڑکی سوار ہوئی تھی۔ پھر جب وہ بس سے اتری تو بھی وہ اس کے پیچھے لگا رہا۔ لڑکی جب اپنے محلے کی گلی میں داخل ہوئی تو اس شہدے نے اپنی کار چھوڑ کر اس کا پیچھا کیا کیونکہ گلی میں کار داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے لڑکی کے قریب جا کر اس سے یہ تک کہہ دیا کہ اگر وہ بہ رضا و رغبت اس کی بات نہیں مانے گی تو وہ اسے اس کے گھر سے بھی اٹھوا سکتا ہے۔
اس بات پر لڑکی بہت زیادہ بوکھلائی تھی اور اس نے بھاگنے کی حد تک تیز چلنا شروع کر دیا تھا۔ اس منظر پر تاج ور کی نظر بھی پڑی تھی اور تبھی وہ اس شہدے کے قریب بھی گیا تھا۔
یہ ساری باتیں تاج ور کو اس لڑکی کی ماں سے معلوم ہوئی تھیں جو اسے یہ سمجھانے اس کے گھر آئی تھی کہ بڑے گھر کے ان لوفروں کو نظر انداز کر دینا ہی اچھا ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنی دولت کے بل بوتے پر کچھ بھی کر سکتے ہیں اور اب وہ لوفر کسی وقت تاج ور کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتا ہے۔
ماں نے یہ بھی بتایا تھا کہ اب وہ اپنی بیٹی کو اسکول نہیں بھیجے گی۔
تاج ور کو اس بات کا بھی افسوس تھا کہ ایک پولیس کانسٹیبل نے بھی اس لوفر کی حرکت دیکھی تھی لیکن ایسا بن گیا تھا جیسے اس نے کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔
''پچھتانا ہوگا وہ کہ وہ لوفر کس بڑے باپ کا بیٹا ہے۔'' لڑکی کی ماں نے کہا۔ ''یہاں پولیس ہم غریبوں کو تو پریشان کر سکتی ہے، بڑے لوگوں سے نہیں الجھتی۔''
''ہاں بیٹا!'' خود تاج ور کی ماں نے اسے سمجھایا۔ ''ان لوگوں سے مت الجھا کرو۔''
جھگڑے کے وقت تاج ور کو معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ شہدا کس باپ کا بیٹا ہے لیکن اگر اسے معلوم ہوتا تو بھی وہ وہی کرتا جو اس نے کیا تھا۔
پھر دو دن بھی نہیں گزرے تھے کہ چند افراد نے کسی جگہ اس شہدے کو گھیر لیا اور کسی پرانی دشمنی کی وجہ سے اس کو قتل کر دیا۔
اسی شام پولیس تاج ور کے گھر آئی اور اسے شہدے کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے لے گئی۔ وہ لاکھ چیخا کہ اسے گرفتار کرنے کے لیے پولیس کے پاس وارنٹ ہونا چاہیے لیکن اس کی ایک نہ سنی گئی۔
مقتول شہدے سے تاج ور کے جھگڑے کی بات پولیس کانسٹیبل ہی نے تفتیش کرنے والے پولیس افسر کو بتائی تھی جسے بنیاد بنا کر اسے گرفتار کیا گیا تھا کیونکہ اصل قاتلوں کو گرفتار کیا ہی نہیں جا سکتا تھا کیونکہ وہ بھی وڈیرا اور جاگیر دار قسم کے لوگوں کے بیٹے تھے، بلکہ ان میں سے ایک لڑکا واقعی کسی جاگیر دار کا بیٹا تھا۔
یہ باتیں تاج ور کو بہت دن بعد معلوم ہوئیں۔
تھانے میں تو اسے شدید تشدد کا شکار ہونا پڑا تھا۔
پولیس نے گرفتاری کے دوسرے ہی دن اسے عدالت میں پیش کر کے ایک ہفتے کا جسمانی ریمانڈ لے لیا تھا۔ وہ تشدد کر کے اس سے یہ بھی معلوم کرنا چاہتے تھے کہ قتل کی واردات میں اس کے ساتھ اور کون کون تھا؟
خود تاج ور ہی اس قتل کا ذمے دار نہیں تھا تو وہ کیسے بتاتا کہ اس کے ساتھ اور کون کون تھا۔ ایک ہفتے میں تشدد سہہ سہہ کر اس کی حالت خراب ہو گئی۔ چھٹے دن اس سے یہ بیان لینے کی کوشش کی گئی کہ کچھ نامعلوم لڑکوں نے خود ہی اسے پیشکش کی تھی کہ وہ اس کا ساتھ دے سکتے ہیں اور اس نے ان کی پیشکش قبول کر لی تھی۔
تاج ور نے یہ بیان دے دیا کیونکہ اسے حوالات ہی کے ایک ساتھی نے بتایا تھا کہ تشدد سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ پولیس اگر پچاس افراد کے قتل کا اعتراف کرانا چاہے تو وہ بھی کر لیا جائے کیونکہ بعد ازاں عدالت میں مقدمہ چلنے پر عدالت سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ بیان اس سے تشدد کر کے لیا گیا ہے۔ سمجھانے والے نے ایسی کئی مثالیں دی تھیں جن میں لوگوں نے تشدد سے بچنے کے لیے سو سو آدمیوں کے قتل کا فوراً اعتراف کر لیا تھا۔
اگر تاج ور وہ اعتراف نہ کرتا تو اس رات اس پر اتنا تشدد کیا جاتا جو گزرے ہوئے چند دنوں میں نہیں کیا گیا تھا۔
تھانے پہنچنے کے بعد وہ تاج ور کی پہلی رات تھی جب

اس پر تشدد نہیں کیا گیا۔
اگلے دن جب اسے عدالت میں پیش کیا گیا تو عدالت کے احاطے میں اچانک فائرنگ شروع ہو گئی۔ فائرنگ کرنے والے اسے پولیس سے چھڑا لے گئے۔
وہ "بلیک برڈ گروہ" کے لوگ تھے جن کا علاقہ پولیس کے لیے "نوگوایریا" بن چکا تھا۔
وہاں اس کی اندرونی چوٹوں کا علاج کیا گیا۔ وہ اس دوران میں بالکل بے خبر رہا تھا کہ اس کے والدین کس حالت میں تھے۔ وہ ان سے ملنے کے لیے ہر قیمت پر اپنے گھر جانے کے لیے تیار تھا لیکن اسے نہیں جانے دیا گیا اور جب دس بارہ دن میں اس کا مکمل علاج ہو گیا تب بلیک برڈ نے اس سے کہا۔
"تم جانتے ہو، ہم لوگ کون ہیں؟"
"کبھی کبھی اخبارات میں تم لوگوں کے بارے میں پڑھا ہے۔"
"میں اور میرے گروہ کا ہر آدمی اس معاشرے اور یہاں کی پولیس کی لاقانونیت کا ستایا ہوا ہے اور ہم نے تمہیں بھی اسی لیے چھڑایا ہے کہ تمہارے ساتھ بھی زیادتی ہوئی تھی۔ اب تم ٹھیک ہو لیکن گھر جاؤ گے تو پھر گرفتار کیے جاؤ گے اور پھر اب گھر پر تمہارے لیے دھرا ہی کیا ہے۔"
"کچھ نہیں، لیکن ماں باپ تو ہیں۔"
"تمہاری ماں اور تمہارے محلے کے کچھ لوگوں نے تمہاری گرفتاری پر تھانے کے باہر احتجاج بھی کیا تھا مگر ان کو لاٹھی چارج کر کے منتشر کر دیا گیا۔ تمہاری ماں کو بھی معمولی چوٹیں آئی تھیں جو دو دن میں ٹھیک ہو گئی تھیں۔ رو رو کر اُن کا برا حال تھا۔ ہم نے انہیں مالی مدد بھی پہنچانی چاہی تھی لیکن اس لیے قبول نہیں کی گئی کہ ہم جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ اس کے دو دن بعد تمہارے والد کی حالت بہت زیادہ خراب ہوئی تو تمہاری ماں کسی نہ کسی طرح انہیں سرکاری اسپتال لے گئیں لیکن ان کی حالت اتنی بگڑ چکی تھی کہ وہ جانبر نہ ہو سکے۔"
"کیا؟" تاج ور کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
"میرے والد......" اس کی آواز بھرا گئی۔
"میں جانتا تھا کہ تمہیں اس اطلاع سے بہت صدمہ ہو گا لیکن حالات کیسے بھی ہوں، ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ تمہاری والدہ بھی اپنے شوہر کی موت کا صدمہ برداشت نہیں کر سکی تھیں۔ ان کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔"
یہ جاننے پر تاج ور کی کیا حالت ہوئی ہو گی، اس کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جسے اچانک معلوم ہو کہ اس کے محبوب والدین اچانک یہ دنیا ہمیشہ کے لیے چھوڑ چکے ہیں۔
بلیک برڈ نے کہا تھا۔ "میں تمہارا ہمدرد ہوں، تم سے جھوٹ کیوں بولوں گا اور پھر ایک ایسی بات جو تمہارے لیے بہت کرب ناک ثابت ہوئی ہے۔ اس کے باوجود اگر تم میری باتوں کی تصدیق کرنا چاہو تو محلے کے کسی آدمی کو فون کر کے پوچھ لو۔" اس نے اپنا موبائل تاج ور کی طرف بڑھایا تھا۔ "تمہیں اپنے محلے کے کسی آدمی کا موبائل نمبر تو معلوم ہو گا۔"
اتنی باتوں کے بعد تاج ور کو تصدیق کے لیے فون کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر روتا اور سسکیاں لیتا رہا۔ بلیک برڈ نے اسے رونے سے نہیں روکا۔ وہ چاہتا ہو گا کہ تاج ور کا دل ہلکا ہو جائے۔
اس کے اگلے دن تاج ور ساکت و صامت بیٹھا خلا میں گھور رہا تھا کہ بلیک برڈ پھر اس کے کمرے میں آیا۔
"اب تمہیں ایک فیصلہ کرنا ہے۔" اس نے تاج ور سے کہا۔ "واپس اپنے گھر جا کر پھر پولیس کی گرفت میں جانا ہے یا ہمارے ساتھ رہ کر اس دنیا سے اپنا انتقام لینا ہے؟"
"انتقام لینا چاہتا ہوں میں۔" تاج ور کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ "جرم بے گناہی میں میری ہڈی پسلی ایک کر دی گئی اور میں اپنے ماں باپ کے جنازوں کو کندھا بھی نہیں دے سکا۔ درندے پولیس والوں نے مجھے اپنے ماں باپ کے مرنے کی خبر بھی نہیں ہونے دی۔ اس کا انتقام تو میں لینا چاہتا ہوں لیکن یہ شاید میرے اختیار میں نہیں ہے۔"
"سب کچھ تمہارے اختیار میں ہو جائے گا اگر تم میرے گروپ میں شامل ہو جاؤ۔" بلیک برڈ نے پیشکش کی۔
"مجھ میں وہ صلاحیت نہیں ہے جو تمہارے گروپ کے لوگوں میں ہو گی۔"
"یہ میری ذمّے داری ہو گی کہ تم میں وہ صلاحیت پیدا کی جائے لیکن میں اس معاملے میں تم پر دباؤ نہیں ڈالوں گا۔ میرے گروپ میں شامل ہونے والے ہر شخص کو یقین رکھنا چاہیے کہ ہم جو دوسروں پر گولیاں برساتے ہیں، کسی دن کوئی گولی ہمارے سینے میں بھی اتر سکتی ہے۔"
"مجھے اب اپنی زندگی سے پیار نہیں رہ گیا۔ کون ہے اب جس کے لیے میں جینا چاہوں۔" یہ کہتے وقت تاج ور کو شیریں کا خیال آیا تھا جو اس نے اپنے دماغ سے جھٹک دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی محبوب شیریں کو بھی بیوگی کا داغ سہنا پڑے۔ بلیک برڈ اسے اس کی طرف سے خبردار کر

چکا تھا۔

بلیک برڈ بولا۔ ''زندگی سے پیار نہیں رہا تو اب تم سب کچھ کرسکو گے۔ کل سے تمہاری ٹریننگ شروع ہو جائے گی۔''

''میں نے سنا ہے کہ تمہارا علاقہ پولیس کے لیے نو گو ایریا ہے۔''

''ٹھیک سنا ہے تم نے۔''

''لیکن کیسے؟''

''ہمارے ساتھ رہو گے تو دھیرے دھیرے سب سمجھ لو گے۔''

☆☆☆

دوسرے دن سے تاج ور کی عسکری تربیت شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے اسے ریوالور اور رائفل چلانا سکھائی گئی، پھر نشانہ بازی کی مشق کا آغاز ہوا جس کے بعد اس کی کمانڈو ٹریننگ بھی شروع ہوئی۔ اور آخر ایک دن اس سے کہہ دیا گیا کہ اب وہ خود کو گروپ کا فعال رکن سمجھ سکتا ہے۔

اس طرح وہ تاج ور سے تاجو بن گیا۔ گروہ کے سبھی افراد نے اسے تاجو کہنا شروع کر دیا تھا۔

اسی دوران میں تاجو کو یہ معلومات حاصل ہو گئی تھیں کہ اس گروپ کی سرپرستی کرنے والے کئی ایم این اے اور ایم پی اے تھے۔ ان میں سے بعض کی پہنچ وزیر داخلہ تک تھی۔ وہ اس گروہ کے سرپرست اس لیے بنے تھے کہ الیکشن کے وقت یہ گروپ انہیں جتوانے کے لیے بہت کچھ کرتا تھا۔

اس گروپ کی داغ بیل بلیک برڈ نے ہی ڈالی تھی جس کا اصل نام کچھ اور تھا۔ اس گروپ کی مدد کے لیے ایک دشمن ملک کے جاسوس بھی حرکت میں آگئے تھے۔ ان کے تعاون سے گروپ کو بے پناہ اسلحہ مل گیا تھا، یہاں تک کہ ایک اینٹی کرافٹ گن بھی مل گئی تھی۔

اس گروپ کا ایک ٹارگٹ تو پولیس ہی تھی، دوسرے وہ اپنی مالی قوت بڑھانے کے لیے ان مال دار لوگوں کو بھی نشانہ بناتے تھے جن کی دولت مندی کے بنیادی اسباب ناجائز طریقے تھے۔ انہیں یا ان کے کسی قریبی عزیز کو اغوا کر کے بے پناہ تاوان لیا جاتا تھا اور تاوان نہ ملنے کی صورت میں انہیں مار بھی ڈالا جاتا تھا۔

تاجو کو صرف یہ بات اچھی نہیں لگی تھی کہ یہ گروپ ایک دشمن ملک سے بھی مدد لے رہا تھا لیکن اسے نظر انداز کرنا اس لیے ضروری تھا کہ اس گروپ میں رہے بغیر تاجو اپنا انتقام نہیں لے سکتا تھا۔

اس دوران میں موبائل فون پر شیریں سے اس کی بات ہوتی رہتی تھی جب اس نے پہلا فون کیا تھا تو شیریں بے اختیار چیخ اٹھی تھی۔

''کہاں ہو تم؟'' وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

''میں جہاں بھی ہوں ٹھیک ہوں شیریں! اب پولیس میری ہڈیاں نہیں توڑ سکتی۔''

''تمہارے والد اور والدہ......''

''مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔''

''اخبارات میں آیا ہے کہ تمہارا تعلق بلیک برڈ گروپ سے تھا اور انہی لوگوں نے تمہیں عدالت سے فرار کرایا تھا۔''

''اخبارات کو یہ اطلاع فراہم کرنا پولیس کی کمینگی ہے کہ میرا تعلق بلیک برڈ سے تھا لیکن اب یقیناً میرا تعلق بلیک برڈ گروپ سے ہے۔''

''اس کا کیا نتیجہ نکلے گا تاج ور؟''

''یہ فیصلہ تو وقت ہی کرے گا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔''

''میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تاج ور!'' شیریں ہیجانی لہجے میں بولی تھی۔

''تو پھر۔'' تاجو نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''مرنا ہوگا میرے ساتھ۔''

''میرا جینا مرنا سب تمہارے ساتھ ہے۔ کتنے دن سے تمہیں دیکھا تک نہیں۔ نیندیں حرام ہو گئی ہیں میری۔ کسی طرح بھی مجھ سے ملو۔''

''کچھ دن انتظار کرنا پڑے گا شیریں۔'' تاجو نے کہا تھا۔ ''موقع محل کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے میں کوئی تدبیر سوچوں گا تم سے ملنے کی لیکن اب تم تاج ور سے نہیں، تاجو سے ملو گی۔ اب میں تاجو ہوں، صرف تاجو۔''

''تم جو کچھ بھی ہو، میرے ہو، بس۔ اور میں تمہارے علاوہ کسی کی نہیں ہو سکتی۔''

''دیکھو اب حالات کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ انتظار کرو۔ میں تمہیں وقتاً فوقتاً فون کرتا رہوں گا۔''

''روز فون کرو۔'' شیریں کے انداز میں بے تابی تھی۔ ''تمہاری آواز ہی سن کر کچھ سکون ملتا رہے گا مجھے۔''

''کوشش کروں گا۔''

''کوشش کی بات نہ کرو۔ وعدہ کرو۔''

''تمہیں ابھی اندازہ نہیں ہو سکتا شیریں کہ مجھے اب کن حالات سے گزرنا ہے۔ مجھ سے کوئی ایسا وعدہ نہ لو جو اگر کبھی ٹوٹا تو مجھے صدمہ ہوگا۔''

''اچھا۔'' شیریں کے لہجے میں مردنی آگئی تھی۔ ''لیکن جب بھی موقع ملے، مجھے فون ضرور کرنا۔ تمہارا نمبر تو میرے پاس آگیا ہے، کسی وقت میں فون کرلیا کروں گی۔''

''نہیں کرسکو گی۔ تمہیں فون بند ملے گا۔ اب میری زندگی بہت سی احتیاطوں کے ساتھ گزرے گی شیریں!...... اچھا اب بس، باقی باتیں پھر کسی دن۔''

''میں بے چینی سے انتظار کیا کروں گی۔''

تاجو نے محبت سے ماؤتھ پیس کو چوم کر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

پھر وہ دن بھی آگیا جب پولیس اسٹیشن کے وہ پولیس والے چن چن کر مارے گئے جنہوں نے اس پر تشدد کیا تھا۔ اس کانسٹیبل نے بھی اپنے سینے پر گولی کھائی جس نے اس کے خلاف بیان دے کر اسے گرفتار کرایا تھا۔ ٹارگٹ کلنگ کی ان وارداتوں میں تاجو تو پیش پیش تھا ہی، گروپ کے لوگ بھی اس سے تعاون کرتے رہے تھے کیونکہ گروپ کی دوسری وارداتوں میں تاجو اُن کے ساتھ ہوتا تھا۔

تاجو کی منصوبہ بندیاں بھی گروپ کے لیے حرف آخر کا درجہ حاصل کر گئیں۔ کئی وارداتوں میں ایسا بھی ہوا کہ وہ لوگ اپنے مقصد میں ناکام ہوجاتے اگر تاجو کی حاضر دماغی کام نہ آتی۔ اپنی انہی صلاحیتوں کی وجہ سے بلیک برڈ نے اسے اپنا نائب مقرر کرلیا۔ اس کے بعد وہ سب کچھ بھی تاجو کے علم میں آتا چلا گیا جو گروپ کے باقی لوگ نہیں جانتے تھے۔ حکومت کے ان لوگوں کے نمبر جو اس گروپ کے سرپرست تھے اور جن کی وجہ سے گروپ کے علاقے کے خلاف کوئی فیصلہ کن پولیس کارروائی نہیں ہوتی تھی اور جو تھوڑی بہت کارروائیاں ہوتی تھیں، وہ صرف دکھاوے کے لیے ہوتی تھیں۔ مشہور یہ کیا گیا تھا کہ کوئی بڑی کارروائی اس لیے نہیں ہو پاتی کہ اس علاقے میں رہنے والے عام لوگوں کی زندگیاں بھی خطرے میں پڑ جاتیں جسے گروپ نے اپنا یرغمال بنالیا ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ وہ ساری آبادی غریبوں کی تھی جن کے دکھ درد اور پریشانی میں گروپ کا ہر فرد سرگرم رہتا تھا۔ اسی لیے سب لوگ اس گروپ سے خوش تھے۔ وہ جب اپنے کاموں کی وجہ سے علاقے کے باہر جاتے تھے تو دوسروں پر یہی ظاہر کرتے تھے کہ اس گروپ کی وجہ سے وہ بہت تنگ ہیں، حکومت اس گروپ کو ختم کرنے میں آخر کب کامیاب ہوگی؟

اسی طرح بیرونی امداد کے ذرائع بھی تاجو کے علم میں آگئے تھے۔

وقت گزرتا رہا۔ وہ وقتاً فوقتاً شیریں کو فون بھی کرتا رہا۔ مناسب موقع محل کے اعتبار سے ان کی کئی ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں۔ ہر ملاقات میں شیریں پوچھتی تھی کہ تاجو ان حالات سے کب اور کس طرح نکل سکے گا؟

تاجو ہمیشہ ایک ہی جواب دیتا۔ ''انتظار کرو۔ وقت آنے پر سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

لیکن خود وہ جانتا تھا کہ سب کچھ اس طرح کبھی ٹھیک نہیں ہوسکتا جس طرح شیریں چاہتی تھی۔

اب اخبارات میں یہ بات بھی آچکی تھی کہ تاجو اس گروپ کا سب سے زیادہ خطرناک شخص ہے۔ اسی لیے اس کے سر کی قیمت بھی مقرر کردی گئی تھی لیکن یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ گروپ کا کوئی فرد اس کے بارے میں مخبری کردیتا۔ وہ سب ایک دوسرے سے مخلص تھے جنہیں اب دولت کی ذرا بھی طمع نہیں رہی تھی۔ گردشِ حالات نے انہیں ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے الگ کردیا تھا جو کبھی ان کی دنیا تھی۔

وہ سب تاجو سے اس کی صلاحیتوں اور ذہانت سے خاصے مرعوب ہوگئے تھے۔ یہ احساس بھی سب کو ہوگیا تھا کہ بلیک برڈ کے بعد اب تاجو ہی اس گروپ کا ''بڑا'' ہے۔ ان لوگوں نے اسے ''استاد تاجو'' کہنا شروع کیا تھا لیکن تاجو نے انہیں سختی سے منع کردیا۔

گروپ میں شامل ہوئے اسے خاصا عرصہ گزر چکا تھا جب ایک بڑی واردات کرتے ہوئے پولیس سے ٹکراؤ کی نوبت آگئی۔ فائرنگ کا بے تحاشا تبادلہ ہوا۔ فائرنگ میں گروپ کے ایک آدمی کے علاوہ خود بلیک برڈ بھی مارا گیا لیکن باقی لوگ پولیس کے نرغے سے نکل کر اپنے علاقے تک پہنچ گئے۔

بلیک برڈ سے ان سبھی کو بہت لگاؤ ہوگیا تھا اس لیے دو دن تک علاقے میں ایسا سکوت رہا جیسے کسی گھر میں موت ہو گئی ہو۔ سبھی افسردہ تھے۔ تیسرے دن ان سب نے مشاورت کی اور متفقہ طور پر تاجو کو اپنا سربراہ مان لیا۔ اسی دن کے بعد سے تاجو نے بھی اپنا خفیہ نام بلیک برڈ رکھ لیا۔

گروپ کا سربراہ بننے کے بعد اس نے دو اہم کام کیے۔ ایک تو یہ کہ بجلی کے محکمے کے تمام سب اسٹیشنز پر علاقے کے عام لوگوں کو ملازم کرادیا تاکہ جب بھی واردات کے وقت روشنی ان کے لیے خطرناک ثابت ہوتی نظر آئے، اس علاقے کی بجلی اُڑا دی جائے۔ ان لوگوں کا گروپ کے دوسرے کاموں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ بس اسی لیے تھے کہ جب انہیں بلیک برڈ کی طرف سے حکم ملے، وہ اس

علاقے کی بجلی اُڑا دیں جس کی نشاندہی کی گئی ہو۔ اس اقدام سے گروپ کو تین مرتبہ فائدہ پہنچ چکا تھا۔ تیسرا موقع تو وہی تھا جب شیریں کے گھر کے پاس سے فرار ہوتے وقت تاجو نے اس کی ضرورت محسوس کی تھی اور خطرے میں پڑے بغیر پروین کے گھر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

دوسرا کام اس نے یہ کیا کہ ''بیرونی ذرائع'' سے امداد لینا ہی نہیں چھوڑی بلکہ ان سے ترکِ تعلق بھی کرلیا۔ یہ تعلق اسے شروع ہی سے پسند نہیں تھا کیونکہ وہ لوگ بعض اوقات گروپ کو اپنے کسی مقصد کی تکمیل کے لیے بھی استعمال کرتے تھے۔ اس طرح تاجو نے یہ ''داغ'' دھولیا کہ وہ لوگ کسی بیرونی طاقت کے ایجنٹ بھی تھے۔

تاجو کے خیال کے مطابق گروپ کو اب ان لوگوں کی امداد کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ گروپ کے پاس اسلحے کا انبار لگ چکا تھا۔ اس کے باوجود اگر کبھی اسلحے کی ضرورت پڑتی تو وہ اسمگلروں سے خریدا جاسکتا تھا۔ پیسے کی ان کے پاس اب کوئی کمی نہیں تھی۔ ایک آہنی والٹ میں ان کے پاس کروڑوں ڈالرز موجود تھے اور مقامی کرنسی بھی بڑی تعداد میں موجود تھی جو تاوان کی صورت میں ملتی رہتی تھی۔

پولیس کی ٹارگٹ کلنگ کا سلسلہ بھی اس نے رکوا دیا کیونکہ گروپ کے جس شخص کو بھی پولیس کے بعض لوگوں سے انتقال لینا تھا، وہ لے چکا تھا۔ خود تاجو بھی ان سب کو ختم کر چکا تھا جو اس پر تشدد کے ذمے دار تھے۔ ان میں سے اب صرف ایس پی نادر... زندہ تھا جو یہ جانتا تھا کہ اس پر تشدد کیا جارہا ہے لیکن اس نے اس معاملے میں کبھی رکاوٹ نہیں ڈالی تھی جبکہ وہ ایسا کرسکتا تھا۔

''پولیس کا بس ایک آدمی باقی ہے اب۔'' اس نے گروپ کے لوگوں سے کہا تھا۔ ''اس کے بعد میرا کام بھی مکمل ہوجائے گا۔''

اور اس کام کی تکمیل کے بعد کیا کرنا ہوگا؟ تاجو یہ بات اکثر سوچا کرتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اب وہ اس گروپ کو چھوڑ دے اور خود ہی ان میں سے کسی باصلاحیت شخص کو بلیک برڈ کا ''منصب'' دے دے لیکن اس کے بعد وہ خود قانون کی گرفت سے کس طرح بچ سکے گا؟ اس بارے میں بھی دو ایک خیالات اس کے ذہن میں کلبلاتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ کسی سے کچھ بات چیت کر بھی چکا تھا۔

ایک مسئلہ اس کے لیے شیریں بھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، خودکشی کرلے گی اور خود وہ بھی شیریں کے بغیر جو زندگی گزارتا، وہ وحشت زدہ ہی ہوتی۔ یہ انسان کے لیے بہت بڑا کرب ہوتا ہے کہ اس سے محبت کرنے والا ایک فرد بھی نہ ہو۔ اب اس سے محبت کرنے والی واحد فرد صرف شیریں ہی تھی۔ ماں باپ مر ہی چکے تھے۔ دوسرے اعزہ کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا اور جو باقی رہ گئے تھے، انہوں نے تاجو کے گھر کی غربت کی وجہ سے کسی نہ کسی بات کو جواز بنا کر ان سے قطع تعلق کرلیا تھا۔ تاجو کو ان سے اس کی شکایت بھی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اندھیرے میں سائے کا جدا ہو جانا ایک قدرتی عمل ہے۔ بس شیریں؟ یہ اس کے لیے بہت بڑا سوال تھا۔ فی الحال اس نے شیریں کے سر سے یہ خطرہ تو ٹال ہی دیا تھا کہ اس کی شادی جنید سے ہونے والی تھی اور اس نے کیا ٹالا تھا، خود جنید ہی نے ایسی حرکت کی تھی۔ اب وہ خود ہی شیریں سے شادی نہ کرتا۔

☆☆☆

جنید کو جب راجن کے گھر میں ہوش آیا تو اس کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ چہرے پر سوجن بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ہونٹ اور گال کی اندرونی سطح کے زخموں سے بہنے والے خون کے دھبے بھی اس کے کپڑوں پر موجود تھے۔

کمرے میں اس کے سوا کوئی نہیں تھا جس کی جنید کو توقع بھی تھی۔ اس کا یہ یقین بھی بے جا نہیں تھا کہ اس کی پٹائی کرنے والا شیریں کا وہی عاشق ہوگا جس کی وجہ سے شیریں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ظاہر تھا کہ وہی عاشق شیریں کو اپنے ساتھ لے گیا ہوگا۔ یہ بہرحال جنید کے لیے ایک معما تھا کہ وہ شخص وہاں پہنچ کیسے گیا، اور شیریں بھی جانتی تھی کہ وہ اسے بچانے آجائے گا۔ اسی لیے وہ خوف زدہ بھی نہیں تھی۔

جنید لڑکھڑاتا ہوا سا اس کمرے سے نکلا تو اسے راجن کی لاش بھی نظر آگئی۔ لاش کا ملنا اس کے لیے حیران کن نہیں تھا۔ اپنے حملہ آور سے اس نے سن ہی لیا تھا کہ وہ راجن کو ختم کرچکا ہے۔

اپنی کار اسے وہیں ملی جہاں اس نے چھوڑی تھی۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا۔ کار حرکت میں لانے کے بعد اسے احساس ہوا کہ بازوؤں میں ہونے والی تکلیف کے باعث اسٹیئرنگ پر اس کی گرفت مضبوط نہیں تھی۔ ضروری تھا کہ وہ زیادہ رفتار سے کار نہ چلاتا۔

اس کا دماغ غصے کی آگ کا ایندھن بنا ہوا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ شیریں سے اپنا انتقام لے۔ یہ خیال تو اس نے اپنے ذہن سے نکال ہی دیا تھا کہ وہ اب بھی شیریں

سے شادی کے لیے کوشش جاری رکھے گا۔

ایک ڈیڑھ فرلانگ کی مسافت طے کرتے کرتے اس کے دماغ میں ایک منصوبہ آگیا جس پر عمل کر کے وہ شیریں سے انتقام لے سکتا تھا۔ اس نے کار روک دی اور اپنے منصوبے پر غور کرنے لگا۔ جلد ہی اس نے فیصلہ کرلیا کہ اسے اپنے منصوبے پر ضرور عمل کرنا چاہیے۔ اس نے موبائل فون جیب سے نکالا اور شیریں سے رابطہ قائم کیا۔

''اوہ!'' شیریں کی آواز سنائی دی۔ ''اتنی پٹائی کے باوجود تمہاری عقل ٹھکانے نہیں آئی ؟''

جنید طنزیہ انداز میں بولا۔ ''اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ کر کہاں گئی ہو؟''

''کیا بکواس کررہے ہو تم، میں اپنے گھر پر ہوں۔''

''تمہارے عاشق نے ایک شخص کا قتل بھی کیا ہے اس گھر میں جہاں تم نے مجھے بلایا تھا؟''

''شٹ اَپ۔'' دوسری طرف سے شیریں نے غصیلی آواز میں کہا اور لائن ڈس کنکٹ کردی۔

جنید کے ہونٹوں پر زہریلی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اپنا موبائل بند کرتے ہوئے سوچا کہ یہ گفتگو کسی حد تک تسلی بخش ہی رہی ہے۔ اس نے وہ سب کچھ اپنے موبائل میں ریکارڈ کرلیا تھا۔

کار دوبارہ حرکت میں آئی۔ اب اس کا رخ قریبی پولیس اسٹیشن کی طرف تھا۔ جب اس کی کار پولیس اسٹیشن کے احاطے میں جاکر رکی اور وہ کار سے اترا تو اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے سپاہیوں کے مختلف تاثرات تھے۔ کوئی مسکرایا تھا اور کسی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر جنید کی طرف اشارہ کیا تھا اگر وہ کار سے نہ اترا ہوتا تو شاید اس پر فقرے بھی کس دیے جاتے۔

''کسی سے جھگڑا ہو گیا صاحب؟'' ایک کانسٹیبل نے اس کے قریب جاتے ہوئے پوچھا۔ ''پرچہ کٹانا ہے؟''

''ہاں۔'' جنید نے جواب دیا۔ ''لیکن پہلے میں تمہارے ایس ایچ او سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''خوش قسمت ہیں آپ۔'' کانسٹیبل نے کہا۔ ''صاحب راؤنڈ پر نکلے ہوئے تھے۔ ابھی ابھی آئے ہیں۔ چلیں میں آپ کو اُن کے کمرے تک پہنچادوں۔''

جنید پہلے ہی تھانے کی عمارت کی طرف بڑھ چکا تھا۔ کانسٹیبل اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اسے امید ہوگی کہ اس کے خوشامد پسندانہ انداز پر اس کی جیب کچھ گرم ہو جائے گی۔

اس کی یہ توقع اس طرح پوری ہوئی کہ ایس ایچ او کے کمرے کی چق اٹھانے سے پہلے جنید نے پچاس کا ایک نوٹ کانسٹیبل کی جیب میں ڈال دیا۔

توقع تو درست ثابت ہوئی لیکن اس کا منہ کچھ بن گیا تھا۔ اسے ایک قیمتی کار سے اترنے والے سے سو روپے کے نوٹ کی امید ہوگی۔

ایس ایچ او نے بھی اس کی طرف کچھ تعجب سے دیکھا۔

''مجھے رپورٹ تو درج کرانی ہے۔'' جنید نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس سے پہلے میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔''

''رپورٹ کس کے خلاف درج کرانی ہے؟ کس سے جھگڑا ہوا ہے آپ کا؟''

''میرا کسی سے کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ مجھے کسی جگہ بلا کر مارا پیٹا گیا ہے۔ مجھے ایک لڑکی کے خلاف رپورٹ درج کرانی ہے۔''

''لڑکی نے مارا پیٹا ہے آپ کو؟'' ایس ایچ او تعجب سے بولا۔

''لڑکی نے مجھے فون کر کے بلایا تھا ایک گھر میں جہاں میری یہ حالت بنانے والا اس کا عاشق ہی ہوگا۔''

''وضاحت سے بتائیں۔ بیٹھ جایئے۔''

جنید اس وقت تک کھڑا ہوا ہی تھا۔

''لڑکی کا نام شیریں ہے۔'' جنید نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''اس سے میری شادی طے ہوگئی تھی لیکن مجھے کسی ذریعے سے معلوم ہوا تھا کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اسی لیے مجھے تعجب ہوا جب اس کا فون آیا۔ اس نے مجھے ایک پتا بتایا اور مجھ سے وہاں آنے کے لیے کہا۔ میں اس توقع پر چلا گیا کہ شاید کچھ بات بن جائے۔ مجھے اس سے شادی کی خواہش تو تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہ وہاں تھی لیکن اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا جس نے اچانک مجھ پر حملہ کردیا۔ مجھے ذرا بھی سنبھلنے کا موقع اس لیے نہیں ملا کہ ایسی کوئی بات سان گمان میں بھی نہیں تھی ورنہ میری صحت ایسی خراب نہیں ہے کہ وہ میرا یہ حال کردیتا۔ سر پر لگنے والی ایک ضرب سے میں بے ہوش ہو گیا پھر جب مجھے ہوش آیا تو وہاں نہ شیریں تھی اور نہ وہ شخص۔ میں اس کمرے سے نکلا تو میں نے وہاں ایک لاش پڑی ہوئی دیکھی۔''

ایس ایچ او خاموشی اور توجہ سے سب کچھ سنتا رہا تھا لیکن آخری جملے پر وہ اس طرح چونکا کہ اپنی کرسی سے ذرا

ساتھ بھی گیا۔ ''لاش؟'' اس کے منہ سے نکلا۔

''جی ہاں۔'' جنید نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ میں نے اس کی گردن ایک طرف اس طرح لٹکی دیکھی ہے جیسے اس کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو، اور گردن کی ہڈی خود بہ خود تو ٹوٹ نہیں سکتی۔''

''یہ بات تو آپ کو سب سے پہلے بتانی چاہیے تھی۔'' ایس ایچ او نے تیزی سے کہا اور پھر فوراً ہی بلند آواز میں کسی کو پکارا۔

جنید نے اس کمرے میں آتے وقت ایک کانسٹیبل کو دروازے کے پاس کھڑا دیکھا تھا۔ ایس ایچ او کی پکار پر وہی اندر آیا۔

''حیدر کو بلاؤ۔'' ایس ایچ او نے اس سے کہا پھر جنید سے بولا۔ ''اس گھر کا پتا بتایئے۔'' اس نے قلم سنبھال لیا تھا۔

جنید نے پتا بتایا جو ایس ایچ او نے لکھ لیا۔

''آپ کو اسپتال جا کر اپنا چیک اَپ کروانا چاہیے۔'' اس نے جنید سے کہا۔ ''ہو سکتا ہے، آپ کو کوئی اندرونی چوٹ بھی آئی ہو۔''

''میں ایسی کوئی بات محسوس نہیں کر رہا ہوں۔'' جنید نے کہا۔ ''جو چوٹیں آئی ہیں، وہ خود ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔ میں جلد از جلد یہاں کی کارروائی مکمل کرانا چاہتا ہوں۔''

اسی وقت ایک سب انسپکٹر اندر آیا۔ وہ حیدر ہی ہوگا۔

''اس گھر پر جایئے۔'' ایس ایچ او نے اسے وہ پرچہ دیا جس پر اس نے جنید کا بتایا ہوا پتا لکھا تھا۔ ''وہاں آپ کو ایک لاش ملے گی۔ غالباً اسے قتل کیا گیا ہے۔ ایمبولینس بھی ساتھ لے جایئے۔ فنگر پرنٹ سیکشن کے لوگوں کو بھی۔ قوی امکان ہے کہ وہاں کچھ افراد کی انگلیوں کے نشانات بھی ملیں گے۔''

''شیریں کے تو ضرور ملیں گے۔'' جنید پُرجوش ہو گیا۔

سب انسپکٹر حیدر نے جنید پر ایک نظر ڈالی اور تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

''آپ نے مجھے تو ساری تفصیل بتا دی۔'' ایس ایچ او نے جنید سے کہا۔ ''اب پرچہ کٹوا دیں جا کر۔''

جنید پرچہ کٹوانے کے لیے جاتے وقت بہت مطمئن تھا۔ اپنے خیال کے مطابق وہ شیریں کو ایک بڑی مشکل میں پھنسوانے جا رہا تھا۔ اسے پولیس کے سامنے قتل کے بارے میں جواب دہی کرنی پڑ سکتی تھی۔

پرچہ کاٹنے والے نے جب شیریں کا نام لکھنے کے بعد اس کے باپ کا نام پوچھا تو جواب سن کر اس کا قلم فوراً رک گیا۔ اس نے جنید کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''شیخ جواد؟......یعنی وہ جو......''

''جی ہاں وہی۔'' جنید نے اس کی بات کاٹی۔ ''اس شہر میں اس نام کا ایک ہی شخص مشہور ہے۔''

''ایک منٹ۔'' محرر نے کہا اور پھر تیزی سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

جنید نے بُرا سا منہ بنایا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ محرر ایس ایچ او کو بتانے گیا ہوگا۔ بڑے لوگوں کے خلاف پرچہ کاٹتے ہوئے پولیس کی جان نکلتی ہے، اس نے بڑی تلخی سے سوچا تھا۔

محرر جلد ہی واپس لوٹا اور جنید سے بولا۔ ''صاحب بلا رہے ہیں آپ کو۔''

''بڑے لوگوں کا نام لکھتے ہوئے تم لوگ بہت گھبراتے ہو۔'' جنید نے اس سے خشک لہجے میں کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر وہاں سے اٹھ کر ایس ایچ او کے کمرے میں پہنچا۔

''آپ شیخ جواد کی بیٹی کے خلاف پرچہ کٹوا رہے ہیں؟''

''ظاہر ہے کہ اسی کے خلاف کٹواؤں گا جس کی وجہ سے میری یہ حالت ہوئی ہے۔''

''آپ نے بتایا تھا کہ اس سے آپ کی شادی طے ہوئی تھی۔''

''جی ہاں۔''

''آپ کا تعلق بھی کسی ایسے ہی بڑے گھرانے سے ہوگا۔''

''میں سیٹھ ابراہیم کا بیٹا ہوں۔ یقیناً آپ سیٹھ ابراہیم کے نام سے بھی واقف ہوں گے۔''

''یقیناً۔ وہ بھی ایک مشہور بزنس مین ہیں۔ اس کے باوجود...... میرا مطلب ہے کہ...... آپ سمجھ سکتے ہیں کہ بڑے لوگوں کے خلاف کارروائی پولیس کے لیے اکثر اوقات پریشانی کا سبب بنتی ہے۔ کیا آپ شیریں کے خلاف کوئی چھوٹا موٹا ثبوت دے سکتے ہیں؟''

''چھوٹا موٹا ثبوت تو دے ہی سکتا ہوں۔'' جنید نے اپنی جیب سے موبائل فون نکالتے ہوئے کہا۔ وہ خود بھی چاہتا تھا کہ ایسی کوئی نوبت آئے۔ اس نے شیریں سے اپنی جو مختصر بات چیت ریکارڈ کی تھی، وہ اس نے ایس ایچ او کو سنا

دی۔

ایس ایچ او کچھ سوچنے لگا۔

''کیا شیریں کا پہلا جملہ قابلِ گرفت نہیں ہے؟'' جنید بولا۔''اس نے پوچھا تھا کہ اتنی پٹائی کے باوجود تمہاری عقل ٹھکانے نہیں آئی۔''

ایس ایچ او نے متفکر انداز میں سر ہلایا، پھر بولا۔

''ریکارڈنگ مجھے پھر سنوائیے۔''

جنید نے ریکارڈنگ اسے دوبارہ سنا دی پھر بولا۔

''اس پر بھی غور کیجیے کہ جب میں نے اس سے کہا تھا کہ تمہارے عاشق نے اس گھر میں ایک قتل بھی کیا ہے جہاں تم نے مجھے بلایا تھا۔ میری اس بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور شٹ اپ کہہ کر لائن کاٹ دی تھی۔''

ایس ایچ او نے پھر فکرمندی سے سر ہلایا اور کچھ سوچ کر بولا۔''اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ شیریں ہی کی آواز ہے؟''

''میں اپنا بیان دے چکا۔'' جنید نے تلخی سے کہا۔

''اب ثبوت حاصل کرنا میرا نہیں بلکہ پولیس کا کام ہے، یہ آپ کا کام ہے۔''

جنید اب کچھ دبنگ اس لیے ہوگیا تھا کہ وہ ایس ایچ او کو اپنے باپ کا نام بتا چکا تھا۔ اس نام کو سننے کے بعد ایس ایچ او کی سطح کا کوئی پولیس آفیسر اسے ٹیڑھے انداز میں جواب نہیں دے سکتا تھا۔

''شیریں کا فون نمبر بتائیں گے آپ مجھے؟'' ایس ایچ او بولا۔

جنید نے اسے نمبر بتا دیا۔ ایس ایچ او نے اپنا موبائل نکال کر وہ نمبر ملایا۔ فون کان سے لگائے ہوئے وہ جنید کی طرف دیکھتا رہا۔

پھر دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد اس نے کہا۔

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں محترمہ!...... میں نے آپ کو دوبارہ فون نہیں کیا ہے۔ میں ایک پولیس اسٹیشن سے بول رہا ہوں۔ میں یہاں کا انچارج ہوں۔''

اب جنید بھی غور سے ایس ایچ او کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''فون میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہاں ایک شخص آپ کے خلاف یہ رپورٹ درج کروانا چاہتا ہے کہ آپ نے اسے کسی سے پٹوایا ہے...... جی ہاں، یہی نام ہے ان کا...... جی ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، ثبوت تو دینا ہوگا انہیں...... سوری، میں نے آپ کی نیند خراب کی...... بس ایک سوال کا جواب اور دے دیجیے، کیا وہ صاحب ایک بار پہلے بھی...... یعنی ابھی کچھ دیر پہلے بھی فون کر چکے ہیں؟...... دراصل یہ سوال میں آپ کی پہلی بات کی وجہ سے کر رہا ہوں۔ آپ نے چھوٹتے ہی کہا تھا کہ تم اب کسی نئے نمبر سے مجھے پریشان کرنا چاہتے ہو۔''

جنید نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ بھی شیریں کے جوابات سنے۔

''آپ کے اس بیان کے مطابق آپ نے فون بند کر دیا لیکن جنید صاحب نے مجھے اپنے موبائل سے ایک ریکارڈنگ سنوائی ہے۔'' ایس ایچ او نے کہا۔''ان کا بیان ہے کہ وہ آپ کی اور ان کی گفتگو کی ریکارڈنگ ہے۔ اس میں آپ نے ان سے کہا ہے کہ اتنی پٹائی کے باوجود تمہاری عقل ٹھکانے نہیں آئی۔''

پھر دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد ایس ایچ او نے کہا۔''شکریہ! مجھے آپ سے بس یہی معلومات درکار تھیں۔'' پھر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''کیا کہہ رہی تھی وہ؟'' جنید نے بے چینی سے پوچھا۔

''ریکارڈ میں نے بھی کی ہے یہ گفتگو۔ یہ بہت کام آئے گی۔ آپ پرچہ کٹوائیے۔''

''آپ کے محرر صاحب کاٹیں گے؟'' جنید نے تلخی سے پوچھا۔

''وہ آپ کے پیچھے پیچھے آیا ہوگا۔ دروازے ہی پر کھڑا ہوگا۔'' ایس ایچ او نے کہا، پھر قدرے بلند آواز میں پکارا۔''قادر!''

محرر فوراً ہی اندر آ گیا۔

''پرچہ کاٹ دو۔'' ایس ایچ او نے اس سے کہا۔''جو کچھ بھی یہ بتائیں، لکھو۔''

''آئیے صاحب۔'' محرر نے جنید سے کہا۔

''ایک منٹ۔'' جنید نے اسے جواب دیا، پھر ایس ایچ او سے بولا۔''کیا میں وہ باتیں سن سکتا ہوں جو شیریں نے آپ سے کہی تھیں؟ آپ بتا چکے ہیں کہ ریکارڈنگ آپ نے بھی کی ہے۔''

ایس ایچ او نے کچھ سوچا، پھر کہا۔''سن لیجیے!'' پھر اس نے محرر سے کہا۔''تم جاؤ، یہ ابھی آتے ہیں تمہارے پاس۔''

محرر کے جانے کے بعد ایس ایچ او نے جنید کو ریکارڈنگ سنوائی۔ ریکارڈنگ کی ابتدا میں تین مرتبہ گھنٹی

بجنے کی آواز سنائی دی، پھر کال ریسیو کی گئی۔ ''تم اب مجھے کسی اور نمبر سے پریشان کرنا چاہتے ہو؟'' شیریں کی غصیلی آواز سنائی دی۔

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں محترمہ!'' یہ ایس ایچ او کی آواز تھی۔ ''میں نے آپ کو دوبارہ فون نہیں کیا ہے۔ میں ایک پولیس اسٹیشن سے بول رہا ہوں۔ میں یہاں کا انچارج ہوں۔''

''اوہ۔'' شیریں کا لہجہ دھیما پڑ گیا۔ ''لیکن کیوں؟ پولیس اسٹیشن سے مجھے فون کیوں کیا گیا ہے؟''

''فون میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہاں ایک شخص آپ کے خلاف یہ رپورٹ درج کروانا چاہتا ہے کہ آپ نے کسی سے اسے پٹوایا ہے۔''

''اوہ! کیا وہ جنید ہے؟''

''جی ہاں، یہی نام ہے ان کا۔''

''بکواس کر رہا ہے وہ۔ اس سے میری منگنی تو ہو چکی ہے لیکن میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ یہ میں اس سے بھی کہہ چکی ہوں۔ اب وہ انتقاماً میرے خلاف جھوٹا مقدمہ بنوانا چاہتا ہے۔ تو بنائے۔ مجھے پروا نہیں ہے۔ اس کے پاس کوئی ثبوت ہے اس کا کہ میں نے اسے پٹوایا ہے؟ ثبوت تو دینا ہوگا اُسے۔''

''جی ہاں۔ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ثبوت تو دینا ہوگا انہیں۔''

''تو ثبوت لیجیے اُس سے۔ آپ نے خوامخواہ میری نیند خراب کی ہے۔''

''سوری! میں نے آپ کی نیند خراب کی۔ بس ایک سوال کا جواب اور دے دیجیے! کیا وہ صاحب آپ کو پہلے بھی...... یعنی ابھی کچھ دیر پہلے بھی فون کر چکے ہیں؟ دراصل یہ سوال میں آپ کی پہلی بات کی وجہ سے کر رہا ہوں۔ آپ نے چھوٹتے ہی کہا تھا کہ تم اب کسی نئے نمبر سے مجھے پریشان کرنا چاہتے ہو۔''

دوسری طرف سے کچھ توقف کے بعد کہا گیا۔ ''ہاں، اس نے مجھے فون کیا تھا لیکن میں نے اس کی اُلٹی سیدھی باتوں کا کوئی جواب ہی نہیں دیا اور فون بند کر دیا۔''

''آپ کے اس بیان کے مطابق آپ نے فون بند کر دیا لیکن جنید صاحب نے مجھے اپنے موبائل سے ایک ریکارڈنگ سنوائی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ وہ آپ کی اور ان کی گفتگو کی ریکارڈنگ ہے۔ اس میں آپ نے ان سے کہا ہے کہ اتنی پٹائی کے باوجود تمہاری عقل ٹھکانے نہیں آئی۔''

''بکواس ہے یہ اُس کی۔ کسی اور سے بات کر کے اس نے یہ ریکارڈنگ کی ہوگی۔ کسی لڑکی سے کہہ دیا ہوگا کہ وہ اس کی باتوں میں یہ جوابات دے۔''

''شکریہ۔ مجھے آپ سے بس یہی معلومات درکار تھیں۔''

اس آخری بات کے بعد ایس ایچ او نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''تو سنی آپ نے اس کی آواز؟'' جنید پُرجوش انداز میں بولا۔ ''اس کی اور میرے موبائل کی آواز میں کوئی فرق نہیں ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ بظاہر تو فرق نظر نہیں آتا لیکن یہ فیصلہ میں نہیں کر سکتا۔ ایکسپرٹ ہی ان دونوں آوازوں کو سن کر فیصلہ دے سکتا ہے۔ کیا آپ اپنا موبائل مجھے عنایت کریں گے؟ میں اپنا اور آپ کا موبائل ایکسپرٹ کو بھجوا دوں گا۔''

''شوق سے لے لیجیے آپ۔'' جنید نے کچھ سوچے سمجھے بغیر اپنا موبائل اس کے حوالے کر دیا۔ ''میں ہر قیمت پر شیریں کے خلاف قانون کی کارروائی دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس سے شادی کرنے کا خیال تو اب میں اپنے ذہن سے جھٹک چکا ہوں۔ وہ لڑکی جو کسی لوفر کو چاہتی ہو، میں اُس سے شادی کیسے کر سکتا ہوں؟''

''اگر ایکسپرٹ کی رپورٹ یہی ہوئی کہ دونوں آوازیں ایک ہی لڑکی کی ہیں تو ہمیں کارروائی کا جواز مل جائے گا۔ دو جھوٹ بھی ثابت ہو جائیں گے۔ ایک تو یہ کہ آپ کے فون پر اس نے آپ سے بات نہیں کی۔ دوسرے جب میں نے کہا کہ یہاں کوئی شخص ان کے خلاف رپورٹ کرنا چاہتا ہے تو چھوٹتے ہی آپ کا نام کیوں لیا گیا۔''

''آپ فوری طور پر اسے طلب کر کے پوچھ کچھ کیوں نہیں کرتے؟''

''وہ کسی معمولی گھر کی لڑکی ہوتی تو ایسا کیا جا سکتا تھا۔ بڑے لوگوں کے معاملات میں پولیس کو احتیاط کرنی پڑتی ہے۔''

''یہ دہرا قانون ہی تو ہمارے ملک کی تباہی کا سبب بن رہا ہے۔'' جنید نے تلخی سے کہا۔

ایس ایچ او کے چہرے سے ناگواری ظاہر ہوئی لیکن اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ جا کے پرچہ کٹوائیں اور پھر کسی اسپتال جا کر......''

''اِن چوٹوں کے لیے مجھے کسی اسپتال جانے کی

ضرورت نہیں۔ گھر پر چند دن آرام کروں گا تو یہ خود ہی ٹھیک ہوجائیں گی۔''

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ ایس ایچ او نے ریسیور اٹھایا۔ ''ہیلو!'' پھر دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد کہا۔ ''انگلیوں کے نشانات مل جانا تو اچھی علامت ہے۔ ٹھیک ہے۔ کام مکمل کر کے لوٹو۔'' اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''کس کا فون تھا؟'' جنید نے بے تابی سے پوچھا۔ ''کس کی انگلیوں کے نشانات مل گئے ہیں؟''

''حیدر کا فون تھا۔ جب آپ پرچہ کٹوانے گئے تھے تو بھی اس کا فون آیا تھا۔ اسے وہاں لاش بھی مل گئی تھی اور ایک کمرے میں ایسے آثار بھی ملے تھے کہ وہاں کچھ جھگڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہاں انگلیوں کے نشانات ملنے چاہئیں۔ اب اس نے رپورٹ دی ہے کہ خاصے نشانات ملے ہیں۔''

''اس میں شیریں کی انگلیوں کے نشانات ضرور ہوں گے۔'' جنید خوش ہوا۔

''ایسی صورت میں یہ کیس بہت مضبوط ہوجائے گا۔ میرا آپ سے رابطہ رہنا ضروری ہے۔ اپنا موبائل تو آپ چھوڑے جا رہے ہیں۔ کوئی اور نمبر؟''

''ایک موبائل گھر پر ہے۔ اس کا نمبر لکھ لیجیے آپ۔''

جنید نے نمبر بتایا اور کہا۔ ''میں کسی وقت بھی آپ سے کسی اچھی خبر کا منتظر رہوں گا۔''

ایس ایچ او نے سر ہلانے پر اکتفا کی۔

جنید جب پرچہ کٹوا کر پولیس اسٹیشن سے اپنے گھر کی طرف لوٹا تو بہت خوش تھا۔ اس کے خیال کے مطابق شیریں، راجن کے قتل کے معاملے میں بھی پھنس سکتی تھی۔

اپنی چوٹوں کے بارے میں بھی اس نے سوچ لیا تھا کہ باپ کو وہی سب کچھ بتائے گا جو اس نے پولیس کو بتایا تھا۔

☆☆☆

پولیس اسٹیشن سے فون آنے کے بعد شیریں کی نیند اُڑ گئی تھی اور اس نے پریشانی کے عالم میں ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔ اسے اس کی ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ جنید اس کے خلاف رپورٹ درج کرانے پولیس اسٹیشن پہنچ جائے گا۔ وہ ان حالات سے تاج ور کو آگاہ کرنا چاہتی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ تاج ور صرف ضرورت کے وقت اپنا موبائل استعمال کرتا تھا ورنہ بند رکھتا تھا۔

فی الحال اسے اتنا اطمینان ضرور تھا کہ پولیس اتنی رات گئے آ کر اسے پریشان اس لیے نہیں کر سکتی تھی کہ جنید اپنی درج کرائی ہوئی رپورٹ کے سلسلے میں کوئی ثبوت نہیں دے سکتا تھا۔

پھر اچانک اسے ایک ایسا خیال آیا کہ اس کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔ یہ تو یقینی امر تھا کہ جنید نے پولیس کو اس مکان کا پتا ضرور بتایا ہوگا جہاں اس کی پٹائی ہوئی تھی۔ ایسی صورت میں یہ بھی یقینی تھا کہ پولیس کو وہاں راجن کی لاش مل گئی ہوگی۔ وہاں وہ لوگ اس کمرے کا جائزہ بھی لے سکتے تھے جہاں جنید کی پٹائی ہوئی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہاں جھگڑا ضرور ہوا ہے۔ پولیس وہاں انگلیوں کے نشانات بھی ڈھونڈ سکتی تھی۔ یہ خطرے کی بات تھی۔ وہاں پولیس کو نہ صرف اس کے بلکہ تاجو کی انگلیوں کے نشانات بھی مل سکتے تھے۔ اس طرح معاملہ یقیناً سنگین ہو جاتا۔

بے چین ہو کر اس نے اپنے موبائل پر تاجو کا نمبر ملایا۔ اسے ذرا بھی امید نہیں تھی کہ رابطہ ہوجائے گا لیکن اس وقت اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑک گیا جب دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی۔

''خیریت تو ہے شیریں!'' تاجو کی آواز آئی۔ ''اتنی رات کو کیا ہوگیا؟''

''شکر ہے کہ تم نے کال ریسیو کر لی۔''

''اسے اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے۔ دراصل ابھی میں نے کسی سے فون پر بات کی تھی۔ پھر میں موبائل بند کرنے ہی والا تھا کہ اس کی گھنٹی بج اٹھی۔ اسکرین پر تمہارا نام دیکھ کر میں نے کال ریسیو بھی کر لی ورنہ ڈس کنکٹ کر دیتا۔ میں اس نمبر سے فون کرتا تو ہوں لیکن کوئی کال ریسیو نہیں کرتا۔ خیر چھوڑو۔ تمہیں اس وقت فون کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟ کیا جنید نے کوئی حرکت کی ہے؟''

''ہاں، اور ایسی حرکت جس کی توقع مجھے بالکل نہیں تھی۔'' شیریں نے کہا اور پھر پولیس اسٹیشن کا فون آنے سے لے کر اپنے دماغ میں آنے والے خیال تک، سبھی کچھ بیان کر ڈالا۔ تاجو نے وہ سب کچھ بالکل خاموشی سے سنا تھا۔ شاید وہ سب کچھ سنتے ہوئے وہ کچھ سوچتا بھی رہا ہو۔

''ہوں۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ''جنید کو اس کی سزا تو ملے گی۔ ایک بڑا ڈوز اور دینا پڑے گا۔ تم بہرحال پریشان نہ ہو۔ میں نے اپنے آدمیوں سے کہہ دیا تھا کہ وہاں سے نشاناتِ انگشت صاف کر دیں۔ انہیں بتا دیا تھا کہ نشانات کہاں کہاں ہو سکتے ہیں۔ امکان نہیں کہ کوئی نشان

پولیس کو مل جائے۔"
"یہ تو تمہیں بھی نہیں معلوم کہ میری انگلیوں کے نشانات کہاں کہاں ہوں گے؟"
"اندازے سے بتایا تھا۔ خیر، اس معاملے میں تمہیں پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔ میں اب اسی وقت سے وہاں کی خبر لینا شروع کر دوں گا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔ میں اس کا کچھ سدِباب کر لوں گا۔"
"تمہیں لاش وہاں سے غائب کروا دینی چاہیے تھی۔"
"ضروری نہیں سمجھا تھا۔ خیر، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں تمہارے حالات سے بھی باخبر رہوں گا۔ اب تم سو جاؤ اطمینان سے۔"
لیکن اس گفتگو کے بعد بھی شیریں کو کُلّی اطمینان حاصل نہیں ہو سکا۔ وہ اس کے بعد بھی کچھ دیر تک ٹہلتی رہی تھی۔ پھر بستر پر لیٹنے کے بعد بھی اسے فوری طور پر نیند نہیں آسکی۔ دماغ میں خیالات گردش کرتے رہے تھے۔ پھر یکایک اسے ایک ایسا خیال آیا کہ وہ ایک بار پھر بے چین ہو کر بستر سے اٹھ بیٹھی۔ وہ پریشان کن خیال یہ تھا کہ شاید ایس ایچ او نے اس سے کی جانے والی باتیں بھی ریکارڈ کر لی ہوں۔ ایسی صورت میں اس کی اور جنید کے موبائل کی آوازوں کا موازنہ کیا جا سکتا تھا۔ دونوں موبائلوں میں یکساں آواز اس کے لیے پریشانی کا سبب بن سکتی تھی۔ اس پر یہ الزام لگ جاتا کہ اس نے پولیس سے غلط بیانی کی تھی۔
شیریں نے یہ بات بتانے کے لیے تاجو کا نمبر ملایا لیکن بے سود۔ تاجو کا موبائل بند تھا۔
شیریں ایک بار پھر ٹہلنے لگی۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ اب اسے نیند نہیں آئے گی۔ اسے خود پر بھی غصہ آیا۔ تاجو سے رابطہ ہونے پر اسے اپنے اس خدشے کا اظہار بھی کر دینا چاہیے تھا۔ وہ پُر یقین تو نہیں تھی لیکن اسے خیال تھا کہ عدالتیں اس قسم کی ریکارڈنگ کو "ثبوت" نہیں سمجھتیں، البتہ آواز کی اس یکسانی کی وجہ سے پولیس کو یہ موقع بہرحال ملتا کہ وہ اس کے لیے پریشانی کا سبب بنے، اسے سوال و جواب میں الجھایا جائے۔
بہرحال جو کچھ شیریں نے پہلے ہی ایک فیصلہ کیا تھا، اس کی وجہ سے عدالت کی تو خیر نوبت ہی نہیں آتی لیکن پولیس کی پریشانی سے بچنے کے لیے اس نے فیصلہ کیا کہ جو قدم اسے ایک آدھ دن اور سوچ کر اٹھانا تھا، وہ قدم اب فوری طور پر اٹھایا جائے۔ وہ پولیس کے جھمیلے میں پڑنے کے لیے آمادہ نہیں تھی۔
فجر کے وقت اس نے ایک ملازمہ کو ہدایت کی کہ اس کے لیے ناشتا تیار کیا جائے۔
ملازمہ کو اس پر تعجب ہوا کیونکہ اس گھر میں ناشتا نو بجے کے لگ بھگ کیا جاتا تھا۔ شیخ جواد اٹھتا ہی آٹھ بجے کے بعد تھا لیکن ملازمہ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ شیریں سے اس بارے میں استفسار کر سکتی۔
ناشتا تیار ہونے تک شیریں نے ہلکا سا شاور لے کر کپڑے تبدیل کر لیے۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے وہ تازہ دم ہونا چاہتی تھی۔
ناشتا کرنے کے بعد اس نے اپنا ضروری سامان ایک اٹیچی کیس میں بھرا اور ایک ملازم کو بلا کر اس سے کہا کہ وہ اٹیچی کیس لے جا کر اس کی کار کی ڈکی میں رکھ دے۔
یہ بھی ایک غیر معمولی بات تھی۔ ملازمہ کی طرح ملازم کو بھی تعجب ہوا۔ شیریں کو خیال تھا کہ اس غیر معمولی بات کی اطلاع کوئی ملازم اس کے والد جواد تک پہنچا سکتا تھا، خواہ اسے شیخ جواد کو جگانے کی جسارت ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ اسی لیے شیریں نے اٹیچی کیس اٹھائے ہوئے ملازم کے ساتھ باہر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
"مجھے ایک فلائٹ پکڑنی ہے۔ بیرونِ شہر جا رہی ہوں۔ رات کو اطلاع ملی تھی کہ میری ایک دوست کی حالت بہت خراب ہے۔ اسی کو دیکھنے جا رہی ہوں۔ رات ہی میں نے ڈیڈی کو بتا دیا تھا۔"
اس کے خیال کے مطابق اب کوئی ملازم شیخ جواد کو اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھتا۔ شیریں یہی چاہتی تھی کہ باپ کو اطلاع ملنے سے پہلے وہ اس گھر سے دور جا چکی ہو۔ اسے یہ خیال بھی تھا کہ صبح ہوتے ہی شاید پولیس بھی آ دھمکتی جس کا سامنا کرنا اس کے لیے پریشانی کا سبب بنتا۔
کار میں بیٹھ کر جب وہ گھر سے روانہ ہوئی تو پو پھٹنے میں دو چار ہی منٹ باقی تھے۔ وہ تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کر رہی تھی پھر بھی جب وہ اس علاقے کے قریب پہنچی جسے "نوگو ایریا" کہا جاتا تھا، دھوپ اچھی خاصی پھیل چکی تھی اور گاڑیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔
"نوگو ایریا" کی حد شروع ہونے سے ذرا پہلے شیریں نے دو پولیس چوکیاں بھی دیکھیں اور یہ بھی محسوس کیا کہ وہاں موجود پولیس والوں نے اس کی کار کی طرف حیرت سے دیکھا تھا جو نوگو ایریا میں داخل ہو رہی تھی۔
یہ غریبوں اور متوسط طبقے کی بستی تھی جہاں رہنے

والے کار رکھنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ممکن تھا کہ دو چار کے پاس کاریں بھی ہوتیں لیکن وہ پرانی اور بہت معمولی ہوتیں جبکہ شیریں کی کار نہایت قیمتی تھی۔

علاقے میں کچھ دکانیں کھل چکی تھیں۔ وہاں شیریں نے ایک ایسا منظر دیکھا جو پہلے کبھی صرف فلموں میں دیکھا تھا۔ بعض مکانات کی چھتوں پر یا کسی بلند مقام پر موجود ہر شخص کے ہاتھ میں اسلحہ موجود تھا۔ کسی کے پاس کلاشنکوف، کسی کے پاس آٹومیٹک رائفل بلکہ ایک مقام پر ہلکی مشین گن بھی دکھائی دی۔

اس علاقے میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنی کار کی رفتار بہت کم کر دی تھی۔ یہاں بھی اس نے محسوس کیا کہ راہ گیر اور دکانوں پر موجود لوگ اس کی کار کی طرف تعجب سے دیکھ رہے تھے۔

یکایک کسی طرف سے دو موٹر سائیکلیں آئیں اور انہوں نے شیریں کی کار کا راستہ روک لیا۔ شیریں کو کار روکنی پڑی تھی لیکن وہ اس صورت حال سے بالکل نہیں گھبرائی۔ اسے ایسی صورت حال کی توقع تھی بلکہ اسے ایسی کسی بات کا انتظار تھا۔

موٹر سائیکلوں پر دو دو آدمی بیٹھے تھے۔ پچھلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے دونوں آدمی اتر کر تیزی سے کار کے قریب آئے۔

''کدھر جا رہی ہو میم صاحب!'' ان میں سے ایک نے کھڑکی پر جھک کر اس سے پوچھا۔ ''کیا اس شہر میں نئی ہو؟ کوئی پرانا شہری تو اِدھر سے گزرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔''

''کیونکہ یہ نو گو ایریا ہے۔'' شیریں خفیف سا مسکرائی۔

ان دونوں آدمیوں نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''میں تاجو سے ملنے آئی ہوں۔'' شیریں سنجیدہ ہو گئی۔

اب ان دونوں آدمیوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں جلد از جلد تاجو سے ملنا چاہتی ہوں۔'' شیریں نے کہا۔

''کیوں ملنا چاہتی ہو؟'' ایک نے پوچھا۔

''تم اپنے چیف کو اطلاع دو کہ شیریں آئی ہے۔''

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف الجھی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''باس کو اطلاع دو۔'' ایک دھیمی آواز میں بولا۔

دوسرے نے اپنی جیب سے موبائل نکالا۔ رابطہ قائم کرنے کے بعد اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ ''باس!...... ایک نئی کار ہمارے علاقے میں داخل ہوئی تھی۔ اطلاع ملتے ہی ہم نے اسے روک لیا۔ ڈرائیونگ کرنے والی نے کہا ہے کہ اسے آپ سے ملنا ہے۔ اپنا نام شیریں بتایا ہے۔''

دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد اس نے ''جی'' کہا اور پھر موبائل فون شیریں کی طرف بڑھا دیا۔

شیریں نے موبائل کان سے لگا کر کہا۔ ''ہیلو!''

دوسری طرف ایک طویل سانس لی گئی، پھر تاجو کی آواز آئی۔ ''یہ کیا حرکت کی ہے تم نے۔ یہاں ہرگز نہیں آنا چاہیے تھا۔ فوراً واپس جاؤ۔''

''میں واپس جا کے مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتی۔''

''کسی مصیبت میں نہیں پڑو گی تم۔''

''تمہیں علم نہیں ہے سب باتوں کا۔''

''مجھے سب معلوم ہے اور میں اس کا بندوبست بھی کر چکا ہوں۔''

''بعض باتیں تمہیں معلوم نہیں ہوں گی۔ دوسرے یہ کہ......'' شیریں نے جھوٹ بولا۔ ''میں ڈیڈی کے نام پرچہ چھوڑ آئی ہوں کہ اب وہ میرا انتظار نہ کریں۔''

''اوہ گاڈ!...... یہ کیا کر بیٹھی ہو تم۔''

''اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو بھی میں یہاں آنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ میں نے کل رات ہی تم سے کہہ دیا تھا کہ تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے اس لیے اب میں کوئی ایسا قدم اٹھاؤں گی کہ تم بے بس ہو جاؤ گے۔''

''ہوں۔'' طویل سانس لے کر کہا گیا۔ ''لیکن یہ اچھا نہیں کیا تم نے۔''

''ساری باتیں فون پر ہی کرو گے کیا؟''

''اچھا!'' ایک بار پھر طویل سانس لی گئی۔ ''اس آدمی کو اپنی گاڑی میں بٹھا لو جس نے تمہیں موبائل فون دیا ہے۔ یہ تمہیں لے آئے گا میرے پاس۔ موبائل اُسے واپس دو۔ میں اسے ہدایت کر دوں۔''

شیریں نے موبائل اس شخص کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''لو بات کرو۔''

اس نے موبائل اپنے کان سے لگا کر ''ہیلو'' کہا، پھر دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد موبائل بند کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے بولا۔ ''باس کا حکم ہے کہ انہیں پورے احترام کے ساتھ ان تک پہنچا دیا جائے۔ تم اب جاؤ۔ میں ان کے ساتھ گاڑی میں جاؤں گا۔''

دوسرے آدمی نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اپنا شانہ اچکایا اور کار کے آگے کھڑی ہوئی موٹر سائیکلوں کی طرف چلا گیا۔

موبائل فون والے نے کار کی پچھلی نشست کا دروازہ کھولنا چاہا۔

''آگے ہی آجاؤ۔'' شیریں نے اس سے کہا۔ ''راستہ بتانے میں بھی آسانی ہوگی۔''

''میں آگے، آپ کے برابر میں کیسے بیٹھ سکتا ہوں میڈم! باس نے حکم دیا ہے کہ آپ کو پورے احترام کے ساتھ ان تک پہنچایا جائے۔''

شیریں ہنس پڑی۔ اب وہ بالکل مطمئن نظر آرہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''تم میرے برابر میں بیٹھو گے تو میرا احترام کم نہیں ہوجائے گا۔ چلو آؤ، جلدی کرو، شاباش!''

وہ ہچکچاتا ہوا بونٹ کے آگے سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کے دروازے تک آیا اور دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

شیریں نے انجن اسٹارٹ کیا اور کار کو حرکت میں لاتے ہوئے بولی۔ ''کدھر چلنا ہے؟''

''ابھی تو سیدھی چلیے! آگے ایک چوراہا ہے، وہاں سے بائیں ہاتھ کو مڑنا ہوگا۔''

یہ نو گو ایریا کئی مربع میل کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ شیریں کی کار جہاں رکوائی گئی، وہاں دو منزلہ بنے ہوئے ایک مکان کے قریب کوئی دوسرا مکان نہیں تھا۔

شیریں کو مکان میں لے جانے کے لیے تاجو خود باہر آچکا تھا۔ اس نے اس آدمی کو جانے کا اشارہ کیا جو شیریں کو لے کر آیا تھا۔ وہ آدمی جب واپس جارہا تھا تو اس کے چہرے سے الجھن ظاہر ہورہی تھی۔ وہ یہی سوچ رہا ہوگا کہ اس خوب صورت لڑکی سے اس کے باس کا کیا تعلق ہوسکتا ہے۔

مکان کے اندر آنے کے بعد تاجو نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''یہ تم نے کیا حرکت کی ہے پاگل؟''

''مجھے تاجو سے مل کر ایک مطالبے کی ضرورت پیش آگئی تھی۔'' شیریں نے سنجیدگی سے کہا۔

''تاجو سے مطالبہ؟'' وہ مسکرایا۔ ''کیا مطالبہ ہے؟''

''میرے تاج ور کو یرغمال بنالیا ہے تم نے! میں اس کی رہائی چاہتی ہوں۔ تاوان میں جو کچھ بھی مانگو گے، وہ مل جائے گا۔''

''تاج ور کسی مناسب وقت پر ہی تمہیں مل سکتا ہے۔ یہ میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں۔ ابھی تم سنجیدگی سے یہ بتاؤ کہ تمہیں آج ہی گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرنے کی ایسی کیا مجبوری پیش آگئی؟''

''رات میں نے دوبارہ بھی فون کیا تھا لیکن تمہارا موبائل بند ملا۔'' شیریں نے جواب دیا۔ ''نشانِ انگشت کے بارے میں تو تم نے مجھے مطمئن کردیا تھا لیکن اس کے بعد مجھے ایک پریشان کن خیال یہ آیا کہ پولیس اسٹیشن سے جو فون آیا تھا، ممکن ہے کہ میری وہ گفتگو بھی ریکارڈ کی گئی ہو۔ ایسی صورت میں وہ گفتگو اور جنید کے موبائل کی گفتگو کا موازنہ کیا جاتا تو کس نتیجے پر پہنچا جاتا؟''

''اسی نتیجے پر کہ دونوں آوازیں کسی ایک ہی لڑکی کی ہیں۔'' تاجو نے کہا۔ ''تم نے مجھ سے اس بارے میں بات نہیں کی تھی لیکن میں نے تو اس بارے میں فوراً سوچ لیا تھا۔''

''اس کے باوجود تم نے سمجھ لیا تھا کہ میرے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں؟''

''ہاں۔'' تاجو نے کہا۔ ''پولیس اپنے طور پر یہ سمجھ تو سکتی ہے کہ وہ آوازیں تمہاری ہی ہیں لیکن اس بنیاد پر تمہیں پریشان نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پولیس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس بارے میں ایکسپرٹ سے رپورٹ لے۔ رپورٹ پازیٹو ہونے کی صورت میں پولیس تمہارے خلاف ایکشن لے سکتی ہے لیکن رپورٹ پازیٹو آئے گی ہی نہیں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''رات کو تمہارا فون آنے کے بعد میں سو نہیں گیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ رپورٹ کس تھانے میں درج کرائی گئی ہے۔ میرے خیال میں امکان یہی تھا کہ رپورٹ اسی علاقے کے تھانے میں درج کرائی گئی ہوگی، اسی لیے وہیں کی پولیس راجن کے مکان تک پہنچ سکی ہوگی۔ میں نے جو سوچا تھا، وہی ہوا بھی۔ یعنی مجھے معلوم ہوگیا کہ رپورٹ اسی تھانے میں درج کرائی گئی ہے۔ میں نے یہ بھی معلوم کرلیا کہ ایس ایچ او نے اس کیس کی تفتیش سب انسپکٹر اکرم کو سونپی ہے۔''

''کیا کیا معلوم کرلیتے ہو تم؟'' شیریں حیرت سے بولی۔ ''یہ تو ایسا ہے جیسے تم کسی خفیہ ایجنسی کے سربراہ ہو۔''

تاجو مسکرایا۔ ''ایسا جال میں نے ہی پھیلایا ہے کہ ہر بات سے باخبر ہوسکوں۔ ایس ایچ او نے سب انسپکٹر اکرم کو یہ ہدایت بھی کردی تھی کہ سب سے پہلے تو وہ ان دونوں موبائل کی ریکارڈنگ کے بارے میں ایکسپرٹ کی رپورٹ

حاصل کرے چنانچہ آج دو تین گھنٹے بعد اسے پورٹ مل جائے گی۔"

"اور وہ پازیٹو نہیں ہوگی۔ ابھی تم نے یہی کہا ہے نا؟"

"ہاں، اسی کا تو بندوبست کیا ہے میں نے۔ اگر اس بے وقوف شخص نے پازیٹو رپورٹ بھیجی تو اس سے کہا جا چکا ہے کہ آج ہی اس کی لاش پر اس کے گھر والے ماتم کر رہے ہوں گے۔"

"اوہ۔" شیریں نے سکون کی سانس لی اور ایسا معلوم ہوا جیسے وہ نڈھال ہوگئی ہو۔

"تم لیٹ جاؤ۔" تاجو نے بستر کی طرف اشارہ کیا۔ "میرا خیال ہے کہ تم رات کو سو نہیں سکی ہو۔ میں تو سب بندوبست کرنے کے بعد سو گیا تھا۔ ابھی اس وقت جاگا ہوں جب اس علاقے میں تمہاری آمد کی اطلاع دی گئی تھی۔"

باتیں کرتے ہوئے تاجو شیریں کو اپنی خواب گاہ تک لے آیا تھا۔

"میری حالت واقعی بہت غیر ہو چکی ہے۔" شیریں نے بستر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "تو آوازوں کی شناخت کے ایکسپرٹ کو تم دھمکی دلوا چکے ہو؟"

"یہ محض دھمکی نہیں ہے۔ اگر اس نے حماقت کی تو مارا جائے گا۔"

"بہت سفاک ہوگئے ہو تم تاج ور۔"

"میں اب ایسی ہی دنیا کا باسی ہوں کہ اگر ایسا نہ بنوں تو میری گرفتاری یا موت مجھ سے بہت قریب ہو جائے۔"

"لیکن میری خاطر تمہیں اس دنیا سے نکلنا ہے۔"

"پھر وہی باتیں جن کا جواب میں تمہیں دے چکا ہوں۔"

"لیکن اب میں یہاں آگئی ہوں۔ تمہیں جلد کچھ کرنا ہوگا۔"

"ابھی تو تم سو جاؤ۔ رات بھر کے رت جگے نے تمہیں بہت تھکا دیا ہوگا۔"

"تم کہاں سوؤ گے؟ تم بھی تو پوری نیند نہیں لے سکے ہو۔"

"میں اب اس کا عادی ہو چکا ہوں۔ اکثر پوری نیند نہیں لے پاتا۔ اس وقت بھی مجھے ایک کام ہے۔ جا رہا ہوں ایک گھنٹے کے لیے۔"

"مجھے بہت باتیں کرنی ہیں تم سے۔"

"تم پوری نیند لے لو۔ باتیں بھی ہو جائیں گی۔ مجھے آنا تو ایک ہی گھنٹے میں ہے لیکن شاید دیر ہو جائے۔ اس سے کوئی فرق بہرحال نہیں پڑے گا۔ پروین تمہارا خیال رکھے گی۔ میں اس سے کہہ جاتا ہوں۔"

پروین کا نام تاجو کی زبان پر آتے ہی شیریں چونکی تھی، تاجو کے خاموش ہونے پر بولی۔ "یہ نام شاید میں نے ڈیڈی سے سنا تھا۔"

"سنا ہوگا۔ میں تم سے ملنے آیا تھا تو پولیس کی وجہ سے فرار ہو کر وہیں گیا تھا۔ اس کے شوہر نے مخبری کی تھی اس لیے میں نے اسے ختم کر دیا۔ پروین کو اپنے ساتھ نہ لے آتا تو وہ مشکل میں پڑ جاتی۔ پہلے میں نے اس کے رہنے کا بندوبست کہیں اور کیا تھا لیکن پھر یہیں رکھ لیا۔ وہ میرے کھانے پینے کا اور گھر کی صفائی وغیرہ کا خیال رکھتی ہے۔"

"اب میں خیال رکھوں گی اپنے گھر کا۔" شیریں مسکرائی۔

"اپنے گھر کا" کے الفاظ پر تاجو مسکرایا اور پھر گھڑی پر نظر ڈال کر بولا۔ "مجھے اب جانا چاہیے ورنہ دیر ہو جائے گی۔"

وہ چلا گیا تو شیریں نے سونے کے ارادے سے فوراً آنکھیں بند نہیں کیں۔ وہ پروین کے بارے میں سوچنے لگی تھی کہ وہ کیسی ہوگی۔ تاجو اور پروین کی نسبت سے کوئی منفی خیال اس کے دماغ میں نہیں آیا تھا۔

دو ڈھائی منٹ بعد اس نے اپنا موبائل نکالا اور اپنے والد کے نمبر ڈائل کیے۔ اسے توقع تھی کہ شیخ جواد ابھی سو ہی رہا ہوگا۔ اس کا خیال درست بھی ثابت ہوا۔ کئی گھنٹیوں کے بعد شیخ جواد کی آواز سنائی دی جو شاید نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے کچھ بھرائی ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے؟ کیوں جگا دیا؟ تمہیں معلوم ہے کہ میں آٹھ بجے سے پہلے نہیں اٹھتا۔"

"میں رات بھر جاگی ہوں ڈیڈی! اب سونے جا رہی ہوں۔ سوچا سونے سے پہلے آپ کو ایک اطلاع دے دوں۔"

"کوئی اطلاع ایسی ہے کہ تم میرے اٹھنے کا انتظار نہیں کر سکتی تھیں؟" شیخ جواد کا لہجہ بہت خشک تھا۔

"میں نے بتایا نا ڈیڈی کہ رات بھر جاگنے کے بعد اب سونا چاہتی ہوں اس لیے آپ کو یہ اطلاع دینی ضروری تھی کہ جب آپ جاگیں گے تو مجھے گھر پر نہیں پائیں گے۔"

"کیا مطلب؟ اتنی صبح کہاں جانا پڑ گیا؟"

''مجھے آپ نے مجبور کر دیا تھا ڈیڈی! میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ چکی ہوں۔''
''کیا؟'' شیخ جواد جیسے چیخ پڑا تھا۔
''میں نے کہا نا کہ آپ نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ میں تاج ور کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی چنانچہ...... آپ میرا مطلب سمجھ ہی گئے ہوں گے۔''
پھر شیریں نے جواب کا انتظار کیے بغیر رابطہ منقطع کیا اور جلدی سے موبائل کھول کر اس میں سے دونوں ''سم'' نکال لیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ شیخ جواد کی کال ریسیو کرے۔ وہ یقیناً اس سے دوبارہ بات کرنا چاہ سکتا تھا۔
اس کے علاوہ شیریں اب اپنے وہ نمبر استعمال بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تاجو اس کے لیے دوسری ''سم'' کا بندوبست کر ہی دیتا۔

☆☆☆

دو بجے تھے جب شیریں کی آنکھ کھلی۔ وہ بہت سکون کی نیند سوئی تھی۔ وہ انگڑائی لے کر اٹھی تو اس نے دیکھا کہ اپنا جو اٹیچی کیس اس نے اپنی کار ہی میں چھوڑ دیا تھا، وہ اب وہیں موجود تھا۔ اسے خیال آیا کہ وہ گروپ کا کوئی آدمی تو یہاں نہیں لایا ہوگا کیونکہ یہاں وہ سو رہی تھی۔ اٹیچی کیس لانے والا خود تاجو ہی ہو سکتا تھا، اور ہاں، پروین بھی تو تھی اس گھر میں۔
شیریں نے اٹھ کر اٹیچی کیس کھولا۔ اس میں سے اپنے لیے ایک سادہ لباس منتخب کیا اور وہ ہاتھ میں لیے باتھ روم میں چلی گئی۔
باتھ روم سادہ ضرور تھا لیکن وہاں ہر آسائش موجود تھی۔ شیریں پوری طرح تیار ہو کر باتھ روم سے نکلی تو پہلا قدم باہر رکھتے ہی چونک گئی۔ اس نے جس لڑکی کو وہاں دیکھا، وہ اس کے خیال کے مطابق پروین ہی ہو سکتی تھی۔ تاج ور سے اس نے سن بھی لیا تھا کہ وہ اسی گھر میں تھی۔ عمر کے اعتبار سے وہ لڑکی ہی نظر آتی تھی لیکن چہرے سے پختگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ نقش و نگار اچھے تھے۔ جسمانی طور پر متناسب بھی تھی۔
''آپ ناشتا کرنا پسند کریں گی یا کھانا کھائیں گی؟''
شیریں نے ٹرالی کی طرف دیکھا جو بستر کے قریب تھی۔
''ٹرالی تو شاید کھانے ہی کی ہے۔'' وہ بولی۔
''ناشتے کا سامان بھی ہے۔''
''تم پروین ہو نا؟''
''جی۔'' وہ بولی۔ ''میں آپ کے اٹھنے کی منتظر تھی۔ باس کہہ گئے تھے کہ آپ کا خیال رکھوں۔ میں تھوڑی دیر بعد آ کر کمرے میں جھانک لیا کرتی تھی۔''
''ہوں۔'' شیریں بستر کی طرف بڑھی۔
''آپ کو دیکھنے کا اشتیاق تھا مجھے...... باس سے آپ کا ذکر تو سن چکی تھی۔''
''تاج ور کہاں ہے؟''
''وہ آپ کے سامنے ہی گئے تھے۔ واپس نہیں لوٹے ابھی۔''
''اتنی دیر؟''
''ان کی واپسی کا کچھ طے نہیں ہوتا۔ ممکن ہے ابھی آ جائیں، ممکن ہے رات تک آئیں۔''
''کہاں جانا ہوتا ہے؟''
''یہ تو وہ کسی کو بھی نہیں بتاتے۔''
شیریں بستر پر ٹرالی کے قریب بیٹھ گئی۔
''آؤ، تم بھی کھا لو۔'' وہ بولی۔
''میں کھا چکی ہوں میڈم۔''
''بیٹھ تو جاؤ۔ کھڑی کیوں ہو؟''
پروین اس کرسی پر بیٹھ گئی جو بستر کے قریب ہی تھی۔
''تاج ور سے میں بھی تمہارا ذکر سن چکی ہوں۔''
شیریں نے کھانا شروع کرتے ہوئے کہا۔ ''تم ابھی جوان ہو، آئندہ کے لیے کیا ارادہ ہے؟''
''میں اب شادی نہیں کروں گی۔''
''کیوں؟ کوئی خاص وجہ؟''
''جی۔'' پروین نے نظریں جھکا لیں۔
''وجہ بتانا پسند کرو گی؟''
''گستاخی ہوگی اگر میں آپ کے سوال کا جواب نہ دوں لیکن معذرت کے ساتھ آپ سے درخواست کروں گی کہ وجہ نہ پوچھیے۔''
شیریں نے سر ہلا دیا اور یہ بات آگے نہیں بڑھائی لیکن اس کے دل میں ایک شک کلبلا گیا تھا جس کا اس نے اظہار نہیں کیا۔
''شب و روز یہیں رہتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔
''اگر گروپ کے کسی کام سے نہ جانا پڑے تو یہیں رہتی ہوں۔''
''تم بھی گروپ کے لیے کام کرتی ہو؟'' شیریں کو قدرے تعجب ہوا تھا۔
''میں ہر وہ کام کر سکتی ہوں جو اس گروپ کا کوئی بھی

مرد کر سکتا ہے۔'' پروین خفیف سا مسکرائی۔
''رائفل، ریوالور وغیرہ چلا لیتی ہو؟'' شیریں نے حیرت سے پوچھا۔
''جی۔'' پروین نے جواب دیا۔ ''ڈرائیونگ تو میں بہت ہی تیز کرتی ہوں۔''
شیریں کا تعجب برقرار رہا۔ اس سیدھی سادی نظر آنے والی لڑکی کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایسے خطرناک کام بھی کر لیتی ہوگی۔
''اس گروپ میں کیسے شامل ہوئیں؟'' اس نے پوچھا۔
پروین کے جواب سے پہلے ہی خوفناک دھماکے سنائی دینے لگے۔ شیریں کے ہاتھ کا نوالہ پلیٹ میں گر گیا۔ ''یہ کیا؟'' اس کے منہ سے نکلا۔
''رائفل، کلاشنکوف، گرینیڈ۔'' پروین بالکل پُرسکون تھی۔ ''پولیس نے آپریشن شروع کیا ہے۔ ہمارے ساتھی جواب دے رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں پولیس پسپا ہو جائے گی۔ دو ایک گرفتار ہوں گے جنہیں چند دن میں بے قصور قرار دے کر چھوڑ دیا جائے گا۔''
''اس حالت میں تمہارا سکون مجھے حیرت میں ڈال رہا ہے۔''
''آپ بھی اس کی عادی ہو جائیں گی، اگر یہاں زیادہ دن رہیں۔'' پروین نے جواب دیا۔ ''دس پندرہ دن میں پولیس آپریشن ہوتا ہی رہتا ہے، اور اس وقت کے آپریشن کی تو ہمیں اطلاع بھی تھی۔ باس نے کہیں سے فون کر کے جمال خاں کو بتا دیا تھا کہ پولیس آپریشن کرنے والی ہے۔''
دھماکوں سے فضا بدستور لرز رہی تھی۔
''آپ کھانا کھایئے میڈم!'' پروین نے کہا۔ ''اس آپریشن کے اثرات یہاں تک نہیں پہنچیں گے۔''
''اب اگر بھوک لگی تو بعد میں کھا لوں گی۔'' شیریں نے ٹشو پیپر سے اپنے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''ذہن منتشر ہو گیا ہے۔''
''چائے بنا دوں؟'' پروین کرسی سے اٹھ کر ٹرالی کے قریب آئی۔
''ہاں، چائے پی لوں گی۔'' شیریں کا ذہن بدستور دھماکوں کی طرف تھا۔
پروین چائے بنانے لگی۔
''یہ جمال خاں کون ہے؟'' اس نے پروین سے پوچھا۔
''باس کا نائب ہے۔''
ان دونوں کی گفتگو مزید آگے نہیں چل سکی۔ تاجو کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی کوئی ایسا تاثر نہیں تھا کہ علاقے میں جو کچھ ہو رہا تھا، اس کی کوئی اہمیت تھی۔
پروین نے چائے کی پیالی شیریں کو دی اور ٹرالی لے کر کمرے سے چلی گئی۔ ممکن ہے اسے تاجو نے اشارہ کیا ہو جو شیریں نہیں دیکھ سکی تھی۔
''ان دھماکوں نے تمہیں پریشان کر دیا ہوگا؟'' تاجو اس کے قریب آتے اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''شاید کھانا بھی ٹھیک سے نہ کھایا ہو۔''
''تم جس دنیا میں زندگی گزار رہے ہو، وہ میرے لیے اجنبی تو ہے۔''
''پروین سے تمہیں سب کچھ معلوم تو ہو چکا ہوگا۔''
''ہاں۔''
''لیکن یہ وہ بھی نہیں جانتی کہ اس وقت کا آپریشن تمہاری بازیابی کے سلسلے میں ہے۔''
''کیا مطلب؟'' شیریں چونکی اور چائے کا گھونٹ لیتے لیتے رہ گئی۔
تاجو نے جواب دیا۔ ''تمہارے والد محترم نے رپورٹ درج کرائی ہے کہ میں تمہیں اغوا کر کے اپنے علاقے میں لے گیا ہوں۔ انہوں نے اس سلسلے میں آئی جی سے بھی رابطہ کیا تھا۔ آئی جی کے احکام یہاں کے ایس پی تک پہنچے اور......'' تاجو ہنسا۔ ''آپریشن شروع ہو گیا۔''
''تمہیں کیسے معلوم کہ یہ میرے والد کی رپورٹ کے سبب ہوا ہے؟''
''مجھے سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ ہر وہ بات جس کا کوئی تعلق مجھ سے ہو۔ میں نے ایسا ہی جال پھیلایا ہے۔'' تاجو نے جواب دیا۔ ''جلد ہی اس کی تصدیق بھی ہو جائے گی کہ میں نے تمہیں اغوا نہیں کیا بلکہ تم خود یہاں آئی ہو۔ علاقے کے باہر کی دو پولیس چوکیوں نے تمہاری کار اس طرف آتے دیکھی بھی اور اس کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ جب ان کی یہ رپورٹ ایس پی کے ذریعے آئی جی تک پہنچے گی تو وہ تمہارے والد کو بتا دے گا کہ تم خود یہاں آئی ہو۔''
''مجھ پر شدید غصہ آ رہا ہوگا انہیں۔'' شیریں سوچتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو خیر انہیں معلوم ہی تھا کہ میں نے خود گھر چھوڑا ہے۔ انہوں نے تم پر الزام اس لیے لگایا ہوگا کہ پولیس

یہاں کارروائی کرے۔ یہ بات اخبارات میں بھی آجائے گی کہ میں یہاں خود آئی ہوں۔ اس سے وہ اور چراغ پا ہوں گے۔''

''کیا اس سے تمہیں دکھ ہوگا؟''

''وہ بہرحال میرے باپ ہیں۔ افسوس تو مجھے ہونا ہی چاہیے کہ اب وہ اپنے احباب و دوست وغیرہ سے نظر کیسے ملائیں گے لیکن ایسے حالات خود انہوں نے پیدا کیے۔ اگر وہ میری شادی کے معاملے میں عجلت سے کام نہ لیتے تو میں ابھی یہ قدم نہیں اٹھاتی اور اس وقت کا انتظار کرتی کہ جب میرا تاج ور تم مجھے کب لوٹاتے۔''

''اس سے پہلے کیا تم ایک خوش خبری سننا پسند نہیں کرو گی؟'' تاجو مسکرایا۔

''خوش خبری؟''

''ہاں۔'' تاجو نے کہا۔ ''جنید نے اپنا موبائل ایس ایچ او کو دے کر اپنے گلے میں پھندا خود ہی ڈالا ہے۔ سب انسپکٹر اکرم کو آج ساڑھے دس بجے رپورٹ مل گئی تھی کہ دونوں آوازیں مختلف لڑکیوں کی ہیں۔ جنید کے موبائل میں جس لڑکی کی آواز ہے، اس نے تمہاری آواز کی نقل کی ہے اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہی ہے لیکن سو فیصد نہیں۔''

''یعنی جنید پولیس کی نظر میں جھوٹا بن گیا ہے؟'' شیریں تیزی سے بولی۔

''نہ صرف جھوٹا بن گیا ہے بلکہ پولیس نے یہ بھی جان لیا ہے کہ اسی نے تمہیں اغوا کروایا تھا۔''

''وہ کیسے؟''

''جب رپورٹ کی وجہ سے جنید جھوٹا ثابت ہوا تو پولیس نے سیلولر کمپنی سے اس کے موبائل کا ریکارڈ حاصل کر لیا۔ وہ موبائل پر راجن سے جو باتیں کرتا رہا تھا، وہ پولیس کے علم میں آگئیں۔ مجھے ملنے والی آخری اطلاع ایک گھنٹے پہلے کی ہے۔ جنید کو پولیس اسٹیشن بلایا گیا ہے۔ وہاں اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جا چکا ہے یا کیا سلوک کیا جائے گا، اس کی اطلاع بھی مجھے جلد ہی مل جائے گی۔''

''یہ بہت اچھا ہوا کہ اس کی گردن پھنس گئی۔''

''ایک اطلاع اور سن لو۔'' تاجو نے کہا۔ ''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس مکان سے ہماری انگلیوں کے نشانات صاف کر دیے گئے ہیں لیکن تھوڑی سی گڑبڑ ہو گئی۔ دو جگہ تمہاری اور ایک جگہ میری انگلیوں کے نشانات پولیس کو مل ہی گئے۔''

''تو پھر؟'' شیریں بولی۔ ''یہ کوئی تشویش کی بات تو نہیں۔ پولیس نے سمجھ لیا ہوگا کہ تم نے ہی جنید کو مارا پیٹا، راجن کو قتل کیا اور مجھے وہاں سے نکلوا دیا۔ تم سے میرا تعلق تو اب راز رہا ہی نہیں۔ یہ بات اخبارات تک میں آجائے گی اور شاید ٹی وی چینلز پر بھی کہ میں خود تمہارے پاس گئی ہوں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ سب معاملہ پولیس کی نظر میں صاف ہو چکا ہے اور ہاں! اس مکان سے پولیس کو ایک جرائم پیشہ شخص جبران کی انگلیوں کے نشانات بھی ملے ہیں۔ وہ ایک بار کا سزا یافتہ ہے۔ پولیس نے سمجھ لیا ہے کہ راجن اور جبران نے مل کر ہی تمہیں اغوا کیا تھا پھر تمہیں اس مکان میں پہنچانے کے بعد جبران وہاں سے چلا گیا اور راجن میرے ہاتھوں مارا گیا۔ پولیس یقیناً جبران کو گرفتار کرے گی۔ اس کا بیان جنید کی گردن پر لگنے والے پھندے کو اور کس دے گا۔''

''یہ بہت اچھا ہوگا اس ذلیل شخص کے ساتھ۔ میں نے اس سے درخواست تک کی تھی کہ وہ مجھ سے شادی سے انکار کر دے لیکن اس ذلیل نے مجھے بے آبرو کرنے کے لیے اغوا ہی کروا ڈالا...... یہ دھماکے؟...... یہ کب ختم ہوں گے۔ میرے دل کی دھڑکنیں مسلسل بڑھی ہوئی ہیں۔''

''یہ سلسلہ ابھی کچھ دیر اور باقی رہے گا۔''

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور پروین کی آواز بھی آئی۔ ''باس!''

''آجاؤ پروین!'' تاجو نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

پروین جاتے وقت دروازہ بھیڑ گئی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آئی۔

''میں یہ اطلاع دینے آئی ہوں باس کہ میڈم کا بیڈروم مکمل کر دیا گیا ہے۔''

''گڈ!...... چلو دکھاؤ۔'' تاجو کھڑا ہو۔ ''تم بھی آؤ۔'' اس نے شیریں سے کہا۔ ''تم بھی دیکھ لو اپنا بیڈروم۔''

اس وقت شیریں کی زبان پر ایک سوال آتے آتے رہ گیا۔ پروین کے سامنے تاجو سے وہ سوال کرنا اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔

شیریں جب ان دونوں کے ساتھ اس کمرے میں پہنچی تو دنگ رہ گئی۔ اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ اس بستی کے اس معمولی گھر میں اتنا پُرآسائش اور سجا ہوا بیڈروم ہو سکتا ہے۔

''یہ...... یہ کیسے...... ہو گیا؟'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

پروین جلدی سے بولی۔ ''کیا کوئی کمی رہ گئی؟''

''نہیں، میں حیران ہوں کہ اتنا آراستہ پیراستہ بیڈ روم؟''

تاجو مسکرایا۔ ''تمہارے شایانِ شان تو ہونا چاہیے تھا۔'' پھر اس نے پروین کو جانے کا اشارہ کیا، اور شیریں سے بولا۔ ''میرا کمرا تو بس کام چلانے کے لیے ہے۔ ایسی کوئی خواہش ہی نہیں کہ پُرتعیش زندگی گزاروں۔''

''تو اب یہیں بیٹھ کر باتیں کریں۔'' شیریں نے کہا۔

''ہاں بیٹھو۔''

دفعتاً شیریں چونکی۔ ''اوہ! باتوں میں اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ دھماکے رک چکے ہیں۔''

''میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ کچھ دیر کی بات ہے۔''

''ہاں!'' شیریں بولی۔ ''سب باتیں ہوچکیں۔ اب میرے بنیادی سوال کا جواب دو۔''

''یعنی میں تمہارا تاج ور کب تمہیں واپس کروں گا۔''

''ہاں۔''

''اور اس کے لیے تم تاوان دینے کے لیے بھی تیار ہو؟''

''ہاں۔''

''تم سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی ہو شیریں...... تاوان دینا بہت مشکل ہوگا تمہارے لیے۔ کیا تم میرے ساتھ ایسی زندگی گزار سکو گی جس میں تمہیں یہ سب تعیشات تو کیا، کسی بھی قسم کا تعیش حاصل نہیں ہوگا۔''

''تمہارا ساتھ ہوگا تو میں ہر قسم کی زندگی گزار لوں گی لیکن مجھے بتاؤ تو سہی کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگا؟''

''سچی بات تو یہ ہے شیریں کہ اس گروپ میں آنے کے بعد میں نے سمجھ لیا تھا کہ میں جب لوگوں پر گولیاں برسا رہا ہوں تو کبھی نہ کبھی کوئی گولی میرے سینے میں بھی نہ جانے کتنے سوراخ کر ڈالے لیکن تمہاری باتوں کی وجہ سے مجھے سوچنا پڑا کہ میں زندہ کیسے رہ سکتا ہوں، تمہارے ساتھ زندگی کیسے گزار سکتا ہوں۔ تم یہ بھی یقین کر لو کہ اپنا انتقام مکمل کر لینے کے بعد میں خود ہی اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دینا چاہتا تھا۔''

''تمہارا انتقام تو اب پورا ہو چکا ہوگا۔''

''نہیں۔'' تاجو نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ابھی ایس پی نادر زندہ ہے۔ پولیس والوں کی ہلاکتوں سے خوف زدہ ہو کر وہ طویل رخصت پر بیرونِ ملک چلا گیا ہے۔ اب میری اطلاع کے مطابق وہ دو ایک دن میں واپس آنے والا ہے۔ اسے ختم کر کے ہی میرا انتقام مکمل ہوگا۔ اس کے بعد تمہاری خاطر میں نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ ہم دونوں اس ملک سے کہیں دور چلے جائیں گے۔''

''مگر کیسے؟''

''قانونی طور پر تو یہ ممکن نہیں۔ ہم اسمگل ہی ہو سکتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''اسلحے وغیرہ کے سلسلے میں کچھ اسمگلروں سے رابطہ قائم ہوا تھا اس گروپ کا۔ اب میں نے اسلحہ لینا تو چھوڑ دیا ہے لیکن ان لوگوں سے جان پہچان تو بہرحال باقی ہے۔ انہی میں سے ایک سے میں نے بات کی تھی کہ دو افراد کو اس ملک سے باہر لے جانا ہے۔ اس نے میرا رابطہ انسانوں کو اسمگل کرنے والے ایک گروہ سے کرا دیا تھا۔ کل جو میری واپسی میں تاخیر ہوئی تو اس کا سبب یہی تھا کہ مجھے کل ان کے سرغنہ سے تمام معاملات طے کرنے پڑے تھے۔ وہ اس وقت موجود نہیں تھا۔ مجھے اس کا انتظار کرنا پڑا۔ اس کی لانچیں لوگوں کو مختلف ملکوں میں پہنچاتی ہیں۔ ملکوں ہی کے حساب سے فی شخص معاوضہ طے کیا جاتا ہے۔ میں نے اس سے سب کچھ طے کر لیا ہے۔ نصف رقم ایڈوانس میں بھی دے دی ہے کیونکہ میں اسے فوراً نہیں بتا سکتا تھا کہ ان دو افراد کو کب اسمگل کرنا ہے، اس لیے مجھے اس نے اپنا شیڈول دے دیا ہے۔ یعنی اس کی لانچ کس ملک کے لیے کب روانہ ہوتی ہے۔''

''تو ہم کہاں جائیں گے؟''

''کسی بڑے ملک میں جا کر تو ہماری روپوشی مشکل ہو سکتی ہے اس لیے میں نے ایک چھوٹے سے ملک پرتگال جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں اس بارے میں بھی سوچ رہا ہوں کہ ہم پرتگال کے کسی بڑے شہر کے بجائے کسی چھوٹے سے جزیرے پر اتر جائیں۔ وہاں ہماری روپوشی آسان ہوگی۔ بس یہ ہے کہ مجھے وہاں محنت مزدوری کرنی پڑے گی۔ وہ پیسا تو میں یہاں سے لے کر نہیں جاؤں گا جو غیر قانونی طریقوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ کیا تم وہاں ایک مزدور کے ساتھ زندگی گزار سکو گی؟ یہ سب کچھ میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم اپنا تاج ور حاصل کرنے کے لیے یہ تاوان دے سکو گی؟''

''میں اپنے تاج ور کے لیے سب کچھ کر سکتی ہوں۔'' شیریں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''تمہارے ساتھ میں بھی

مزدوری کرلوں گی۔''

''اچھا اب اس معاملے کے دو پہلو اور بھی ہیں۔ وہ بھی جان لو۔ یہ اسمگلر تو یقین دلاتے ہیں کہ وہ کسی خطرے سے دو چار ہوئے بغیر اپنی منزل تک پہنچ جاتے ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسی لانچیں بعض اوقات راہ میں پڑنے والے کسی ملک کی بحری پولیس کی نظر میں بھی آجاتی ہیں۔ وہ لانچ کو اپنے نرغے میں لے لیتے ہیں۔ اسمگلر مدافعت کرتے ہیں تو فائرنگ میں مارے جاتے ہیں۔ اسمگل ہونے والے لوگوں سے ان کے ملک کا نام معلوم کرکے اس ملک سے رابطہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے لوگوں کو واپس لے لے اور ان کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہے، وہ کرے۔ ہم اگر واپس آتے ہیں تو تمہارے ساتھ تو حکومت کا رویہ کچھ اور ہوگا لیکن میں یقیناً پھانسی کے پھندے تک پہنچ جاؤں گا۔''

''اگر ہم اپنے ملک کا نام ہی نہ بتائیں؟''

''تو ہمیں اس ملک کی جیل میں رہنا پڑے گا، غالباً۔''

''میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔''

''اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ بعض اوقات بحری قزاق بھی لانچ کو اور تمام لوگوں کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں اور پھر ان کے ملک سے ان لوگوں کو چھوڑنے کے لیے تاوان مانگتے ہیں۔''

''نہیں بھی اگر ہم اپنے ملک کا نام نہ بتائیں تو؟''

''وہ ہم پر تشدد بھی کر سکتے ہیں اور ہلاک بھی کر سکتے ہیں۔''

''میں تمہارے ساتھ مرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔''

''اچھی طرح سوچ لو شیریں! میں نے ساری صورتِ احوال تمہارے سامنے رکھ دی ہے۔''

''اور میں بھی کہہ چکی ہوں کہ میں اپنے تاج ور کے لیے ہر قسم کا تاوان دینے کے لیے تیار ہوں۔''

''تو پھر کچھ دن انتظار کرو۔ ایس پی نادر کو ختم کرنے کے بعد میں اس گروپ کی سربراہی جمال خاں کو سونپ دوں گا اور ہم دونوں یہاں سے چلے جائیں گے۔''

''جمال خاں کا نام میں نے پروین سے بھی سنا تھا۔''

''ہاں، وہ گروپ میں میرا نائب ہے۔''

''پروین سے میری خاصی باتیں ہوئی تھیں۔ میں نے اس سے یہ بھی پوچھا تھا کہ وہ دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتی۔ اس نے جواب دیا کہ اب وہ زندگی بھر شادی نہیں کرے گی۔ میں نے سوال کیا کہ اس کی کوئی خاص وجہ ہے تو اس نے اثبات میں جواب دیا لیکن اس وجہ کی وضاحت نہیں کی بس میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی سے محبت کرتی ہے لیکن جس سے وہ محبت کرتی ہے، وہ اس سے شادی نہیں کرے گا۔''

''ٹھیک محسوس کیا ہے تم نے۔ یہی بات ہے۔''

''میں نے یہ اندازہ بھی لگایا ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔''

تاجو نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے نظریں جھکالی تھیں۔

شیریں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ایک جانب دیکھتے ہوئے نہ جانے کس سوچ میں ڈوب گئی۔

تاجو اب وہاں سے اٹھنا چاہتا تھا کہ شیریں یکایک پوچھ بیٹھی۔

''اس بستی کے لوگ کیسی زندگی گزار رہے ہیں؟''

''معمول کے مطابق، جیسے اس ملک کے تمام شہری۔''

جواب دیتے ہوئے تاجو کے چہرے پر استعجاب تھا۔ ''یہ عجب سوال کیا تم نے، شاید میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ بستی کے لوگوں کو ہمارے گروپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ یہاں کی کئی غریب لڑکیوں کی شادیاں بھی کروائی ہیں گروپ نے۔ ان کی ہر پریشانی میں ہم ان کے کام آتے ہیں۔''

''شادیاں بھی ہو جاتی ہیں؟ یعنی نکاح خواں بھی ہیں۔''

''سب کچھ ہے یہاں۔ میں ابھی بتا چکا ہوں کہ سب لوگ معمول کی زندگی گزار رہے ہیں۔ عید، بقر عید، محرم، رمضان، سب کچھ ہوتا ہے یہاں لیکن اچانک تمہیں یہ سب پوچھنے کا خیال کیوں آیا؟ ابھی تم کسی سوچ میں ڈوب گئی تھیں، پھر اچانک یہ سوال کر بیٹھیں۔''

''ہاں تاج ور! میں سوچنے لگی تھی کہ جب ہم یہاں سے فرار ہو رہے ہوں گے تو شاید ہماری لانچ کسی ملک کی بحری پولیس پکڑ لے یا ہمیں قزاق پکڑ لیں۔ ایسی صورت میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارا انجام کیا ہوگا۔''

''یہ سب کچھ میں نے ہی تمہیں بتایا ہے۔ تم سوچ لو کہ اپنے تاج ور کو حاصل کرنے کے لیے یہ تاوان دے سکتی ہو یا نہیں۔ ابھی وقت ہے۔ اچھی طرح سوچ لو۔''

''میں کہہ چکی ہوں کہ میں ہر قسم کا تاوان دینے کے لیے تیار ہوں۔ بس ایک خواہش ہے میری۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو مرتے وقت یہ صدمہ میرے ساتھ نہ جائے کہ تاج ور میرا نہ ہوسکا۔''

''کیسی باتیں کررہی ہو تم؟ تاج ور بھی تمہارا ہے۔''

"میں...... دراصل...... میں چاہتی ہوں۔" شیریں کی نظریں جھک گئیں۔ "میں سہاگن مرنا چاہتی ہوں۔"

"اوہ!" تاجو مسکرا دیا۔ "تم چاہتی ہو کہ ہم شادی کر لیں؟"

شیریں کی نظریں جھکی رہیں۔ اس کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

تین دن بعد تاجو نے اپنے نائب جمال خاں کو بلایا اور اس سے کہا۔ "مجھے ان دنوں دو اطلاعات ملی ہیں۔ ایک اطلاع تو مجھے تم نے ہی دی تھی کہ ایس پی نادر واپس آ گیا ہے۔ تمہیں کچھ ہدایات دی تھیں اور یہ بھی کہا تھا کہ ایس پی نادر کو ختم کرنے کے بعد میں یہ گروپ چھوڑ دوں گا۔ میرے بعد اس کے سربراہ تم ہی ہو گے۔ میں شیریں کے ساتھ یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اصولی طور پر میرا کام ایس پی نادر کی ہلاکت کے بعد ختم ہو جائے گا اور میرا خیال ہے کہ گروپ کے سبھی لوگ اپنا انتقام لے چکے ہیں اور اب اس زندگی میں صرف اس لیے پھنسے ہوئے ہیں کہ دوسرا کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ کوئی اپنی سابقہ زندگی کی طرف واپس لوٹے گا تو قانون کے شکنجے میں جکڑا جائے گا۔ پھانسی یا عمر قید اس کا مقدر ہو گی۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں باس! اب ہماری یہ زندگی، مجبوری بن چکی ہے۔ آپ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ جا رہے ہیں۔ میں آپ سے یہ سوال نہیں کر سکا تھا کہ آپ کیسے واپس جا سکیں گے یا قانون آپ کو معاف کر دے گا؟"

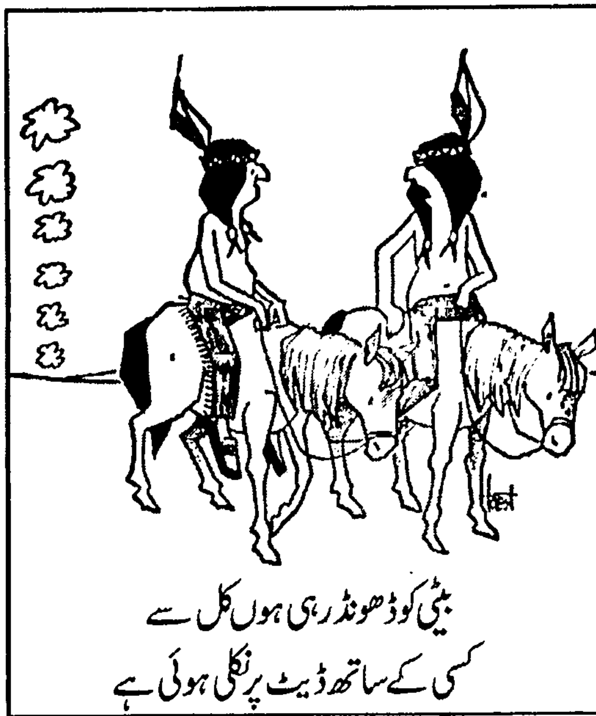
"میں نے یہ ملک چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہے جمال خاں!" تاجو نے جواب دیا اور پھر وضاحت سے بتا دیا کہ اس کا اور شیریں کا کیا پروگرام ہے۔"

سب کچھ سننے کے بعد جمال خاں نے کہا۔ "کیا اسی طرح ہم لوگ ملک سے نہیں نکل سکتے؟"

"یقیناً نکل سکتے ہیں لیکن سارا گروپ ایک ساتھ نہیں جا سکتا۔ ایک لانچ اتنے لوگوں کو نہیں لے جا سکتی۔ میں تمہیں اس اسمگلر سے ملوا دوں گا۔ تم خود اس سے طے کر لینا کہ وہ سارے گروپ کو یہاں سے کتنی قسطوں میں نکال سکتا ہے۔ باقی لوگوں سے بھی پوچھ لینا کہ کیا وہ اس کے لیے تیار ہیں؟"

"میں بات کر لوں گا۔ آپ کسی دوسری اطلاع کی بھی بات کر رہے تھے۔"

"ہاں۔" تاجو نے کہا۔ "یہ اطلاع مجھے آج ہی ملی ہے۔ حکومت کی دو بہت بڑی شخصیتیں کل رات ہی فوج سے



بیٹی کو ڈھونڈ رہی ہوں کل سے
کسی کے ساتھ ڈیٹ پر نکلی ہوئی ہے

رابطہ کر چکی ہیں۔ پولیس کی ناکامی کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمارے گروپ کو ختم کروانے کے لیے فوجی آپریشن کروایا جائے۔"

"اوہ!"

"حکومت کے جو لوگ ہمارے ساتھ ہیں، وہ اب اس میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ مجھ سے کہا ہے کہ اگر فوج آپریشن کے لیے تیار ہو گئی تو وہ ہمارے لیے کچھ نہیں کر سکیں گے۔ فوج کو وہ آپریشن سے روک نہیں سکتے۔ اب اس کے لیے بھی تیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اگر آپریشن میری موجودگی میں ہوا تو میرا فیصلہ ہے کہ ہم مقابلہ نہیں کریں گے۔ اگر آپریشن میرے بعد ہوا تو فیصلے کی ذمّے داری تم پر ہو گی لیکن تمہیں بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ فوج سے مقابلہ نہ کرنا۔ یہ تو ہے کہ ہمارا گروپ فوجیوں کو بھی خاصا نقصان پہنچا سکتا ہے لیکن آخر کار غلبہ تو فوج ہی پائے گی۔ مقابلے کرنے والے گرفتار ہوں گے یا مارے جائیں گے لیکن یہ کوئی مناسب بات نہیں ہو گی۔ یہ ہمارے ملک کی فوج ہے، ہماری محافظ ہے اور پھر ان سے ہماری کوئی دشمنی بھی نہیں ہے۔ ہر چند کہ کچھ کالی بھیڑیں اس میں بھی ہیں لیکن ساری فوج تو بری نہیں ہے۔ ہمارے ملک کا صرف یہی ایک ایسا ادارہ ہے جس کے لیے میرے دل میں احترام ہے لیکن میرے بعد سربراہ کی حیثیت سے تم جو چاہو، فیصلہ کرنا۔ میں نے بس مشورہ دیا ہے۔"

"مناسب مشورہ ہے آپ کا باس! لیکن مجھے یہ سب کچھ باقی ساتھیوں کو بھی بتانا ہو گا۔ شاید وہ اس کے لیے تیار نہ ہوں کہ مقابلہ کیے بغیر خود کو فوج کے حوالے کر دیں۔"

''تم آج ہی سب کا عندیہ لینا شروع کردو۔ فوج اگر آپریشن کے لیے تیار ہوئی تو بھی اس میں ابھی چند دن تو لگیں گے۔ ان دنوں میں جو لوگ اسمگل ہو کر یہاں سے باہر جانا چاہیں، وہ باہر چلے جائیں اور جو مقابلہ کرنے کو ترجیح دیں، وہ یہاں رکیں۔''

''آپ کی طرح میں بھی فوج سے مقابلہ کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ آپ کے بعد میں بھی یہاں سے نکلنے ہی کی کوشش کروں گا اور گروپ کی سربراہی ان میں سے کسی کو سونپ دوں گا جو مقابلہ کرنا چاہیں گے۔''

''اگر میں آپریشن سے پہلے چلا گیا تو یہ فیصلے تمہیں ہی کرنے ہوں گے۔ میں یہاں بس اس وقت تک ہوں جب تک ایس پی نادر کو ختم نہ کردوں۔ اب تم مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ اس کی ریکی کرواؤ۔ مجھے اس کی نقل و حرکت کی مکمل رپورٹ چاہیے۔''

''اگر آپ نہ بلاتے تو میں خود آپ کو بتانے کے لیے آنے والا تھا۔ وہ بہت محتاط ہے۔ اس کی حفاظت کا بہت سخت بندوبست کیا گیا ہے۔ گھر سے دفتر تک اس کے ساتھ محافظوں کی چار گاڑیاں ہوتی ہیں۔ ان تین دن میں وہ مختلف راستوں سے اپنے دفتر گیا ہے اور واپسی میں بھی مختلف راستے استعمال کیے ہیں۔ اگر راہ میں کسی طرح اس پر حملہ کیا بھی جائے تو ہمیں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ صحیح منصوبہ بندی کی جائے تو کامیابی تو ہو جائے گی لیکن ہمارے کافی ساتھی بھی اپنی جان سے جائیں گے۔''

''میں اس معاملے میں اپنے زیادہ ساتھیوں کی قربانی دینا ہرگز پسند نہیں کروں گا؟ مجھے کوئی ایسا منصوبہ بنانا پڑے گا کہ تنہا یہ کام کرسکوں۔ کیا کسی طرح اس کے گھر میں داخل ہوا جاسکتا ہے؟''

''جن دنوں وہ باہر رہا، اس کے بنگلے کی چار دیواری خاصی اونچی کروا دی گئی ہے۔ پھاٹک اور عقبی دروازے پر بھی اس کے محافظوں کی دو گاڑیاں اس وقت ضرور ہوتی ہیں جب وہ گھر میں ہو اور گھر کے اندر حفاظت کا الیکٹرانک نظام لگوایا گیا ہے۔''

تاجو ہنس پڑا۔ ''کتنا بزدل ہے یہ شخص۔''

جمال خاں خاموش رہا۔

''ٹھیک ہے۔'' تاجو نے اس سے کہا۔ ''میں سوچوں گا کہ کیا کیا جاسکتا ہے۔''

جمال خاں سوچ میں ڈوبا ہوا رخصت ہو گیا۔

اس وقت تاجو گھر کے ایک ایسے کمرے میں تھا جسے وہ لائبریری کے طور پر استعمال کیا کرتا تھا۔ ایک الماری میں خاصی کتابیں بھری ہوئی تھیں جن میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہتا تھا۔

جمال خاں کے جانے کے بعد کمپیوٹر کھولا۔ ''گوگل سرچ'' کے ذریعے شہر کا نقشہ نکالا۔ اسے ڈاؤن لوڈ کیا، پھر اس کا ایک بڑا پرنٹ نکال کر اپنے سامنے پھیلا لیا۔ ایس پی نادر کے گھر سے اس کے دفتر تک کے علاقے کے گرد ایک سرخ دائرہ بنایا اور اس پر غور کرنے لگا۔ اس کے خیال کے مطابق چار راستے ایسے تھے جنہیں ایس پی نادر استعمال کر سکتا تھا۔ اگر وہ بہت زیادہ گھوم پھر کر جاتا تو دو راستے اور بھی ممکن تھے۔ تاجو نے ان پر بھی نشان لگایا۔ اس بارے میں مزید معلومات کے لیے وہ دوبارہ جمال خاں کو بلاتا لیکن اسی وقت پیچھے سے شیریں نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ تاجو اپنے کام میں اتنا منہمک تھا کہ اندرونی کمرے سے اس کمرے میں آنے والے دروازے کے کھلنے کی آواز سنائی دی گئی تھی، نہ شیریں کے قدموں کی چاپ!

''کیا ہو رہا ہے سرکار میری؟'' شیریں نے پوچھا۔ ''یہ نقشہ کیسا ہے؟''

''اپنے شہر ہی کا ہے۔''

''اور اس پر بنا ہوا یہ سرخ دائرہ؟''

''اس علاقے میں ایس پی نادر کا گھر اور اس کا دفتر ہے اور یہ نشانات ان راستوں کے ہیں جن سے وہ آتا جاتا ہے۔''

شیریں کے چہرے سے خوش گوار تاثرات یک لخت ختم ہو گئے اور وہ بے حد سنجیدہ نظر آنے لگی۔ اس نے تاجو کے گلے سے بانہیں نکالیں اور اس کے سامنے آکر اسی کرسی پر بیٹھ گئی جہاں سے جمال خاں اٹھ کر گیا تھا۔

''ابھی اس سلسلے میں شاید اسمارٹ موبائل فون سے بھی فائدہ اٹھانا پڑے۔ ضروری ہے کہ ایک ایک سڑک کے بارے میں علم ہو۔''

''گویا فیصلہ کن وقت قریب آچکا ہے۔'' شیریں بہت سنجیدہ تھی۔

''ہاں جانِ من!''

''اس پر راستے ہی میں حملہ کرو گے؟''

''ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ اس کے گھر میں گھس کر بھی اسے مارا جاسکتا ہے۔ اس کے گھر کا نقشہ اس بلڈر سے معلوم کرنا پڑے گا جس نے وہ بنگلا بنوایا ہے۔''

''بتا دے گا وہ؟''

''ریوالور کی نال کنپٹی سے لگی ہو تو انسان سب کچھ اُگل دیتا ہے۔ یہ ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی کچھ فیصلہ کروں گا میں۔''

''بہت احتیاط سے منصوبہ بنانا تاج ور۔'' شیریں کی آواز بھرّا گئی۔ ''اگر میں نے تم سے وعدہ نہ کیا ہوتا کہ میں تمہارے کسی معاملے میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔ تو میں تم سے کہتی کہ معاف کر دو واپس پی نادر کو۔''

''وہ کسی قیمت پر بھی قابلِ معافی نہیں ہے۔''

''اس کے گھر والوں پر کیا گزرے گی؟''

''میرے اندر انسانیت جگانے کی کوشش مت کرو شیریں۔'' اب تاجو بھی بے حد سنجیدہ ہو گیا۔ ''کیا نادر نے سوچا ہو گا کہ جب مجھ پر حوالات میں تشدد کیا جا رہا تھا تو میرے والدین کے دلوں پر کیسی قیامت ٹوٹ رہی ہو گی۔ حادثے میں ان کا انتقال تو بعد میں ہوا تھا اور مجھے اس کی خبر تک نہیں دی گئی تھی۔ میں جب بھی وہ سب کچھ یاد کرتا ہوں یا وہ مجھے یاد آ جاتا ہے تو میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔''

''ہاں۔'' شیریں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''مجھے اندازہ ہے تمہارے کرب کا۔''

''جمال خاں کو میں ابھی پھر بلاؤں گا۔ نقشہ میرے سامنے ہے۔ اب مجھے اس سے کچھ اور معلومات بھی حاصل کرنا ہوں گی یا وہ مطلوبہ معلومات حاصل کر کے مجھے بتائے گا۔ سارے کام جلد از جلد کرنا ہوں گے۔ چار دن بعد ایک لانچ جانے والی ہے۔ اگر وہ مس ہو گئی تو پھر بیس دن انتظار کرنا ہو گا اور یہ انتظار اب ممکن اس لیے نہیں ہے کہ فوج کسی دن بھی ہمارے علاقے پر آپریشن کر سکتی ہے۔''

''فوج؟'' شیریں چونکی۔

''ہاں، ابھی بتاتا ہوں۔ ذرا جمال کو فون کر دوں۔'' تاجو نے اپنے موبائل پر نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ ''اسے ابھی بلاؤں گا۔''

شیریں چپ رہی۔ اس کے چہرے پر تفکرات اور گہرے ہو گئے تھے۔

جمال خاں کو فون کرنے کے بعد تاجو نے اسے فوجی آپریشن کے بارے میں وہ سب کچھ بتانا شروع کیا جو وہ جمال خاں کو بتا چکا تھا۔

اس کے بعد بھی ان دونوں میں اس وقت تک باتوں کا سلسلہ جاری رہا جب تک جمال خاں نہیں آ گیا۔ اس کی آمد پر شیریں اٹھ کر اس کمرے سے چلی گئی۔

☆☆☆

کار چھینی گئی تھی۔ کئی دن کی تلاش کے بعد بلیک برڈ گروپ کے آدمی ایک ایسے شخص کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے جس کی شکل تاجو سے کسی حد تک ملتی جلتی تھی۔ اس کا تعلق بھی خاصے آسودہ گھرانے سے تھا۔ کچھ ہی دن پہلے اس نے لینڈ کروزر خریدی تھی۔ وہ ڈرائیور ملازم رکھ سکتا تھا لیکن اس نے نہیں رکھا تھا۔ ڈرائیونگ اس کا شوق تھی۔ یہی سب باتیں تاجو کے حق میں تھیں چنانچہ گروپ ہی کی ایک لڑکی نے اسے ایک ہی دن میں اپنے جال میں پھنسا لیا تھا۔ دوسری ہی رات اس نے نو بجے فون کر کے اسے کسی جگہ بلایا۔ وہ بڑے اشتیاق سے وہاں پہنچا اور وہیں گروپ کے لوگوں نے اسے اغوا کر لیا۔

''اب آپ روانہ ہو سکتے ہیں سر۔'' تاجو نے اپنے علاقے میں کال ریسیو کی۔ ''ہم اسے اغوا کر کے اپنے علاقے میں لا رہے ہیں۔''

تاجو اس وقت اپنی کار ہی میں بیٹھا ہوا تھا لیکن ڈرائیونگ سیٹ پر پروین تھی۔

''چل دو فوراً۔'' تاجو نے پروین سے کہا، پھر ماؤتھ پیس میں بولا۔ ''اس کی گاڑی مجھے کہاں ملے گی؟''

''وہ سلویا کے گھر کے سامنے ہی کھڑی ہے۔ اشفاق بھی آپ کو وہیں ملے گا۔''

سلویا ہی نے اس شخص کو اپنے جال میں پھنسایا تھا اور اشفاق کا تعلق بھی گروپ ہی سے تھا۔

پروین انجن اسٹارٹ کر کے کار تیزی سے حرکت میں لے آئی۔

''ٹھیک ہے۔'' تاجو نے اپنے موبائل میں کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

''سلویا کا گھر تمہیں معلوم ہی ہے۔'' اس نے پروین سے کہا۔

''جی باس!''

دس منٹ بعد ہی کار تاجو کے مخصوص علاقے کے باہر دو پولیس چوکیوں کے درمیان سے گزری۔

''کار دیکھ تو لی گئی ہو گی۔'' پروین بولی۔ ''کیا پولیس والے اس کی اطلاع ہیڈ کوارٹر کو نہیں دیں گے کہ آپ علاقے سے نکلے ہیں؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں خاصی رشوت پہنچائی جاتی ہے۔''

''لیکن جب شیریں یہاں آئی تھیں تو پولیس ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دی گئی تھی۔''

''وہ تو ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی اجنبی کار اس علاقے میں داخل ہوگی، اس کی اطلاع وہ اپنے ہیڈکوارٹر کو ضرور دیں گے۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔''

''آپ نے مجھے ابھی تک نہیں بتایا کہ سلویا کے گھر کے بعد ہماری منزل کہاں ہوگی؟''

''میں نے تمہیں ایس پی نادر کے گھر کا نقشہ بھی دیا تھا اوران راستوں کے نقشے بھی جو نادر اپنے دفتر سے گھر آنے جانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ آخر مجھے فیصلہ کرنا پڑا کہ اس کے گھر میں داخل ہونا زیادہ خطرناک ہوگا اس لیے بہتر یہی ہے کہ اسے اس کے کسی راستے ہی میں ختم کیا جائے۔ نادر کو کل کا سورج نہیں دیکھنا چاہیے۔''

''نادر اس وقت اپنے گھر سے کیوں نکل رہا ہے؟ یہی اطلاع ملی ہوگی نا؟''

''نہیں۔ وہ ساڑھے دس گیارہ کے درمیان اپنے دفتر سے نکلے گا۔ میں نے ایک ایسا کیس کروادیا تھا کہ نادر کو زیادہ رات تک دفتر میں رکنا پڑے۔''

''تو اس پر راستے ہی میں حملہ کرنا ہے؟''

''اتنی باتوں کے بعد تمہیں اتنا تو سمجھ ہی لینا چاہیے تھا۔''

''جی باس۔'' پروین نے سر ہلایا، پھر بولی۔ ''مجھے خوشی ہے کہ اس مہم میں آپ نے مجھے اپنے ساتھ رکھنا پسند کیا۔''

''میں اس خطرناک اور اپنے ذاتی معاملے میں گروپ کے کسی آدمی کو بھی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا لیکن تمہیں ساتھ لینا میری مجبوری ہے۔ تم ہر قسم کی گاڑی بہت مہارت سے چلاسکتی ہو اور یہ ضروری تھا کہ میرے ساتھ ڈرائیونگ کرنے والا کوئی اور ہو۔ مجھے تو اس دوران میں مسلسل اپنے اسمارٹ موبائل پر نظر رکھنی ہوگی۔ شہر کی تمام سڑکوں کے نقشے گوگل پر ہوتے ہیں لیکن مجھے صرف ان راستوں کے نقشے دیکھنے ہوں گے جو میں نے تمہیں دیے تھے۔ میں نے ان پر نشانات بھی لگائے تھے۔ تم نے وہ نقشے ذہن نشین کر لیے ہیں نا؟''

''انسانی ذہن جس حد تک کرسکتا ہے باس، وہ میں نے کیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم کوئی کمپیوٹر نہیں ہو۔ خود میں نے بھی وہ نقشے ذہن نشین کیے ہیں، اس کے باوجود مجھے اسمارٹ موبائل سے بھی مدد لینی پڑے گی۔ جہاں بھی تمہیں کچھ سمجھنے میں پریشانی ہوگی، میں تمہیں بتادوں گا۔''

انہی باتوں میں ان کی گاڑی سلویا کے گھر کے سامنے جارکی جہاں ایک لینڈ کروزر کے پاس اشفاق کھڑا تھا۔

''انجن اسٹارٹ ہی چھوڑ کر اترو۔'' تاجو نے اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''تم یہ گاڑی لے کر اپنے علاقے میں جاؤ۔'' تاجو نے کار سے اتر کر اشفاق سے کہا۔

''او کے باس۔'' اشفاق نے کہا پھر لینڈ کروزر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''چابی اسی میں لگی ہوئی ہے۔''

اس کے بعد پروین اور تاجو کا سفر لینڈ کروزر میں شروع ہوا۔ تاجو کے اتھ ایک چھوٹا سا بریف کیس اور ایک تھیلے کے علاوہ فور بیرل پستول بھی تھا جس کی لمبائی عام پستولوں سے خاصی زیادہ تھی۔ فی الحال وہ اپنے باکس میں تھا۔

''کیا پوزیشن ہے؟'' تاجو نے موبائل پر اپنے کسی آدمی سے پوچھا۔

''ابھی وہ اپنے دفتر سے نہیں نکلا ہے باس۔''

''جب نکلے تو مجھے فوراً اطلاع دینا۔'' تاجو نے کہہ کر موبائل بند کردیا۔

''اب ہمیں کدھر جانا ہے باس؟'' پروین نے پوچھا۔

''ہماری گاڑی ان چھ راستوں کے درمیان کسی جگہ پہنچنا چاہیے۔'' تاجو نے بریف کیس کھولتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھ گئی۔ اندازہ ہے مجھے۔ وہاں پہنچنے کے بعد ہم اس راستے کا رخ کرسکتے ہیں جہاں سے نادر گزرے گا۔''

''ہاں۔''

اس چھوٹے سے بریف کیس میں میک اَپ کا سامان تھا۔ تاجو نے میک اَپ کرنے کی باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی لیکن اس وقت اسے کچھ زیادہ کام نہیں کرنا تھا۔ صرف فرنچ کٹ داڑھی لگانی تھی۔ اس کام سے وہ جلد ہی فارغ ہوگیا۔ پھر اس نے آنکھوں پر جو عینک لگائی وہ بظاہر نظر کی عینک تھی لیکن اس میں پلین شیشے لگے ہوئے تھے جس شخص کی یہ لینڈ کروزر تھی، وہ نظر کا چشمہ استعمال کرتا تھا۔

لینڈ کروزر کے شیشے تاریک تھے باہر سے صرف ونڈ اسکرین کی طرف سے دیکھا جاسکتا تھا اس لیے تاجو نے سارا کام خاصا آگے جھک کر کیا تھا۔

''تمہیں ساتھ لے کر میں نے ایک رسک یقیناً لیا ہے۔'' تاجو بولا۔ ''کم از کم میں نے کسی عورت کو لینڈ کروزر

ڈرائیو کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ لوگ اسی لیے تمہیں تعجب سے دیکھ رہے ہیں۔''

گاڑی کسی ویران سڑک پر نہیں دوڑ رہی تھی۔

''میں نے بھی محسوس کیا ہے باس۔'' پروین بولی۔

''لیکن یہ مجبوری تھی۔ اس شخص کے پاس یہ لینڈ کروزر ہی تھی جسے اغوا کیا گیا ہے۔''

''پچھلے چوراہے پر کھڑے ہوئے ایک سپاہی نے بھی مجھے حیرت سے دیکھا تھا۔''

''لینڈ کروزر کے باعث کوئی دشواری پیش آسکتی ہے۔ ہمیں ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

''میں بیک مرر پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔''

''یہ تو مجھے معلوم ہے، تم اتنی ہوشیار تو ہو۔ ہمیں اپنے اردگرد کے ماحول سے پوری طرح باخبر تو رہنا ہوگا۔''

''ایک سارجنٹ کی موٹر سائیکل ہمارے پیچھے آرہی ہے باس۔'' پروین کے لہجے میں تشویش تھی۔

''اوہ!'' تاجو نے تیزی سے سوچا، پھر بولا۔ ''اب بائیں جانب جو موڑ آ گیا ہے، اسی طرف مڑ جاؤ۔ وہاں برائے نام ٹریفک ہوگا۔''

''کرنا کیا ہے باس؟'' پروین نے لینڈ کروزر کو بائیں جانب موڑتے ہوئے کہا۔

''اگر وہ رکنے کا اشارہ کرے تو روک دینا۔''

اسی وقت سیٹی کی آواز سنائی دی۔

''وہ ہمیں روکنا چاہتا ہے۔'' تاجو نے سنجیدگی سے کہا۔ ''رفتار کم کرتی چلی جاؤ۔ گاڑی روکنا ہی بہتر ہے۔''

''جب وہ قریب آئے گا تو کیا اسے ختم کریں گے؟''

پروین نے رفتار تیزی سے کم کرنا شروع کی تھی اس لیے اسی وقت موٹر سائیکل آگے آگئی اور سارجنٹ نے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ بھی کیا۔

''روک دو گاڑی۔'' تاجو نے کہا۔

پروین نے گاڑی ایک کنارے کر کے روک دی۔ موٹر سائیکل بھی اس کے آگے رکی۔ سارجنٹ اسے سائڈ اسٹینڈ پر کھڑی کر کے لینڈ کروزر کی طرف آیا۔ تاجو نے شیشہ کھول دیا۔

''اتنی تیز رفتاری سے چلائی جا رہی ہے گاڑی۔'' وہ درشت لہجے میں بولا۔ ''اور ڈرائیونگ بھی ایک خاتون کر رہی ہیں۔''

''ارے میری محبوبہ کو بڑی مہارت ہے ڈرائیونگ میں۔'' تاجو ایسے لکنت آمیز لہجے میں بولا۔ جیسے شراب پیے ہوئے ہو۔ ''جانے دو آفیسر! کیوں رنگ میں بھنگ ڈال رہے ہو۔''

اس وقت پروین نے بھی حاضر دماغی کا ثبوت دیتے ہوئے اس طرح مسکرا کر سارجنٹ کی طرف دیکھا جیسے ذرا بھی پریشان نہ ہو۔

''کاغذات دکھایئے گاڑی کے۔'' سارجنٹ کا لہجہ بہ دستور درشت رہا۔

''وہ آپ ضرور دیکھیں، میرا ڈرائیونگ لائسنس بھی دیکھیں۔'' تاجو نے ڈیش بورڈ سے فائل نکالتے ہوئے کہا۔ ''میری محبوبہ کے پاس بھی ڈرائیونگ لائسنس ہے لیکن ذرا جلدی دیکھ لیں دوست! اس وقت موڈ بڑا اچھا ہے۔'' اس نے جب فائل سارجنٹ کی طرف بڑھائی تو اس پر پانچ پانچ ہزار کے دو نوٹ بھی تھے۔

''اچھا ٹھیک ہے، جایئے!'' نوٹوں کی مقناطیسیت نے سارجنٹ کے لہجے کی ساری تختی نچوڑ لی۔ ''لیکن اتنی تیز ڈرائیونگ مت کیجیے محترمہ۔'' اس نے دیکھے بغیر فائل واپس کرتے ہوئے کہا لیکن دونوں نوٹ فائل کے اوپر سے غائب ہو چکے تھے۔

''ہاں جانِ من!'' تاجو نے پروین کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''رفتار اتنی تیز مت رکھو۔''

سارجنٹ اپنی موٹر سائیکل کی طرف واپس جانے لگا۔

پروین سکون کی سانس لیتے ہوئے گاڑی حرکت میں لائی۔ ''اچھی خاصی رشوت دے ڈالی آپ نے۔''

''وہ کم بخت تو یہی سمجھا ہوگا کہ مجھے نشے میں نوٹوں کی شناخت بھی نہیں رہی۔'' تاجو نے ہنس کر کہا۔ ''اس نے مجھے کوئی عیاش آدمی اور تمہیں کال گرل سمجھا ہوگا۔''

ان کا سفر پھر شروع ہو گیا۔ سارجنٹ اپنی موٹر سائیکل پر واپس جا رہا تھا۔

''اب ہمیں دائیں جانب مڑ کر پھر دائیں جانب مڑنا ہوگا تاکہ اپنے صحیح راستے پر جا سکیں۔'' پروین بولی۔

''گڈ!'' تاجو نے کہا۔ ''یقیناً تم نے اس علاقے کے اردگرد کے نقشے بھی دیکھ ڈالے ہیں اور گوگل پر ہی دیکھے ہوں گے۔''

''جی باس!''

''تمہارا انتخاب کر کے میں نے قطعی غلطی نہیں کی ہے۔''

''اس وقت تو ہم کسی ہنگامے سے شاید بال بال بچے

ہیں۔"

"عین وقت پر یہی تدبیر سوجھی تھی مجھے۔اس کو مارنے سے تو ہنگامی صورتِ حال شروع ہوسکتی تھی۔"

اس وقت تاجو کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

"وہ دفتر سے نکل رہا ہے باس!" دوسری طرف سے بتایا گیا۔

"راستہ کون سا اختیار کرے گا؟"

"اس کا اندازہ تو چند منٹ بعد ہی ہوگا۔"

"میں ہولڈ کرتا ہوں۔" تاجو نے جواب دیتے ہوئے اپنی جیب سے دوسرا اسمارٹ فون نکالا اور اسے آن کر دیا۔

"وہ چار نمبر سے نکلنا چاہتا ہے باس۔" ذرا دیر بعد اطلاع ملی۔

اس دوران میں تاجو اسمارٹ موبائل پر "گوگل میپ" کے ذریعے اس علاقے کو دیکھ رہا تھا جہاں سے نادر روانہ ہوا تھا۔ پھر اس نے وہ نقشہ نکال لیا جو چار نمبر راستے کی نشاندہی کر رہا تھا۔

"شاباش! تم بہت ٹھیک جا رہی ہو۔" تاجو نے پروین سے کہا اور پھر موبائل پر اپنے آدمی سے بولا۔ "تم مسلسل رابطے میں رہو۔ بہت دور رہ کر تعاقب جاری رکھو اور مجھے ایک ایک منٹ کی صورتِ حال سے آگاہ رکھو۔"

"ٹھیک ہے باس۔"

"ابھی رفتار دھیمی رکھو۔" تاجو نے کہا۔ "پہلے یہ معلوم ہوجائے کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔"

پروین نے رفتار کچھ کم کر دی۔

ایک منٹ بعد ہی تاجو کو اطلاع ملی کہ ایس پی نادر نے تین نمبر کا راستہ اختیار کیا ہے اور رفتار ساٹھ میل کے لگ بھگ ہے۔

تاجو نے نادر کے استعمال میں آنے والے راستوں کو "نمبروں" کے کوڈ ورڈز دیے تھے۔

"کے ایف سی کے چوراہے کی طرف چلو۔" تاجو نے پروین سے کہا۔ "بیس منٹ بعد اسے وہاں سے گزرنا چاہیے۔ ستر میل کی رفتار سے چلو۔ ہم بروقت پہنچ جائیں گے۔"

پروین نے ایکسلیریٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔

"ہم بالکل ٹھیک جا رہے ہیں۔" تاجو کی نظر موبائل کی اسکرین پر دکھائی دینے والے نقشے پر جمی ہوئی تھی۔

چند منٹ بعد تاجو نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے کہا جا رہا تھا۔ "اس نے اپنا راستہ تبدیل کیا ہے باس! اس کا قافلہ نیلم بیکری کے برابر کی گلی میں مڑ گیا ہے۔" بولنے والے کے لہجے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ "غالباً مجھے چیک کر لیا گیا ہے۔ دو موبائلیں نہ جانے کس طرف سے آکر میرے پیچھے لگ گئی ہیں۔"

"تو پھر تم تیز رفتاری سے نکل جاؤ۔" تاجو نے سرعت سے کہا۔ "اپنی جان بچانے کی کوشش...... کرو۔"

"کرو۔" تاجو نے اس وقت کہا تھا جب ایک دھما کا سنائی دے چکا تھا اور وہ دھما کا کسی رائفل کے فائر کا تھا۔

اس کے بعد پے در پے دھماکے سنائی دینے لگے، پھر یکا یک سناٹا چھا گیا۔ رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔

موبائل کا اسپیکر آن ہونے کی وجہ سے پروین بھی کچھ سن رہی تھی۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ اچانک ذہنی طور پر کچھ منتشر ہو جانے کے باوجود اس نے لینڈ کروزر کا راستہ تبدیل کیا تھا۔

"دو دھماکے یقیناً کار کے ٹائر پھٹنے کے تھے۔" تاجو نے اپنے تجربے کی بنیاد پر کہا۔ "یقیناً اس کی کار الٹ گئی ہو گی۔" اس کے چہرے سے غصہ ظاہر ہوا تھا۔ "اس سؤر نادر کی وجہ سے ہمارا ایک آدمی اور گیا۔"

"میں نے راستہ تبدیل کیا ہے باس۔" پروین نے کہا۔ "وہ گلی خاصی لمبی ہے۔ وہ جس سڑک پر ختم ہوگی، ہم وہیں پہنچیں گے۔"

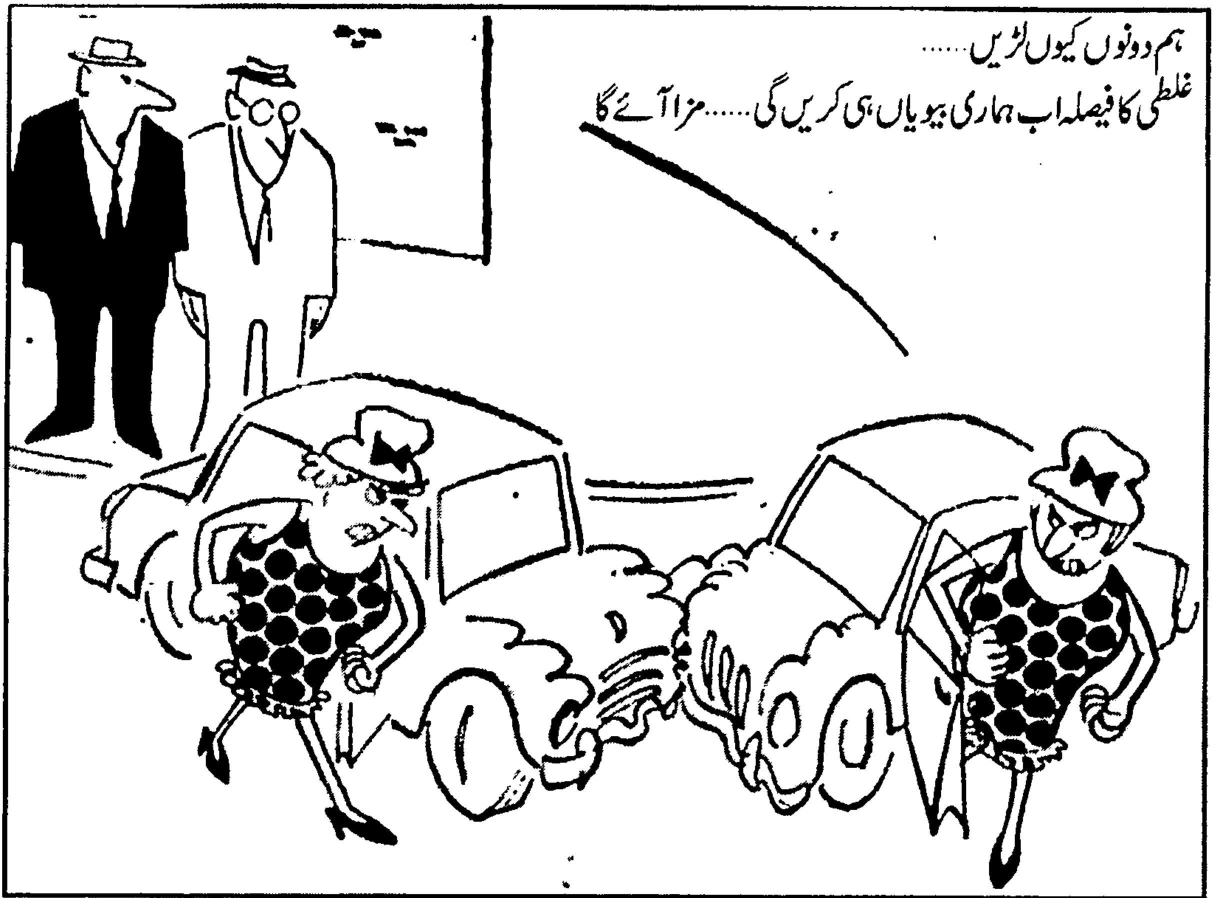
پروین نے رفتار بہت بڑھا دی تھی۔

"مجھے امید نہیں کہ ہم بروقت پہنچ سکیں گے۔" تاجو کے لہجے میں مایوسی تھی۔ "اور اگر آج وہ بچ گیا تو میرے لیے......" وہ نہ جانے کیا کہتے کہتے چپ ہوگیا۔

پھر ذرا ہی دیر بعد انہوں نے دیکھا کہ گلی سے ایک موٹر سائیکل نکلی، پھر دو موٹر سائیکلیں ساتھ ساتھ، اس کے بعد ایک موبائل، پھر ایک کار جو ایس پی نادر کی تھی۔ اس کے بعد ایک اور پولیس موبائل۔

پروین نے یک لخت رفتار میں بہت زیادہ اضافہ اسی وقت کر دیا تھا جب گلی سے پولیس گارڈ کی پہلی موٹر سائیکل نکلی تھی لیکن رفتار اتنی بڑھانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ایس پی نادر کا قافلہ گلی سے نکل کر بائیں جانب مڑ چکا تھا۔ تاجو کی لینڈ کروزر اسی طرف بڑھ رہی تھی۔

"نکل گیا۔" تاجو نے دانت پیسے۔ "رفتار کم کرو اور دائیں جانب مڑ جاؤ۔ تعاقب کر کے ہم اس کے قریب نہیں پہنچ سکیں گے۔"



پروین نے رفتار تیزی سے کم کی تھی تاکہ اسے دائیں جانب کے راستے پر موڑا جاسکے۔

تاجو کی بات جاری رہی تھی۔ ''پولیس موبائل ہمیں نادر کی کار کے قریب نہیں ہونے دیتی۔''

پروین لینڈ کروزر دائیں جانب موڑ چکی تھی۔

''اب بائیں جانب موڑو۔'' تاجو نے کہا۔ ''وہ راستہ زیادہ چوڑا نہیں ہے لیکن ہمیں اسی پر تیز رفتاری سے چلنا ہو گا۔ بہت تیز رفتاری سے۔''

''میں سمجھ رہی ہوں باس۔'' پروین نے گاڑی بائیں جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ''اب وہ سڑک ہمارے بائیں ہاتھ کی طرف ہے جس پر نادر کا قافلہ جارہا ہے۔''

''اب ہمارے راستے میں دو چوراہے پڑ رہے ہیں۔'' تاجو موبائل پر نظر آنے والے نقشے پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ ''ان دونوں کے بعد جو تیسرا چوراہا ہے، وہیں سے نادر کا قافلہ سڑک کراس کرے گا۔''

''یعنی وہ دائیں جانب مڑ کر اس چوراہے کی طرف آئے گا؟''

''ہاں، یہ اندازہ میرا اس لیے ہے کہ اسی چوراہے سے گزر کر وہ اپنے گھر کے بہت قریب ہو جائے گا لیکن'' تاجو کی نظر گھڑی پر بھی تھی۔ ''ہم بروقت وہاں نہیں پہنچ سکیں گے۔'' اس کے دماغ نے کیلکولیٹر کی طرح فاصلے اور وقت کا حساب لگا لیا تھا۔

اس وقت لینڈ کروزر پہلے چوراہے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ سگنل کی بتی زرد ہو چکی تھی۔ دوسری گاڑیاں تیزی سے اپنی رفتار میں کمی لائی تھیں لیکن پروین نے رفتار میں اضافہ کر دیا۔ سگنل کی بتی سرخ ہو چکی تھی جب لینڈ کروزر نے چوراہا پار کیا۔ دائیں بائیں جانب سے آنے والی جو گاڑیاں حرکت میں آچکی تھیں، انہیں اچانک بریک لگا کر حادثے سے بچنا پڑا۔

''ٹھیک کیا تم نے۔'' تاجو بولا۔ ''وہ لوگ ہمیں گالیاں تو دے رہے ہوں گے لیکن اس وقت گالیاں کھانا ضروری تھا۔''

''یس باس!''

لینڈ کروزر فراٹے بھر رہی تھی اور تاجو کا دماغ وقت اور فاصلے میں الجھا ہوا تھا۔ اسے اس کا بھی افسوس تھا کہ اس کے ذاتی معاملے میں گروپ کا ایک آدمی کام آگیا۔ ٹائروں کے پھٹ جانے کے باعث یہ امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ وہ پولیس سے بچ کر نکل سکا ہوگا۔

موبائل کی گھنٹی نے تاجو کو اس کی طرف متوجہ کیا۔ اس نے کال ریسیو کی جو اس کے نائب جمال خاں کی تھی۔ کال ریسیو کرتے ہی تاجو چونک گیا۔ دوسری طرف سے ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے گولیاں چل رہی ہوں۔

''ہیلو جمال!'' تاجو تیزی سے بولا۔
''فوج نے آپریشن شروع کر دیا ہے باس۔'' جمال خاں نے پریشان لہجے میں جواب دیا۔ ''سب ساتھی مقابلہ کر رہے ہیں۔''
''بہت غیر متوقع ہے یہ آپریشن۔'' تاجو نے کہا۔ ''خیر! بہتر ہے جمال خاں کے ہتھیار ڈال دو۔ سب لوگ خود کو فوج کے حوالے کر دیں۔ مقابلے میں جانیں جائیں گی اور کچھ نہیں ہوگا۔''
''باس!'' پروین تیزی سے بولی۔ ''وہ نکل رہا ہے شاید۔''
لینڈ کروزر اس وقت دوسرے چوراہے کے قریب پہنچ رہی تھی۔ سگنل سے پہلے اس کے آگے ایک کار تھی جس نے بریک لگائے تھے۔ موٹر سائیکل راہ کے بیچ میں کھڑی کر کے سارجنٹ، ٹریفک کو رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔
پروین نے بھی بریک لگائے تھے۔
''بائیں طرف کاٹو!'' تاجو نے تیزی سے کہا۔ ''آگے والی کار کے برابر میں رکو۔''
پروین نے تیزی سے ایسا ہی کیا اور آگے والی کار کے برابر میں جا کر رکی۔ اسی وقت بائیں جانب سے نادر کے دو موٹر سائیکل سوار گارڈ نکلے اور بائیں جانب مڑ گئے۔ اس کے بعد پولیس موبائل نکلی۔
اسی اثنا میں تاجو، جمال خاں سے رابطہ منقطع کرنے کے بعد لینڈ کروزر کی چھت کی کھڑکی (روف ٹاپ) کھولتے ہوئے اپنی سیٹ پر کھڑا ہو چکا تھا۔
بیچ سڑک پر اپنی موٹر سائیکل کے ساتھ کھڑا ہوا گارڈ، تاجو کو اس طرح کھڑے دیکھ کر چونکا۔ فوراً اس کا ہاتھ اپنے ہولسٹر پر گیا تھا لیکن اسے ریوالور نکالنے کی مہلت نہیں مل سکی۔ تاجو کے بائیں ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پسٹل تھا جس کی گولی نے گارڈ کی کھوپڑی اُڑا دی۔ اس کے ساتھ ہی دائیں ہاتھ میں دبا ہوا گرینیڈ سنسناتا ہوا ایس پی نادر کی کار کی طرف گیا جو اسی وقت سامنے آئی تھی۔ گرینیڈ اس کے بونٹ پر پھٹا۔ تاجو نے بائیں ہاتھ میں دبا ہوا پسٹل فوراً ہی ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا جو نیچے سیٹ پر جا گرا۔ اسی ہاتھ سے ایک اور گرینیڈ نکال کے دائیں ہاتھ میں لے لیا تھا۔ یہ عمل اتنی تیزی سے مکمل ہوا تھا کہ جب بونٹ پر گرینیڈ پھٹا تو دوسرا گرینیڈ تاجو کے دائیں ہاتھ میں تھا جو اس نے نادر کی کار پر پھینکا۔
نیچے سے پروین نے ہدایت کے مطابق فور بیرل لمبا پسٹل تاجو کے بائیں ہاتھ میں پکڑا دیا تھا۔

دوسرے گرینیڈ نے ایس پی کی پوری کار اُڑا دی تھی۔
پروین ہدایت کے مطابق لینڈ کروزر حرکت میں لا چکی تھی اسی وقت تاجو نے فور بیرل سے گولیاں برسائیں اور پھر جلدی سے اسی وقت بیٹھ گیا جب پولیس کی طرف سے بے شمار گولیوں کی باڑھ آئی۔ وہ گولیاں اسے بھی چھلنی کرتیں اور ونڈ اسکرین کو بھی لیکن اس وقت پروین لینڈ کروزر کو بہت تیزی سے دائیں جانب موڑ چکی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گولیاں لینڈ کروزر کی چھت اور بائیں جانب کی کھڑکی کے شیشے کے علاوہ دروازے کو بھی چھلنی کر گئیں۔ انہی میں سے کچھ گولیاں تاجو کے جسم کے مختلف حصوں میں پیوست ہوئیں اور وہ کراہ کے ساتھ آگے کی طرف گرا اس کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرا گیا تھا۔
معجزانہ طور پر کسی گولی نے پروین کو ذرا بھی گزند نہیں پہنچائی۔ اس کا پیر بھی ایکسیلیریٹر پر بھرپور دباؤ ڈال چکا تھا اور لینڈ کروزر فراٹے بھرنے لگی تھی۔
''باس!'' پروین چیخ پڑی لیکن اس نے تاجو کے جسم کے مختلف حصوں سے خون بہتا دیکھ لیا تھا۔
جواب میں تاجو کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ اگر لینڈ کروزر کی تیز رفتاری سے اس کا جسم متاثر نہ ہو رہا ہوتا تو غالباً وہ بالکل ساکت ہوتا۔
''مائی گاڈ!'' پروین کچھ روہانسی ہوگئی۔
عقب سے گولیوں کی بارش ہو رہی تھی لیکن لینڈ کروزر ان گولیوں کی پہنچ سے دور نکل چکی تھی۔
پولیس کی دونوں موبائلیں تعاقب میں لگ چکی ہوں گی، یہ خیال پروین کے ذہن میں آیا تو لیکن اسے بیک مرر پر نظر ڈالنے کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ یہی بہت غیر معمولی بات تھی کہ وہ لینڈ کروزر کو انتہائی تیز رفتاری سے دوڑاتی رہی تھی۔
اسپتال، اسپتال، اس کے دماغ میں گونج سی تھی۔ اسے یقین تھا کہ تاجو شدید زخمی ہو چکا تھا۔ اس صورت میں اسپتال ہی کا رخ کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد گرفتاری بھی یقینی تھی لیکن اس وقت پروین کی شدید ترین خواہش یہی تھی کہ تاجو کی زندگی بچائی جائے۔ اس کی نظر سامنے سڑک پر بھی تھی اور تاجو پر بھی نظر ڈال رہی تھی۔
چند فرلانگ کے فاصلے پر دائیں بائیں جانب کے راستے سے دو پولیس موبائل نکلیں اور انہوں نے لینڈ کروزر کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی لینڈ کروزر پر گولیاں بھی برسائیں لیکن ونڈ اسکرین محفوظ رہا۔ پروین نے دانت پر

ڈانت جما کر ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھایا۔ ایک پولیس موبائل لینڈ کروزر کا دھکا کھا کر ایک طرف لڑھکتی چلی گئی اور لینڈ کروزر کے لیے آگے نکلنے کا راستہ بن گیا۔ دھکا لینڈ کروزر کو بھی لگا تھا جس سے تاجو اپنی نشست پر اس طرح لڑھکا کہ اس کا سر پروین کی گود میں گرا۔

''تاجو!'' پروین ایک بار پھر چیخ پڑی۔ وہ اس وقت ''باس'' کہنا بھول گئی تھی۔ اس کے دل سے ''تاجو'' ہی ابھرا تھا اور اس کی زبان پر آ گیا تھا۔

راستے میں قریب ہی ایک پولیس اسٹیشن تھا۔ وہاں موجود پولیس بھی وائرلیس کے ذریعے الرٹ کی جا چکی ہوگی۔

☆☆☆

جب فوج نے ''نوگو ایریا'' پر اچانک آپریشن شروع کیا تھا تو جمال خاں نے تاجو سے بات کرنے کے بعد شیریں کو بھی ساری بات بتا دی تھی۔

''وہی کرنا چاہیے تمہیں، جو تمہارے باس نے کہا ہے۔'' شیریں جواب میں بولی تھی۔ ''فوج سے مقابلہ چند دن بھی نہیں کیا جا سکتا۔''

جمال خاں سر ہلا کر فوراً اس کے پاس سے چلا گیا تھا اور وہ پریشانی کے عالم میں ٹہلتی رہی تھی۔ موبائل فون اس کے ہاتھ میں تھا جس کا نیا نمبر صرف تاجو ہی جانتا تھا۔ شیریں اتنی پریشان تھی کہ اس کے جانے کے بعد سے اب تک کئی مرتبہ اس سے رابطہ کرنے کی کوشش میں ناکام ہو چکی تھی۔ جمال خاں کے جانے کے بعد بھی اس نے ایک بار کوشش کی اور ناکام رہی، تاجو کا فون بند تھا۔ وہ پریشانی کے عالم میں ٹہلتی رہی۔

گولیاں چلنے کے دھماکے برابر سنائی دے رہے تھے۔

گرفتار تو وہ بھی ہوگی، وہ سوچ رہی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس بارے میں وہ کوئی اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھی۔ یہ فیصلہ اس نے کر لیا تھا کہ وہ تاجو سے اپنی شادی کی بات ہرگز نہیں چھپائے گی۔ اس نے کہیں رکھا ہوا نکاح نامہ نکال کر اپنے پرس میں رکھ لیا۔

اچانک اسے خیال آیا کہ اس سے غلطی ہوگئی ہے۔ وہ جمال خاں سے تاجو کا وہ نمبر معلوم کر سکتی تھی جس پر گروہ کے لوگوں کا رابطہ رہتا تھا۔ اس نے جلدی سے جمال خاں کا نمبر ملایا لیکن وہ اس سے بھی بات نہیں کر سکی۔ جمال خاں کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔ یہ شیریں کو بعد میں معلوم ہوا کہ جمال خاں فوج کے کسی افسر سے بات کر رہا تھا۔

پھر دس منٹ بعد ہی گولیاں چلنا بند ہوگئیں۔ گروپ نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

جس رجمنٹ نے یہ آپریشن کیا تھا، اس کی کمانڈ لیفٹیننٹ کرنل اسلم کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے اپنے ماتحت کو ہدایت کر دی تھی کہ قیدیوں کو فی الحال پولیس کی کسٹڈی میں نہیں دیا جائے گا، فوج اس کی تحقیقات خود کرے گی۔

کرنل اسلم ہی کی ہدایت پر قیدیوں کو کسی نامعلوم مقام پر منتقل کیا جا رہا تھا جب ایک کیپٹن نے اس سے فون پر کہا۔ ''سر! آپ نے کہا تھا کہ یہاں شیخ جواد صاحب کی بیٹی شیریں صاحبہ بھی ہوں گی جن کے ساتھ ذرا بھی زیادتی نہ کی جائے۔''

''ہاں، کہا تھا میں نے۔''

''ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی گئی ہے۔ تمام قیدیوں کو منتقل کیا جا رہا ہے۔ ان کو بھی......''

''نہیں۔'' کرنل نے بات کاٹ دی۔ ''انہیں تم خود میرے پاس لاؤ۔''

''یس سر۔'' دوسری طرف سے کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

کرنل ٹہلنے لگا۔ شیخ جواد سے اس کے ذاتی تعلقات تھے۔ جس وقت آپریشن کیا جا رہا تھا، کرنل نے فون پر اس کی اطلاع شیخ جواد کو دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''یہاں سے آپ کی بیٹی بھی مل جانا چاہیے۔''

''جہنم میں جائے وہ۔'' شیخ جواد نے غصے سے کہا۔ ''میرے منہ پر کالک مل دی ہے اس نے۔ اب میں نہیں چاہوں گا کہ وہ میری نظروں کے سامنے آئے۔'' اور پھر شیخ جواد نے کرنل کی کوئی اور بات سنے بغیر ریسیور رکھ دیا تھا۔

کرنل نے اس وقت ایک ٹھنڈی سانس لی تھی۔ وہ بھی محبت کا مارا ہوا شخص تھا۔ ایک بہت بڑے گھر کی لڑکی اس سے محبت کرنے لگی تھی اور وہ بھی اسے دل و جان سے چاہنے لگا تھا۔ ان کی شادی اس لیے نہیں ہو سکی تھی کہ لڑکی کا باپ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ بیٹی کی شادی کہیں اور کرنا چاہتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا تھا کہ لڑکی نے خودکشی کر لی تھی اور کرنل بھی برسوں اس کے لیے تڑپتا رہا تھا۔ اسی باعث اسے تاجو سے تو نہیں لیکن شیریں سے ہمدردی تھی۔ اسے بس یہ قلق تھا کہ شیریں نے ایک جرائم پیشہ سے محبت کی تھی جس سے اس کا ملاپ کرانا قانون کے بس کی بات نہیں تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی کیپٹن نے شیریں کو اس کے سامنے پیش کر دیا۔

شیریں کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔
کرنل نے کیپٹن کو جانے کا اشارہ کیا اور اس کے جانے کے بعد شیریں سے بولا۔ ''آپ کے والد سے میرے اچھے خاصے تعلقات ہیں۔ کسی باعث مجھے آپ سے ہمدردی بھی ہے۔ لیکن میں آپ کو اس وقت تک رہا نہیں کرسکتا جب تک تفتیش سے یہ بات سامنے نہ آجائے کہ آپ تاجو کے جرائم میں اس کی شریک نہیں تھیں۔ میں تفتیش سے پہلے آپ کی زبان سے اس کا جواب سننا چاہتا ہوں۔''
''میں تاج ور کے کسی جرم میں اس کی شریک نہیں ہوں۔''
''تاج ور؟''
''اس کا نام یہی ہے۔ وہ اس گروپ میں آنے کے بعد تاجو بنا ہے۔''
''اچھا۔ خیر، میں آپ کے چہرے کے تاثرات کی بنا پر آپ کا جواب درست سمجھ رہا ہوں۔ یقیناً تفتیش کے بعد آپ کو رہائی مل جائے گی۔ صرف میرا مطمئن ہونا کافی نہیں ہے۔''
''میں اپنے بارے میں نہیں، تاجو کے بارے میں پریشان ہوں۔''
''وہ ہمارے ہاتھ نہیں لگا ہے۔ مجھے اطلاع مل چکی ہے کہ وہ آپریشن سے پہلے اس علاقے سے کہیں چلا گیا تھا۔ میں نے ڈی آئی جی کو اس کی اطلاع دے دی ہے۔ پولیس اسے تلاش کررہی ہوگی۔ اب میں آپ سے ایک بات اور پوچھنا چاہتا ہوں۔ رہائی کے بعد آپ کہاں جائیں گی۔ آپ کے والد سے ابھی میری بات ہوچکی ہے۔ وہ تو اب آپ کی صورت دیکھنے کے بھی روادار نہیں۔''
''میں اپنا گھر چھوڑ چکی ہوں۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ وہ کس بات کے روادار ہیں اور کس بات کے نہیں ہیں۔ مجھے اب وہیں جینا ہے، جہاں تاجو ہوگا۔ زندگی ہو یا موت، میں ہر صورت میں اس کے ساتھ ہوں۔ اب تو اس سے میری شادی بھی ہوچکی ہے۔''
کرنل چونکا لیکن اس سے پہلے کہ اس کا ردِعمل الفاظ میں ڈھلتا، اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے جو کچھ بتایا گیا، وہ تاجو کے بارے میں تھا۔ کرنل نے بے اختیار ایک طویل سانس لی۔
''اچھا ہوا آپ نے مجھے یہ اطلاع دے دی۔ شکریہ۔''
بات ختم کرنے کے بعد کرنل نے شیریں سے کہا۔ ''رہا ہونے کی صورت میں اگر تاجو تمہیں فوری طور پر نہ مل سکے تو تم میرے گھر میں آکر رہ سکتی ہو بیٹی!...... میں تمہیں بیٹی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میری عمر تم سے بہت زیادہ ہے اور میری بڑی بیٹی تم سے چار پانچ سال ہی چھوٹی ہوگی۔''
''آپ کی ہمدردی کا بہت شکریہ، لیکن میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ میں تعلیم یافتہ ہوں۔ ملازمت کرسکتی ہوں۔''
''لیکن کسی چھت کی ضرورت تو پڑتی ہی ہے۔'' کرنل نے کہا۔ ''خیر! اس پر بعد میں بعد کریں گے۔ فی الحال تمہیں دوسرے قیدیوں کے ساتھ کہیں اور منتقل کردیا جائے گا۔''
کرنل نے خاموش ہوکر کیپٹن کو آواز دی۔
شیریں بولی۔ ''اگر آپ کو مجھ سے ہمدردی ہے تو جیسے ہی تاجو کے بارے میں کچھ معلوم ہو، مجھے اطلاع دے دیجیے گا۔''
شیریں نے اسے اپنا موبائل نمبر بھی بتادیا۔
کیپٹن اندر آگیا تھا۔ وہ شیریں کو لے کر چلا گیا۔
ٹی وی چینلز سے بتایا جارہا تھا کہ فوجی آپریشن کامیاب رہا لیکن ایک خفیہ ایجنسی کی اطلاع یہ تھی کہ گروپ کے کچھ افراد نے بستی کے بعض گھروں میں روپوشی اختیار کی ہے۔ ان افراد کی وجہ سے بستی کے گھروں کی تلاشی اس وقت تک لی جائے گی جب تک تمام روپوش افراد گرفتار کرلیے جائیں۔ یہ کہا جارہا تھا کہ تلاشی کا یہ کام شاید اس علاقے میں کرفیو لگا کر کیا جائے۔
شیریں ان تمام باتوں سے بے خبر تھی۔ اسے کسی نامعلوم مقام پر کسی عمارت کے کمرے میں بند کردیا گیا تھا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا لیکن دروازے کے باہر ایک مسلح سنتری موجود تھا۔
شیریں اس بات سے بھی بے خبر تھی کہ گروپ کے باقی لوگوں کو بھی اسی عمارت میں رکھا گیا ہے یا کہیں اور پہنچادیا گیا ہے۔ وہ یہ جاننے کی خواہش مند بھی نہیں تھی۔ اس کے دماغ میں صرف یہ سوال گونج رہا تھا کہ تاج ور اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا یا نہیں، اور یہ کہ اب وہ کہاں تھا۔ وہ رات شیریں پر قیامت کی طرح گزری۔ صبح تک وہ ایک پل کے لیے بھی نہیں سوسکی تھی۔ اس کا موبائل اس سے نہیں لیا گیا تھا لیکن اسے ایک پل کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ اپنے باپ سے رابطہ کرے اور اسے بتائے کہ وہ کن حالات سے گزر کر کہاں پہنچ گئی تھی۔
صبح ہونے پر اس کے کمرے میں ناشتا بھی پہنچادیا

گیا۔

"تاج ور...... میرا مطلب ہے...... تاجو...... اس گروپ کے لیڈر کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟" وہ اضطراب کے عالم میں ناشتا لانے والے سے پوچھ بیٹھی تھی۔

لیکن اسے جواب نہیں ملا تھا۔ ناشتا پہنچانے والا خاموشی سے واپس چلا گیا تھا۔

گیارہ بجے کے قریب دو فوجی افسر اس کے کمرے میں آئے۔ انہوں نے شیریں پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ تاجو کے گروہ میں کس حد تک فعال تھی۔

شیریں فعال تھی ہی نہیں تو انہیں کیا بتاتی۔ شائستگی سے کیے جانے والے سوالات کا وہ شائستگی ہی سے جواب دیتی رہی۔ یہ سلسلہ آدھے گھنٹے تک جاری رہا۔ پھر جب دونوں افسر جانے لگے تو شیریں ان سے بھی پوچھ بیٹھی۔ "اس گروپ کے لیڈر کا کیا ہوا؟"

دونوں افسروں نے جوا دینے کے بجائے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر اُن میں سے ایک نے شیریں کے ہاتھ میں دبے ہوئے موبائل پر نظر ڈالی، اس کی دیکھا دیکھی دوسرے افسر نے بھی یہی کیا۔ اس کے بعد پھر ایک دوسرے سے نظریں ملائیں۔ ان میں سے ایک نے اس طرح اپنے شانے اچکائے جیسے بات سمجھ میں نہ آئی ہو، اس کے بعد وہ دروازے کی طرف مڑ گئے۔

"پلیز!" شیریں چیخ پڑی۔ "اتنا بھی نہیں بتا سکتے؟"

دونوں افسر باہر نکل گئے۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔

بے بسی کے احساس سے شیریں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک بار تو اس کا جی چاہا تھا کہ دیوار سے ٹکرا کر اپنا سر پھاڑ لے۔ اس کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا تھا کہ تاجو اپنا موبائل نمبر بند رکھتا ہے۔ اسی لیے اس سے رابطہ نہیں ہو سکا تھا لیکن وہ خود تو اسے فون کر سکتا ہے۔

گھنٹے بھر کے بعد پھر دو فوجی افسر آئے۔ انہوں نے بھی شیریں سے پوچھ گچھ شروع کی۔ صرف الفاظ کا الٹ پھیر تھا لیکن جاننا وہ بھی چاہتے تھے کہ گروپ میں شیریں فعال تھی یا نہیں اور اگر تھی تو کس حد تک تھی۔

کچھ دیر پوچھ گچھ کے بعد وہ دونوں بھی چلے گئے۔ شیریں کو ان سے بھی تاجو کے بارے میں اپنے سوال کا جواب نہیں مل سکا تھا۔

شیریں سے دو مرتبہ پوچھ گچھ کی جانے والی رپورٹس اس افسر کو ملیں جو تمام گرفتار شدگان سے پوچھ گچھ کا نگراں تھا۔ اس نے وہ دونوں رپورٹس پڑھ کر چند منٹ غور کیا، پھر اس پر اپنا نوٹ لکھا۔

شیریں اس گروپ کی کارکن نہیں رہی۔ اسے رہا کیا جا سکتا ہے۔

پھر یہ رپورٹ شام کے وقت کرنل اسلم کے سامنے تھی۔ شیریں کو رہا کرنے کا فیصلہ وہی کر سکتا تھا۔

رپورٹ میں ایک خاص بات یہ بھی لکھی گئی تھی کہ شیریں شدید ذہنی پراگندگی کا شکار ہے۔ وہ بار بار تاجو کے بارے میں پوچھتی رہی تھی جبکہ اس کے پاس اسمارٹ موبائل موجود ہے جس پر وہ کسی بھی ٹی وی چینل سے خبریں سن سکتی تھی۔

ٹی وی چینلز اس بارے میں یہ خبریں مستقل نشر کر رہے تھے کہ جس لینڈ کروزر سے گرینیڈ پھینک کر ایس پی نادر کی کار تباہ کی گئی تھی، وہ لینڈ کروزر وہی لڑکی پروین چلا رہی تھی جس کے شوہر کو تاجو نے قتل کیا تھا۔ گرینیڈ خود تاجو نے مارے تھے اور اس کی فائرنگ سے کئی کانسٹیبل زخمی اور دو ہلاک ہوئے تھے۔ پروین تیزی سے لینڈ کروزر کو وہاں سے بھگا لینا چاہتی تھی۔ اس وقت پولیس کی طرف سے کی جانے والی فائرنگ نے لینڈ کروزر کو چھلنی کیا تھا اور خیال کیا جا رہا تھا کہ وہ دونوں اس سے کم از کم زخمی ضرور ہوئے ہوں گے لیکن اس کے بعد یہ بات سامنے آئی تھی کہ تاجو کے جسم میں پانچ گولیاں لگی تھیں اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ یہ اس وقت معلوم ہوا تھا جب پروین نے فرار ہونے کی کوشش کے بجائے لینڈ کروزر ایک پولیس اسٹیشن کے احاطے میں داخل کر دی تھی۔

اس طرح وہ دونوں پولیس کی حراست میں آئے تھے۔ پروین کو حوالات میں بند کرنے کے ساتھ ہی بے ہوش تاجو کو اسپتال پہنچا دیا تھا۔ آپریشن کر کے اس کے جسم سے گولیاں نکال لی گئی تھیں۔ لیکن دو گولیوں سے اسے بہت خطرناک زخم لگے تھے جن کا اندمال کرنے کی سرتوڑ کوششیں کی جا رہی تھیں۔ اسپتال کا اعلامیہ یہ تھا کہ یہ زندگی اور موت کی جنگ ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ زندگی جیتے گی یا موت!

کرنل اسلم نے رپورٹ پڑھنے کے بعد شیریں کی رہائی کا حکم جاری کیا اور اس کے ساتھ ہی متعلقہ افسر کو یہ ہدایت بھی کی کہ شیریں کو رات آٹھ بجے تک اس کے گھر پہنچا دیا جائے۔

وہ چاہتا تھا کہ شیریں کم از کم اس وقت تک اس کے گھر میں رہے جب تک اسے اس کا باپ شیخ جواد قبول نہ کر لے۔

وہ ایک ایسا فوجی آفیسر تھا جو محبت کرنے والوں کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتا تھا۔ اسے شیریں سے ہمدردی تھی جو

محبت کے ہاتھوں مجبور ہوکر تاجور کے پاس چلی گئی تھی۔ اگر تاجو بہت سے لوگوں کا قاتل نہ ہوتا اور سرکاری طور پر اس کے سر کی قیمت نہ رکھی گئی ہوتی تو کرنل کو اس سے بھی ہمدردی ہوتی۔

دوسرے قیدیوں سے پوچھ گچھ کی رپورٹس بھی کرنل کو مل چکی تھیں۔ ان رپورٹس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان لوگوں نے کن حالات کی وجہ سے یہ گروہ بنایا تھا۔ رپورٹس میں یہ بات بھی تھی کہ بستی کے لوگ ان سے بہت خوش تھے۔ ان میں کئی کو بستی کے کچھ لوگوں نے یہ پیشکش بھی کی تھی کہ وہ ان کے گھروں میں روپوش ہو جائیں مگر انہیں خطرے میں نہ ڈالنے کے لیے انہوں نے یہ پیشکش قبول نہیں کی تھی اور تاجو کی ہدایت پر جمال خاں نے خود کو اور پورے گروپ کو فوج کے حوالے اس لیے کیا تھا کہ فوج ان کے وطن کی محافظ تھی جس سے انہیں کوئی شکایت بھی نہیں تھی۔

ان سب نے اپنے ہاتھوں سے کیے گئے ہر اُس کام کا اعتراف کرلیا تھا جو قانون کی نظر میں جرم تھا۔

خفیہ ایجنسی کی رپورٹ کے پیش نظر جب اس بستی میں کرفیو لگا کر گھروں کی تلاشی کا حکم جاری کیا ہی جانے والا تھا کہ خفیہ ایجنسی کی دوسری رپورٹ آگئی تھی کہ مزید چھان بین کے بعد معلوم ہوا کہ پہلی رپورٹ غلط تھی۔

غلط فہمی کا سبب یہ ہوسکتا تھا کہ بستی کے کچھ لوگوں نے گروپ کے بعض افراد کو اپنے گھر میں روپوش ہونے کی پیشکش بہرحال کی تھی۔ اسی دوسری رپورٹ کے باعث کرفیو لگا کر تلاشی کا حکم جاری نہیں کیا گیا۔

شیریں کی رہائی کا حکم جاری کرنے کے بعد کرنل نے شیخ جواد کو فون کیا اور اس سے کہا۔ ''آج رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیے۔ کوشش کیجیے گا کہ ساڑھے آٹھ بجے تک آجائیں۔ آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میں خود حاضر ہو جاتا لیکن کسی وجہ سے ضروری ہے کہ آپ تشریف لائیں۔''

شیخ جواد نے آمادگی ظاہر کردی۔ وہ سمجھ گیا ہوگا کہ گفتگو شیریں ہی کے بارے میں ہوگی۔ اگرچہ وہ اپنی بیٹی کے معاملے میں بہت برہم تھا لیکن بہرحال ایک باپ تھا جسے فطری طور پر یہ فکر لاحق تھی کہ جو حالات سامنے آچکے تھے، اس کی روشنی میں اس کی بیٹی کا کیا ہوگا۔

☆☆☆

رات آٹھ بجے شیریں کو کرنل اسلم کے گھر پہنچا دیا گیا۔

''اپنی رہائی کے سلسلے میں آپ کی شکر گزار ہوں۔'' شیریں نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ ''لیکن میں آپ کے گھر میں رہنے کے لیے تیار نہیں ہوں کرنل صاحب! میں اس کے لیے بھی آپ کی ممنون ہوں کہ آپ مجھے بیٹی کہہ چکے ہیں لیکن میں وہیں جیوں اور مروں گی جہاں میرا تاجور ہوگا، پلیز...... آپ ہی بتا دیجیے مجھے اس کے بارے میں۔''

''چند گھنٹے تو میرے گھر میں گزار لو، پھر میں تمہیں کچھ بتا سکوں گا۔''

''چند گھنٹے۔'' شیریں روہانسی ہوگئی۔ ''میرا ایک ایک لمحہ کرب میں گزر رہا ہے۔''

''تم نے بتایا تھا کہ اس سے تمہاری شادی ہو چکی ہے۔''

''جی ہاں، میرے پاس ثبوت موجود ہے۔'' شیریں نے پرس سے نکاح نامہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

کرنل نے نکاح نامہ لے کر اس پر ایک نظر ڈالی اور پھر وہ شیریں کو واپس کر دیا۔ اسی وقت ایک عورت اور ایک نوجوان لڑکی ڈرائنگ روم میں آئیں۔ انہیں اس کی ہدایت پہلے ہی کرنل سے مل چکی تھی۔

''یہ شیریں ہے۔'' کرنل نے تعارف کرایا۔ ''اور یہ دونوں میری بیوی اور بیٹی ہیں۔''

کرنل کی بیوی نے قریب آکر شیریں کو اپنے سینے سے لگالیا اور لڑکی نے بھی قریب آکر اس کا ہاتھ پکڑلیا۔

''تم دونوں شیریں کو اپنے ساتھ اندر لے جاؤ۔'' کرنل نے کہا۔ ''کوشش کرنا کہ یہ کچھ کھالیں۔ یہ کل سے بھوکی ہیں۔''

شیریں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے کرنل کی طرف دیکھا۔ ''آپ کو یہ رپورٹ بھی مل گئی ہے؟''

''ہاں۔'' کرنل نے کہا۔ ''تمہیں جس کمرے میں رکھا گیا تھا، اس میں ایک خفیہ کیمرا ہے۔ کلوز سرکٹ، اس سے تمہاری نگرانی ہوتی رہی ہے۔'' پھر اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''شیریں کو لے جایئے نا، مجھے کچھ کام کرنے ہیں۔''

رنج والم کی تصویر بنی شیریں ان ماں بیٹی کے ساتھ چلی گئی۔

ڈرائنگ روم ہی میں ایک تپائی پر ایک فائل پڑی ہوئی تھی۔ کرنل اسے کھول کر بعض کاغذات پر نظر دوڑانے لگا۔ پھر اس نے فائل بند کر کے موبائل پر کور کمانڈر سے رابطہ کیا۔ دس منٹ تک حالات پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔

آٹھ بج کر پینتیس منٹ پر شیخ جواد آگیا۔

گفتگو کا آغاز کرنل نے ہی کیا۔ ''ایک خاص وجہ ہے کہ میں نے آپ کو زحمت دی۔''

''شیریں ہی کی بات ہوگی۔'' شیخ جواد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''کیا حشر ہوگا اب اس کا؟ خبروں میں تو سن چکا

ہوں کہ وہ بھی گرفتار ہوئی ہے۔"
"ان سبھی سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے لیکن شیریں کو پوچھ گچھ کے بعد آج ایک گھنٹے پہلے رہا کر دیا گیا ہے۔"
"اوہ!"
"نہ جانے کیوں، میں اس کا سبب تو نہیں بتا سکتا۔ میں نے اسے بیٹی کہہ دیا ہے۔ اب میں اس رشتے کی لاج بھی رکھوں گا۔ میں نے اسے یہیں بلا لیا ہے۔"
شیخ جواد کچھ چونک سا گیا۔
"میری بیوی اور میری نوجوان بیٹی بھی ہیں گھر میں۔" کرنل نے اپنی بات جاری رکھی۔ "شیریں ان کے ساتھ خود کو ایڈجسٹ کر سکتی ہے لیکن وہ میرے گھر میں رہنے پر آمادہ نہیں۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر زندگی گزارنا چاہتی ہے۔"
"تو گزارنے دیں۔" شیخ جواد کا لہجہ سپاٹ ہی رہا۔
کرنل چند لمحے رک کر بولا۔ "کہا جاتا ہے کہ فوجیوں کے دل بہت سخت ہوتے ہیں لیکن میں شاید پیدائشی فوجی نہیں ہوں اس لیے مجھے شیریں سے بہت ہمدردی ہے۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ آپ اسے قبول کرلیں۔ جو ہونا تھا، وہ تو ہو چکا۔ وہ تاجو سے شادی کر چکی ہے لیکن......"
"کیا!" شیخ جواد اس طرح چونکا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔
"جی ہاں۔" کرنل نے کہا۔ "لیکن حالات اب یکسر بدل چکے ہیں۔ تاجو اسپتال میں زندگی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ شاید وہ بچ نہ سکے۔ ڈاکٹرز سے میری بات ہو چکی ہے۔ ان کے خیال کے مطابق کوئی معجزہ ہو جائے تو دوسری بات ہے۔ ایسی صورت میں، شادی کے باوجود وہ شیریں کی زندگی سے نکلا ہوا ہوگا۔"
اسی وقت کرنل کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ کال اس کے ایک ماتحت کی تھی جسے تاجو کی خبر داری پر لگایا گیا تھا۔
"ہوں۔" کرنل نے کال ریسیو کی۔ "کوئی اطلاع؟"
"جی سر! تاجو اب نہیں رہا۔ ایکسپائر۔"
دو تین لمحوں کے لیے کرنل چپ رہ گیا پھر اس نے پوچھا۔ "کنفرم؟"
"ہنڈریڈ پرسنٹ سر!"
کرنل نے رابطہ منقطع کر دیا اور اپنی طرف غور سے دیکھتے ہوئے شیخ جواد سے بولا۔ "وہی اطلاع ملی ہے جو میں ابھی کہہ رہا تھا۔"
"مر گیا وہ؟" شیخ جواد کے منہ سے نکلا۔ "جان چھوٹ گئی شیریں کی۔"

کرنل کو اس کا لہجہ اچھا نہیں لگا لیکن اس نے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا اور بولا۔ "شیریں کو یہ بتانا تو پڑے گا۔ اتنی بڑی بات چھپی تو رہ بھی نہیں سکتی۔ بہتر ہوگا کہ اسے یہ بات تنہائی میں نہ معلوم ہو نہ جانے کیا ردِعمل ہوگا اس کا۔ وہ بہت شدت سے چاہتی ہے تاجو کو۔ جب سے گرفتار ہوئی ہے، اس کے دماغ میں صرف یہ سوال گونج رہا ہے کہ تاجو کہاں ہے۔ تفتیشی افسروں کے علاوہ اس نے مجھ سے بھی یہ سوال کیا تھا۔ اس کا ذہن مسلسل اسی میں الجھا ہوا ہے۔ اسے خیال ہی نہیں آسکا کہ اپنے موبائل پر وہ کسی بھی چینل کی خبریں سن سکتی ہے۔"
شیخ جواد سوچ میں ڈوبا ہوا کسی جانب دیکھتا رہا۔
"میری بیوی بہت سمجھ دار ہے۔" کرنل نے کہا۔ "اسے بلا کر بتاتا ہوں کہ وہی یہ اطلاع شیریں کو دے۔ پھر جو بھی ردِعمل ہو، میری بیوی میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ شیریں کو سنبھال لے گی۔"
لیکن آدھے گھنٹے بعد یہ ہوا کہ جب کرنل کی بیوی نے شیریں کو ایک بری خبر سنانے کے لیے تمہید باندھ کر اسے ذہنی طور پر ہر بات کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی تو شیریں کا چہرہ بتدریج پھیکا پڑتا چلا گیا۔ اس نے تمہید ہی سے سمجھ لیا تھا کہ آخر کار اسے کیا سننا تھا۔
اور جب اصل خبر کرنل کی بیوی کی زبان پر آئی تو شیریں کا سارا جسم لرز رہا تھا، رنگت بالکل پھیکی پڑ گئی تھی اور اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں نے جیسے سرگوشی کی تھی۔
"تاااجووو!"
اور اس کا جسم ایک طرف لڑھک گیا تھا۔ وہ شدید صدمے سے بے ہوش ہو گئی تھی۔
کرنل کی بیوی اور بیٹی بہ یک وقت چیخ پڑی تھیں۔ بیوی نے اپنے شوہر کو اور بیٹی نے باپ کو پکارا تھا۔
اس وقت کرنل اور شیخ جواد کمرے کے باہر، قریب ہی موجود تھے۔ کرنل، شیخ جواد کا ہاتھ پکڑے تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اس وقت کرنل کی بیوی شیریں پر جھکی اُسے جھنجوڑ رہی تھی۔
"پانی لاؤ!" اس نے اپنی بیٹی سے کہا اور کرنل کی طرف دیکھتے ہوئے گھبرائی آواز میں بولی۔ "کسی ڈاکٹر کو فون کیجیے۔"
اس کے آخری دو لفظ سننے سے پہلے ہی کرنل اپنا موبائل نکال چکا تھا۔
"اسپتال لے جانا پڑے گا۔" اس نے کہا اور موبائل پر کوئی نمبر ملانے لگا۔ شیخ جواد اس وقت دم بخود کھڑا اپنی بے

ہوش بیٹی کو تکے جا رہا تھا۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر ایمبولینس آگئی۔
کرنل نے اس وقت اپنے اختیارات سے کام لیا تھا۔ شیریں کو فوری طور پر ملٹری اسپتال پہنچا دیا گیا۔
توقع کی جا رہی تھی کہ ڈاکٹر جلد ہی شیریں کو ہوش میں لے آئیں گے لیکن خاصا وقت گزرنے کے بعد انہیں یہ خبر سننے کو ملی کہ شیریں ''کوما'' میں چلی گئی تھی اور فوری طور پر یہ نہیں بتایا جا سکتا تھا کہ وہ کب تک نارمل ہو سکے گی۔
شیخ جواد بہرحال باپ تھا۔ بیٹی سے لاکھ برہم سہی لیکن اس کے چہرے کا رنگ فق پڑ گیا تھا۔ کرنل نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔
''ہمت رکھیے شیخ صاحب!'' اس نے کہا۔ ''ڈاکٹر نے 'فی الحال' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ممکن ہے چند گھنٹوں میں یا کل تک وہ کچھ بتا سکیں۔''
''مجھے ترکی کا ڈکٹیٹر یاد آ گیا ہے۔'' شیخ جواد کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔
''جمال گرسل۔''
شیخ جواد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ برسوں کوما میں رہا تھا اور شاید اسی حالت میں مر گیا تھا۔''
''اتنا مایوس کیوں ہو رہے ہیں آپ؟''
شیخ جواد کچھ نہیں بولا لیکن اس کی مایوسی درست ثابت ہوئی۔ پھر ایک دن نہیں، کئی دن نہیں، کئی ہفتے گزر گئے لیکن شیریں نے آنکھیں نہیں کھولیں۔
اس سارے عرصے میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کرنل اسلم اپنے فرائض سے غافل ہو کر صرف اسپتال کا ہو کر رہ جاتا۔ بلیک برڈ گروپ کے گرفتار شدگان سے پوچھ گچھ جاری تھی۔ اس پوچھ گچھ سے کئی ایم این ایز اور ایم پی ایز کے بارے میں بھی تحقیقات شروع کی جا چکی تھی۔ دو کے خلاف جلد ہی ثبوت بھی مل گئے اور انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ حکومت نے وہ سارا معاملہ فوج پر ہی چھوڑ دیا تھا، پولیس کو منتقل نہیں کروایا تھا۔
لیکن اس ساری مصروفیت کے باوجود وہ شیریں کی طرف سے بالکل بے خبر نہیں رہا اور پھر ایک دن اسے ڈاکٹر ہی نے بتایا کہ شیریں حاملہ تھی۔
شیریں کے معاملے میں وہ شروع ہی سے جذباتی رہا تھا۔ یہ خبر سن کر سناٹے میں آ گیا۔
''یہ کیا ہو گیا کرنل!'' ملاقات ہونے پر شیخ جواد نے پریشان لہجے میں اس سے کہا۔
''جو قدرت کو منظور ہے، وہی ہوا۔'' کرنل نے جواب دیا۔ ''لیکن یہ خیال دل میں مت لائیے گا کہ شیریں پر کوئی تہمت لگائی جا سکتی ہے۔ بچہ اگر پیدا ہوا تو وہ ناجائز نہیں ہو گا۔ شیریں نے تاجو سے شادی کر لی تھی۔''
شیخ جواد چپ رہا۔
وقت کے پر پھڑپھڑاتے رہے۔ بلیک برڈ کے لوگوں کو عدالتوں سے مختلف سزائیں ملتی رہیں۔ اسی دورانیے میں یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ پروین کو جیل ہی میں نہ جانے کیا مل گیا جسے کھا کر اس نے خودکشی کر لی۔
اس نے خودکشی کیوں کی؟
اس بارے میں قیاس آرائیاں تو ہوئیں مگر کوئی نہ جان سکا کہ وہ بھی تاجو کے بغیر زندہ نہیں رہنا چاہتی تھی۔
پھر وہ وقت بھی آیا جب شیریں نے ایک بچے کو جنم دیا لیکن کوما سے باہر نہیں آئی اور بچہ جب چند ماہ کا تھا تو وہ کوما ہی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو گئی۔
بچے کی پیدائش کے وقت ہی اس کی پرورش کی ذمّے داری شیخ جواد نے قبول کر لی تھی۔
''ایک وجہ سے یہ کوئی معمولی ذمّے داری نہیں ہے شیخ صاحب!'' شیریں کی موت کے چند دن بعد کرنل نے شیخ جواد سے کہا تھا۔ ''اپنے ذہن میں یہ خیال ضرور رکھیے گا کہ بچے کا ڈی این اے وہی ہو گا جو اس کے باپ کا تھا۔ اگر آپ نے پرورش میں احتیاط نہ برتی تو معاشرے کو ایک اور تاجو بھی مل سکتا ہے، اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں ہر دور میں تاجو تو ملتے ہی رہیں گے، اگر ہم اپنے معاشرے میں توازن نہ لا سکے، اگر طاقت کے ارتکاز کو روکا نہیں جا سکا، غربت اور بے روزگاری ختم نہیں کی جا سکی، ظلم کا احتساب نہیں کیا جا سکا تو...... تاجو پیدا ہوتے ہی رہیں گے۔ یہ جو آج کل دو دو چار چار ہزار روپوں کے لیے ڈاکے پڑنے لگے ہیں تو اس کی وجوہات بھی ہیں۔ ڈاکا مارنے والے پیشہ ور مجرم نہیں ہیں۔ ان میں سے کوئی اپنے بچوں کو فاقوں سے بچانے کے لیے ڈاکے مار رہا ہے تو کوئی اپنے ماں باپ کے علاج کے لیے ایسی راہوں پر چل نکلا ہے۔ اگر آج کے معاشرے کی زہریلی بنیادیں ختم نہیں کی گئیں تو ایسے ہی درخت پیدا ہوتے اور پھلتے پھولتے رہیں گے۔''
شیخ جواد اس وقت کرنل کا منہ تکنے لگا تھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہ آ سکا ہو کہ وہ سب کچھ ایک فوجی نے کہا تھا یا کسی سوشل ایکٹیوسٹ نے؟

☆☆☆



شکستہ گڑیا

ایچ اقبال

کچھ لوگ شجر کے مانند مزاج رکھتے ہیں... زمین کے اوپر سایہ بن کر ٹھنڈک پہنچانا اور... زمین کے اندر دور تک اپنی جڑیں پھیلائے رہنا... جن پر سارے موسم اترتے ہیں مگر وہ کسی موسم کا تعاقب نہیں کرتے۔ جن کی ہریالی آنکھوں کو تازگی اور ویرانی دلوں میں درد جگاتی ہے مگر... ان کا دوسرا رخ... اپنی انا کے گنبد میں یوں قید رہنا کہ تنہائی میں اپنی ہی بازگشت سنتے رہنا، سلگتی یادوں سے اٹھتا دھواں کچھ تصویریں بناتا اور پھر مٹا دیتا... مگر آگہی کے اُس ایک لمحے نے جیسے اس کی ذات کے گرد حصار کو یوں توڑ ڈالا کہ اس کی ہر سمت رستے بکھر گئے۔ خوابوں کا تاج محل اگرچہ مسمار ہوا لیکن بنیادوں نے پھر سے تعمیروتعبیر کی راہوں پر ڈال دیا۔ وہ جو ریت کے مانند بکھر گیا تھا، جذبات کے تلاطم نے وہ عزم عطا کیا کہ اس شمع کو محفل سے چرا کر اپنے گھر کا چراغ بنا لیا۔ یہ اور بات کہ کتنے ہی طوفان اور موسم آئے اور گزر گئے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی بھیڑ میں اگر کسی کا دلبر کھو جائے تو روگ تمام عمر پیچھا نہیں چھوڑتے مگر... وہ نہ تو کوئی روگ پالنے کا قائل تھا اور نہ ہی کسی کو راہ میں حائل کرنے کا... پھر کیسے محبت اس کی طرف مائل نہ ہوتی۔

شکست و ریخت کی اذیتوں میں مبتلا دو حساس دلوں کی دھڑکنوں کا احوال

یاسمین اور عارف کی کاریں ایک ساتھ ہی شہر کے اس بڑے پارک تک پہنچیں جہاں لوگ تفریحاً یا جوگنگ کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ عارف اور یاسمین کی بیشتر ملاقاتیں اسی پارک میں ہوا کرتی تھیں۔ گزشتہ دو برسوں میں وہ بہت کم کسی اور جگہ ملے تھے۔ یاسمین کی عمر اب ستائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ عارف یقیناً تیس سال سے



زیادہ کا ہو چکا تھا۔ دو سال قبل ان کی ملاقات ایک کیفے میں ہوئی تھی۔ یاسمین نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ عارف کی شاعری بہت پسند کرتی تھی۔ دو سال قبل ہی عارف کا دوسرا مجموعۂ کلام بازار میں آیا تھا۔ یاسمین وہ خریدنے کے بعد ہی چائے پینے کی غرض سے کیفے میں گئی تھی۔ عارف کے دوسرے مجموعۂ کلام کے ٹائٹل کی بیک پر عارف کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی جس نے یاسمین کو مسحور کر دیا تھا۔

یہ تو اپنی خوب صورت نظموں ہی کی طرح خوب صورت ہے، یاسمین نے تصویر دیکھتے ہوتے سوچا تھا۔ مگر کیفے میں اسے دیکھ کر تو وہ چند لمحے کے لیے دم بہ خود رہ گئی اور اسے خیال آیا کہ یہ تو اپنی تصویر سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔

عارف اس وقت چائے پیتے ہوئے ایک کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا اور اس کی کیفیت یہ تھی جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو۔ شاید کچھ شعر ہی اچانک دماغ میں آگئے ہوں اور وہ لکھنے بیٹھ گیا ہو۔

یاسمین بے اختیار اس میز کی طرف کھنچتی چلی گئی، جیسے دھات کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا مقناطیس کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔

''آٹوگراف پلیز!'' یاسمین کی آواز نے عارف کو خاصا چونکا دیا تھا۔

ان دونوں کی وہ پہلی ملاقات ایک ایسی محبت کا عنوان بن گئی جس نے ان دونوں ہی کو بے حد آزمائشوں میں ڈالے رکھا۔

عارف نے آٹوگراف دیتے وقت اخلاقاً یاسمین سے بیٹھنے کے لیے بھی کہا اور چائے کی دعوت بھی دی جو یاسمین نے فوراً قبول کر لی تھی۔ اس وقت اس کے سان گمان میں نہیں تھا کہ وہ ایک ایسا دروازہ کھول رہی ہے جس سے ایک گرجتا ہوا طوفان اس کے وجود میں داخل ہو جائے گا۔

چائے پینے کے دوران میں یاسمین نے عارف کی کئی نظموں پر مختلف زاویوں سے اتنے بھرپور تجزیے کیے کہ عارف اس کی سخن فہمی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

خود یاسمین بھی معمولی شکل صورت کی لڑکی نہیں تھی۔ اس کا رنگ تو کچھ ایسا سرخ وسفید نہیں تھا جو دلکش نقش ونگار کو نکھار دیتا ہے تاہم اس کی ہرنوں جیسی غیر معمولی طور پر بڑی بڑی آنکھیں، تیکھے نقوش اور متناسب جسم ایسا تھا کہ وہ جدھر سے گزرتی، بہت سی نگاہیں اس پر جم کر رہ جاتی تھیں۔

اسی ملاقات میں عارف کو بھی گویا احساس ہوا کہ اس کی نظموں اور غزلوں کا تخیلاتی محبوب، انسانی جسم میں ڈھل کر اس کے سامنے آگیا ہے۔ اسی ملاقات میں دونوں نے کنٹیکٹ نمبرز کا تبادلہ بھی کرلیا، پھر اس کے بعد تو کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جب عارف اسے فون نہ کرتا ہو۔ اس کی باتوں نے یاسمین پر ظاہر کردیا کہ وہ بہت تیزی سے عارف کے رگ وپے میں رچتی بستی چلی جارہی تھی۔

یہ احساس ایسا تھا کہ یاسمین کانپ گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ عارف کی کال ریسیو نہیں کرے گی لیکن وہ اس فیصلے پر قائم نہیں رہ سکی۔ اس نے محسوس کیا کہ خود اس کے صفحۂ دل پر بھی عارف کا نام لکھا جاچکا ہے۔

پھر موبائل فون پر باتیں کرتے ہوئے عارف کے اصرار پر ان کی دوسری ملاقات اس پارک میں ہوئی۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے ان ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان ملاقاتوں میں یاسمین کی کوشش ہوتی تھی کہ موضوع گفتگو عارف کی شاعری تک محدود رہے لیکن عارف کسی نہ کسی طرح اشاروں کنایوں میں اپنے دل کی حالت بیان کرنے کی کوشش بھی کر ڈالتا۔ ان باتوں کی یاد... یاسمین کو تنہائی میں نہ جانے کیوں رلاتی تھی۔

عارف کے مجموعوں میں شائع شدہ دیباچوں وغیرہ سے یاسمین یہ تو جان چکی تھی کہ عارف ایک بڑی کاروباری شخصیت کنور شمشاد کا بیٹا تھا۔ یہ جاننے کے بعد وہ ایک پرشکوہ زندگی کے خواب دیکھ سکتی تھی لیکن اس نے ایسا کوئی خواب نہیں دیکھا۔

جب ان کی ملاقاتوں کو سات آٹھ ماہ گزر چکے تو ایک ملاقات میں جب یاسمین نے عارف کی ایک غزل کو موضوع گفتگو بنایا تو پہلی مرتبہ عارف پر یکایک جھنجلاہٹ طاری ہوگئی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ اب میں شاعری ہی چھوڑ دوں۔ تم گھوم پھر کر اسی کو گفتگو کا موضوع بنائے رکھتی ہو۔ میں اشاروں ہی اشاروں میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں اب تک، اور تم ناسمجھ بھی نہیں ہو۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تمہارے دل میں بھی میرے لیے وہی جگہ بن چکی ہے جو میرے دل میں تمہارے لیے ہے۔''

یاسمین چند لمحوں کے لیے گنگ سی ہوکر رہ گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دماغ میں سناٹا چھا گیا ہو۔ عارف کی زبان پر وہ بات واضح طور پر آگئی تھی جس سے اسے ہمیشہ ڈر لگا رہتا تھا۔

''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں عدیلہ؟'' عارف کچھ توقف سے بولا۔

یاسمین نے پہلی ملاقات میں اسے اپنا نام عدیلہ ہی بتایا تھا۔ اس غلط بیانی کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ بس یوں ہی یاسمین کے دماغ میں یہ خیال آیا تھا کہ پہلی ہی ملاقات میں کسی نوجوان کو اپنا صحیح نام نہیں بتانا چاہیے۔ عارف نے آٹوگراف دیتے وقت اس کا نام پوچھا تھا۔ اس کے بعد وہ نشست قدرے طویل ہوگئی تھی۔ اس نشست کی طوالت ہی کے باعث بعد میں یاسمین کو خیال آیا تھا کہ اس نے غلط نام بتا کر ٹھیک نہیں کیا، لیکن جب غلطی ہوجائے تو اس کا ازالہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ بعد کی ملاقاتوں میں اسے کئی بار خیال آیا کہ عارف کو اپنا صحیح نام بتادے لیکن وہ اس خیال سے تذبذب کا شکار رہی کہ جو غلط بیانی وہ کرچکی تھی، اس کے بارے میں عارف نہ جانے کیا خیال کرے۔

''جواب دو عدیلہ!'' عارف پھر بولا۔

''تم غلط نہیں کہہ رہے ہو عارف!'' یاسمین نے نظریں جھکائے ہوئے جواب دیا۔ ''دراصل میں چاہتی تھی کہ...... کہ...... بس......'' وہ چپ ہوگئی۔

''بس...... کیا مطلب! بات پوری کرو عدیلہ!''

''بس یہ چاہتی تھی میں کہ یہ بات مناسب وقت پر ہی زبان پر لائی جائے۔''

''مناسب وقت سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''یعنی جب ان باتوں کا کوئی نتیجہ بھی نکل سکے۔''

''نتیجہ؟''

''تم میری زبان سے کیوں کہلوانا چاہتے ہو......؟ ابھی جو تم نے ایک واضح بات کی ہے تو کیوں کی ہے؟''

''اس لیے کہ اب میں مزید انتظار نہیں کرسکتا۔ اس سے زیادہ صاف بات یہ ہے کہ اب میں تم سے جلد از جلد شادی کرلینا چاہتا ہوں۔''

یاسمین نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اسی کو میں نے مناسب وقت کہا تھا۔ میں ابھی شادی نہیں کرسکتی عارف!''

"کیوں؟"
"میرا گھریلو معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔"
"نہ جانے کیوں، میں نے آج تک تمہارے گھر ے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں چھیڑی۔ کبھی تمہارے لدین یا بھائی بہنوں کے بارے میں نہیں پوچھا، لیکن اب ت آگئی ہے تو مجھے بتاؤ۔ کیا مسئلہ ہے تمہارے گھر کا؟...... یا ایسا معاملہ ہے کہ تم شادی نہیں کرسکتیں!"
"میری کچھ ذمے داریاں ہیں عارف!" یاسمین کی واز میں لرزش تھی۔ "جب میرے ڈیڈی کا انتقال ہوا تھا ......" وہ چپ ہوگئی۔ اسے جھوٹ بولنے میں دقت محسوس رہی تھی۔
"تو؟" عارف بے تاب ہوا۔
"پلیز عارف!...... آج اس موضوع کو یہیں ختم ردو۔ ہم پھر کسی وقت بات کریں گے اس بارے میں!"
"ابھی میں نے کہا تھا نا کہ اب میں انتظار نہیں رسکتا۔ اس کی ایک وجہ بھی ہے، وہ میں تم سے چھپاؤں گا یں۔ ابھی بتاؤں گا تمہیں، لیکن پہلے تم اپنے مسئلے کے رے میں بتاؤ۔"
"اچھا!" یاسمین نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے جھوٹ بولنے کی ہمت کی۔ "ڈیڈی کے انتقال کے بعد ان کا کاروبار ممی نے سنبھال لیا تھا۔ خود ڈیڈی ہی نے ان میں یہ کاروباری سوجھ بوجھ پیدا کی تھی۔ میں اس وقت سیکنڈ ایر کی طالبہ تھی لیکن ممی نے مجھ سے کہا کہ میں اپنی پڑھائی جاری رکھتے ہوئے، کاروبار میں بھی تھوڑی بہت دلچسپی لیتی رہوں، دراصل ڈیڈی ہی کی طرح وہ بھی یہی چاہتی تھیں کہ اگر انہیں کسی وقت خدانخواستہ کچھ ہوجائے تو کاروبار کی ذمے داری میں سنبھال سکوں۔"
روش پر ٹہلتے ہوئے وہ دونوں ایک بینچ کے قریب پہنچ گئے تھے۔
"بینچ خالی ہے۔" عارف بول پڑا۔ "یہاں بیٹھ جاتے ہیں، مجھے محسوس ہورہا ہے کہ تم تھکن محسوس کررہی ہو۔"
لیکن حقیقت یہ تھی کہ جھوٹ بولتے ہوئے یاسمین کے اعصاب پر کچھ ایسا دباؤ پڑ رہا تھا کہ اس کی چال بھی متاثر ہوگئی تھی۔ اسی کو عارف نے اس کی تھکن سمجھا تھا۔
وہ دونوں بینچ پر بیٹھ گئے۔ یاسمین کھوئی کھوئی سی نظر آرہی تھی۔ عارف کے ٹوکنے پر اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ "جب میں فورتھ ایر میں تھی تو ممی کی صحت خاصی خراب رہنے لگی تھی۔ اسی لیے مجھے کاروباری معاملات پر زیادہ توجہ دینا پڑی۔ اس سے ایک نقصان تو میری پڑھائی کا ہوا۔ میں پاس تو ہوگئی لیکن کوئی اچھی ڈویژن نہیں لاسکی لیکن دوسری

الیکشن کی برکتیں

ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر لیڈر حضرات اتنے ہی پیٹ کے ہلکے تھے تو اب تک کیسے خاموش بیٹھے تھے؟ یہ جو اچانک انہیں ایک دوسرے کی برائیوں کا خیال آگیا ہے اور فطرتیوں اور تبریوں کی طرح مخالفین کے لتے لینے لگے ہیں تو کیا اس سے قبل ان کی معلومات کا یہ خانہ خالی تھا یا محض انتخابات کا انتظار تھا؟ بہرصورت کچھ بھی ہو اتنی بات ماننا پڑے گی کہ یہ سب الیکشن کی برکتیں ہیں جو ہر شخص زباں دانی کے میدان میں خم ٹھونک کر نکل آیا ہے۔ ہر ایک اپنی جگہ الو کی بنا ہوا ہے اور اسے یہ خیال تک نہیں آتا کہ بھائی! تیرے ایک نہیں دو کندھے ہیں اور ان میں سے ایک اتر بھی سکتا ہے۔ اصل فیصلہ تو الیکشن کے بعد ہونا ہے ابھی تو صرف ڈنڑ بیٹھکوں سے ہی ایک دوسرے کو دہلایا دبکایا جارہا ہے اور محض "بڑھکوں" اور چیلنجوں پر گزارا کیا جارہا ہے۔

* * * *

سرکس

گزشتہ کچھ دنوں سے کراچی میں ایک سرکس چل رہا تھا بڑے اشتہار چھپ رہے تھے اور بے شمار لوگ سرکس کے فن کاروں کے کرتب دیکھنے جاتے تھے۔ کئی بار رات کو وہاں سے گزر ہوا تو دیکھا، یار لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ تماشائی ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ خوب رش لے رہا تھا لیکن وہ روز پہلے وہاں سے گزرنا ہوا تو دیکھا کہ سرکس کا تنبو وغیرہ گرایا جارہا تھا اور سازوسامان سمیٹا جارہا تھا۔ تعجب ہوا کہ اس قدر چالو بزنس کو بند کیا جارہا ہے؟ آگے بڑھ کر ایک صاحب سے دریافت کیا "کیوں صاحب سرکس بند کیوں کر دیا؟ یہ تو خاصا رش لے رہا تھا؟" جواب میں انہوں نے ایک نظر دیکھا اور ڈھیلا سا منہ بنا کر بولے۔ "صاحب! الیکشن کے دن آگئے ہیں۔ گلی گلی محلہ محلہ جلسے شروع ہوگئے ہیں۔ ان حالات میں ہمارا سرکس کون دیکھنے آئے گا؟"
شفیع عقیل کی کتاب "سرخ سفید سیاہ" سے اقتباس

طرف یہ بہتری آئی کہ میں نے کاروباری معاملات کو تقریباً پوری طرح سمجھ لیا۔ اس کے بعد میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ممی کو آرام کرنے دوں۔ تمام معاملات میں نے خود سنبھال لیے۔ کوئی زیادہ پیچیدگی آجاتی ہے تو گھر پر ممی سے مشورہ کرلیتی ہوں۔ ممی کے مشورے پر میں نے یہ بھی کیا ہے کہ اپنی چھوٹی بہن کو بھی کاروبار میں تھوڑا بہت انوالو کرلیا ہے۔ اب وہ بھی گریجویشن کرنے والی ہے۔ ابھی میں اس پر زیادہ دباؤ نہیں ڈال رہی ہوں۔ بنیادی معاملات میں نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھے ہیں۔''

''تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ جب تک وہ کاروبار پوری طرح نہ سنبھال لے، تم شادی نہیں کرسکتیں؟'' عارف بول پڑا۔

''یہ بات نہیں۔ دراصل میرا ایک بھائی بھی ہے۔ ممی نے اسے ایک کورس کرنے کے لیے باہر بھیجا ہے۔ وہ آجائے گا تو وہی سنبھالے گا سارا کاروبار۔''

''وہ کب آئے گا؟''

''لگ بھگ ایک سال بعد۔'' یاسمین نے جواب تو دے دیا لیکن اس خیال سے اس کا دل بیٹھنے لگا کہ اگر عارف مزید ایک سال انتظار کرنے پر آمادہ ہوگیا تو وہ سال بھر بعد اس کو مزید کس طرح ٹال سکے گی۔

''سال......'' عارف بے چینی سے بڑبڑایا۔ ''اتنا انتظار میں نہیں کرسکتا عدیلہ......! ڈیڈی اب جلد از جلد میری شادی کردینا چاہتے ہیں۔ تمہیں ڈیڈی کے انداز فکر پر تعجب ضرور ہوگا۔ میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کروں گا۔ اس پر وہ کہنے لگے کہ اس پر انہیں کوئی اعتراض نہیں لیکن مجھے ایک شادی ان کی خواہش کے مطابق بھی کرنا پڑے گی۔''

''کیا مطلب!'' یاسمین کے منہ سے نکلا۔

عارف دھیرے سے لیکن کسی قدر طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ''خود انہوں نے بھی دو شادیاں کی تھیں۔ ایک اس لڑکی سے جو انہیں پسند تھی اور دوسری اس سے جوان کے ڈیڈی کو پسند تھی۔''

''اوہ! تمہاری سوتیلی والدہ بھی ہیں؟''

''اب تو کسی والدہ بھی نہیں۔'' عارف نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''کئی سال ہوئے، دونوں کا انتقال ہوچکا ہے۔ اس کے سال بھر بعد سے ڈیڈی کی خواہش ہے کہ میری شادی کردیں، میں انہیں اس طرح ٹالتا رہا ہوں کہ ابھی مجھے کوئی لڑکی پسند نہیں آئی۔ اب کل ڈیڈی نے مجھے فیصلہ سنا دیا ہے کہ اب وہ مہینے بھر کے اندر میری شادی کردینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ جب کوئی لڑکی مجھے پسند آجائے تو میں اس سے بھی شادی کرلوں۔''

''تمہارا خیال ہے، میں یہ گوارا کرلوں گی کہ......''

''میں سمجھ گیا، تم کیا کہنا چاہتی ہو۔'' عارف نے اس کی بات کاٹی۔ ''نہیں عدیلہ! تمہیں کوئی سوتن برداشت نہیں کرنا پڑے گی۔ اتنے عرصے سے ہمارا ساتھ ہے، میں تمہیں بہت اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔ تم بہت ذہین ہو۔ تم ڈیڈی کے دل میں اس طرح گھر لوگی کہ وہ میری دوسری شادی کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیں گے۔''

''اور اگر ایسا نہ ہوا تو؟'' یاسمین نے خوامخواہ کہا۔ یہ تو وہ طے کرچکی تھی کہ عارف سے شادی نہیں کرے گی۔

''تو......'' عارف نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''تو میں تمہیں ساتھ لے کر گھر چھوڑ دوں گا لیکن دوسری شادی نہیں کروں گا۔ ڈیڈی ناراض ہوں گے تو ہوجائیں، مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ میں ان کی جائداد سے محروم ہوسکتا ہوں تم ہوجاؤں! میری جائداد تو تم ہوگی عدیلہ!''

''لیکن میرے بھائی کے آنے میں تو ابھی......''

''وہ تو تم مجھے بتا چکی ہو۔'' عارف نے اس کی بات کاٹی۔ ''لیکن اب تمہیں کوئی تدبیر کرنا ہوگی عدیلہ......! اگر تم سے میری شادی نہیں ہوئی تو ڈیڈی نہ جانے کس سے میری شادی کردیں۔''

''تو کرلینا۔'' عدیلہ کے منہ سے نکلا۔

''کیا!'' عارف حیرت سے بولا۔ ''تم مجھ سے بعد میں شادی کروگی؟ ایک سوتن برداشت کرلوگی؟''

''نہیں۔'' عدیلہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں تمہیں بھولنے کی کوشش کروں گی عارف......! تم بھی کسی طرح مجھے بھلا دینا۔''

''یہ ناممکن ہے۔'' عارف جوشیلا ہوگیا۔ ''میں تمہیں نہیں بھلاسکتا۔''

''سب کچھ ممکن ہوتا ہے عارف!'' یاسمین کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

''یہ ممکن نہیں ہوگا۔ میں نے ڈیڈی کی پسند کی شادی کرلی تو گھٹ گھٹ کر مرجاؤں گا۔ تمہیں نہیں بھول سکوں گا۔ پلیز عدیلہ!......کوئی راستہ نکالو!''

لیکن یاسمین کیا راستہ نکالتی۔ وہ تو خود چاہتی تھی کہ عارف سے اس کی شادی نہ ہو۔ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے اسے خون کے آنسو رونا پڑتا لیکن اسے کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ تنہائی میں وہ اسی خیال سے رو پڑتی

تھی کہ وہ عارف سے شادی نہیں کرسکتی لیکن اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر وہ عارف سے ملتی بھی رہی تھی۔
اس وقت گفتگو اس لیے آگے نہیں بڑھ سکی کہ یاسمین کے موبائل پر کال آگئی تھی۔
''جی ممی!'' اس نے موبائل کان سے لگایا۔
''کہاں ہو اس وقت؟...... خیر کہیں بھی ہو، فوراً گھر آؤ۔ ایک ضروری بات کرنا ہے۔'' دوسری طرف سے کرخت نسوانی آواز آئی۔
''آتی ہوں ممی!''
یاسمین رابطہ منقطع کرتے ہوئے جلدی سے کھڑی ہوئی۔ ''مجھے اب جانا ہوگا عارف! ممی نے فوراً بلایا ہے مجھے۔''
''یہ مسئلہ کب حل ہوگا؟'' عارف نے بے تابی سے پوچھا۔
یاسمین نے پارک کے پھاٹک کی طرف بڑھنا شروع کردیا تھا۔
''ہم اس بارے میں اگلے ہفتے بات کریں گے۔''
''اگلے ہفتے کیوں؟'' عارف نے تیزی سے پوچھا۔
''ایک اہم کاروباری معاملہ ہے۔ میں کل صبح کی فلائٹ سے اسلام آباد جارہی ہوں۔ واپسی ایک ہفتے بعد ہوگی۔''
''میرے لیے تو بڑی پریشانی ہوجائے گی عدیلہ!'' عارف حواس باختہ سا ہوگیا۔ ''میں تو آج صبح ڈیڈی سے کہہ چکا ہوں کہ میں نے لڑکی پسند کرلی ہے۔ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن یہ معاملہ اگر ٹلے گا تو پھر وہ اصرار کریں گے کہ میں ان کی پسند کی لڑکی سے شادی کرلوں۔ ایسی صورت میں میرے لیے صرف یہی ایک راستہ رہ جائے گا کہ میں گھر چھوڑ دوں۔ خواہ ڈیڈی کتنا ہی ناراض ہوں۔''
''ہرگز نہیں عارف......! ایسا ہرگز نہ کرنا۔ تم کو میری قسم ہے۔''
''کیا کہہ رہی ہو عدیلہ!'' عارف پریشان ہوگیا۔
''مجھے ڈیڈی کی پسند کی شادی کرنا پڑجائے گی۔''
''تو کرلینا۔''
''عدیلہ!'' عارف کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔ وہ حیرت سے یاسمین کی طرف دیکھتا رہ گیا۔
''ہاں۔'' یاسمین نے نم ناک آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''پہلی بار ایک بات کہی ہے میں نے......! مانو گے نہیں؟''
''لیکن پھر عدیلہ، تمہیں ایک سوتن......''
''وہ سب بعد میں دیکھا جائے گا۔''

عارف یاسمین کے ساتھ اس کی کار کے قریب جارکا تھا۔ یاسمین چابی سے کار کا دروازہ کھولنے لگی۔
''عدیلہ! میرے لیے بہت پریشانی ہوجائے گی۔''
عارف پاگل سا ہوا جارہا تھا۔
یاسمین نے دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ اس نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو تم اپنا گھر ہرگز نہیں چھوڑو گے۔''
کار حرکت میں آچکی تھی۔
''لیکن عدیلہ!'' عارف نے پاگلوں کی طرح کار کے ساتھ دوڑنا چاہا مگر یاسمین نے اتنی تیزی سے رفتار بڑھائی کہ وہ کار کے ساتھ دوڑتے ہوئے اپنی بات مکمل نہیں کرسکا۔ اسے رکنا پڑا اور وہ حسرت سے یاسمین کی کار کی طرف دیکھتا رہ گیا جو تیزی سے دور ہوتی چلی جارہی تھی۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکا کہ تیز ڈرائیونگ کرتے ہوئے بھی یاسمین کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔
''کیا ہوگا؟'' وہ سوچ رہی تھی۔ ''کیا ہوگا اب؟''
اس کی شدید ترین خواہش یہ تھی کہ عارف اسی لڑکی سے شادی کرلے جسے اس کے باپ نے اس کے لیے پسند کیا تھا، لیکن وہ محسوس کررہی تھی کہ ایسا نہیں ہوسکے گا۔ عارف اس لڑکی سے شادی نہیں کرے گا۔
دوسری صورت کیا ہوسکتی ہے؟ یاسمین کا دماغ برابر کام کرتا رہا۔ یہ سوال اس کے دماغ میں گونجتا رہا کہ دوسری تدبیر کیا ہوسکتی ہے؟ یہ سوال اتنا پیچیدہ تھا کہ جواب میں کوئی بات اس کے ذہن میں نہیں ابھر رہی تھی، مگر پھر یکایک ہی اسے ایک ایسا خیال آیا کہ اس کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔
پہلے تو وہ ہمیشہ یہی سوچتی رہی تھی کہ وہ زندگی بھر شادی نہیں کرے گی اور عارف کی یادوں کے سہارے زندہ رہ لے گی لیکن اب پہلی مرتبہ اسے خیال آیا تھا کہ وہ کسی سے شادی کرلے، کسی سے بھی......! اس صورت میں عارف اسے بے وفا جیسے نہ جانے کتنے نام دے ڈالتا۔ دے ڈالے! یاسمین سوچ رہی تھی۔ کوئی اور تدبیر ممکن نہیں عارف سے شادی نہ کرنے کی۔
دل میں درد اٹھتا رہا، آنکھوں میں آنسو تیرتے رہے لیکن وہ اپنے فیصلے پر جمی رہی۔
کچھ دیر بعد جب اس کی کار ایک خوب صورت بنگلے کے احاطے میں داخل ہوئی۔ پھاٹک پر ''الماس نادر'' کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی، یہ یاسمین کی ماں کا نام تھا۔
کار کھڑی کرکے یاسمین نے ٹشو پیپر سے اپنی آنکھیں

خشک کیں۔ کار سے اتر کر وہ خود کو سنبھالے رکھنے کی کوشش کرتی ہوئی بنگلے میں داخل ہوئی۔ فوراً ہی الماس نادر سے سامنا ہوگیا۔ اس کے ساتھ یاسمین کی چھوٹی بہن ریشماں بھی تھی۔

''آؤ باجی!'' ریشماں مسکراتی ہوئی بولی۔ ''تمہارے لیے ممی کی پاس بہت اچھی خبر ہے۔''

یاسمین استفہامیہ نظروں سے الماس نادر کی طرف دیکھنے لگی۔

''تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟'' الماس نادر نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ یاسمین کی بے حد کوشش کے باوجود اس کے چہرے نے اس کی کیفیت کی چغلی کر دی تھی جسے الماس نادر جیسی جہاں دیدہ عورت بہ آسانی سمجھ گئی۔

''نہیں تو۔'' یاسمین نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''کالج کی ایک دوست کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر نکل گئی تھی۔ بہت تھک گئی ہوں۔ جی چاہ رہا ہے، فوراً بستر پر جا گروں۔''

الماس نادر نے دو تین لمحے تک یاسمین کی طرف غور سے دیکھنے کے بعد کہا۔ ''رانی بیگم آئی تھی آج......! میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا لیکن بہت دن ہوئے......کوئی ایک مہینا پہلے اس سے کہا تھا میں نے کہ وہ تمہارے لیے کوئی اچھا سا رشتہ ڈھونڈے۔ آج وہ بات لے کر آئی تھی مجھے اور تمہاری بہن کو تو رشتہ بہت ہی پسند آیا ہے۔''

لفظ ''رشتہ'' سنتے ہی یاسمین کا دل بڑی زور سے اچھلا تھا۔

الماس نادر کہتی رہی۔ ''تم اب پہلے جیسی رہی بھی نہیں ہو، ڈھلک گئی ہو۔ اب تمہاری جگہ ریشماں سنبھال لے گی۔ لاہور سے تمہیں ایک ہفتے میں واپس آنا ہے۔ یہ تمہارا آخری کام ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔'' یاسمین نے آہستہ سے کہا۔ اگرچہ خود اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ کسی سے شادی کرلے گی لیکن غیر متوقع طور پر یہ بات اس کے سامنے آئی تھی تو اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے سینے میں اس کا دل بیٹھتا ہی چلا گیا ہو۔

''اب میں جاؤں ممی؟'' وہ بولی۔ ''میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔''

الماس نادر اور ریشماں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ان کی حیرت کا سبب یہی تھا کہ یاسمین نے اس رشتے کے بارے میں ذرا بھی استفسار نہیں کیا تھا۔

الماس نادر بولی۔ ''یہ نہیں پوچھوگی کہ......''

''مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے ممی!'' یاسمین نے کہا۔ ''آپ جو فیصلہ کریں گی، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ پہلے بھی ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے آپ کے کسی فیصلے سے اختلاف کیا ہو......بس اب میں جا کے آرام کرتی ہوں۔''

وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

الماس نادر اور ریشماں حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔

یاسمین نے اپنے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کیا اور دوڑنے کے سے انداز میں بستر کے قریب جا کے اس پر گر پڑی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑا تھا۔ اس سیلاب کی شدت میں دھیرے دھیرے ہی کمی آسکی۔ اس کا ہاتھ سرہانے رکھے ہوئے عارف کے مجموعے پر پڑا۔ وہ اس کے سرہانے ہی رکھا رہتا تھا۔ یاسمین نے وہ اٹھا لیا اور اس میں چھپی ہوئی عارف کی تصویر پر نظریں جما دیں۔

''ہاں عارف!'' وہ قدرے توقف سے بڑبڑائی۔ اس کی بڑبڑاتی ہوئی آواز میں بھی لرزش تھی۔ ''بے وفا سمجھ لینا تم مجھے! جو دل چاہے سمجھ لینا، لیکن میرا دل تو جانتا ہے نا......! میں تم سے بے وفائی نہیں کروں گی یہ شادی کرکے!......یہ تو میری وفا ہوگی جس کی چوکھٹ پر میں خود کو قربان کروں گی۔''

اتنا کہتے کہتے یاسمین کی آواز اس کے حلق میں گھٹ گئی اور اس کی آنکھوں سے وہ سیلاب پھر امڈ پڑا جس کی شدت میں کمی آگئی تھی۔

✕✕✕

دوسری صبح ناشتے کی میز پر عارف کے ہاتھ سے سلائس چھوٹ کر فرائی انڈے کی پلیٹ میں گر پڑا۔ اس کے باپ کنور شمشاد نے بات ہی ایسی کہی تھی کہ بوکھلاہٹ میں عارف سے کچھ بھی سرزد ہوسکتا تھا۔

''ایک لڑکی کے لیے تمہارے رشتے کی بات شروع کرادی ہے میں نے۔'' کنور شمشاد نے کہا تھا۔ ''دو ایک دن بعد جواب دینے کے لیے کہا ہے لڑکی کی ماں نے...... اس کی طرف سے انکار کا امکان نہیں ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کی رسم ہے کہ لڑکی والے فوراً جواب نہیں دیتے۔''

''لیکن......ڈیڈی......''

"اب میں مزید تاخیر برداشت نہیں کروں گا۔" کنور شمشاد نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں اپنی اس بات پر اب بھی قائم ہوں کہ اگر تم کسی لڑکی کو پسند کرو گے تو میں اس سے بھی تمہاری شادی میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔ جب تم چاہو گے، تمہاری دوسری شادی بھی ہوجائے گی۔"

"میں نے آپ سے ایک بات اور بھی کہی تھی ڈیڈی!" عارف نظریں جھکائے ہوئے بولا۔ "آپ شاید بھول گئے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ....."

"مجھے یاد ہے۔" کنور شمشاد نے اس کی بات کاٹی۔ "تم چاہتے تھے کہ تمہاری پہلی شادی تمہاری پسند کی ہو۔"

"میں اب بھی یہی چاہتا ہوں۔"

"بہت دن سے تمہاری یہ بات سن رہا ہوں مگر تم نے اب تک کوئی لڑکی پسند نہیں کی۔" کنور شمشاد نے کہا۔ "آخر مجھے فیصلہ کرنا ہی پڑا۔ لڑکی ایسی ہے کہ تم بھی اسے ناپسند نہیں کرو گے۔ یاسمین نام ہے اس کا۔ اس کی ماں ایک بیوہ خاتون ہیں مگر مالی حالات اچھے ہیں۔ یاسمین کی ایک چھوٹی بہن بھی ہے۔ جوان وہ بھی ہوچکی ہے لیکن اس کا تمہارا کوئی جوڑ نہیں بنتا۔ وہ تم سے کافی چھوٹی ہے۔ یاسمین ہی مجھے تمہارے لیے مناسب معلوم ہوئی۔"

عارف کو اس وقت یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم کی جان نکلی جارہی ہو۔

"ناشتا تو کرو!" کنور شمشاد نے بیٹے کو گھورتے ہوئے کہا۔

عارف کا سلائس پلیٹ میں گرا ہوا تھا۔ وہ اس نے اس طرح اٹھایا جیسے کوئی وزنی چیز اٹھا رہا ہو۔ اس کا دماغ بھی جیسے ناکارہ ہوکر رہ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب اس معاملے کو کس طرح ٹالے۔

"رانی بیگم کو تو جانتے ہو نا تم؟" کنور شمشاد نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

"جی..... جی نہیں۔" عارف جیسے چونک کر بولا تھا۔ "میں آپ کے زیادہ تر دوستوں یا شناساؤں کو صرف چہروں سے پہچانتا ہوں، ناموں سے واقف نہیں ہوں۔"

"نیو ایئر کے فنکشن میں جو لوگ آتے ہیں، میں تعارف تو کراتا رہا ہوں ان سے تمہارا۔"

کنور شمشاد کے گھر پر نئے سال کی تقریب ہمیشہ ہوتی تھی۔

"شاید میں بھول گیا ہوں۔" عارف نے دھیمی آواز میں کہا۔

"خیر!" کنور شمشاد نے کہا۔ "وہ ایک اچھی خاتون ہیں۔ شوہر سے کسی اختلاف کے باعث انہوں نے علیحدگی تو اختیار کرلی ہے لیکن طلاق نہیں لی۔ ایک مرتبہ میں نے چند دوستوں کو چائے پر بلایا تھا، تب بھی وہ آئی تھیں۔ تم شاید اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ دراصل تمہارے رشتے کی بات انہی کے ذریعے شروع ہوئی ہے کیونکہ ان کا میل جول بہت زیادہ لوگوں سے ہے اس لیے کچھ عرصہ پہلے میں نے ان سے ذکر کردیا تھا کہ مجھے تمہارے لیے کسی اچھی لڑکی کی تلاش ہے۔ انہوں نے ہی مجھے یاسمین کی تصویر دکھائی تھی۔ اس کی ماں الماس نادر کے بارے میں بھی بتایا تھا اور گھریلو حالات کے بارے میں بھی! آسانی سے تو میں بھی صرف تصویر دیکھ کر اس رشتے کے لیے آمادہ نہیں ہوسکتا تھا لہٰذا ایک دن بعد رانی بیگم نے اپنے موبائل فون سے بنائی ہوئی ان لوگوں کے گھر کی وڈیو بھی دکھائی۔ اس میں یاسمین کے علاوہ بیگم الماس اور ان کی چھوٹی بیٹی ریشماں بھی تھی۔ رانی بیگم نے مجھے بتایا کہ بیگم الماس نادر ابھی اپنی چھوٹی بیٹی کی شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ خود میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ ریشماں سے تمہارا کوئی جوڑ نہیں بنتا۔ میں نے یاسمین کو تمہارے لیے پسند کرلیا اور رانی بیگم کو اجازت بھی دے دی کہ وہ سلسلہ آگے بڑھائے چنانچہ ابھی جب میں ناشتے کے لیے اپنے کمرے سے نکلا تھا تو ان کا فون آیا تھا۔ اسی وقت انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ بیگم الماس نادر نے دو ایک دن بعد جواب دینے کے لیے کہا ہے۔"

اس وقت عارف کے کانوں میں بھی سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔ وہ اپنے باپ کی ساری باتیں ذرا بھی توجہ سے نہیں سن سکا۔ وہ تو اس سوچ میں غلطاں رہا تھا کہ اس معاملے کو کس طرح ٹالا جاسکتا ہے، لیکن کوئی تدبیر اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اسے اپنے والد کے مزاج سے مکمل آگاہی تھی۔ جب وہ کوئی بات ایک مرتبہ کہہ دیتے تو پھر اس پر اڑ جاتے تھے۔ انہوں نے اس کے اور یاسمین کے رشتے کی بات آگے بڑھادی تھی لہٰذا اب وہ اس سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ وہ عارف کی دوسری شادی کے معاملے میں بھی اپنا وعدہ فراموش نہ کرتے لیکن عارف دوسری شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کے دل و دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ عدیلہ اس کے باپ کے دل میں اتنی جگہ بنالے گی کہ پھر وہ دوسری شادی کا خیال اپنے ذہن سے نکال دیتے لیکن وہ سارا معاملہ اس وجہ سے بگڑتا نظر آرہا تھا کہ عدیلہ ابھی شادی کے لیے تیار

ہی نہیں تھی۔

ناشتے کے بعد کنور شمشاد اپنے دفتر چلے گئے۔ انہوں نے عارف کو اپنے کاروبار میں نہیں الجھایا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاعرانہ مزاج رکھنے والا ان کا بیٹا کاروباری معاملات میں بالکل فیل ثابت ہوگا۔

باپ کے جاتے ہی عارف نے موبائل پر عدیلہ سے رابطہ کرنا چاہا لیکن کامیاب نہیں ہوسکا۔ عدیلہ کا موبائل بند تھا۔ عارف نے کئی مرتبہ کوشش کی لیکن اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ عارف نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ اس نے ایرپورٹ انکوائری سے رابطہ کیا۔ عدیلہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس دن اسلام آباد چلی جائے گی۔

انکوائری سے معلوم ہوا کہ ساڑھے سات بجے ایک فلائٹ اسلام آباد جاچکی تھی۔ دوسری فلائٹ گیارہ بجے روانہ ہوتی۔

عارف نے سوچا، شاید وہ ساڑھے سات کی فلائٹ سے نہ گئی ہو اور اب گیارہ بجے کی فلائٹ سے جائے۔ ایسی صورت میں اسے ایرپورٹ پر پکڑا جاسکتا تھا۔

کافی عرصے تک تعلقات رہنے کے باوجود وہ عدیلہ کے گھر کے پتے سے ناواقف تھا۔ یہ کسی حد تک غیر فطری سی بات تھی لیکن ہوا ایسا ہی تھا۔ اس کی طرح عدیلہ نے بھی کبھی اس کے گھر کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔

عارف دس بجے ہی ایرپورٹ پہنچ گیا اور ایسی جگہ کھڑا ہوگیا کہ کوئی شخص بھی اس کی نظروں سے بچ کر ایرپورٹ کی عمارت میں داخل نہ ہوسکے۔ وہ آنے والی کاروں پر بھی نظر رکھے رہا۔ اس کے خیال میں یہ امکان بھی تھا کہ عدیلہ کی چھوٹی بہن ڈرائیونگ جانتی ہو اور وہی عدیلہ کو لے کر آئے تاکہ کار واپس لے جاسکے۔

عارف نے اس دوران میں متعدد بار موبائل پر عدیلہ سے رابطہ کرنے کی بھی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا تھا۔ یہ بات بھی اس کے ذہن کو الجھائے ہوئے تھی کہ عدیلہ نے اپنا موبائل بند کیوں کر رکھا تھا۔ اس الجھن کے ساتھ اس کے دماغ میں یہ سوال بھی تھا کہ عدیلہ مل گئی تو وہ اس سے کیا بات کرے گا۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتا تھا کہ عدیلہ کو صورت حال سے آگاہ کردیتا۔ وہ یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ عدیلہ پر اس کا کیا ردعمل ہوگا مگر اس کے باوجود خوش گمانیوں میں مبتلا تھا۔ ان حالات کی وجہ سے عدیلہ شاید فوری طور پر اس سے شادی کے لیے آمادہ ہوجائے!...... ایسی صورت میں وہ اپنے باپ سے یہ منوانے کی کوشش کرسکتا تھا کہ یاسمین نامی لڑکی سے اس کی شادی کچھ عرصے کے لیے ملتوی کرکے پہلے اس کی اور عدیلہ کی شادی کروادی جائے۔

انہی خیالات میں وقت گزرتا رہا۔ پونے گیارہ بجنے والے تھے جب اس کی مایوسی کا غلبہ شدید ہوگیا۔ اس کے اندازے کے مطابق اسلام آباد جانے والی فلائٹ کے مسافروں کو اس وقت ڈیپارچر لاؤنج میں تو ہونا ہی چاہیے تھا۔

پھر گیارہ بھی بج گئے۔ اسلام آباد کی فلائٹ چلی گئی۔

حد درجہ مایوسی کے عالم میں عارف نے سوچا کہ ابھی کوئی اور فلائٹ بھی ہوگی جس سے عدیلہ نے اسلام آباد جانے کا فیصلہ کیا ہو۔ اس خیال کے باعث اس نے انکوائری سے رابطہ کیا معلوم ہوا کہ ساڑھے چار بجے بھی ایک فلائٹ اسلام آباد جائے گی۔

عارف دل برداشتگی کے عالم میں گھر روانہ ہوا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ ساڑھے تین بجے پھر ایرپورٹ آئے گا۔ اس نے اپنے اس فیصلے پر عمل بھی کیا لیکن نتیجہ وقت کے زیاں کے علاوہ کچھ نہ نکلا۔ عدیلہ اسے نہیں مل سکی۔

اس نے موبائل پر بھی عدیلہ سے رابطہ کرنے کی کوششیں جاری رکھی تھیں لیکن عدیلہ کا موبائل بند ہونے کی وجہ سے رابطہ ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔

پھر دو دن گزر گئے۔ عارف ان دو دنوں میں ایک بار بھی گھر سے باہر نہیں نکلا۔ اس کی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ اسے عدیلہ کے علاوہ کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ بھوک بھی جیسے مرگئی تھی۔ دوپہر کا کھانا اس نے کسی دن بھی نہیں کھایا۔ صبح کا ناشتا اور رات کا کھانا بھی اسے اس لیے کھانا پڑا کہ اس وقت کنور شمشاد عموماً گھر پر ہی ہوتے تھے۔

"کیا بات ہے!" تیسری صبح ناشتے کی میز پر کنور شمشاد نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے اپنی......؟ اس دن کے بعد غالباً شیو تک نہیں بنایا ہے تم نے......! یہ میں نے کل ہی محسوس کرلیا تھا لیکن نظرانداز کرگیا۔ آخر بات کیا ہے؟"

"جانے کیا بات ہے ڈیڈی!" عارف نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "ان دنوں دل نہ جانے کیوں بہت اداس ہے۔"

"اداسی کی وجہ؟"

"وہ میری سمجھ میں بھی نہیں آرہی ہے۔" عارف اس کے علاوہ کوئی جواب نہیں دے سکا۔

''یہ تو میں جانتا ہوں کہ تم شاعر ہو، لیکن شاعر مجنوں تو نہیں بن جاتا...... سچ سچ بتاؤ، کیا معاملہ ہے؟''

''سچ بات!'' عارف کو کچھ خیال آیا تو وہ باپ کا چہرہ تکنے لگا۔

''ہاں، بالکل سچ۔''

''سچ بات یہ ہے ڈیڈی کہ میں ایک لڑکی کو پسند کر چکا ہوں۔''

کنور شمشاد نے چونک کر کہا۔ ''پہلے کیوں نہیں بتایا تم نے؟ میں اس لڑکی سے تمہاری شادی میں رکاوٹ تو نہیں بنتا۔''

''بات کچھ اور ہے ڈیڈی......! وہ لڑکی فی الحال شادی کے لیے تیار نہیں ہے۔''

''کیوں؟''

''اس کی کچھ گھریلو مجبوریاں ہیں۔''

''ایسی کیا مجبوریاں ہیں کہ وہ شادی ہی نہ کر سکے!...... کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ تم سے شادی کرنا ہی نہ چاہتی ہو۔''

''ایسا نہیں ہے ڈیڈی...... وہ مجھے اتنا ہی چاہتی ہے جتنا میں اسے چاہتا ہوں۔''

''پھر مجبوریاں کیسی...... کہیں ملازمت کرتی ہے وہ...... اپنے گھر کی کفیل ہے؟''

''کفیل تو وہ ہے لیکن ملازمت نہیں کرتی۔ اس کے والد اچھا خاصا کاروبار چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔''

عارف نے وہ سب کچھ بیان کر دیا جو اسے عدیلہ نے بتایا تھا۔ یہ بھی بتا دیا کہ کسی کاروباری معاملے ہی میں وہ ان دنوں اسلام آباد گئی ہوئی ہے۔

کنور شمشاد نے کہا۔ ''اس کا پتا بتاؤ۔ میں خود جا کر اس کی ماں سے مل لیتا ہوں۔ جب تک اس لڑکی کا بھائی پڑھ کر واپس آنے کے بعد کاروبار نہیں سنبھالتا، وہ کاروبار سنبھالے رہے۔ شادی سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ مجھے اس کی اس مصروفیت پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ صرف ایک سال کی بات ہے، یہ کوئی طویل مدت نہیں...... اگر وہ فوری طور پر تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے اور اس کی ماں کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا تو میں یاسمین سے تمہاری شادی چند ماہ کے لیے مؤخر کر دوں گا۔''

''عدیلہ کی واپسی کا انتظار کرنا پڑے گا ڈیڈی!''

''کیوں؟ یہ کیوں ضروری ہے......؟ اس کی ماں سے ملنے کے لیے میں آج ہی جانے کے لیے تیار ہوں۔ رانی بیگم کو فون کر دوں گا۔ وہ بھی میرے ساتھ چلی جائیں گی۔ میں ان پر اس معاملے میں بھی اعتماد کر سکتا ہوں۔''

''مجھے عدیلہ کا گھر نہیں معلوم ڈیڈی!'' عارف نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''کیا!'' کنور شمشاد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، پھر جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم اسے اتنا چاہتے ہو اور تمہیں اس کے گھر کا علم نہیں...... کیا شاعر ہونے کے بعد آدمی پاگل بھی ہو جاتا ہے۔''

عارف چپ رہا۔ وہ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

کنور شمشاد ذرا دیر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑاتے رہے، پھر عارف کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''ایک بات میں تمہیں بتا دوں۔ یاسمین کی ماں نے شادی کے لیے آمادگی کا اظہار کر دیا ہے۔ شادی کی تاریخ دس دن بعد طے کی جائے گی۔ اگر عدیلہ تین چار دن بعد واپس آجاتی ہے اور تم اسے شادی پر آمادہ کر لیتے ہو تو میں یاسمین سے تمہاری شادی چند ماہ کے لیے مؤخر کر دوں گا۔ اگر تم ضروری سمجھو تو میں بھی جا کر عدیلہ کی ماں سے مل لوں گا، لیکن اگر وہ دونوں فوری شادی پر رضامند نہیں ہوتیں تو پھر میں یاسمین سے تمہاری شادی کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔''

عارف کی کچھ امید بندھی تو وہ کسی قدر جوش سے بولا۔ ''میں پوری کوشش کروں گا ڈیڈی! آپ کو اس کی کاروباری مصروفیت پر اعتراض نہیں ہے تو وہ ضرور شادی کے لیے تیار ہو جائے گی۔''

''ٹھیک ہے، لیکن تمہاری اس بات نے میرا موڈ بہت خراب کر دیا ہے کہ تم اس کے پتے سے بھی ناواقف ہو۔ کیا شاعری آدمی کو احمق بھی بنا دیتی ہے۔''

عارف کچھ نہیں بول سکا۔ اس کے بعد کنور شمشاد نے کوئی بات نہیں کی۔ ان کا موڈ واقعی بہت خراب ہو گیا تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد بھی وہ کچھ کہے بغیر میز سے اٹھ گئے۔



یاسمین پورے ایک ہفتے بعد اسلام آباد سے لوٹی۔ اس کی بہن ریشماں اسے لینے کے لیے ایئرپورٹ پر موجود تھی۔ یاسمین کے ساتھ ایک چھوٹے سے اٹیچی کیس کے علاوہ کسی قسم کا سامان نہیں تھا۔ وہ کار کی ڈکی میں رکھوا دیا گیا، پھر کار ایئرپورٹ سے روانہ ہوئی۔ ڈرائیونگ سیٹ ریشماں ہی نے سنبھال رکھی تھی۔

''یہ عارف کیا بہت اچھا شاعر ہے باجی؟'' ریشماں

نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔
''کیوں؟'' یاسمین چونکی۔ ''یہ اچانک تجھے عارف کا خیال کیوں آگیا؟''
''تمہیں اس کی شاعری بہت پسند ہے نا......! تمہارے کمرے میں بھی اس کی کتاب رہتی ہے۔ کار میں بھی ہے۔'' ریشماں نے ڈیش بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔
''ہاں۔'' یاسمین نے اپنا وینٹی بیگ کھولتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس کی شاعری بہت پسند ہے۔''
''مجھے تو شاعری سے کوئی دلچسپی ہے نہیں......! کار میں تھی اس کی کتاب تو میں نے تھوڑی سی پڑھی تھی۔''
یاسمین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے وینٹی بیگ سے دو موبائل فون نکالے تھے۔ اس نے ان میں سے ایک کو ''پاور آف'' کیا اور دوسرا جو بند پڑا تھا، اسے کھولا۔
''اس مرتبہ تم دوسرے نمبر کا موبائل کیوں لے گئی تھیں!'' ریشماں بولی۔ ''پہلے تو کبھی ایسا نہیں کیا تم نے!''
اس سے پہلے کہ یاسمین کوئی جواب دیتی، اس موبائل کی گھنٹی بجنے لگی جو اس نے ابھی کھولا تھا۔ یاسمین نے وہ اٹھایا اور اسکرین پر نظر ڈالی۔ کال کرنے والا اس کی توقع کے مطابق عارف ہی تھا۔ یاسمین نے موبائل کان سے لگایا۔ ''ہیلو!'' وہ بہت سنجیدہ تھی۔
''شکر ہے کہ تم نے کال ریسیو کی۔'' دوسری طرف سے عارف نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ''اس ایک ہفتے میں کم از کم سو مرتبہ تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کر چکا ہوں۔ کیا تم اپنا موبائل بند کر دیتی ہو جب شہر سے کہیں باہر جاتی ہو؟''
''ہاں، کہیں جاتی ہوں تو دوسرا نمبر استعمال کرتی ہوں۔'' یاسمین نے جھوٹ بولا۔
''کیوں؟...... اچھا خیر، مجھے دوسرا نمبر بتا کے تو جاتیں۔ بہت پریشان رہا ہوں اس ہفتے میں۔ اب فوراً مجھ سے ملو۔ کہاں ہو اس وقت؟''
''ابھی پہنچی ہوں کراچی!...... ایرپورٹ سے گھر کی طرف جا رہی ہوں۔''
''ٹیکسی میں؟''
''نہیں۔'' یاسمین نے جواب دیا۔ ''ریشماں آئی تھی مجھے لینے۔''
''ریشماں؟'' چونک کر کہا گیا۔ ''یہ کون ہے؟''
یاسمین کو یاد نہیں تھا کہ اس نے پہلے کبھی عارف کو اپنی بہن کا نام بتایا تھا یا نہیں لیکن عارف کے چونکنے سے اس نے یہی سمجھا کہ اس نے عارف کو اپنی بہن کا نام نہیں بتایا ہوگا۔
''میری چھوٹی بہن ہے یہ۔'' یاسمین نے جواب دیا۔
''عجیب بات ہے، اس کی چھوٹی بہن کا نام بھی...... اچھا خیر چھوڑو۔ یہ باتیں ملاقات پر ہی ہوں گی۔ تم فوراً مجھ سے ملنے آؤ، ابھی دوپہر ہے۔ پارک میں ملنا تو اچھا نہیں رہے گا۔ اسی کیفے میں آؤ جہاں ہم پہلی مرتبہ ملے تھے۔''
''فوراً کیسے آجاؤں!'' یاسمین بولی۔ ''ابھی تو ریشماں کے ساتھ گھر جا رہی ہوں۔ پھر کچھ دیر تو گھر پر رکوں گی۔''
''تم سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے میرے اعصاب ٹوٹنے لگے ہیں۔ میں تم سے جلد از جلد ملنا چاہتا ہوں عدیلہ!''
''آخر بات کیا ہے؟ اتنی بے تابی؟''
''بات کچھ ایسی ہی ہے کہ تمہیں بتانا بہت ضروری ہے لیکن اتنی مختصر بات نہیں ہے کہ فون پر بتا دوں۔ تمہارے ساتھ تمہاری بہن بھی تو ہے نا......! فون پر بات نہیں ہو سکے گی۔''
''مجھے اب پندرہ منٹ تو لگیں گے گھر پہنچنے میں!'' یاسمین نے کہا۔ ''کچھ دیر تو رکنا ہوگا نا! اس کے بعد مجھے پہنچنے میں بیس منٹ تو لگیں گے۔''
''ٹھیک ٹھیک وقت بتاؤ پلیز...... میں بہت بے چین ہوں۔''
یاسمین نے گھڑی دیکھی۔ ''اتنی بے چینی ہے تو میں گھر پر دس منٹ سے زیادہ نہیں رکوں گی۔''
''ٹھیک ہے۔'' عارف نے کہا۔ ''پینتالیس منٹ بعد میں کیفے میں تمہارا منتظر ہوں گا۔''
''اچھا۔'' یاسمین نے رابطہ منقطع کیا۔
اس دوران میں ریشماں چپ رہی تھی۔ بس کبھی کبھی یاسمین پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال لیتی تھی۔ وہ اس وقت بولی جب یاسمین نے موبائل بند کیا تھا۔
''کون تھا باجی؟''
''میری ایک دوست ہے۔'' یاسمین نے جواب دیا۔ ''کسی وجہ سے پریشان ہے، مجھ سے مشورہ کرنا چاہتی ہے۔ جانا تو پڑے گا مجھے!''
''اگر وہ تمہاری کوئی بہت اچھی دوست ہے تو تمہیں فوراً اس سے ملنے جانا چاہیے نا باجی!...... تم کار لے جاؤ، میں ٹیکسی کر کے چلی جاؤں گی۔''

''نہیں نہیں۔ یہ ٹھیک نہیں رہے گا۔ ممی کی ڈانٹ پڑ جائے گی مجھ پر!''

''ممی گھر پر نہیں ہیں۔ کہہ کر گئی تھیں کہ دو تین گھنٹے بعد واپسی ہوگی ان کی۔ ابھی انہیں گئے ہوئے مشکل سے ایک گھنٹا گزرا ہے۔ وہ اسی وقت گئی تھیں جب میں تمہیں لینے کے لیے گھر سے نکلی تھی۔''

''پھر بھی یہ ٹھیک نہیں ہے کہ تم ٹیکسی کرو۔ گھر پہنچ کر تم گاڑی سے اتر جانا۔ میں فوراً چلی جاؤں گی۔''

ریشماں نے اس معاملے میں تکرار غیر ضروری سمجھی۔

یاسمین کا ذہن عارف میں الجھا رہا۔ یہ اس نے بھی عارف کے لہجے سے محسوس کرلیا تھا کہ بات کچھ زیادہ ہی غیر معمولی تھی۔

ریشماں کو گھر پر اتار کے یاسمین نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور روانہ ہوگئی۔ اس نے موبائل پر عارف سے رابطہ کر کے اسے بتایا کہ وہ گھر پر ایک منٹ بھی رکے بغیر کیفے کی طرف روانہ ہو چکی ہے۔

''میں خود راستے میں ہوں۔ اگر تم گھر پر رکتیں تو مجھے دس بارہ منٹ انتظار کرنا پڑتا تمہارا۔''

''اب تو بتادو کیا بات ہے!...... ریشماں اب میرے ساتھ نہیں ہے۔''

''اب تم آہی رہی ہو تو آمنے سامنے بیٹھ کر ہی بات ہوگی۔''

''خاصی الجھن میں ڈال دیا ہے تم نے......! اچھا خیر! میں آرہی ہوں۔''

یاسمین نے رابطہ منقطع کر کے کار کی رفتار میں اضافہ کیا۔ وہ واقعی بہت زیادہ الجھ گئی تھی۔ معاملہ جو کچھ بھی ہو، اس کے بارے میں کوئی قیاس کرنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

جب وہ کیفے میں داخل ہوئی تو سامنے ہی کی میز پر عارف دکھائی دیا۔ غالباً وہ جان بوجھ کر ایسی میز پر بیٹھا تھا کہ یاسمین کیفے میں قدم رکھتے ہی اسے دیکھ لے۔

یاسمین قریب جاکر اس کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ یہ اس نے فوراً محسوس کرلیا تھا کہ عارف کے چہرے پر پریشانی کے اثرات خاصے گہرے تھے۔

''میں تم سے پانچ منٹ پہلے پہنچ گیا تھا۔'' عارف بولا۔

''اصل بات کی طرف آؤ۔ تم نے میرے دماغ پر بہت دباؤ ڈال دیا ہے۔ میں کوئی اندازہ لگانے سے قاصر ہوں کہ بات کیا ہوسکتی ہے۔''

''یقیناً وہ ایسی ہی بات ہے۔'' عارف نے کہا۔ ''میں نے یہ ہفتہ شدید اذیت میں گزارا ہے۔ اگر فون پر بات ہو جاتی تو میں اتنی اذیت میں نہیں رہتا۔''

''اب بات تو بتاؤ!''

''ڈیڈی کہیں میری شادی کر رہے ہیں۔ بات چھیڑ دی ہے انہوں نے!''

اگرچہ یاسمین خود چاہتی تھی کہ عارف کسی لڑکی سے شادی کرلے مگر عارف کے منہ سے یہ بات سن کر اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا، تاہم اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے افسردہ سی اور ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''مبارک ہو عارف!''

عارف اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگا۔

یاسمین سنجیدہ ہوگئی۔ ''کیا مجھے مبارک باد نہیں دینا چاہیے تھی؟''

''میں تم سے یہ توقع نہیں کر رہا تھا کہ تم میرے زخموں پر نمک چھڑکو گی۔'' عارف کی آواز بھرا گئی۔

''تمہیں اپنے والد کی بات تو ماننا ہی ہوگی نا عارف!''

''ضروری نہیں ہے، اگر تم مجھ سے فوری طور پر شادی کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

''یہ تم کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟''

''ڈیڈی سے بہت تفصیلی بات ہو چکی ہے۔ وہ اس کے لیے تیار ہیں کہ اگر میں اپنی پسند کی لڑکی سے فوری طور پر شادی کرلوں تو وہ دوسری شادی موخر کردیں گے اور مجھے یقین ہے کہ تم ان کے دل میں اپنے لیے اتنی جگہ بنالوگی تو پھر وہ میری دوسری شادی کا ارادہ ترک ہی کردیں گے۔''

یاسمین چند پل خاموش رہی، پھر بولی۔ ''میں تم کو کیسے سمجھاؤں کہ میں ابھی شادی نہیں کرسکتی۔''

''اپنی کاروباری مصروفیت کی وجہ سے؟''

''ہاں۔''

''شادی کے بعد ڈیڈی کو تمہاری کاروباری مصروفیت پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''کیا مطلب!'' یاسمین حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''ہاں عدیلہ!'' عارف نے کہا۔ ''میں نے ڈیڈی کو تمہارے بارے میں سب کچھ بتادیا ہے۔''

''اوہ!''

''اب بتاؤ!'' عارف بے تابی سے بولا۔ ''اب تو کوئی رکاوٹ نہیں ہونا چاہیے تمہارے سامنے۔''

یاسمین نہ صرف خاموش رہی، بلکہ اس نے نظریں بھی

جھکا لیں۔

”جواب دو عدیلہ!“ عارف اس کے بولنے کا انتظار نہیں کرسکا۔

”کیا بولوں!“ یاسمین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

عارف بولا۔ ”اب تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے نا؟“

”رکاوٹ تو ہے۔“

”اب کیا ہے؟“

فوری طور پر یاسمین کے دماغ میں آیا کہ وہ عارف کو بتا دے کہ اس کی ممی نے بھی اس کی شادی کہیں طے کردی ہے لیکن وہ یہ بات زبان پر نہیں لاسکی۔ پہلے بھی اس نے سوچا تھا کہ عارف کو یہ بات وہ فون پر ہی بتا سکے گی۔

عارف نے پہلو بدلا۔ ”تم پھر خاموش ہوگئیں، بتاؤ اب کیا رکاوٹ ہے؟“

”وہ...... یاسمین...... بات کچھ ایسی ہے عارف کہ......“ اسے خاموش ہوجانا پڑا کیونکہ ویٹر آئس کریم لے آیا تھا اور ان کی میز پر رکھ رہا تھا۔

”میں نے پہلے ہی آرڈر دے دیا تھا۔“ عارف بولا۔ ”تمہیں یہاں کی آئس کریم پسند ہے نا!...... میں نے ویٹر سے کہہ دیا تھا کہ جب تم آجاؤ تو وہ آئس کریم لے آئے۔“

یاسمین چپ رہی۔ ویٹر آئس کریم رکھ کر چلا گیا۔

”ہاں۔“ عارف بولا۔ ”تم کچھ کہتے کہتے رک گئی تھیں!“

یاسمین نے اثبات میں سر ہلایا، پھر بولی۔ ”وہ بات کچھ ایسی ہے کہ میں تمہارے سامنے بیٹھ کر اپنی زبان پر نہیں لاسکتی۔ میں تمہیں فون پر بتا دوں گی۔“ یہ جواب دیتے ہوئے بھی یاسمین کا دماغ الجھا ہی رہا تھا کہ کیا وہ فون پر بھی عارف سے سچ بول سکے گی؟

”کب بتاؤ گی فون پر؟“ عارف نے پوچھا۔

”رات کو کسی وقت فون کروں گی تمہیں!“

”اچھا!“ عارف نے طویل سانس لی۔ ”میں چند گھنٹے اور انتظار کرلیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اب اپنی جو مشکل بھی بیان کروگی، اس کا بھی کوئی حل نکال لیا جائے گا۔“

”تم وہیں شادی کیوں نہیں کرلیتے!“

”کہاں؟“ عارف چونکا۔

”جہاں تمہارے ڈیڈی چاہتے ہیں۔“

”یہ کہنے سے تو بہتر تھا کہ تم مجھے ذبح کر ڈالتیں۔“ یہ کہتے ہوئے عارف کے ہونٹ شدت سے لرز گئے تھے۔

یاسمین کے لیے یہ بہت دشوار ہوتا جارہا تھا کہ خود کو قابو میں رکھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی۔

”رات کو فون کروں گی میں تمہیں۔“ وہ بہ مشکل کہہ سکی اور یک لخت کرسی سے اٹھ کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈگمگا رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ عارف کے سامنے چند سیکنڈ بھی رکتی تو اس کے سامنے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔

عارف ہکا بکا بیٹھا رہ گیا لیکن یاسمین نے مڑ کر دیکھا ہی نہیں۔ جب وہ کیفے سے نکل رہی تھی تو چند آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ہی گئے تھے جو اس نے ہاتھ سے پونچھ ڈالے۔

جب وہ اپنی کار میں بیٹھی تو انجن اسٹارٹ کرتے وقت اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اسے ہوش نہیں رہا تھا کہ اس نے کس طرح ڈرائیونگ کی اور کس طرح گھر تک پہنچی۔ کار سے اتر کر وہ اس طرح دروازے کی طرف لپکی جیسے اس پر دیوانگی طاری ہوگئی ہو۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد وہ تقریباً دوڑنے کے انداز میں اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھی تھی۔ دروازہ بھی اس نے طوفانی انداز میں کھولا اور سیدھی اپنے بستر کی طرف گئی تھی۔ اسے سینڈل اتارنے کا بھی خیال نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے بستر پر اوندھی گری۔ اس کی آنکھوں سے وہ سیلاب امنڈ پڑا جسے اتنی دیر تک روکے رکھنے کی کوشش میں اس پر قیامت گزرتی رہی تھی۔

آنسو بھی وہ خاموشی سے نہیں بہا رہی تھی۔ اس کی سسکیوں سے اس کا سارا جسم ہل رہا تھا۔

سسکیوں اور آنسوؤں کا طوفان بتدریج کم ہوتے ہوتے تھم گیا لیکن اسے احساس نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر تک روتی رہی تھی۔ جب اس کے آنسو تھمے تو ان آنسوؤں سے اس کا سارا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ بڑی آہستگی سے تکیے کے نیچے گیا اور اس نے عارف کا وہ مجموعہ نکالا جو عموماً اس کے سرہانے ہی رکھا رہتا تھا۔ اس کا پہلا مجموعہ وہ اپنی کار میں رکھتی تھی جو ریشماں نے بھی دیکھ لیا تھا۔

وہ اوندھی ہی لیٹی رہی۔ اس کی آنکھیں عارف کی تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔

”کاش تم مجھے نہ ملے ہوتے۔“ وہ دھیمی اور گلوگیر آواز میں بولی تو اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اسے کیفے کا وہ منظر یاد آرہا تھا جب اس نے پہلی مرتبہ عارف کو ایک میز پر کچھ لکھتے ہوئے دیکھا تھا اور جیسے کسی مقناطیسی کشش نے اسے عارف کے قریب پہنچا دیا تھا۔ اس وقت وہ تصور بھی

نہیں کرسکی تھی کہ یہ معاملہ کس حد تک آگے بڑھ جائے گا۔
''باجی!'' آواز دھیمی تھی لیکن یاسمین اس طرح ہڑبڑا کر اٹھی جیسے اس نے کسی دھماکے کی آواز سنی ہو۔
وہ آواز ریشماں کی تھی۔ یاسمین نے دیکھا کہ وہ اس کے بستر پر ہی پائنتی کی طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ یاسمین نے جلدی سے عارف کا مجموعہ تکیے کے نیچے سرکا دیا۔
''کب آئیں تم؟'' یاسمین نے پوچھا۔ وہ اچانک ریشماں کو دیکھ کر گھبرا سی گئی تھی۔
''میں تمہارے پیچھے پیچھے ہی آگئی تھی، جبھی سے بیٹھی ہوں۔'' ریشماں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میری نظر پڑ گئی تھی تم پر!...... تمہاری حالت دیکھ کر میں بہت پریشان ہوگئی تھی۔ تمہارے پیچھے کمرے میں آئی تو تم بے تحاشا رو رہی تھیں۔ تمہاری حالت یہ تھی کہ تم نے میری آہٹ بھی نہیں سنی۔ جب میں بستر پر بیٹھی تب بھی تم نے محسوس نہیں کیا کہ کوئی آکر بیٹھا ہے، میں پریشانی سے تمہیں روتا دیکھتی رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ تمہیں کیا صدمہ پہنچا ہے لیکن میں چپ چاپ اس لیے بیٹھی رہی کہ تم اچھی طرح اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلو۔ اس کے بعد ہی تم سے پوچھوں گی کہ...... لیکن اب تو پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ تم نے ابھی جس تصویر سے بات کی تھی، وہ میں دیکھ چکی ہوں اور تمہارا جملہ بھی سن لیا ہے۔ تم نے یہی کہا تھا نا باجی کہ کاش تم مجھے نہ ملے ہوتے۔''
یاسمین کی نظریں جھک گئیں۔ ریشماں پر اس کے دل کا راز فاش ہو چکا تھا لیکن یہ یاسمین کے لیے کوئی پریشان کن بات نہیں تھی۔
''تم عارف صاحب سے محبت کرتی ہو؟'' ریشماں نے سوال کیا۔
یاسمین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی نظریں جھکی رہی تھیں۔
''اور......'' ریشماں پھر بولی۔ ''اب اس لیے رو رہی ہوگی کہ ممی نے تمہاری شادی طے کردی ہے لیکن اس روز تو تمہیں کچھ نہیں ہوا تھا جب ممی نے میرے سامنے ہی تمہیں بتایا تھا۔''
یاسمین خاموش رہی۔
''خیر!'' ریشماں مسکراتی رہی۔ ''اگر تم اسی دن ممی سے پوچھ لیتیں کہ تمہاری شادی وہ کہاں طے کررہی ہیں تو تمہیں اس وقت رونا نہیں پڑتا۔'' ریشماں نے بستر پر آگے ہوکر تکیے کے نیچے سے عارف کا مجموعہ نکالا اور تصویر کو دو انگلیوں سے تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ ''انہی سے تو طے ہورہی ہے تمہاری شادی!''
یاسمین شدت سے چونکی اور ریشماں کا منہ تکنے لگی۔
''تم ملو تو جاکر ان سے!'' ریشماں نے شوخی سے کہا۔ ''یہ بتائیں گے تمہیں۔'' اس کا اشارہ تصویر کی طرف تھا۔ ''چونکانا چاہتے ہوں گے یہ تمہیں...... جبھی تم کو ابھی تک اس سے بے خبر رکھا ہے۔''
''ریشماں!'' یاسمین نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ مذاق ہے تو بہت گھٹیا مذاق ہے جو تجھے کم از کم اپنی بڑی بہن سے نہیں کرنا چاہیے۔''
''کیسی باتیں کررہی ہو باجی!'' ریشماں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''کیا میں تمہارے سر کی قسم کھاؤں کہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔''
اب یاسمین کے لیے شک وشبے کی گنجائش نہ رہی اور وہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ اب اس کا ایک اور امتحان شروع ہوگیا۔
''ابھی خوش ہونے کا وقت نہیں آیا ریشماں!'' یاسمین نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اب تو پہاڑ جیسا دوسرا امتحان شروع ہوا ہے میرا۔''
''کیوں؟'' ریشماں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
یاسمین نظریں جھکا کر سوچ میں ڈوب گئی۔
''پتا نہیں تم کیسی باتیں کرنے لگیں۔'' ریشماں پھر بولی۔ ''میں پوچھوں گی ضرور تم سے کہ یہ تمہارے لیے امتحان کیوں ہے...... ابھی تو تم ممی کے پاس چلی جاؤ۔ وہ تمہارے آنے سے پانچ منٹ پہلے آگئی تھیں۔ ہاں کچھ جلدی آگئیں۔ مجھ سے کہا تھا انہوں نے کہ تم آؤ تو تمہیں ان کے پاس بھیج دوں۔''
''اچھا!'' یاسمین نے آہستگی کے ساتھ بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔
''لیکن پہلے اپنا حلیہ تو درست کرلو...... آئینہ دیکھو گی تو پتا چلے گا۔ چہرے سے بیمار لگنے لگی ہو، آنسوؤں سے چہرہ ابھی تک بھیگا ہوا ہے۔''
یاسمین نے اپنے گال پر ہاتھ پھیرا اور آنسوؤں کی نمی محسوس کی۔
''میں منہ دھو کے کپڑے بدل لیتی ہوں۔'' یاسمین نے باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
''تم آؤ، میں ممی کے پاس جارہی ہوں، کہہ دوں گی

کہ ابھی آئی ہو۔ کپڑے بدل کر آؤ گی۔ یہ تو میں نے کہہ دیا تھا ان سے کہ ایرپورٹ سے آنے کے بعد تم اپنی کسی دوست سے ملنے چلی گئی تھیں۔''

یاسمین کچھ کہے بغیر باتھ روم میں داخل ہوگئی۔ اس نے واش بیسن کے اوپر لگے ہوئے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ ریشماں نے جو کچھ کہا تھا، غلط نہیں تھا۔ یاسمین نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور واش بیسن میں منہ دھونے لگی۔

کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا، پھر الماس نادر کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

ریشماں وہیں تھی اور ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی، الماس نادر بستر پر نیم دراز تھی اور کسی سوچ میں ڈوبی نظر آرہی تھی۔

یاسمین کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔ ''میں نے ٹھیک ہی فیصلہ کیا کہ تمہاری شادی کر دینا ضروری سمجھا۔ لاہور سے تمہاری شکایت آئی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ تمہاری جگہ ریشماں لے لے۔ تم اب...... اچھا خیر!...... ابھی ریشماں نے بتایا کہ تم پہلے ہی سے عارف کو پسند کرتی ہو۔''

یاسمین نے نظر-ین جھکالیں۔

''اس نے بتایا نہیں تمہیں!'' الماس نادر نے پوچھا۔

''دوسرے ہی دن صبح ساڑھے سات کی فلائٹ سے میں اسلام آباد چلی گئی تھی۔''

''فون پر بھی رابطہ نہیں ہوا؟''

''میں ایسے موقعوں پر آپ کے اور ریشماں کے علاوہ کسی سے رابطہ نہیں کرتی۔ ڈسٹربنس ہوتی ہے۔ اسی لیے میں نے اپنا فون بدل لیا تھا۔ عارف ضرور فون کرتا۔ اسے نہیں بتایا تھا میں نے اپنا نیا نمبر!''

''عجیب سی بات کہہ رہی ہو تم!...... ریشماں بتا چکی ہے مجھے کہ تمہاری کیا حالت تھی، جب تم اسے اتنا چاہتی ہو تو نیا نمبر بھی بتانا چاہیے تھا۔''

''عارف کو میرے گھر کا پتا معلوم نہیں تھا۔ بات یہاں تک پہنچی کیسے!''

''میں نے تمہیں بتایا تھا شاید کہ رانی بیگم پڑی ہیں بیچ میں!''

''مجھے یاد نہیں رہا شاید۔''

''تین دن بعد تمہاری شادی کی تاریخ طے کرنا ہے، میں کوشش کروں گی کہ زیادہ دیر نہ لگے۔ دس بارہ دن کی تاریخ طے ہو جائے۔''

''جی۔''

یاسمین میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ الماس نادر کے سامنے اس رشتے سے انکار کرتی۔ اگر ہمت ہوتی بھی تو اس کے انکار کے بعد یہ بحث چھڑ جاتی کہ جب وہ عارف کو اتنا پسند کرتی ہے تو انکار کا سبب؟

اس کا انکار الماس نادر اور ریشماں، دونوں ہی کو حیران کرتا۔

ذرا دیر بعد جب وہ اپنے کمرے میں لوٹی تو اس نے بڑی تیزی سے اپنا موبائل اٹھایا۔ الماس نادر کے کمرے میں جاتے وقت وہ دونوں ہی موبائل ساتھ لے جانا بھول گئی تھی۔

رابطہ قائم ہوتے ہی دوسری طرف سے عارف کی آواز آئی۔ ''شکر ہے کہ تم نے ابھی فون کرلیا، رات تک کا انتظار بھی میرے لیے کچھ کم اذیت ناک نہیں ہوتا۔''

''تمہارے والد نے تمہاری شادی کہاں طے کی ہے یا کر رہے ہیں؟'' یاسمین نے کسی تمہید کے بغیر وہ سوال کر ڈالا جو اس کے دماغ میں گردش کر رہا تھا۔

عارف حیرت سے بولا۔ ''یہ پوچھنے کے لیے فون کیا تھا؟''

''ہاں۔''

''کیوں؟''

''بس جاننا چاہتی ہوں۔''

''کیا جاننا چاہتی ہو؟''

''ان لوگوں کے نام وغیرہ۔'' یاسمین نے کہا۔

''جس سے میری شادی کی بات چلائی ہے ڈیڈی نے اس کا نام یاسمین ہے۔ اسے اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے کہ اس کی چھوٹی بہن کا نام وہی ہے جو تمہاری بہن کا ہے۔ ماں کا نام الماس نادر ہے۔''

''کون لوگ ہیں یہ؟''

''مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم! میں نے ڈیڈی سے کوئی سوال نہیں کیا۔''

''اچھا! ابھی تو مجھے یہی معلوم کرنا تھا۔ اب رات ہی کو فون کروں گی۔'' یاسمین نے کہا اور رابطہ ختم کرنے کے ساتھ ہی موبائل ''پاور آف'' بھی کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ عارف بے تاب ہوکر اسے فون کرے گا اور اس سے معلوم کرنا چاہے گا کہ اس نے وہ پوچھ کچھ کیوں کی تھی اور یاسمین اسے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکتی تھی۔

موبائل فون ایک طرف ڈال کر وہ بستر پر نیم دراز حالت میں سر پکڑے سوچتی رہی کہ اب کیا کرے...... ! وہ

ب پہلے سے زیادہ کڑے امتحان میں پڑ گئی تھی، اچانک س کے دماغ میں ایک بات آئی اور اس نے اس بارے میں کچھ سوچے سمجھے بغیر اپنا وہ موبائل اٹھایا جس کا نمبر عارف کے پاس نہیں تھا۔ وہ اس پر میسیج ٹائپ کرنے لگی۔ ٹائپ کرنے کے بعد اس نے ایک بار اسے پڑھا۔ اس نے ٹائپ کیا تھا۔

"عارف صاحب!...... آپ کو حیرت ہوگی کہ میں "یاسمین" آپ سے مخاطب ہو رہی ہوں۔ وہی یاسمین جس سے آپ کی شادی طے ہو رہی ہے۔ میں آپ سے ایک التجا کرنا چاہتی ہوں جو آپ کو بہت عجیب لگے گی۔ آپ اس شادی سے انکار کر دیجیے۔ آپ مرد ہیں، ایسا کر سکتے ہیں لیکن میں لڑکی ہوں، میں ہمت نہیں کر سکتی۔ کوئی وجہ ہے کہ ہماری شادی نہ ہونا ہی بہتر ہوگا۔ آپ ایک اچھے شاعر ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ایک اچھے انسان بھی ہوں گے اس لیے میری التجا نظر انداز نہیں کریں گے۔"

یاسمین نے دو مرتبہ عبارت پڑھی اور پھر وہ پیغام عارف کے موبائل نمبر پر بھیج دیا۔ عبارت کے آخر میں اس نے اپنا نام لکھنا غیر ضروری سمجھا تھا۔ وہ پیغام کی ابتدا ہی میں لکھ چکی تھی کہ وہ کون ہے......

پیغام تو اس نے بھیج دیا لیکن متفکر رہی۔ اس نے سوچے سمجھے بغیر یہ قدم اٹھا ڈالا تھا لیکن اب سوچ رہی تھی کہ کیا اس کا یہ اقدام درست ثابت ہوگا؟

یہ یقین اسے بہرحال تھا کہ عارف یہ پیغام پڑھ کر خوش ہو جائے گا اور اسے فون کر کے بتائے گا بھی لیکن پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ عارف کی کال نہیں آئی۔ تب اچانک یاسمین کو خیال آیا کہ اس نے اپنا موبائل فون تو عارف سے بات کرنے کے بعد "پاور آف" کر دیا تھا۔ اعصابی تناؤ اور ذہنی خلفشار ہی اتنا تھا کہ وہ کوئی بات بھی بھول سکتی تھی۔ اس نے موبائل اٹھا کر اسے "آن" کیا۔ اسے یقین تھا کہ عارف کو اس کا نمبر بند ملا ہوگا تو وہ صبر نہیں کرے گا، بار بار اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے گا۔

یہ خیال درست ثابت ہوا۔ پانچ منٹ بعد عارف کی کال آ گئی۔

"یہ کیا کرتی ہو تم!" اس کے لہجے میں قدرے جھنجلاہٹ تھی۔ "تم نے بتایا تھا کہ تم شہر سے باہر جاتی ہو تو اپنا یہ موبائل بند کر دیتی ہو لیکن اب تو تم کراچی ہی میں ہو نا؟"

"سوری۔" یاسمین نے آہستہ سے کہا۔ "تم سے بات کرنے کے بعد میں بے خیالی میں فون بند کر بیٹھی تھی۔ دو

تین منٹ پہلے اسے کھولا ہے۔ کیا تم نے فون کیا تھا؟''
''تیسری مرتبہ کر رہا ہوں۔ دو مرتبہ تو فوراً کوشش کی تھی۔''
''فوراً کیا مطلب؟''
''یاسمین نے مجھے ایس ایم ایس کیا ہے۔ وہ پڑھتے ہی میں نے تم سے رابطے کی کوشش کی تھی۔ فی الحال تو میرا دماغ ہلکا ہو گیا ہے۔ یاسمین مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔''
''کیا مطلب!'' یاسمین انجان بن گئی۔
''بعد میں بات کریں گے۔ پہلے تم اس کا ایس ایم ایس پڑھ لو۔ میں تمہیں بھیج رہا ہوں۔'' دوسری طرف عارف بہت بے تاب تھا۔ اس نے فوراً ہی رابطہ منقطع کر دیا تاکہ ایس ایم ایس بھیج سکے۔
ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس کا ایس ایم ایس آ گیا۔ وہی ایس ایم ایس جو یاسمین نے اسے بھیجا تھا...... یاسمین کے ہونٹوں پر ہلکی سی افسردہ مسکراہٹ ابھری اور معدوم ہو گئی۔
پھر دو منٹ اور گزرے تھے کہ عارف کی کال بھی آ گئی۔
''مل گیا ایس ایم ایس؟'' اس نے پوچھا۔
''ہاں۔ پڑھ لیا میں نے......! ہوسکتا ہے یہ یاسمین کسی اور کو پسند کرتی ہو، اس سے شادی کرنا چاہتی ہو۔''
''کچھ بھی ہو، میری بلا سے...... فی الحال میری جان تو چھوٹ جائے گی۔ میں نے ڈیڈی کو فون پر بتا دیا ہے۔''
''کیا!'' یاسمین چونکی۔
''بلکہ وہ ایس ایم ایس بھی انہیں بھیج دیا ہے۔''
یاسمین قدرے بوکھلا گئی۔ اس نے کہا۔ ''تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا عارف!...... اس بے چاری نے تم پر اعتماد کیا تھا۔ تم نے اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔''
''میرے لیے اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا عدیلہ!...... میں ڈیڈی کو یہ ایس ایم ایس دکھائے بغیر اپنی جان نہیں چھڑا سکتا تھا۔''
''اچھا اب تم اس کا ایس ایم ایس ڈیلیٹ تو کر دو!'' یاسمین نے تیزی سے کہا۔
''کیوں؟'' عارف نے تعجب سے پوچھا۔
''اس کا موبائل نمبر ہوگا نا ایس ایم ایس کے ساتھ......! تم نے اس کا ایس ایم ایس اپنے ڈیڈی کو بھیجا ہوگا تو اس کے ساتھ اس کا نمبر تو نہیں گیا ہوگا۔ بعد میں تم اپنے ڈیڈی سے کہہ دینا کہ تم غلطی سے وہ ایس ایم ایس ڈیلیٹ کر چکے ہو۔ اس طرح اس بے چاری کی جان بچ سکتی ہے۔ وہ اپنے گھر والوں سے کہہ سکتی ہے کہ وہ ایس ایم ایس اس نے نہیں کیا۔''
دوسری طرف خاموشی رہی۔
''ہیلو!'' یاسمین قدرے بلند آواز میں بولی۔ ''تم چپ کیوں ہو گئے؟''
''میں ڈیڈی کو وہ نمبر بھی بھیج چکا ہوں۔''
یہ جواب سنتے ہی یاسمین کو اپنا دماغ چکراتا ہوا محسوس ہوا۔
عارف کہہ رہا تھا۔ ''ایس ایم ایس ملنے کے بعد ہی ڈیڈی نے فون پر مجھ سے کہا تھا کہ میں وہ نمبر بھی انہیں بھیجوں چنانچہ میں نے بھیج دیا۔ میں نے تو تمہیں فوراً فون کرنا چاہا تھا۔ اگر اس وقت تم سے بات ہو جاتی تو شاید میں تمہاری یہ بات مان لیتا۔ شاید کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ نمبر نہ ہونے کی وجہ سے ڈیڈی شبے میں پڑ جاتے کہ اس شادی سے بچنے کے لیے ایس ایم ایس کی چالاکی خود میں نے کی ہے۔ ڈیڈی اس ایس ایم ایس سے بہت الجھ گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ وہ ابھی دفتر سے واپس گھر پہنچ رہے ہیں حالانکہ عموماً وہ اتنی جلدی نہیں آتے۔''
عارف کی آواز یاسمین کو کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ ایس ایم ایس کر کے اس نے کتنی بڑی غلطی کی تھی۔ اب یہ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوسکتا تھا۔
''عدیلہ!'' عارف کے لہجے میں اس مرتبہ کچھ افسردگی تھی۔ ''کیا تمہیں اس بات سے ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی کہ میں اس شادی سے بچ گیا۔''
یاسمین نے طویل سانس لی۔ ''اب دیکھنا ہوگا کہ تم اس شادی سے بچ سکو گے یا نہیں۔''
''اب کیوں نہیں بچ سکوں گا...... اب تو جواز ہے میرے پاس...... میں ڈیڈی سے کہہ سکتا ہوں کہ جب وہ لڑکی خود ہی مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی تو میں زبردستی اس سے شادی کیوں کروں۔''
یاسمین جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ ریشماں تیزی سے دروازہ کھولتی ہوئی اندر آئی، پھر یاسمین کو موبائل پر کسی سے بات کرتے دیکھ کر ٹھٹک جانے والے انداز میں دروازے کے قریب ہی رک گئی۔
''کوئی آ گیا ہے۔ میں تم سے بعد میں بات کروں گی۔'' یاسمین نے دھیمی آواز میں کہہ کر رابطہ منقطع کیا اور

سوالیہ نظروں سے ریشماں کی طرف دیکھا۔
''ممی بلا رہی ہیں تمہیں!'' ریشماں نے فکرمند لہجے میں کہا۔
''تو اتنی پریشان کیوں نظر آرہی ہو!'' یاسمین کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔
''باجی!'' ریشماں غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم نے کوئی ایسی حرکت کی ہے کیا باجی کہ ممی کو غصہ آئے۔''
یاسمین کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے خیال آیا تھا کہیں ایسا تو نہیں کہ عارف کے والد نے اس کی ممی سے بات کی ہو اور انہیں وہ ایس ایم ایس بھیج دیا ہو جو اس نے عارف کو بھیجا تھا؟
''نہیں تو......'' یاسمین بہ مشکل بول سکی۔ ''مجھے کچھ نہیں معلوم کہ ممی کو میری کیا بات بری لگی ہوگی۔''
''جانے کیا بات ہے پھر!'' ریشماں الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''وہ بھی غصے میں ہیں اور ماما بھی......''
''ماما؟'' یاسمین چونکی۔
''ہاں......'' ریشماں نے جواب دیا۔ ''ابھی چند منٹ پہلے تو آئے ہیں اسلام آباد سے......! میں اس وقت برآمدے میں تھی۔ بالکل ٹھیک موڈ تھا اس وقت ان کا۔ مجھ سے دو ایک باتیں کر کے وہ ممی کے کمرے کی طرف چلے گئے۔'' ریشماں نے اپنی بات دہرائی، پھر بولی۔ ''میں اس وقت مالی کو لان کے پودوں کے بارے میں کچھ سمجھا رہی تھی۔ اس سے باتیں کر کے میں ممی کے کمرے کی طرف گئی کہ ماما سے باتیں کروں۔ میں نے وہاں قدم رکھا ہی تھا کہ ممی نے مجھ سے کہا۔ ''اچھا ہوا تم آ گئیں، ذرا بلا کے تو لاؤ اسے، اپنی باجی کو......!'' ان کے چہرے سے غصہ صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ یہی حالت ماما کی تھی، وہ تو غصے میں ٹہل رہے تھے۔ جانے کیا بات ہوئی ہے کہ وہ انہوں نے شاید ماما کو بھی بتائی اور انہیں بھی غصہ آ گیا۔ میں ابھی کہہ چکی ہوں باجی کہ وہ جب آئے تھے تو بالکل ٹھیک تھے۔ مجھ سے ہنس کر بات کی تھی۔ ممی کے کمرے میں جانے کے بعد پتا نہیں کیا ہوا۔''
''چلو۔'' یاسمین نے آہستہ سے کہا اور دروازے کی طرف قدم بھی اٹھائے۔
''سوچ لو باجی!'' ریشماں بولی۔
''کیا سوچ لوں؟''
''اگر تم نے کوئی ایسی بات کی ہے جو ممی کو بری لگی ہے تو تم پہلے ہی سے سوچ لو کوئی بہانہ......''
''چل تو سہی! دیکھتی ہوں کیا بات ہے۔''
ریشماں ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑا کر اس کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔ یاسمین محسوس کر رہی تھی کہ اس کے قدم بوجھل ہو رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر وہی بات ہوئی جس کا اسے خیال آیا تھا تو اب وہ کیا کہہ سکے گی۔
جب وہ دونوں الماس نادر کے کمرے میں داخل ہوئیں تو یاسمین کی نظر فوری طور پر ماما پر ہی پڑی۔
ماما نجیب خان الماس نادر سے دو چار سال چھوٹا تھا۔ اس کا قد خاصا نکلتا ہوا تھا۔ چوڑے پائنچوں کا پاجامہ، شیروانی، سلیم شاہی جوتی اور سر پر قراقلی ٹوپی میں وہ ٹھیٹ مشرقی شخص نظر آتا تھا۔ اسلام آباد میں لوگ اسے نواب زادہ نجیب خان کے نام سے جانتے تھے اور مشہور تھا کہ وہ رام پور کے نواب کی فیملی سے تعلق رکھتا تھا۔
وہ اس وقت بھی ٹہل رہا تھا۔ الماس نادر بیٹھی ہوئی اس طرح اپنی پیشانی سہلا رہی تھی جیسے سر میں درد ہو لیکن یاسمین کو دیکھتے ہی وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور یاسمین کو گھورنے لگی۔ نجیب خان بھی ٹہلتے ٹہلتے رک کر یاسمین کی طرف دیکھنے لگا۔
ریشماں کچھ گھبرائے ہوئے سے انداز میں بولی۔
''کیا میں جاؤں ممی؟''
''ضروری نہیں! تمہاری موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' الماس نادر نے کہا، پھر یاسمین کو گھورتی ہوئی بولی۔ ''کیا میں تمہیں پاگل سمجھ لوں؟''
یاسمین خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔
''یہ دیکھو!'' الماس نادر نے اپنا موبائل فون اس کی طرف بڑھایا۔
یاسمین کو چند قدم آگے بڑھ کر موبائل لینا پڑا۔
''کیا ہے ممی؟'' اس نے موبائل لیتے ہوئے پوچھا تھا۔
''خود دیکھ لو، کیا ہے اسکرین پر!''
الماس نادر کے بولنے سے پہلے ہی یاسمین کی نظر موبائل اسکرین پر پڑی اور اسے اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی۔ اسکرین پر اسی ایس ایم ایس کی ابتدائی سطریں دکھائی دے رہی تھیں جو اس نے عارف کو بھیجا تھا۔
''رانی بیگم کو عارف کے والد نے فون کیا تھا اور یہ ایس ایم ایس بھی بھیجا تھا۔'' الماس نادر ترش لہجے میں بولی۔ ''رانی بیگم نے مجھے فون کیا اور یہ ایس ایم ایس بھی بھیج دیا۔

عارف کو یہ ایس ایم ایس اسی نمبر سے بھیجا گیا ہے جو تم اسلام آباد سے مجھے فون کرتے ہوئے استعمال کیا کرتی تھیں۔''

یاسمین خاموش کھڑی رہ گئی۔

''تمہارا وہ موبائل کہاں ہے؟'' الماس نادر نے پوچھا۔

یاسمین کو اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بہ مشکل بول سکی۔ ''میرے کمرے میں۔''

''جاؤ!'' الماس نادر نے ریشماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے کمرے سے وہ موبائل لے کر آؤ۔''

ریشماں دروازے کی طرف مڑنے ہی والی تھی کہ یاسمین بول پڑی۔ ''کیا کریں گی وہ منگوا کے ممی!''

''اگر تم نے یہ ایس ایم ایس اپنے موبائل سے اڑایا نہیں ہے تو وہ اب بھی موجود ہوگا اس میں!''

''جی ہاں۔'' یاسمین نظریں جھکائے ہوئے بولی۔ ''وہ ہے اس میں۔''

''کیوں؟'' الماس نادر نے کڑے تیوروں کے ساتھ کہا۔ ''تم تو اس سے محبت کرتی ہو...... جب تمہیں یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ تمہاری شادی اسی سے کی جا رہی ہے تو تم اس کے لیے تڑپ رہی تھیں۔ ریشماں نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری کیا حالت تھی۔''

یاسمین چپ رہی۔

''جواب کیوں نہیں دیتیں!'' نجیب خان یکا یک گرجا۔

یاسمین سہم گئی۔ وہ نجیب خان سے بہت ڈرتی تھی۔

''میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی ماما!'' یاسمین کی آواز میں لرزش تھی۔

''کیوں؟'' نجیب خان اس مرتبہ حیرت سے بولا۔ ''اس سے محبت کرتی ہو لیکن اس سے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔''

''جی ماما!'' یاسمین کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

''کیا عارف اس بات سے پریشان نہیں کہ تم اس سے محبت کرنے کے باوجود اس سے شادی نہیں کرنا چاہتیں...... کیا تمہاری محبت یک طرفہ ہے؟...... میرا مطلب ہے، کیا عارف تمہیں نہیں چاہتا؟ تمہارا جو یہ ایس ایم ایس ہے، یعنی جو تم نے عارف کو بھیجا، اس سے بھی شبہ ہوتا ہے جیسے عارف تم سے واقف نہیں۔''

''جی ہاں۔ مجھ سے واقف نہیں ہے وہ۔'' یاسمین کا یہ جواب ایک اعتبار سے سچ ہی تھا۔ عارف اسے عدیلہ کے نام سے جانتا تھا۔

نجیب خان کی ان باتوں کے دوران میں الماس نادر جو خاموش رہی تھی، یکا یک بول اٹھی۔ ''ریشماں نے مجھے بتایا تھا کہ تم اس کی تصویر دیکھ کر رو رہی تھیں اور تم نے یہ بھی کہا تھا کہ کاش تم اس سے نہ ملی ہوتیں۔ کیوں ریشماں!''

''جی۔'' ریشماں نے آہستہ سے کہا۔ وہ پریشان سی ایک طرف کھڑی ہوئی تھی۔

الماس نادر پھر یاسمین کو گھورنے لگی۔ نجیب خان کی نظریں بھی یاسمین پر جمی ہوئی تھیں۔

یاسمین بولی۔ ''اس سے میری ملاقات ایک کیفے میں ہوئی تھی۔ میں نے اس سے آٹو گراف لیا تھا۔ اس سے ایک مداح کی حیثیت سے ملی تھی۔''

''اس کے بعد کبھی نہیں ملیں؟''

''ملی ہوں۔''

''ابھی تم نے کہا تھا کہ۔'' نجیب خان بول پڑا۔ ''عارف تم سے واقف نہیں۔''

''وہ مجھے یاسمین کے نام سے نہیں جانتا۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے اسے اپنا نام عدیلہ بتایا تھا۔ وہ مجھے عدیلہ کے نام سے جانتا ہے۔''

''کیوں؟'' الماس نادر چونک کر بولی۔

''پہلی بار ملی تھی اس سے......! مناسب نہیں سمجھا تھا کہ اسے اپنا اصلی نام بتاؤں۔ پھر بعد کی ملاقاتوں میں مجھے ہمت نہیں ہوئی کہ اسے اپنی غلط بیانی کے بارے میں بتاؤں۔''

''کیا تم سے...... یعنی عدیلہ سے بھی محبت نہیں کرتا؟''

اب جانے کیوں یاسمین کے لیے جھوٹ بولنا مشکل ہو گیا تھا۔ ''کرتا ہے۔'' وہ بہ مشکل بول سکی۔

''لیکن یاسمین نامی لڑکی سے بھی شادی کے لیے تیار ہو گیا...... ظاہر ہے کہ اگر وہ تیار نہ ہوا ہوتا تو اس کے باپ کو یہ بات چھیڑنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی......''

''وہ اس شادی کو ٹال سکتا ہے اگر میں...... یعنی عدیلہ اس سے شادی کے لیے آمادہ ہو جائے۔''

''تو تم آمادہ کیوں نہیں ہو؟''

''میں اس سے محبت کرتی ہوں۔'' یاسمین لرزیدہ آواز میں بولی۔ ''میں اسے دھوکا نہیں دینا چاہتی۔''

''کیسا دھوکا؟''

''میں نے اسے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''آئندہ بھی نہ بتانا......''

''وہ جان لے گا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ شادی کے بعد

کوئی مرد......"

"اس کی پروامت کروتم!" الماس نادر بول پڑی۔ "اس کا بندوبست ہو جائے گا۔"

"میرے ضمیر میں تو کھٹک رہے گی۔" یاسمین دبی زبان سے بولی۔

"بکواس مت کرو۔" نجیب خان پھر گرجا۔ "تمہاری شادی اسی سے ہوگی۔ فضول قسم کی دلیلیں مت دو۔" پھر وہ الماس نادر کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم رانی بیگم کو فون کر کے اسے کہہ دو کہ وہ ایس ایم ایس یاسمین نے نہیں بھیجا تھا۔ یہ اس کی ایک دوست کی شرارت ہے۔ یاسمین کو اس شادی سے انکار نہیں۔" اس کے بعد وہ پھر یاسمین سے مخاطب ہوا۔ "اب تم جاؤ، یہ خیال اپنے ذہن سے نکال دو کہ تم اس سے شادی نہیں کروگی۔ اگر تم چاہو تو اس سے ملاقات کر کے اسے بتادو کہ تم عدیلہ نہیں، یاسمین ہی ہو اور اگر نہ بتانا چاہو تو بھی کوئی حرج نہیں۔ شادی کے بعد جب وہ یاسمین کے بجائے عدیلہ کو دیکھے گا تو حیران رہ جائے گا۔ اسے خوشی بھی ہوگی اور...... اچھا خیر! اب تم جاؤ اور تم رانی بیگم کو فون کرو الماس!" وہ عمر میں چھوٹا ہونے کے باوجود الماس نادر کو اس کے نام ہی سے مخاطب کرتا تھا۔

یاسمین روہانسی ہوگئی تھی۔ اسی کیفیت میں وہ اپنے کمرے سے نکلی۔ اس کے پیچھے ریشماں بھی نکل آئی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے آستین سے اپنی آنکھیں خشک کیں۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ ریشماں اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

"تم جاؤ ریشماں!" اس نے پلٹ کر ریشماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اس وقت تنہائی چاہتی ہوں۔ پلیز!"

"لیکن باجی، میں تم سے اسی معاملے میں تو باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ آخر تم......"

"پلیز!" یاسمین نے اس کی بات کاٹی۔ "وہ پھر کسی وقت کرلینا۔ اس وقت مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ میرا دماغ چکرا رہا ہے۔"

"اچھا باجی!" ریشماں نے ٹھنڈی سانس لی۔

یاسمین نے اس کے واپس جاتے ہوئے قدموں کی چاپ سنی تو مڑ کر دروازہ بند کیا وہ کھوئی کھوئی سی اپنے بستر کی طرف بڑھی۔ بستر پر لیٹ کر وہ چھت کو تکنے لگی۔ وہ چند لمحوں میں بالکل بدل گئی تھی۔ کہاں تو کمرے میں داخل ہوتے وقت اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں لیکن پھر اسے جانے کیا خیال آیا تھا کہ یکایک اس کا چہرہ بالکل سپاٹ ہوگیا تھا۔ ہر قسم کے تاثرات سے عاری، جیسے وہ پتھرا گئی ہو۔

ایک ڈیڑھ گھنٹا اس طرح گزر گیا کہ وہ بستر پر لیٹی چھت کو تکتی رہی۔ اس عرصے میں اس کی پلکیں بھی معمول سے کم جھپکیں۔ بہت سے خیالات اس کے دماغ میں چکراتے رہے تھے۔ آخر اس کے جسم نے حرکت کی۔ اس نے اپنا دوسرا موبائل فون اٹھایا جس سے وہ عارف کو ایک مرتبہ ایس ایم ایس کر چکی تھی۔

اب وہ ایک اور ایس ایم ایس کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ٹائپ کرنا شروع کیا۔

"عارف صاحب!...... میں، یاسمین آپ سے ایک بار پھر مخاطب ہو رہی ہوں۔ مجھے بالکل خیال نہیں تھا کہ میں نے آپ کو جو ایس ایم ایس بھیجا تھا، وہ آپ کی ذات تک محدود نہیں رہے گا۔ وہ سب کچھ میری والدہ تک پہنچ گیا۔ میں بڑی مشکل میں پھنس گئی۔ میں نے کہا تھا نا کہ میں ایک لڑکی ہوں، شادی سے انکار کی ہمت نہیں کرسکتی۔ مجبوراً مجھے یہ بہانہ بنانا پڑا کہ میرا موبائل کچھ دیر کے لیے میری ایک دوست کے پاس رہا تھا۔ وہ ایس ایم ایس بھیجنا اس کی شرارت ہوسکتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بات آپ تک پہنچ گئی ہو۔ اگر نہیں پہنچی تو جلد ہی پہنچ جائے گی۔ میں چاہتی ہوں کہ انکار آپ ہی کی طرف سے ہو۔ اب میں مجبور ہوگئی ہوں کہ آپ سے مل کر آپ کو بتادوں کہ میں شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی۔ کل آپ مجھ سے مل لیجیے۔ میری درخواست ہے کہ یہ ایس ایم ایس آپ اپنی ذات تک محدود رکھیے گا۔ مجھ سے ملنے کے بعد آپ کو اختیار ہوگا کہ آپ کو کیا قدم اٹھانا چاہیے۔"

یہ تحریر ٹائپ کرنے کے بعد یاسمین نے اسے دو مرتبہ پڑھا۔ پھر اس میں اضافہ کیا کہ دوسرے دن کس وقت اور کس جگہ ملاقات ہوگی۔

عارف کو یہ ایس ایم ایس کرنے کے بعد اسے یہ پریشانی لاحق نہیں تھی کہ عارف اس کے بارے میں بھی اپنے والد کو بتادے گا۔ اس کی جو وجہ اس کے ذہن میں تھی وہ سامنے بھی آگئی۔ اس کے اس موبائل کی گھنٹی بجنے لگی جس کا نمبر عارف کے علم میں تھا۔ یاسمین نے وہ فون اٹھایا۔ کال واقعی عارف کی تھی۔ یاسمین کو یہی یقین تھا کہ وہ ایس ایم ایس ملنے کے بعد عارف فوری طور پر اسی کو فون کرے گا۔

"ہاں عارف!" یاسمین نے موبائل کان سے لگا کر کہا۔

''عجیب صورت حال بن رہی ہے۔'' دوسری طرف سے عارف نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔
''اب کیا ہوا؟'' یاسمین نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔
''میں تمہیں تفصیل بتانے کے بجائے وہ دوسرا ایس ایم ایس تمہیں بھیج دیتا ہوں جو یاسمین نے مجھے ابھی ابھی بھیجا ہے۔ اس سے تم خود ساری بات سمجھ لوگی۔''
''پھر آیا ہے ایس ایم ایس؟'' یاسمین نے سادگی سے پوچھا۔
''ہاں، وہ میں بھیج رہا ہوں تمہیں۔ وہ پڑھنے کے بعد تم مجھے فون کرنا۔ میں تم سے اس بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔''
یاسمین کے کچھ بولنے سے پہلے ہی دوسری طرف سے رابطہ منقطع کیا جاچکا تھا۔ یاسمین نے بھی اپنا موبائل بند کیا اور انتظار کرنے لگی۔ اس کا چہرہ اب بھی سپاٹ تھا۔
جلد ہی اس کے موبائل پر وہ ایس ایم ایس آ گیا جو اس نے عارف کو بھیجا تھا۔
ایک منٹ بعد اس نے عارف کے موبائل ... رابطہ کیا۔
''پڑھ لیا؟'' عارف نے بے تابی سے پوچھا تھا۔
''ہاں۔'' یاسمین نے کہا۔ ''جانے کیوں نہیں چاہتی یہ لڑکی تم سے شادی کرنا...... بات میری سمجھ میں بھی نہیں آرہی ہے۔''
''وہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آرہی ہے لیکن اب کام بن جائے گا۔''
''کیا مطلب!''
''میں تم سے کہہ چکا ہوں نا کہ میں خود اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ اب مجھے ڈیڈی سے بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔ میں ان سے کہہ سکتا ہوں کہ جو لڑکی شادی سے پہلے ہی مجھ سے اس قسم کا لچر مذاق کر رہی ہو، اس سے میں ہرگز شادی نہیں کروں گا۔''
''یعنی تم یہ ایس ایم ایس بھی اپنے ڈیڈی کو......''
''ہاں۔'' عارف نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''یہ مجھے بہت اچھا موقع مل گیا ہے۔''
''مجھے افسوس ہوگا اگر تم نے ایسا کیا۔''
''کیوں؟'' عارف کے لہجے میں حیرت تھی۔
''وہ بے چاری نہ جانے کس بپتا میں گرفتار ہے۔ تمہیں اس سے ہمدردی ہونا چاہیے۔ وہ تم سے ایک مرتبہ ملنا چاہتی ہے۔ مل لوگے تو کیا فرق پڑے گا......؟ ملنے کے بعد بھی تم جو چاہو، کرسکتے ہو۔ اپنی مرضی کے مالک ہو تم! لیکن اچھی بات یہی ہوگی کہ پہلے تم اس سے مل لو۔ جان تو لو کہ وہ بے چاری آخر کس مصیبت میں گرفتار ہے۔''
''تمہارے اس مشورے سے میں ایک ہی مطلب اخذ کرسکتا ہوں۔''
''مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ تم کیا مطلب اخذ کرسکتے ہو۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ مجھے جس عارف سے محبت ہے، وہ ایک اچھا انسان ہونے کا ثبوت دے۔ اس لڑکی نے تم سے درخواست کی ہے، التجا کی ہے، اسے نظرانداز کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہوگی عارف!''
عارف نے جواب میں فوراً کچھ نہیں کہا۔ یاسمین نے ایسی آواز سنی جیسے عارف نے ایک طویل سانس لی ہو۔
''کیا میں کچھ غلط کہہ رہی ہوں عارف؟'' یاسمین بولی۔
''چھوڑو اس بحث کو...... میں کل مل لیتا ہوں اس سے...... اس کے بعد ہی فیصلہ کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے بلکہ میں ابھی اسے فون کرتا ہوں۔ کل تک الجھن میں پڑا رہوں گا۔ اگر وہ مجھ سے آج ہی مل لے تو بہتر ہوگا۔ کل تک کی الجھن سے تو بچ جاؤں گا۔''
''اگر تم آج ہی ملنا چاہتے ہو تو بھی اسے ایس ایم ایس ہی کرو۔ وہ تم سے بات کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہی ہوگی، ورنہ ایس ایم ایس کیوں بھیجتی، فون کرلیتی تمہیں!''
''کوشش کرکے دیکھ لیتا ہوں۔ اگر اس نے کال ریسیو نہیں کی تو پھر ایس ایم ایس ہی کردوں گا۔''
''ایسا کرو۔''
''اس سے بات کرکے میں تمہیں پھر فون کروں گا۔''
''اچھا۔''
دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔
یاسمین انتظار کرنے لگی۔ جلد ہی اس کے دوسرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ یاسمین کو یقین تھا کہ کال عارف ہی کی ہوگی، تاہم اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ اسکرین پر عارف ہی کا نمبر تھا۔ یاسمین نے کئی گھنٹیاں بجنے کے باوجود کال ریسیو نہیں کی۔
آخر گھنٹیاں بجنا بند ہوگئیں۔ پھر کچھ وقفے سے ایس ایم ایس آیا۔
عارف نے لکھا تھا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ تم مجھ سے بات کرتے ہوئے کیوں ہچکچا رہی ہو۔ خیر!...... میں تمہاری یہ بات مان رہا ہوں کہ تم سے ملاقات کرنے تک یہ ایس ایم ایس اپنی ذات تک محدود رکھوں لیکن کل تک الجھن میں پڑے رہنا میرے لیے مشکل ہوگا۔ تم مجھ سے

ابھی، ایک گھنٹے کے اندر اندر مل لو، اسی جگہ جو تم نے تجویز کی ہے، میں تمہارا انتظار کروں گا۔ اگر تم نہیں آئیں تو میرے لیے مشکل ہوگا کہ یہ ایس ایم ایس اپنی ذات تک محدود رکھوں۔"

یاسمین نے پیغام پڑھنے کے بعد عارف کو یہ ایس ایم ایس بھیجا۔

"اچھا! میں ایک گھنٹے میں پہنچ جاؤں گی۔ میں آپ کو پہچانتی ہوں اس لیے آپ کی میز تک پہنچنا میرے لیے مشکل نہیں ہوگا۔"

یاسمین نے ملاقات کے لیے ایک ایسے ریسٹورنٹ کا نام تجویز کیا تھا جہاں بہت کم لوگ جاتے تھے حالانکہ وہ ریسٹورنٹ برا نہیں تھا۔

وہاں پہنچنے میں یاسمین کو آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگتا اس لیے وہ فوراً بستر سے نہیں اٹھی۔ اس کے چہرے سے اب قدرے پریشانی ظاہر ہونے لگی تھی۔ اس نے دوسرے دن تک کی مہلت اس لیے چاہی تھی کہ عارف کو سب کچھ بتانے کے لیے خود کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کر سکے۔ جو کچھ اسے بتانا تھا، وہ زبان پر لانا اس کے لیے آسان نہیں تھا لیکن وہ اس خیال سے فوراً ملنے پر آمادہ ہوئی تھی کہ عارف واقعی دوسرے دن تک ضبط نہیں کر پاتا اور ایس ایم ایس کی بات اس کے ڈیڈی سے ہوتی ہوئی الماس نادر تک پہنچ جاتی۔

باتھ روم میں جاکر یاسمین نے منہ پر پانی کے چھپکے مارے۔ اس طرح وہ خود کو تازہ دم کرنا چاہتی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ کر اس نے اپنا میک اپ بھی درست کیا، پھر اپنے کمرے سے نکلی۔

ریشماں اپنے کمرے میں تھی۔ یاسمین نے وہاں جاکر اس سے کہا۔ "میری دوست کی طبیعت پھر کچھ زیادہ خراب ہوگئی ہے۔ اس کی بہن کا فون آیا تھا ابھی!...... میں اسی کے گھر جارہی ہوں، ممی کو بتادینا۔"

"اچھا۔" ریشماں نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

یاسمین مڑی اور تیزی سے چلتی ہوئی بنگلے سے نکل آئی۔ وہ اس وقت الماس نادر یا نجیب خان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہ عارف سے بات کرنے کے لیے اپنی ہمت مجتمع کرنے میں کوشاں رہی۔

طے شدہ وقت سے پانچ منٹ پہلے ہی اس کی کار ریسٹورنٹ کے سامنے پارک ہوچکی تھی لیکن اس نے کار سے اترنے میں تین منٹ لگادیے۔ پھر کار سے اتر کر ریسٹورنٹ کی طرف بڑھی جو اوپری منزل پر تھا۔ وہ عارف کے مزاج کو جانتی تھی اس لیے اسے یقین تھا کہ عارف وقت سے پہلے ہی ریسٹورنٹ پہنچ چکا ہوگا۔

اس کا یقین درست ثابت ہوا۔

"تم!" عارف اسے دیکھ کر چونک پڑا۔

"ہاں۔" یاسمین اپنا وینٹی بیگ گود میں رکھتے ہوئے عارف کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تمہیں نہیں آنا چاہیے تھا عدیلہ!" عارف پہلو بدل کر بولا۔ "ممکن ہے کہ وہ تمہارے سامنے مجھ سے بات نہ کرنا چاہے اور تمہیں دیکھ کر واپس لوٹ جائے۔"

"ایسی صورت میں وہ تمہیں ایس ایم ایس ضرور کرے گی۔ اگر ایسا ہوا تو میں چلی جاؤں گی۔" یاسمین نے اپنی گود میں رکھا ہوا وینٹی بیگ کھولتے ہوئے کہا۔

"لیکن۔" عارف بولا۔ "تم نے اس وقت آنا کیوں ضروری سمجھا؟"

"ابھی بتاتی ہوں۔" یاسمین نے جواب دیتے ہوئے وینٹی بیگ سے اپنا وہ موبائل نکالا جس سے وہ عارف کو ایس ایم ایس کرتی رہی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ گود میں ہی رکھے تاکہ عارف وہ موبائل نہ دیکھ سکے۔

عارف الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

یاسمین نے ایس ایم ایس ٹائپ کیا۔ "عارف!...... میں یعنی یاسمین تمہارے سامنے بیٹھی ہوئی ہوں۔"

یہ ایس ایم ایس اس نے عارف کے موبائل پر بھیجنے کے بعد اپنا موبائل وینٹی بیگ میں رکھا اور سیدھی ہوکر عارف کی طرف دیکھنے لگی جو اس وقت اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھ رہا تھا۔

"تین منٹ زیادہ ہوگئے۔" وہ بڑبڑایا۔ "وہ ضرور تمہیں دیکھ کر واپس چلی گئی ہوگی۔"

اسی وقت عارف کی جیب میں پڑے ہوئے موبائل کی "میسج ٹون" سنائی دی۔ عارف نے جلدی سے موبائل نکالا اور اس کی اسکرین پر نظر ڈال کر یاسمین کی طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے بولا۔ "اسی کا ایس ایم ایس ہے، میں نے کہا تھا نا کہ وہ تمہیں دیکھ کر واپس چلی گئی ہوگی۔"

"کوئی لڑکی یہاں آتی ہوئی دکھائی تو نہیں دی۔ تم دیکھو تو، اس نے کیا میسج کیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے یاسمین کی

آواز میں لرزش آ گئی تھی۔
عارف نے ایس ایم ایس پڑھا۔ عبارت مختصر تھی۔ عارف نے چونک کر یاسمین کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کا تاثر بھی تھا۔
"کیا مطلب!" اس کے منہ سے نکلا۔ "یاسمین کا ایس ایم ایس یہ ہے کہ وہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی ہے۔"
"ہاں۔" یاسمین نے افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "ایس ایم ایس میں کچھ غلط نہیں ہے۔"
"لیکن... لیکن......" عارف ہکلانے سا لگا۔ "میرے سامنے تو تم بیٹھی ہو۔"
"میں ہی یاسمین ہوں۔" اس مرتبہ یاسمین نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے معاف کر دینا عارف!...... میں نے تمہیں غلط نام بتایا تھا اپنا...... میرا نام عدیلہ نہیں، یاسمین ہے۔"
عارف ہونقوں کی طرح اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔
"کیفے میں ہماری وہ پہلی ملاقات...... یاد ہے نا!" یاسمین نے نظریں جھکا لیں۔ "جب تم نے آٹوگراف دینے کے لیے میرا نام پوچھا تھا تو یکایک میرے دماغ میں خیال آیا کہ مجھے پہلی ہی ملاقات میں کسی مرد کو اپنا نام نہیں بتانا چاہیے۔ آٹوگراف لینے کا مقصد تو یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے نام پر لیا جائے مگر جب میرے دماغ میں یہ خیال آیا تو میں بے اختیار تمہیں ایک غلط نام بتا بیٹھی۔ فوری طور پر وہی نام میرے ذہن میں ابھرا تھا۔"
عارف اب بھی کچھ نہیں بول سکا۔ وہ اب بھی یاسمین کو اس طرح تکے جا رہا تھا جیسے اس کے سامنے کوئی عجوبہ ہو۔
یاسمین نے ایک بار نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا دیا۔ "لیکن جب تم سے باتیں شروع ہوئیں تو ملاقات ختم ہونے تک مجھے احساس ہو چکا تھا کہ غلط نام بتا کر میں نے غلطی کی ہے۔ اس احساس ہی کی وجہ سے میں نے تمہیں اپنا موبائل نمبر غلط نہیں بتایا۔ اس وقت میں نے سوچا تھا کہ بعد میں تمہیں بھی کسی وقت اپنی غلطی کے بارے میں بتا دوں گی لیکن بعد میں یہ ہوا کہ میں تذبذب کا شکار ہو گئی۔ بار بار یہ خیال ذہن میں آ جاتا تھا کہ جب میں تمہیں یہ بات بتاؤں گی تو میرے بارے میں تم نہ جانے کیا سوچو۔ اس تذبذب میں زیادہ دن گزر گئے اور پھر میں نے فیصلہ کیا کہ تم سے اپنے تعلق کو عدیلہ ہی کے نام سے چلنے دیا جائے۔"
عارف اب بھی خاموش رہا۔ ان باتوں نے یقیناً اس کو دماغی طور پر اتنا چکرا دیا تھا کہ اسی کی طرح شاید اس کی زبان بھی پتھرا سی گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہوگا کہ وہ ان باتوں پر اپنا ردعمل کن الفاظ میں ظاہر کرے۔
"تم کچھ نہیں بولو گے عارف!" یاسمین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس مرتبہ اس کی آواز کچھ بھرا گئی تھی۔
عارف کے ہونٹ پہلے تو لرزے، پھر وہ بہ وقت بول سکا۔ "میں...... میں کیا بولوں۔" اس کا لہجہ سوالیہ نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوا تھا جیسے اس نے جو کچھ کہا تھا، خود سے کہا تھا۔
یاسمین افسردگی سے مسکرائی۔ "مجھے برا بھلا ہی کہو۔"
عارف کے ہونٹ پھر لرزے اور اس مرتبہ لرز کر ہی رہ گئے۔ وہ کچھ بول نہیں سکا۔ یاسمین نے پھر نظریں جھکا لیں۔ اب اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔
اس وقت ویٹر ان کے قریب آ گیا۔ پہلے تو اس بے چارے نے انتظار ہی کیا ہوگا کہ اسے قریب آنے کا اشارہ کیا جائے۔
عارف نے اس سے چائے لانے کے لیے کہا لیکن اس طرح جیسے اسے خود بھی معلوم نہ ہو کہ اس نے ویٹر سے کیا کہا تھا۔
یاسمین سر جھکائے ہوئے بولی۔ "میں تنہائیوں میں رویا کرتی تھی عارف کہ مجھے تم سے محبت تو ہو گئی ہے لیکن میں تم سے شادی نہیں کر سکوں گی۔ پھر اچانک مجھے معلوم ہوا کہ ممی کسی سے میری شادی طے کر رہی ہیں۔ میں نے ان سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ میری شادی کہاں کر رہی ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ اچھا ہے، میری شادی کہیں ہو جائے۔ تم مجھے بے وفا اور نہ جانے کیا کیا سمجھتے لیکن مجھے وہ سب کچھ قبول تھا۔"
"عدیلہ!" عارف کے منہ سے بے اختیار وہی نام نکلا جو اسے پہلی مرتبہ بتایا گیا تھا۔ "یعنی۔" وہ قدرے رک کر بولا۔ "میرے علاوہ کسی سے شادی کرنے پر تمہیں کوئی اعتراض......"
"ہاں۔" یاسمین نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کسی اور سے شادی ہونے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ تم سے تو میں اس لیے شادی نہیں کرنا چاہتی کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ کوئی بھی اس شخص کو دھوکا نہیں دے سکتا جس سے وہ محبت کرتا ہو۔"
"دھوکے سے کیا مراد ہے تمہاری!" دھیرے دھیرے عارف بولنے کے قابل ہو گیا تھا۔
"وہ...... وہ......" یاسمین نے اپنی بات مکمل کیے بغیر پھر نظریں جھکا لیں۔ "میں...... میں کیا بتاؤں عارف!...... تمہیں کیا بتاؤں کہ مجھ پر اس وقت کیسی قیامت گزر گئی تھی

جب مجھے معلوم ہوا تھا کہ میری شادی تمہارے ساتھ طے کی جارہی ہے۔ میرا دماغ جیسے شل ہوگیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کروں۔ ممی سے یہ کہنا میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ میں یہ شادی نہیں کروں گی۔ اسی لیے میں نے تم کو ایس ایم ایس بھیجا۔ میرا خیال تھا کہ تم میری بات مان لو گے اور شاید یہی سوچو کہ یاسمین نامی یہ لڑکی کسی اور سے محبت کرتی ہے اس لیے تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے یہ بھی خیال تھا کہ تم خود بھی میرے علاوہ...... یعنی عدیلہ کے علاوہ کسی سے شادی کے لیے تیار نہیں ہو۔ ایس ایم ایس بھیجنے کا خیال میرے دماغ میں اچانک آیا تھا اور میں کچھ غور کیے بغیر یہ قدم اٹھا بیٹھی تھی۔ اگر میں سوچ لیتی تو یقیناً میری سمجھ میں آجاتا کہ تم اس شادی سے بچنے کے لیے میرے ایس ایم ایس ہی کا سہارا لو گے، اپنے والد کو دکھا دو گے...... اور اس طرح بات بڑھے گی، میری ممی تک پہنچے گی اور وہی ہوا۔" یاسمین نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں تم سے ملوں، تمہیں بتادوں کہ میں...... یعنی عدیلہ ہی دراصل یاسمین ہوں اور یہ بھی بتادوں کہ میں تم سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی جبکہ میں تمہیں اپنی زندگی سے بھی زیادہ چاہتی ہوں۔ تمہاری خاطر اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔"

عارف نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر رکھتے ہوئے مٹھیاں بھینچ لیں اور بولا۔ "مگر کیوں؟ کیوں عد...... ہاں! میں اب بھی تمہیں عدیلہ ہی کہوں گا۔ مجھے کچھ وقت لگے گا اپنی یہ عادت چھوڑنے میں!...... مجھے بتاؤ!...... تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں؟"

"اس لیے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔" یاسمین کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ "میں تمہیں دھوکا نہیں دے سکتی۔"

"کیسا دھوکا؟" عارف نے تیزی سے پوچھا۔

"وہ...... وہ...... دراصل......" یاسمین پھر چپ ہوگئی۔

"بتاؤ! پلیز!" عارف شدید سے شدید تر جذباتی ہوتا چلا جارہا تھا۔ "ابھی ذرا دیر پہلے بھی تم وہ وہ کر کے بات ٹال گئی تھیں۔ مجھے صاف صاف بتاؤ۔ پلیز!"

"کیسے بتاؤں!" یاسمین کی آواز اس کے گلے میں پھنسنے لگی۔ "راستے بھر ہمت مجتمع کرتی رہی کہ تمہیں بتادوں گی لیکن میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ اسی لیے میں نے ایس ایم ایس میں لکھا تھا کہ میں تم سے کل ملوں گی۔ میرا خیال تھا کہ میں کل تک خود کو اتنا مضبوط کرلوں گی کہ تمہیں بتا سکوں کہ...... کہ...... لیکن تم نے آج ہی ملنے کی بات کی۔ تمہاری وجہ سے میں یہ سوچ کر گھر سے چل پڑی تھی کہ ہمت کرلوں گی لیکن...... لیکن...... میں کیسے بتاؤں عارف! مجھے ہمت نہیں ہورہی ہے۔"

"کیا پہلے کسی سے تمہاری شادی ہوچکی ہے؟" عارف بول پڑا۔

یاسمین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟"

"سوچتا جو رہا ہوں۔ مسلسل سوچتا رہا ہوں کہ تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں۔ اب اس وقت یہی بات ذہن میں آئی۔ تمہیں یہ خیال ہوگا کہ شادی کے بعد مجھے اس کا علم ہوجائے گا کہ تمہاری شادی ہوچکی ہے اور......"

عارف یکایک خاموش ہوگیا۔ اس نے ویٹر کو دیکھ لیا تھا جو چائے کی ٹرے سنبھالے ان کی میز کے قریب آچکا تھا۔ یاسمین کی پلکیں بھی اب بھیگی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ اس نے جلدی سے اپنا رخ دوسری طرف کیا تاکہ ویٹر اس کی بھیگی ہوئی آنکھیں نہ دیکھ سکے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جلدی سے ٹشو پیپر نکال لیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں خشک کرلیں۔

ویٹر ٹرے رکھ کر چلا گیا۔

"بتاؤ...... عدیلہ...... یاسمین!...... پلیز!...... بتاؤ!...... میرا خیال صحیح ہے؟ تمہاری کبھی کسی سے شادی ہوچکی ہے؟"

یاسمین نے اس کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں۔

"پلیز یاسمین!" عارف بولا۔ "بتاؤ...... پلیز بتاؤ!...... کیا یہی بات ہے؟ پہلے کبھی تمہاری شادی ہوچکی ہے؟...... بتاؤ!"

"کیا بتاؤں عارف...... مجھے ہمت نہیں ہورہی ہے۔ اگر میں تمہاری بات کے جواب میں نہیں کہوں گی تو تم پوچھو گے کہ پھر کیا بات ہے اور اگر ہاں کہوں گی تو بھی تم سوالات کرو گے کہ وہ شادی ختم کیوں ہوگئی۔ پلیز عارف! یہاں ہوٹل میں مجھے اتنا جذباتی نہ کرو کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگوں۔ میں ہمت نہیں کر پارہی ہوں کہ تمہیں کچھ بتاؤں...... پلیز!...... پلیز عارف! میں رو پڑوں گی اگر......" اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں پھر ڈبڈبانے لگیں۔

"اچھا!" عارف نے طویل سانس لی اور پہلی مرتبہ یاسمین کے چہرے سے نظریں ہٹا کر میز کی طرف دیکھنے لگا۔

چائے میز پر موجود تھی لیکن اس کا خیال نہ یاسمین کو آیا تھا، نہ عارف کو!

یاسمین نے ایک بار پھر ٹشو پیپر سے اپنی آنکھیں خشک کیں۔ عارف کی طرح اس نے بھی نظریں جھکالی تھیں۔ وہ اس وقت چونکی جب اس نے برتنوں کی کھنک سنی۔ اس نے دیکھا کہ عارف چائے بنانے کے لیے پیالیاں سیدھی کر رہا تھا۔

''میں بناتی ہوں۔'' یاسمین جلدی سے بولی اور ٹرے اپنی طرف کھسکانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے۔

عارف نے اپنے ہاتھ ہٹالیے۔

یاسمین نے دونوں پیالیوں میں چائے بنانے کے بعد ایک پیالی عارف کی طرف بڑھائی جو اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا اور کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''چائے پیو۔'' یاسمین دھیمی آواز میں بولی اور خود بھی اپنی پیالی اٹھائی۔

ان دونوں نے چائے اس طرح پی جیسے کوئی فرض ادا کر رہے ہوں۔ اس دوران میں دونوں ہی خاموش رہے۔ چائے ختم کرنے کے بعد ویٹر کو اشارہ کیا۔ ویٹر بل لے آیا۔ عارف نے بل کی ادائیگی کی، پھر ویٹر کے جانے کے بعد یاسمین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔''میں نے جان لیا کہ تم عدیلہ نہیں، یاسمین ہو، لیکن...... کیا اس ملاقات کا مقصد اتنا ہی تھا؟''

یاسمین کوئی جواب نہیں دے سکی۔

کچھ خاموشی کے بعد عارف، پھر بولا۔''ایک بات کہی تھی تم نے...... کل تک کی مہلت چاہی تھیں تم!...... کل تک تم ہمت کر لوگی کہ مجھے شادی نہ کرنے کی صحیح وجہ بتاسکو۔''

''کوشش کروں گی مگر ابھی یہ خیال تو تم اپنے دماغ سے نکال ہی دو کہ پہلے کسی سے میری شادی ہو چکی ہے۔''

عارف نے طویل سانس لی۔''چلو ٹھیک ہے، نکال دیتا ہوں یہ خیال اپنے ذہن سے...... میں کل تک تمہارے جواب کا انتظار کروں گا۔ ہاں ایک خدشہ مجھے ضرور ہے۔ کل تک تم نے ہمت کر بھی لی تو میرے سامنے آکر تمہاری ہمت شاید پھر جواب دے جائے لہٰذا......''

''لہٰذا؟'' یاسمین نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کل ہم ملیں گے نہیں۔'' عارف نے کہا۔''تم مجھے فون پر بتادینا۔ میرا خیال ہے کہ فون پر تمہاری ہمت جواب نہیں دے گی۔''

یاسمین خاموش رہی۔

''چلو اب اٹھتے ہیں یہاں سے۔'' عارف پھر بولا۔

یاسمین کچھ کہے بغیر کھڑی ہوگئی۔ ریسٹورنٹ سے باہر نکل کر یاسمین اپنی کار کی طرف بڑھی۔ عارف اس کے ساتھ چلتا ہوا بولا۔

''تمہیں کار تک تو چھوڑ دوں۔''

یاسمین اب بھی خاموش رہی۔ کار کے قریب پہنچ کر اس نے دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا۔ عارف کار کی کھڑکی کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ یاسمین نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ اس وقت اس کی پلکیں پھر بھیگنے لگی تھیں مگر اس سے پہلے کہ اس کے آنسو ڈھلک جاتے، وہ کار حرکت میں لائی اور تیزی سے اس کی رفتار بڑھاتی چلی گئی۔ اس نے عقب نما آئینے میں دیکھا کہ عارف جہاں کھڑا تھا، وہیں کھڑا اس کی کار کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ یاسمین کی ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے دو آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے گھر پر تھی۔ اس دوران میں اس نے اپنے جذبات پر قابو پالیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گھر کا کوئی فرد اس کی بھیگی ہوئی آنکھیں دیکھے۔

وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ ٹی وی لاؤنج سے ریشماں نکلی۔''دیکھ آئیں اپنی دوست کو باجی...... کیسی ہے اب؟''

''ٹھیک ہو جائے گی۔ زیادہ تشویش کی بات نہیں ہے۔''

''اسی لیے اتنی جلدی واپس آگئیں۔'' ریشماں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی تھی۔

''ہوں۔''

''تم اس وقت بھی پریشان نظر آرہی ہو۔ کیا اپنی دوست کی وجہ سے یا اپنی شادی کی وجہ سے۔''

یاسمین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہوگئی۔ ریشماں اب بھی اس کے ساتھ تھی۔

''کیا بات کرنا چاہتی ہے تو مجھ سے!'' یاسمین بولی۔

''تم اس شادی کی وجہ سے کیوں پریشان ہو باجی جبکہ تم ان سے محبت بھی کرتی ہو۔''

''اسی لیے پریشان ہوں کہ محبت کرتی ہوں۔ میں عارف کو دھوکا نہیں دینا چاہتی۔ شادی کے بعد اسے پتا چل جائے گا۔''

''نہیں پتا چلے گا باجی......! ممی نے کہا تو تھا تم سے...... انہوں نے ڈاکٹر فیروزہ سے بات کر لی ہے۔''

''ڈاکٹر فیروزہ کون؟''
''گائنا کولوجسٹ ہیں۔ وہ سب ٹھیک کردیں گی۔''
یاسمین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
''ہاں باجی!......ممی بتا رہی تھیں کہ وہ بہت ماہر ہیں۔''
''یہ بھی تو دھوکا دینا ہی ہوگا عارف کو!''
''جب تم ان سے محبت کرتی ہو تو انہیں پانے کے لیے تمہیں اتنا تو کرنا ہی پڑے گا باجی!''
''میں نہیں کرسکوں گی۔ میں تو چاہتی ہوں کہ عارف کو پہلے ہی سے سب کچھ بتادوں۔'' یاسمین نے اپنے دل کی بات ریشماں پر اس لیے ظاہر کردی کہ وہ اس پر بھروسا کرسکتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ یہ بات ریشماں کی زبان سے الماس نادر تک نہیں پہنچے گی۔
ریشماں چونکی۔ ''انہیں بتانا چاہتی ہو؟''
''ہاں۔''
''پھر تو......شاید وہ......شادی نہ کریں تم سے!''
''عارف کو دھوکا دینے سے اچھا ہے کہ میں زندگی بھر اس کے لیے تڑپتی رہوں۔'' یاسمین نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
ریشماں اس کا منہ تکتی رہ گئی۔
یاسمین اس موضوع پر زیادہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی، اس لیے بولی۔ ''ماما کہاں ہیں؟''
''اپنے کمرے ہی میں ہوں گے، جب سے آئے ہیں کہیں گئے تو نہیں۔''
گھر میں نجیب خان کے لیے ایک کمرا مخصوص تھا۔ وہ جب بھی اسلام آباد سے دو چار دن کے لیے آتا تھا، اسی کمرے میں رہتا تھا۔
''اچھی طرح سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا باجی!'' ریشماں نے کہا اور یاسمین کے جواب کا انتظار کیے بغیر جانے کے لیے اٹھ گئی۔
یاسمین نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ اس وقت بھی محسوس کررہی تھی کہ عارف کو حقیقت سے آگاہ کرنا اس کے لیے ایک کٹھن امتحان ہے۔
لیکن دوسرے دن دوپہر تک وہ ہمت مجتمع کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اس نے اپنے موبائل پر عارف سے رابطہ کرنا چاہا لیکن اسے عارف کا موبائل بند ملا۔ اسے تعجب ہوا۔ اسے یقین تھا کہ عارف اس کا جواب سننے کے لیے بے چین ہوگا اور اس کے کان اپنے موبائل کی گھنٹی سننے کے لیے بے چین رہیں گے۔
اتفاقی طور پر بند ہوگیا ہوگا اس کا موبائل، یاسمین نے سوچا۔
پندرہ منٹ بعد اس نے دوسری مرتبہ رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوسکی۔ موبائل بہ دستور بند تھا۔
شام ہوتے ہوتے یاسمین نے متعدد کوششیں کر ڈالیں مگر عارف سے بات کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ یہ ایسی صورت حال تھی جس نے یاسمین کو بے حد پریشان کردیا تھا۔ اب جبکہ وہ عارف کو حقیقت بتانے کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح تیار ہوگئی تھی تو اس سے رابطہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔
اس سے اگلا دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ پھر اس سے اگلا دن بھی اور یاسمین کی پریشانی مسلسل بڑھتی رہی۔ اب دوسری صورت یہ ہوسکتی تھی کہ وہ عارف سے ملاقات کرے لیکن اسے عارف کے گھر کا پتا معلوم نہیں تھا۔ وہ ریشماں سے اس بارے میں معلوم کرسکتی تھی لیکن اسے خیال تھا کہ عارف کے سامنے بیٹھ کر اپنی زبان کھولنے میں کامیاب نہیں ہوسکے گی۔
ایک دن اور گزر گیا۔ عارف کا موبائل بہ دستور بند مل رہا تھا۔ پھر اس دن اس وقت یاسمین کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی جب اسے ریشماں سے معلوم ہوا کہ شادی کی تاریخ طے پاچکی تھی۔
پانچ دن بعد شادی ہونا تھی۔
اس دن وہ اتنی روئی جتنا وہ ساری زندگی میں کبھی نہیں روئی تھی۔

✶✶✶

عارف نے اپنا موبائل اس لیے بند کیا تھا کہ وہ شادی نہ کرنے کے سلسلے میں یاسمین کی کوئی وجہ سننے کے لیے اب تیار ہی نہیں تھا۔ وہ کہہ چکی تھی کہ پہلے اس کی کسی سے شادی نہیں ہوئی، لیکن اگر ہو بھی چکی ہوتی تو عارف اسے خاطر میں نہیں لاتا۔ یاسمین سے اس کی محبت اتنی ہی شدید ہوچکی تھی۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس سے شادی نہ کرنے کے سلسلے میں یاسمین کا کوئی بھی مسئلہ ہو، وہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کچھ بھی کرگزرے گا لیکن شادی یاسمین ہی سے کرے گا۔
اپنا نیا نمبر اس نے صرف اپنے والد کنور شمشاد کو بتایا تھا۔ اس کے باپ نے نمبر بدلنے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہہ دیا تھا کہ اس کا پہلا نمبر بہت زیادہ لوگوں کو معلوم ہوچکا ہے اور موبائل کی وقت بے وقت کی گھنٹی اسے بور کردیتی ہے لہٰذا

اب وہ اپنا نیا نمبر اپنے بہت چنیدہ دوستوں یا واقف کاروں کو بتا رہا ہے۔

جواز کیونکہ معقول تھا اس لیے کنور شمشاد نے دوبارہ اس بارے میں کوئی بات ہی نہیں کی تھی۔

گزرتے ہوئے دنوں میں اسے دو ایک بار یہ خیال بھی آیا کہ یاسمین شاید فون پر بھی اس سے کوئی بات کرنے کی ہمت نہ کر سکی ہو اور اس نے اسے فون ہی نہ کیا ہو۔

لیکن اگر کیا ہو تو؟ عارف کے دماغ میں یہ سوال بھی ابھرا تھا۔

تو موبائل بند ملنے پر وہ بہت پریشان ہوئی ہوگی، جھنجلائی بھی ہوگی۔ عارف نے سوچ لیا تھا کہ اگر وہ خفا بھی ہوگی تو شادی کے بعد وہ اپنی روٹھی ہوئی محبوبہ کو منا لے گا۔ یہ تو وہ خوب سمجھتا تھا کہ یاسمین بھی اسے دل وجان سے چاہنے لگی تھی۔ وہ اتنی زیادہ خفا ہرگز نہ ہوتی کہ اسے منانا بہت مشکل ہو جاتا۔

ایک اندیشہ عارف کو یہ ضرور ہوا تھا کہ یاسمین تنگ آکر اپنی ماں کے سامنے ہی اس شادی سے انکار نہ کر دے لیکن جب شادی کی تاریخ طے ہو گئی اور اس کے تین چار روز بعد بھی تاریخ منسوخ ہونے جیسی کوئی بات اس کے سامنے نہیں آئی تو وہ مطمئن ہو گیا۔ اس کا زیادہ تر وقت اس خمار میں گزرنے لگا کہ شادی کی پہلی رات کو وہ اپنی محبوب بیوی کو کس کس طرح منائے گا۔

کبھی کبھی وہ تھوڑا سا فکرمند ہوتا کہ یاسمین کے سامنے کوئی بہت ہی بڑا مسئلہ ہوگا جس کے باعث وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی، لیکن عارف کی یہ فکرمندی وقتی ثابت ہوئی تھی۔ وہ یہ سوچ کر اس فکر سے نجات حاصل کر لیتا کہ پیسا ہو تو دنیا کا ہر مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے باپ کے پاس بہت دولت تھی اور اکلوتا بیٹا ہونے کے باعث عارف فطری طور پر یہی سوچتا تھا کہ وہ ساری دولت اس کی تھی۔ اس کا ذاتی اکاؤنٹ بھی چھوٹا موٹا نہیں تھا۔ کنور شمشاد نے اس کا اکاؤنٹ لاکھوں روپے سے کھلوایا تھا تاکہ عارف کو اپنی بڑی سے بڑی خواہش پوری کرنے کے لیے باپ سے کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

اسی اکاؤنٹ سے عارف نے یاسمین کے لیے ایک بے حد قیمتی ہار خریدا تھا جو وہ اسے منہ دکھائی میں دینا چاہتا تھا۔

شادی میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا جب رات کو دس بجے کے قریب ایک ملازم نے آکر اس سے کہا کہ اسے اس کے والد نے اپنے کمرے میں بلایا ہے۔

اس وقت اپنی اچانک طلبی پر عارف کو تعجب ہوا، تاہم وہ کنور شمشاد کے کمرے میں پہنچا اور یہ دیکھ کر چونک گیا کہ وہاں ایک عورت بھی موجود تھی۔ پختہ عمر کی اس عورت نے خود کو اس حد تک ''مین ٹین'' کیا تھا کہ وہ اس عمر میں بھی خاصی دلکش اور پروقار نظر آ رہی تھی۔ عارف کو یہ خیال آیا کہ وہ اس عورت کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی عارف کو یہ بہت عجیب معلوم ہوا تھا کہ وہ عورت اس کے باپ کی خواب گاہ میں تھی اور وہ بھی رات کے وقت!

''یہ رانی بیگم ہیں۔'' کنور شمشاد نے فوراً تعارف کرایا۔

اب عارف کو خیال آیا کہ اس نے رانی بیگم کو اپنے ہی گھر میں دیکھا ہوگا۔ کنور شمشاد نے اسے بتایا تھا کہ وہ نیو ایئر کے فنکشنز میں ان کے گھر آیا کرتی تھی اور اسی نے یاسمین سے اس کی شادی بھی طے کرائی تھی۔ گویا وہ کنور شمشاد کی خواتین دوستوں میں سے ایک تھی۔

عارف کو یہ بھی اچھا نہ لگا کہ ایک خاتون دوست کو اس کے باپ نے رات کے وقت اپنی خواب گاہ میں بٹھا رکھا تھا۔

''حیران ہو گئے تم کہ میں نے تمہیں اس وقت کیوں بلایا ہے۔'' کنور شمشاد نے تعارف کرانے کے ساتھ اپنی بات جاری رکھی۔ ''بیٹھ جاؤ، دراصل رانی بیگم ہی کا اصرار تھا کہ میں جو فرض تمہاری شادی کے بعد ادا کرنا چاہتا تھا، وہ شادی سے پہلے ہی ادا کر دوں۔''

عارف بیٹھ گیا اور الجھی ہوئی نظروں سے اپنے باپ کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھا کہ اس کا باپ اپنا کیا فرض ادا کرنا چاہتا تھا۔ نیز یہ کہ رانی بیگم کی ایسی کیا حیثیت تھی کہ وہ کسی فرض کی ادائیگی کے سلسلے میں اس کے باپ سے اصرار کرے۔

رانی بیگم سے تعارف کے وقت عارف نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی تھی اور جواباً رانی بیگم نے بھی نہ صرف سر ہلایا تھا بلکہ مسکرائی بھی تھی۔

''میں کوئی تمہید نہیں باندھنا چاہتا عارف!'' کنور شمشاد نے عارف کے بیٹھتے ہی کہا تھا۔ ''ابھی چند منٹ کے اندر اندر میرے کاروبار کے لیگل ایڈوائزر ایڈووکیٹ ظفر علی یہاں آنے والے ہیں۔ میں نے انہیں کل شام ہدایت کر دی تھی اور ایک گھنٹے قبل انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے کاغذات تیار کر لیے ہیں، تمہیں آج ہی...... بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ابھی ان کاغذات پر دستخط کرنا ہیں۔''

''کیسے کاغذات ڈیڈی!'' عارف حیرت سے بولا۔
''میں نے اپنا کاروبار، بلکہ سبھی کچھ تمہارے نام کردیا ہے۔ میرا جو ذاتی اکاؤنٹ ہے، وہ بہرحال...... ظاہر ہے کہ میرے ہی نام رہے گا لیکن باقی سب کچھ آج سے قانونی طور پر تمہارا ہوجائے گا۔''
''اس کی کیا ضرورت تھی ڈیڈی......! آپ کا جو کچھ ہے، وہ میرے علاوہ کس کا ہوسکتا ہے۔'' عارف باپ کی بات سے متعجب ہوا تھا۔
''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں قانونی طور پر تمہارے نام سب کچھ اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ اب تمام کاروباری معاملات میں تمہارے ہی دستخط ہوں گے۔ صرف دستخط ہی نہیں ہوں گے بلکہ اب سارا کاروبار سنبھالنا بھی تمہاری ذمے داری ہوگی۔''
عارف نے فوراً کچھ بولنا چاہا لیکن کنور شمشاد نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا اور اپنی بات جاری رکھی۔ ''اپنے شاعرانہ مزاج کی وجہ سے تمہیں کبھی کاروباری معاملات سے دلچسپی نہیں رہی اور میں نے بھی تم پر زور نہیں ڈالا کہ تم میرا ہاتھ بٹاؤ لیکن اس طرح ہمیشہ تو نہیں چل سکتا نا عارف! میرے بعد تمہی کو سب کچھ دیکھنا ہوگا لہٰذا......''
''اب ایسی بات بھی اپنی زبان پر نہ لائیں۔'' رانی بیگم بول اٹھی۔ ''یہ کہنا کوئی ضروری تو نہیں کہ آپ کے بعد۔''
''جی ڈیڈی!'' عارف بھی بول پڑا۔ ''آپ کو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی!''
''انسان کو حقیقت سے نظریں نہیں چرانا چاہئیں۔'' کنور شمشاد نے کہا۔ ''ہم تینوں ہی میں سے کسی نہ کسی کو کسی وقت اس دنیا سے رخصت تو ہونا ہے، خیر......! میں یہ کہنے جارہا تھا کہ شادی کے بعد تم ہنی مون کے لیے جہاں چاہو چلے جاؤ لیکن واپس آنے کے بعد سارا کاروبار تمہی کو سنبھالنا ہے۔ میں اب بہت تھک چکا ہوں۔''
''لیکن میں تو کاروبار کی الف ب سے بھی واقف نہیں ڈیڈی!''
''تمہیں الف ب سے واقف کرانا میری ذمے داری ہے۔ میں فوری طور پر خود کو الگ تھلگ نہیں کرلوں گا، تمہاری رہنمائی کے لیے میں چند ماہ تمہارے ساتھ دفتر جاتا رہوں گا۔ بے شک تمہارا مزاج شاعرانہ ہے لیکن تم پڑھے لکھے ہو۔ یہ ممکن نہیں کہ تم کاروبار کے طریق جلد ہی نہ سمجھ لو، اور پھر یہ کہ...... وہی بات زبان پر آرہی ہے میرے...... کسی نہ کسی دن یہ سب کچھ سنبھالنا تو تمہیں ہی پڑیگا۔ اب اس معاملے میں تمہیں کوئی بحث چھیڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں جو فیصلہ کرچکا ہوں، اس میں اب کسی بھی قسم کی تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔''
عارف کو چپ ہوجانا پڑا۔
''ظفر صاحب! ابھی تک نہیں آئے۔'' کنور شمشاد نے گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے بڑبڑانے والے انداز میں کہا، پھر وہ عارف کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''ابھی وہ نہیں آئے ہیں تو میں ایک بات سے اور آگاہ کردوں، یہ رانی بیگم تمہاری نئی ممی ہیں۔''
''جی!'' عارف اچھل ہی پڑا۔
''ہاں۔'' کنور شمشاد سنجیدہ رہے۔ ''رانی بیگم سے میری شادی کو دو سال گزر چکے ہیں۔ اب تک میں نے یہ بات مصلحتاً چھپائے رکھی۔ لوگ باتیں بناتے کہ بیٹے کی اب تک شادی نہیں کی اور خود شادی کرکے بیٹھ گیا۔ تمہاری شادی کے سلسلے میں عجلت مجھے اس لیے بھی تھی۔ آخر کب تک یہ بات چھپائے رکھوں...... ویسے اب بھی کچھ دن تو یہ بات پوشیدہ ہی رکھوں گا۔ یہ سب لوگوں پر افشا میں اس وقت کروں گا جب کاروبار تم پوری طرح سنبھال لوگے۔''
عارف نے رانی بیگم کی طرف دیکھا جو خاموش بیٹھی بس مسکرا رہی تھی۔
''اور ہاں!'' کنور شمشاد پھر بولا۔ ''میں نے تمہیں غالباً یہ بتایا تھا کہ رانی بیگم کی اپنے سابق شوہر سے ذہنی ہم آہنگی نہیں ہوسکی تھی اس لیے دونوں ایک دوسرے سے الگ رہنے لگے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی علیحدگی قانونی طور پر ہوچکی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ان سے شادی کیسے کرسکتا تھا۔ اب تمہیں ایک بات اور بتادوں۔''
لیکن اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتے، ملازم نے آکر اطلاع دی کہ ان کا لیگل ایڈوائزر آگیا ہے جسے ڈرائنگ روم میں بٹھادیا گیا ہے۔
''چلو، ہم دونوں وہیں چلتے ہیں۔'' کنور شمشاد نے کھڑے ہوتے ہوئے عارف سے کہا۔ پھر رانی بیگم کی طرف دیکھا۔ ''تم یہیں رکو......''
رانی بیگم نے سرہلانے پر اکتفا کیا۔
عارف اور کنور شمشاد ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ ایڈووکیٹ ظفر کو عارف جانتا بھی تھا۔
کاغذات پر دستخط ہونے کے بعد ایڈووکیٹ نے عارف سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''مبارک ہو کہ آج سے

آپ قانونی طور پر بھی اپنے سارے کاروبار وغیرہ کے مالک بن گئے ہیں۔"

عارف مسکرایا لیکن اس کی مسکراہٹ جبری تھی۔ غیر متوقع طور پر جو کچھ ہوا تھا، اس نے عارف کو خاصا الجھا دیا تھا۔ خاص طور پر ذہنی جھٹکا اسے اس بات سے لگا تھا کہ رانی بیگم اس کی سوتیلی ماں تھی۔

البتہ اس انکشاف سے یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ اس کے باپ کو اس کی دوسری شادی پر اعتراض کیوں نہیں تھا۔ کنور شمشاد کی یہ تیسری شادی تھی۔ پہلے جو ان کی دو شادیاں ہو چکی تھیں اور دوسری شادی ان کی پسند کی شادی تھی اور وہ سب کچھ عارف کے علم میں تھا لہٰذا کنور شمشاد اس کی دوسری شادی پر معترض ہونے کا کوئی جواز ہی نہیں رکھتے تھے۔

ایڈووکیٹ ظفر کو رخصت کرنے کے بعد وہ عارف سے بولے۔ "جاؤ! اب تم آرام کرو۔"

غالباً وہ بھول ہی گئے تھے کہ عارف کو انہیں کوئی دوسری بات بھی بتانا تھی۔ ایڈووکیٹ کی آمد کی اطلاع کے باعث ان کی وہ بات ادھوری ہی رہ گئی۔

خود عارف کا ذہن بھی اتنا الجھ گیا تھا کہ اسے بھی کسی "دوسری بات" کا خیال نہیں آیا۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر لیٹ گیا۔ رانی بیگم کی وجہ سے تو اس کا ذہن الجھا ہوا تھا ہی لیکن اس خیال سے اس پر گھبراہٹ بھی طاری تھی کہ اب اسے کاروباری ذمے داریاں بھی سنبھالنا ہوں گی۔

دوسری صبح ناشتے کی میز پر اس کے ساتھ صرف کنور شمشاد تھا۔ عارف کو اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ رانی بیگم کو کنور شمشاد نے رات ہی کو کسی وقت رخصت کر دیا ہوگا۔ خود کنور شمشاد ہی نے کہا تھا کہ ابھی وہ کچھ عرصے تک اپنی اس شادی کو منظر عام پر نہیں لانا چاہتا۔

رانی بیگم کے رہنے کے لیے کنور شمشاد نے اسے دوسرا گھر دلا دیا ہوگا۔

کنور شمشاد ناشتا کرنے کے بعد دفتر چلا گیا۔ عارف اپنے کمرے میں آگیا۔ یاسمین سے ملاقات کے بعد وہ کسی دن بھی گھر سے نہیں نکلا تھا۔ اپنے کمرے ہی میں پڑا یاسمین کے بارے میں سوچتا رہتا یا اس کی شاعری جاری رہتی۔ اس نے یاسمین اور اپنی محبت پر اچھی خاصی لمبی نظم کہہ ڈالی تھی جو وہ شادی کی پہلی رات یاسمین کو سنانا چاہتا تھا۔

اس نے اپنا موبائل بند ہی رکھا۔ یہاں تک کہ شادی کا دن آگیا۔ پھر شادی بھی ہو گئی۔ رات گئے وہ یاسمین کو بیاہ کر گھر لے آیا۔ مہمان رخصت ہوتے رہے۔ اسی دوران میں رانی بیگم نے اسے الگ تھلگ لے جا کر شفقت آمیز مسکراہٹ اور لہجے میں کہا۔ "اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ دلہن کو زیادہ انتظار نہ کراؤ۔"

عارف خود بھی اپنے کمرے میں جانے کے لیے بے چین تھا۔ اس دن اس کے کمرے کی خاص آرائش رانی بیگم اور دو تین خواتین نے کی تھی جو کنور شمشاد کی دوست تھیں۔

عارف نے دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا موبائل بند ہونے کی وجہ سے یاسمین خفا تو ضرور ہوگی لیکن اسے یہ اطمینان بھی تھا کہ وہ اسے منا لے گا۔

بستر پر یاسمین اپنی ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھے بیٹھی تھی۔ اس کا رخ دروازے کی طرف نہیں تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز اسے یقیناً سنائی دی ہوگی لیکن اس نے اس وقت بھی دروازے کی طرف نہیں دیکھا۔ اس کے خفا ہونے کی یہ دلیل عارف کے لیے کافی تھی لیکن وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بستر کے قریب پہنچ گیا۔

"زیورات ابھی سے اتار ڈالے تم نے!" عارف اس طرح بولا جیسے اسے یاسمین کی خفگی کا کوئی خیال نہ ہو۔

"ہوں۔" یاسمین نے نہ تو منہ کھولا، نہ اس کی طرف دیکھا۔

"یہ سب کچھ تو مجھے کرنا تھا یاسمین!" عارف شوخ لہجے میں کہتے ہوئے بستر پر بیٹھ گیا، پھر بستر کی دونوں سائڈ ٹیبلز پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "کسی دراز میں رکھ دیے؟"

اس مرتبہ یاسمین نے سر کی جنبش سے واڈ روب کی طرف اشارہ کیا۔

"اوہو!" عارف ہنسا۔ "اتنی احتیاط؟"

یاسمین خاموش رہی۔

"بہت ناراض ہو؟" عارف نے بڑی محبت سے یاسمین کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ یاسمین نے نظریں چار نہیں کیں اور اپنی آنکھیں جھکا لیں۔

"واقعی بہت ناراض ہو اور ناراضی اسی لیے ہو سکتی ہے کہ میں نے اپنا موبائل بند رکھا تھا۔ ہے نا؟"

یاسمین نہ کچھ بولی، نہ اس نے نظریں اٹھائیں۔

"میں ابھی تمہارا غصہ ختم کر دوں گا۔" عارف نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہارے لیے بڑی خوب صورت نظم لکھی ہے۔"

عارف نے اس کی ٹھوڑی چھوڑ دی اور نظم سنانا شروع

کی۔ یاسمین نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپالیا۔
نظم مکمل ہوگئی تو بھی یاسمین کا چہرہ گھٹنوں میں چھپا رہا۔
عارف نے ایک طویل سانس لی۔ ''اتنی اچھی نظم سن کر بھی تمہارا غصہ دور نہیں ہوا؟ کتنے اچھوتے استعارے استعمال کیے ہیں میں نے تمہارے حسن کے لیے!'' یہ کہتے ہوئے عارف نے ہاتھ آگے بڑھا کر اس کا چہرہ بھی اوپر اٹھایا اور چونک پڑا۔ یاسمین کا چہرہ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔
''یہ کیا!'' عارف کے منہ سے نکلا۔ ''آج کی رات تم رو رہی ہو۔''
یاسمین نے ایک سسکی لی اور پہلی مرتبہ بولی۔ ''اس خیال سے رو پڑی ہوں کہ تم نے اس نظم میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے برعکس کبھی نظم لکھو گے۔''
''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' عارف کہتے ہوئے ایک رومال سے اس کا چہرہ خشک کرنے لگا جو آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ''اب اگر ایک بھی آنسو بہایا تو میری ناراضگی شروع ہوجائے گی۔ دیکھو تو...... تمہاری موجودگی کے باعث اس کمرے کا منظر کتنا حسین ہوگیا ہے۔ اس منظر کو اپنے آنسوؤں سے دھندلا نہ کرو۔''
''یہ منظر۔'' یاسمین یاس انگیز لہجے میں بولی۔ ''کچھ ہی وقت جاتا ہے کہ یہ منظر یکسر بدل جائے گا۔''
''تمہاری موجودگی میں تو یہ ممکن نہیں میری جان!''
''میری ہی وجہ سے تو بدلے گا۔''

یاسمین نے جو کچھ کہا تھا، وہ درست ثابت ہوا۔ کچھ دیر بعد اس کمرے کا منظر اس حد تک یقیناً تبدیل ہوگیا تھا کہ یاسمین اور عارف ایک دوسرے سے بالکل لاتعلق نظر آرہے تھے۔ اگرچہ دونوں ہی بستر پر لیٹے ہوئے تھے مگر ان کے درمیان کچھ فاصلہ تھا۔ چہروں کے تاثرات بھی بدلے ہوئے تھے۔ یاسمین گم صم اور چت لیٹی چھت کو تک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ عارف اس طرح لیٹا ہوا تھا کہ اس کا رخ یاسمین کی مخالف سمت میں تھا۔ چہرے پر کسی بھی قسم کے تاثرات نہیں تھے، جیسے وہ پتھرا گیا ہو۔ اس کی پلکیں بھی کم کم جھپک رہی تھیں۔
یہ بوجھل سکوت عارف ہی کی آواز سے ٹوٹا۔ اس نے یاسمین کی طرف کروٹ لیے بغیر بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ ''مجھے یہ دھوکا تم نے کیوں دیا یاسمین؟''
''میں نے تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیا۔'' یاسمین کی نظریں چھت پر جمی رہیں۔
''تم پھر جھوٹ بول رہی ہو۔'' عارف بولا۔ ''شوہر سے یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی کہ اس کی بیوی کی شادی پہلے بھی ہوچکی ہے۔ اگر تم مجھے بتا دیتیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے جذبات کو جھٹکا تو اب لگا ہے۔ میرے پوچھنے پر بھی تم نے کہہ دیا تھا کہ تمہاری شادی نہیں ہوئی۔''
''میں اب بھی قسم کھا کر کہوں گی کہ میری شادی نہیں ہوئی۔''
اب عارف کے پتھرائے ہوئے چہرے پر تغیر آیا۔ اس نے کروٹ لی اور یاسمین کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ حیرت سے بولا۔ ''تم اب بھی یہی کہہ رہی ہو...... میں تو اب بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری وہ شادی کئی سال برقرار بھی رہی ہوگی۔''
''ہرگز نہیں۔ میں قسم کھا چکی ہوں عارف!'' یاسمین نے جواب دیتے ہوئے اس کی طرف نہیں دیکھا، چھت ہی کو تکتی رہی۔
عارف اس مرتبہ کچھ تلخ لہجے میں بولا۔ ''تمہاری قسمیں مجھے یقین نہیں دلاسکتیں کہ میں تمہاری زندگی میں آنے والا پہلا مرد ہوں۔''
''یہ جھوٹ تو میں بولنا بھی نہیں چاہتی۔''
''کیا!'' عارف نہ صرف چونکا بلکہ اس کی حیرت میں بھی اضافہ ہوا۔ ''تم جانتی ہو؟ تمہاری اس بات کا کیا مطلب ہوا؟''
''جانتی ہوں۔'' اس مرتبہ یاسمین کی آواز کانپ گئی۔ ''تم سے پہلے میری زندگی میں بہت سے مرد آچکے ہیں۔''
اس مرتبہ عارف کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ اب یاسمین کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کسی دوسری دنیا کی مخلوق کو دیکھ رہا ہو۔
''تم مجھے طوائف بھی کہہ سکتے ہو عارف!'' یاسمین کی آواز رندھ گئی اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ''اسی لیے میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن تمہیں یہ سب کچھ بتانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ آخر میں نے تمہیں موبائل فون پر سب کچھ بتانے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن تم نے اپنا موبائل مستقل بند رکھا۔ میں تم سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں عارف کہ تمہیں دھوکا نہیں دینا چاہتی تھی، دے ہی نہیں سکتی تھی۔ آج بھی تمہیں کچھ معلوم نہ ہوپاتا اگر میں تمہیں دھوکا دینا چاہتی۔ اس شہر کی بعض گائناکولوجسٹ یہ گھناؤنا کام بھی کرتی ہیں۔ ان گائناکولوجسٹ کی وجہ سے نہ جانے کتنی لڑکیاں اپنے شوہروں کو دھوکا دیتی ہوں گی۔ وہ لڑکیوں کو

بالکل دوشیزہ بنا دیتی ہیں۔ میں چاہتی تھی کہ تم اس تلخ حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ۔ اس کے بعد تم مجھے قبول کرسکو تو کرو یا مجھے ٹھوکر مار دو۔''

''مائی گاڈ!'' عارف کے منہ سے نکلا اور وہ اپنی پیشانی مسلنے لگا۔

''میں تو ممی کے لیے سونے کی چڑیا تھی عارف!'' یاسمین نے اپنی رندھی ہوئی آواز سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اب نہیں رہی تھی۔ ڈھلک چکی ہوں نا اب...... گاہکوں کو شکایت رہنے لگی تھی۔ اسی لیے ممی نے میری شادی ہی کردی۔ اب میرے بجائے میری چھوٹی بہن ان کے لیے سونے کی چڑیا بنے گی۔''

یہ ایسے انکشافات تھے کہ عارف کا سر چکرانے لگا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ وہی سب کچھ سن رہا ہے جو یاسمین اسے بتا رہی تھی۔ اس کے خیال میں شاید یہ ناممکن تھا کہ کوئی ماں اپنی بیٹیوں سے اس طرح پیسا کمائے۔

عارف نہیں جانتا تھا کہ یاسمین کی ماں الماس نادر خود ایک طوائف تھی، لیکن اس نے جسم فروشی کا یہ کام نجیب خان کی مدد سے اس طرح کیا تھا کہ کبھی کسی کو اس کے بارے میں ایسا کوئی شک بھی نہ ہو۔ نجیب خان اس کے لیے ایسے گاہک تلاش کرتا تھا جن کا تعلق عرب ریاستوں سے ہو۔ وہ کسی ریاست کے شہزادے نہ ہوتے ہوئے بھی شہزادوں ہی کی طرح مال دار ہوتے تھے اور جب الماس نادر اس قابل نہ رہی تو اس نے اپنی بیٹی یاسمین سے یہ کام کروانا شروع کیا۔

یاسمین اور ریشماں کی بچپن ہی سے ایسی تربیت کی گئی تھی کہ وہ سمجھ لیں کہ انہیں جوان ہونے کے بعد کیا کرنا ہے۔ دونوں بہنوں کو اچھی تعلیم اسی لیے دلائی گئی تھی کہ انہیں بڑے بڑے لوگوں کی آغوش کی زینت بننا تھا اور انہیں یہ بات بھی بتا دی گئی تھی کہ ان کی ماں نے بھی اپنی جوانی میں یہی سب کچھ کیا تھا۔

یاسمین نے عارف کو یہ سب کچھ بتا دیا اور عارف کی اس دوران میں یہ حالت رہی جیسے وہ کوئی گڑھی ہوئی کہانی سن رہا ہو۔

''نجیب خان میرا ماما ہے یا نہیں، میں نہیں جانتی۔'' یاسمین مشینی انداز میں بولے جا رہی تھی۔ ''یہ تو مجھے اور ریشماں کو ممی نے بتایا ہے۔ وہ بہت عیار شخص ہے عارف......! مستقل طور پر وہ اسلام آباد میں رہتا ہے۔ اسے عرب ریاستوں کے ایسے لوگ وہیں ملتے ہیں جنہیں عیاشی کے لیے کسی لڑکی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان لوگوں سے نجیب خان کا میل جول برسوں پرانا ہے، جب وہ ممی کے لیے گاہک تلاش کیا کرتا تھا۔ بات صرف اس حد تک نہیں ہے عارف......! ایک لڑکی کے ذریعے اتنی دولت نہیں کمائی جاسکتی جو ممی کے پاس ہے اور خود نجیب خان بھی ایک شوگر مل کا مالک بن گیا ہے۔ اتنی دولت بلیک میلنگ سے جمع کی گئی ہے۔''

ایک مرتبہ پھر عارف کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اب یاسمین نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اداسی اب بھی چھائی ہوئی تھی۔ بولی۔ ''ہاں عارف! بلیک میلنگ......! جب نجیب خان اسلام آباد میں کوئی گاہک تلاش کرلیتا اور میں اسلام آباد بلائی جاتی تھی تو ممی ایک لاکٹ مجھے ضرور پہنایا کرتی تھیں۔ ان کی نہایت سخت تاکید تھی کہ مجھے جس وقت وہ لاکٹ اپنے گلے سے اتارنا پڑے تو وہ میں قریب ہی کسی جگہ رکھ دیا کروں۔ مجھ پر اس لاکٹ کا راز بہت دن بعد کھلا۔ اتفاق تھا کہ میں نے ممی اور نجیب خان کی باتیں سن لی تھیں۔ اس لاکٹ میں کوئی چیز لگی ہوئی ہے جو آوازیں ٹرانسمٹ کردیتی ہے۔ میں گاہک کے ساتھ عموماً کسی ہوٹل میں ہوتی تھی۔ ہوٹل کے باہر کسی جگہ نجیب خان موجود رہتا تھا۔ میری اور گاہک کی آوازیں لاکٹ میں لگے ہوئے آلے سے ٹرانسمٹ ہوتی تھیں جو نجیب خان کے پاس موجود ایک ریسیور کے ذریعے ریکارڈ کرلی جاتی تھیں۔ بعد میں اسی ریکارڈنگ کے ذریعے اس شخص کو بلیک میل کیا جاتا تھا۔ شاید وہ لوگ مسلسل بلیک میل ہوتے رہتے ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ ممی تمہیں کس طرح بلیک میل کرتیں۔''

''کیا مطلب!''

''میں نے جو زیورات الماری میں رکھے ہیں، ان میں وہ لاکٹ بھی ہے۔ وہ میں نے خود سے دور الماری میں اسی لیے بند کردیا تھا کہ ہم دونوں کی اس وقت کی باتیں نجیب خان نہ سن سکے، نہ ریکارڈ کرسکے۔ کل مجھے وہ لاکٹ ممی کو واپس کرنا ہے۔ غالباً اب وہ ریشماں کو پہنایا جایا کرے گا لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی ہے کہ نجیب خان ہماری آج کی باتیں ریکارڈ کرلیتا تو وہ یا ممی تمہیں کس طرح بلیک میل کرتے۔''

عارف تیزی سے بستر سے اٹھا۔ اس کی نظر الماری کی طرف تھی۔ اس کے انداز سے یہ بات صاف ظاہر ہوگئی کہ وہ الماری سے لاکٹ نکال کر دیکھنا چاہتا تھا۔

''پلیز عارف!'' یاسمین جلدی سے بول پڑی۔ ''ابھی وہ لاکٹ نہ نکالو۔ پہلے میرے بارے میں کوئی فیصلہ کرلو۔''

''کیسا فیصلہ؟''
''تم مجھے اپنے گھر سے کب نکالو گے۔'' یاسمین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
عارف چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر لیٹ گیا۔
کچھ توقف سے یاسمین بولی۔ ''میرے دماغ پر بہت بوجھ ہے عارف! اپنا فیصلہ جلدی سنا دو۔''
''میرا دماغ تو پتھر ہو کر رہ گیا ہے یاسمین!'' عارف کا لہجہ بھی اس مرتبہ پتھرایا ہوا سا تھا۔ ''جو کچھ میں نے ابھی جانا ہے، اس کے بعد میں کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہ گیا ہوں۔ میں ابھی تمہیں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے دماغ پر بوجھ ہوگا لیکن اسے برداشت کر دتا کہ میں کوئی درست فیصلہ کر سکوں۔''
یاسمین چپ رہی۔ عارف بھی پھر کچھ نہیں بولا اور یہ خاموشی طویل سے طویل تر ہوتی چلی گئی۔

✕✕✕

یاسمین کے دماغ میں ماضی چکراتا رہا، بچپن سے جوانی تک کے واقعات، پھر عارف سے ملاقات، ملاقات کے بعد جذباتیت اور بے بسی کی کیفیت! عارف کے وہ اشعار بھی اسے یاد آتے رہے جو اسے بہت پسند تھے۔ مختلف النوع خیالات کی وجہ سے اس کے چہرے کے تاثرات بھی بدلتے رہے۔ کبھی اس کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں، کبھی چہرہ بالکل سپاٹ ہو جاتا۔ اسی عالم میں اس پر غنودگی طاری ہوئی لیکن اسے غنودگی کا احساس بھی نہیں ہوا اور کسی وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔
پھر وہ اس وقت کلبلائی جب اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ پر بوندیں گر رہی تھیں۔ نیند ہی کے عالم میں اس نے اپنا ہاتھ ہٹانا چاہا تو فوراً ہی اپنی کلائی پر گرفت محسوس کی۔ فوراً اس کی آنکھ کھل گئی۔ جو کچھ اس نے دیکھا، وہ فوری طور پر تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آسکا اور جب سمجھ میں آیا تو اس کے منہ سے سسکی کی صورت میں عارف کا نام نکلا۔
عارف بستر سے لگا ہوا فرش پر بیٹھا تھا، اس نے یاسمین کی کلائی پکڑلی تھی اور اس کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو یاسمین کے ہاتھ پر گر رہے تھے۔ جذبات کی شدت سے یاسمین کے ہونٹ کانپنے لگے۔
''عارف!'' دوبارہ اس کے منہ سے آواز اٹکتی ہوئی نکلی تھی اور آنسو اس کی آنکھوں میں بھی آگئے تھے۔
''یاسمین!'' عارف کی آواز گھٹی ہوئی سی تھی۔ ''کیسی ظالم ہے تمہاری ماں، تمہارا ماموں!...... کیسا ظلم توڑا ہے انہوں نے مجھ پر...... میری پیاری گڑیا کو انہوں نے پہلے ہی توڑ پھوڑ ڈالا۔ کیسی قیامت توڑی ہے انہوں نے مجھ پر...... ٹوٹی ہوئی گڑیا دے دی ہے انہوں نے مجھے...... لیکن میں اس ٹوٹی ہوئی گڑیا کو بھی اپنے کلیجے سے لگا کر رکھوں گا۔''
عارف کے آخری فقرے کا مطلب بالکل واضح تھا۔ اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔
یاسمین پاگلوں کی طرح بستر سے اتر کر عارف سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آنسو عارف کے بھی بہتے رہے اور ہونٹوں میں شدید لرزش رہی۔ وہ یاسمین کو اپنے سینے سے لگائے رہا۔
نہ جانے کتنا وقت اسی طرح گزر گیا۔ پھر انہیں یہ بھی احساس نہیں ہوسکا کہ وہ فرش سے کب اٹھ کر بستر پر اس طرح لیٹ گئے جیسے یک جان، دو قالب ہوں۔ اتنی دیر تک انہوں نے ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہا تھا۔ بستر پر لیٹنے کے بعد بھی دونوں خاموش ہی رہے۔ ان دونوں کے چہرے اتنے قریب تھے کہ وہ ایک دوسرے کی سانسیں اپنے چہروں پر محسوس کر رہے تھے، ان کے چہروں پر غم ناک تاثر جیسے منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔
پھر یکایک عارف کے تاثرات میں تبدیلی آئی۔ وہ غضب ناک سا نظر آنے لگا۔
''یاسمین۔'' وہ بولا۔ ''جس عورت کو تم ممی کہتی ہو، میں اب اس کے لیے یہ مقدس لفظ اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتا۔ میں اسے اب الماس نادر ہی کہوں گا۔ تمہیں اس سے اور نجیب خان سے کتنا لگاؤ ہے؟ مجھے بالکل سچ سچ بتانا یاسمین!''
''میں تم سے کوئی جھوٹ بول ہی نہیں سکتی عارف......! اگر یہ میرے لیے ممکن ہوتا تو تمہیں میرے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا اور نہ ہی میں تمہیں وہ سب کچھ بتاتی جو بتا چکی ہوں۔ تمہیں دھوکا دینا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اسی لیے تم سے شدید محبت کے باوجود میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں اپنے محبوب کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ اس سے کوئی جھوٹ نہیں بول سکتی۔''
''تو میرے سوال کا جواب دو۔ تمہیں ان دونوں سے کتنا لگاؤ ہے؟''
''ذرا بھی نہیں عارف...... ذرا بھی نہیں۔''
''پھر تم نے ان کے ساتھ...... خاص طور سے الماس نادر کے ساتھ اتنی زندگی کیسے گزار دی؟''
''میں اور کیا کرتی عارف؟ کہاں جاتی؟ دنیا میں میرا

کوئی نہیں تھا۔ اب تم تو میرے ہو۔ تم سے پہلے تو میرا سہارا کوئی نہیں تھا۔ میں نے...... اور میں نے ہی کیا، ریشماں بھی اپنی آنے والی زندگی سے دکھی ہے۔ میں بھی اسے اپنی قسمت کا جبر سمجھ کر برداشت کرتی رہی ہوں اور ریشماں بھی برداشت کرتی رہے گی۔ ہوش سنبھالتے ہی ہمیں معلوم ہوگیا تھا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ عام طور پر ایسی لڑکیاں اس انداز کی سوچ نہیں رکھتیں جو میری اور ریشماں کی ہے۔ وہ اس زندگی کو خوشی خوشی قبول کر لیتی ہیں لیکن میں ساری زندگی بس کڑواہٹ نگلتی رہی ہوں۔ قدرتی طور پر مجھے شاعری سے لگاؤ تھا۔ میں کچھ سوچنے کے بجائے خود کو اسی میں الجھائے رکھتی تھی۔ شاید ہی کوئی شاعر ہو جسے میں نے نہ پڑھا ہو، لیکن تم سے ملنے کے بعد میں نے کسی اور شاعر کو نہیں پڑھا۔ صرف تم کو پڑھتی رہی ہوں۔“

”تو یہ طے ہے کہ تمہیں ان دونوں سے کوئی لگاؤ نہیں!“

”ہرگز نہیں عارف!“

”تو پھر ان دونوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ میں انہیں معاف نہیں کرسکتا جنہوں نے میری گڑیا کو پہلے ہی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔“

”تم کیا کرو گے عارف؟“ یاسمین سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”ابھی میرے دماغ میں صرف اتنا ہی آیا ہے کہ میں ان سے انتقام لوں گا۔“

”پلیز عارف!“ یاسمین پریشان نظر آئی۔ ”کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا جس سے تمہیں بھی کوئی زک پہنچے۔ میں نے اپنی زندگی صرف برداشت کرنے میں گزاری ہے لیکن یہ میں برداشت نہیں کرسکوں گی کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچ جائے۔“

عارف کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”ریشماں بھی اپنی آنے والی زندگی سے خوش نہیں ہے؟“

”بالکل خوش نہیں ہے۔“

”اور ابھی اس نے اس زندگی میں قدم نہیں رکھا؟“

”نہیں۔“ یاسمین نے جواب دیا۔ ”وہ تو جب نجیب خان اسلام آباد واپس جائے گا تو کوئی گاہک تلاش کرنے کے بعد ریشماں کو وہاں بلایا جائے گا۔“

”تو پھر میں اسے بھی اس خارزار سے بچاؤں گا۔“

”مگر کیسے عارف؟“ یاسمین بے چین ہوئی۔

”میں نے ابھی کہا تھا تم سے...... میں نے ابھی کوئی تدبیر نہیں سوچی۔ بس اتنا ہی آیا ہے میرے دماغ میں کہ مجھے ان لوگوں سے انتقام لینا ہے۔“

”تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے عارف!“ یاسمین جذباتی انداز میں زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

”کل تم کیا کرو گی؟“ عارف نے پوچھا۔ ”اپنے گھر...... میرا مطلب ہے، الماس نادر کے پاس تو جاؤ گی نا؟“

”یہ تو ایک رسم ہے۔ دنیا دکھاوے کے لیے مجھے جانا ہی ہوگا لیکن کل کے بعد میں وہاں کبھی نہیں جاؤں گی۔ فون پر ہی کہہ دوں گی کہ اب وہ لوگ مجھ سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔“

”تم نے لاکٹ الماری میں رکھ دیا ہے۔ نجیب خان ہماری اس وقت کی باتیں ریکارڈ نہیں کرسکا ہوگا۔ الماس

نادرتم سے اس بارے میں پوچھے گی تو!''
''میرے دماغ میں صرف ایک ہی بات ہے۔ میں کہہ دوں گی کہ تم نے کمرے میں آکر مجھ سے کوئی بات کیے بغیر میرے زیور اتار کر کہیں رکھے تھے، پھر...... پھر......''
یاسمین کی زبان لڑکھڑائی۔''میں کہہ دوں گی کہ اس کے بعد ہی عارف نے بولنا شروع کیا تھا۔''
''کیا الماس نادر یقین کرلے گی؟''
''نہ کرے۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔''
''سوچنا پڑے گا اس بارے میں۔'' اس مرتبہ عارف کا انداز بڑبڑانے کا سا تھا اور اس نے گھڑی پر بھی نظر ڈالی۔ ''چھ بجنے والے ہیں۔ سوچنے کے لیے وقت بہت کم ہے۔''
یاسمین کچھ نہیں بولی۔ وہ بھی سوچ میں پڑ گئی تھی۔
''ایک بات نہیں کی تم نے عارف!'' وہ کچھ توقف سے بولی۔
''کیا؟''
''تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میرا یا ریشماں کا باپ کون ہوسکتا ہے۔ تم ہم بہنوں کی پیدائش کو ناجائز سمجھ رہے ہوگے جبکہ ایسا نہیں ہے۔ تمہاری وجہ سے میں بھی اب اس عورت کو الماس نادر ہی کہوں گی۔ یہ بات ہم دونوں کے علم میں ہے کہ الماس نادر نے ایک غریب شخص سے شادی کی تھی۔ شاید اس کے ماں باپ بھی غریب ہی ہوں گے اس لیے اس کی شادی کسی غریب شخص سے ہی ہوسکتی تھی۔ ہم دونوں اس غریب شخص ہی کی بیٹیاں ہیں۔ الماس نادر کی دوسری زندگی ہمارے باپ کی وفات کے بعد کی ہے۔''
''تب تو ایک معما حل ہوگیا۔'' عارف نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
''کیسا معما؟''
''تمہارا غریب باپ یقیناً کوئی بہت شریف انسان ہوگا۔ تم دونوں بہنوں کی رگوں میں اسی شریف باپ کا خون دوڑ رہا ہے۔ اسی لیے تم نے اس زندگی کو خوشی سے قبول نہیں کیا اور ریشماں بھی اسی لیے اپنی آنے والی زندگی کو خوشی سے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔''
یاسمین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''ہاں عارف......! یہی بات ہے۔ میں خود تم سے یہ بات کہتے ہوئے ہچکچا رہی تھی کہ ہم بہنیں کسی کی ناجائز اولاد نہیں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے جھوٹا نہیں سمجھتے۔ اب بہ مشکل خود کو آمادہ کرسکی کہ تمہیں یہ بات بتا ہی دوں۔''
''تمہارے بتانے سے ایک بات صاف ہوگئی لیکن اگر تم دونوں الماس نادر کی ناجائز اولاد ہوتیں تو بھی میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لوگ ناجائز اولاد کے لیے اچھے خیالات نہیں رکھتے لیکن میری سوچ ان سے مختلف ہے۔ اگر کوئی کسی کی ناجائز اولاد ہو تو اس میں اس کا نہیں، اس کی ماں کا قصور ہوتا ہے۔''
''عارف! میرے اچھے عارف!'' یاسمین جذباتی انداز میں اس سے لپٹ گئی۔ ''میرے بہت ہی اچھے عارف...... تمہارے ان خیالات کا اندازہ مجھے پہلے سے تھا۔ تمہاری دو نظموں کا موضوع یہی ہے۔ تم اپنے ان خیالات کا اظہار ان نظموں میں کرچکے ہو۔''
''اور ان نظموں کو ادبی حلقوں میں سراہا بھی جاچکا ہے لیکن اب یہ باتیں چھوڑو۔ بہت کچھ سوچنا ہے مجھے، لیکن اس سے پہلے میں ایک مرتبہ پھر۔'' عارف نے بات ادھوری چھوڑ کر اپنی دو انگلیوں سے یاسمین کے ہونٹوں کو چھیڑا۔
یاسمین نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نظریں جھکالیں۔
دوسری صبح اس کی آنکھ کچھ دیر سے ہی کھلتی اگر عارف اسے جگا نہ دیتا۔ وہ غسل کرکے ہشاش بشاش نظر آرہا تھا۔
''بس اب جلدی سے تیار ہوجاؤ۔'' عارف نے کہا۔ ''آج ڈیڈی دفتر نہیں جائیں گے۔ انہوں نے کل ہی بتادیا تھا۔ اس وقت عموماً ناشتے کی میز لگ جاتی ہے لیکن خاص طور سے آج کے لیے ڈیڈی نے ناشتے کا پروگرام ایک گھنٹے بعد کا رکھا ہے۔''
یاسمین اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ جب وہ غسل کرکے نکلی تو عارف موبائل فون پر دھیمی آواز میں بات کرتے ہوئے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ بات اختتام پر تھی۔ یاسمین نے عارف کو کہتے سنا۔ ''ٹھیک ہے، تم آدھے گھنٹے میں پہنچ جاؤ۔ میں بے چینی سے انتظار کروں گا۔''
اس نے رابطہ منقطع کرکے یاسمین کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''گلاب کی طرح نکھر آئی ہو۔''
''موبائل پر کس سے بات کررہے تھے؟'' یاسمین نے پوچھا۔ ''اس وقت کسے بلایا ہے؟''
''ایک دوست ہے میرا۔ چلو تم جلدی سے تیار ہوجاؤ اور ہاں! زیورات ابھی نہ پہننا۔ تمہاری بہن اپنی کچھ دوستوں کے ساتھ تمہیں جب لینے آئے گی، اسی وقت پہن لینا۔''
''اس لاکٹ کی وجہ سے کہہ رہے ہو؟''
''ہاں۔ میں نہیں چاہتا کہ اگر اس وقت بھی آس پاس کہیں نجیب خان موجود ہو تو ہماری باتیں سن سکے، نہ ریکارڈ

کر سکے۔ تم تیار ہو۔ میں ذرا باہر کا...... میرا مطلب ہے گھر ہی میں...... ایک چکر لگا کر آتا ہوں۔''

وہ یاسمین کے کچھ بولنے سے پہلے ہی تیزی سے چلتا ہوا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

یہ بات یاسمین کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی کہ فوری طور پر عارف نے اپنے کسی دوست کو کیوں بلایا تھا......؟ اس کا ذہن الجھا رہا لیکن اسی دوران میں وہ تیار ہوگئی۔ تیار ہونے کے بعد اسے عارف کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

''میرا اندازہ تھا کہ تم تیار ہو چکی ہوگی۔'' عارف نے اندر داخل ہوتے ہوئے خوشگوار موڈ میں کہا۔ اس کے چہرے سے یہ بات قطعی ظاہر نہیں ہو رہی تھی کہ گزشتہ رات اسے ایک شدید ذہنی جھٹکا لگ چکا تھا یا شاید وہ یاسمین کو یہ تاثر دینا چاہتا ہو کہ جو کچھ اس کے سامنے آیا ہے، وہ سب اس نے سچے دل کے ساتھ قبول کر لیا ہے۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ ڈائننگ روم میں پہنچے۔ ڈائننگ ٹیبل پر اس وقت کنور شمشاد کے ساتھ رانی بیگم بھی موجود تھی۔ عارف کو تعجب ہوا۔ وہ پہلی مرتبہ رانی بیگم کو اتنی صبح اپنے گھر پر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر میں یہ بات نہیں آسکی کہ یاسمین رانی بیگم کو دیکھ کر چونک گئی تھی۔

''آؤ دلہن!'' رانی بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ تم نے زیورات کیوں نہیں پہنے؟''

''اچھا خاصا بوجھ ہوتا ہے، زیورات کا۔'' یاسمین سے پہلے عارف بول پڑا۔ ''میں نے ہی کہا تھا کہ جب ریشماں لینے آئے تو پہن لینا زیورات۔''

پھر وہ دونوں سلام کر کے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

ابھی ناشتا پوری طرح نہیں کیا گیا تھا کہ ایک ملازم نے آکر عارف کو اطلاع دی کہ اس کا دوست شکیب فاروقی آیا ہے اور اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا ہے۔

عارف جلدی سے اٹھا۔ ''سوری ڈیڈی...... میں نے ہی اسے بلایا تھا۔ ایک بہت ضروری کام ہے۔''

''آج تو تمہیں بالکل فارغ ہونا چاہیے تھا۔'' کنور شمشاد نے منہ بنایا۔

''آئی ایم ویری سوری ڈیڈی......! دراصل کام بہت ضروری تھا۔ میں ناشتا بعد میں کر لوں گا۔''

عارف تیزی سے چلتا ہوا ڈائننگ روم سے نکل جانا چاہتا تھا کہ کنور شمشاد بول پڑے۔ ''سنو!'' عارف ٹھٹکا۔ کنور شمشاد نے اپنی بات مکمل کی۔ ''ابھی میں یاسمین بیٹے کو اپنے کمرے میں لے جاؤں گا۔ کچھ باتیں کروں گا، تم اپنے

> ایک لڑکا برتے والی کو چھیڑتے ہوئے ''جہاں سبزی وہاں ڈالڈا کیسی ہو میری خالدہ؟''
> برتے والی نے کہا۔ ''غور سے دیکھ نہ میں خالدہ نہ ڈالڈا۔ میں ہوں تیری والدہ۔''
> لڑکے نے کہا۔ ''اوہ امی جان! جہاں ماتا وہاں ڈالڈا۔''
>
> ☆☆☆

دوست سے مل کر ادھر ہی آجانا۔''

''جی بہتر۔'' عارف نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

یاسمین نظریں جھکائے ناشتا کرتی رہی۔ اس کے ذہن میں یہ سوال نہیں اٹھا تھا کہ کنور شمشاد اس سے کیا باتیں کرے گا۔ یہ سوال اس کے دماغ میں اٹھنا فطری بات ہوتی لیکن اس کا دماغ پہلے ہی اتنا الجھا ہوا تھا کہ اس نے کنور شمشاد کی بات بھی ٹھیک سے نہیں سنی۔ اس پر شدید دباؤ تو اس بات کا تھا کہ رانی بیگم کی وہاں موجودگی کیا معنی رکھتی ہے۔

رانی بیگم نجیب خان کی بیوی تھی۔ اپنے کسی منصوبے کے تحت انہوں نے عام طور پر تو یہ ظاہر کر رکھا تھا کہ ان دونوں میں علیحدگی ہوگئی ہے لیکن حقیقت یہ نہیں تھی۔ ویسے تو رانی بیگم کا قیام ایک بنگلے میں تھا لیکن یاسمین کے علم کے مطابق نجیب خان اس کے بنگلے پر کبھی نہیں جاتا تھا۔ ان کی خفیہ ملاقاتیں خود یاسمین کے گھر میں ہوتی تھیں جب نجیب خان اسلام آباد سے آتا تھا۔

ایسی صورت میں رانی بیگم کی وہاں موجودگی یاسمین کے لیے حیرت کا سبب بننا ہی چاہیے تھی۔

ڈائننگ ٹیبل پر زیادہ تر گفتگو کنور شمشاد اور رانی بیگم میں ہوتی رہی۔ ان باتوں سے یاسمین کو یہ اندازہ بھی ہوا کہ رانی بیگم رات کو شادی میں بھی شریک رہی تھی۔ یاسمین نے رات کو اسے اس لیے نہیں دیکھا تھا کہ وہ مستقل نظریں جھکائے رہی تھی۔

ان باتوں سے یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ رانی بیگم کنور شمشاد کے نہ صرف تجارتی بلکہ گھریلو معاملات میں بھی خاصی دخیل تھی۔

یاسمین کا ذہن الجھا رہا اور ناشتا کر لیا گیا۔ اس کے بعد کنور شمشاد اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ رانی بیگم اس وقت بھی ساتھ رہی۔ بیٹھنے کے بعد کنور شمشاد نے یاسمین کو عارف کے مزاج کے بارے میں سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ

سب کچھ میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ یہ باتیں آئندہ زندگی میں تمہارے کام آئیں گی۔"

"جی۔" یاسمین نظریں جھکائے رہی۔

ایک ملازم آکر چائے دے گیا۔ یاسمین کو علم نہیں تھا کہ ناشتے کے بعد کنور شمشاد اپنے کمرے میں آکر بھی چائے پینے کا عادی تھا یا صرف اسی وقت ایسا ہوا تھا۔

چائے پینے کے دوران میں کنور شمشاد کی باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ اس نے اپنا کاروبار بلکہ اپنا سب کچھ عارف کے نام کر دیا ہے اور اب عارف کو اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ کاروبار میں بھی دلچسپی لینا ہوگی۔

آدھا گھنٹا گزرا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ آنے والا عارف ہی تھا۔

"بس مجھے یہی باتیں کرنا تھیں۔" کنور شمشاد نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ یاسمین سے کہا۔ "اب تم جا کے تیاری کرو۔ کچھ دیر میں تمہاری بہن اپنی دوستوں کے ساتھ آتی ہی ہوگی۔"

یاسمین اٹھ کر عارف کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔

"کیا کہہ رہے تھے ڈیڈی؟" عارف نے پوچھا۔

یاسمین نے سب کچھ مختصراً بتا دیا۔ وہ عارف کے ساتھ اس کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی مگر اس کا دماغ رانی بیگم ہی میں الجھا ہوا تھا۔ وہ عارف سے اس کے بارے میں سوال کر بیٹھی۔

جواب میں عارف نے کہا۔ "فی الحال یہ بات راز میں رکھنا ہے یاسمین! اپنے گھر میں بھی کسی کو نہیں بتانا۔ میرا خیال ہے کہ اب بس دو چار دن کی بات ہے، پھر ڈیڈی ظاہر کر ہی دیں گے۔ وہ رانی بیگم سے شادی کر چکے ہیں۔"

"کیا!" یاسمین ٹھٹک کر رک گئی۔

"کیوں؟" عارف بھی رک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ "ڈیڈی کی تیسری شادی تمہارے لیے تعجب کی بات ہے؟"

"یہ بات نہیں۔" یاسمین نے عارف کا بازو پکڑ کر تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔ "دراصل یہ شادی ممکن ہی نہیں۔ رانی بیگم نجیب خان کی بیوی ہے۔"

اس مرتبہ عارف ٹھٹک کر رکنا چاہتا تھا لیکن یاسمین نے اسے رکنے نہیں دیا اور اسے لیے کمرے میں داخل ہوگئی۔ پھر اس نے عارف کو سب کچھ بتا دیا۔ عارف دم بہ خود بیٹھا رہ گیا۔

"اور اس کا مطلب ہے۔" یاسمین پرجوش انداز میں بولی۔ "یہ لوگ اب غالباً تمہارے گرد بھی کوئی جال بُننا چاہتے ہیں اور آلۂ کار مجھے بنانا چاہیں گے۔"

"میرے گرد کیا جال بنا جا سکتا ہے؟" عارف الجھ گیا تھا۔

"ابھی میں اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ سب کچھ سامنے تو آئے گا اگر ان لوگوں نے مجھے آلۂ کار بنایا لیکن یہاں...... تمہارے معاملے میں تو میں ان کی ایک نہیں چلنے دوں گی۔"

"یہ سب کچھ تو میرے لیے خاصا پریشان کن ہے یاسمین! اور پھر یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے کہ ڈیڈی سے اس کا یہ تعلق ناجائز ہے۔"

"لیکن اس میں تمہارے ڈیڈی کا کوئی قصور نہیں۔ ان کو تو رانی بیگم نے اندھیرے ہی میں رکھا ہوگا۔"

"ہاں، یہ تو خیر ظاہر ہے۔" عارف نے کہا اور سوچ میں ڈوب گیا۔

"اچھا اب میں تیار ہو جاؤں۔ سوچنا تو بہرحال پڑے گا اس بارے میں۔" عارف نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

یاسمین نے الماری سے اپنے زیورات نکالے اور تیار ہونے لگی۔

تھوڑی دیر بعد ریشماں اور اس کی دو دوست آگئیں۔ رانی بیگم نے ان کا استقبال ڈرائنگ روم میں کیا تھا۔ جب یاسمین اور عارف وہاں پہنچے تو کنور شمشاد بھی وہاں آچکے تھے۔

مہمانوں کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی۔ اس کے بعد یاسمین ان کے ساتھ روانہ ہوئی۔ ریشماں اسی کی کار میں آئی تھی۔ اب آئندہ بھی وہ اسی کے استعمال میں رہتی۔

ریشماں نے اپنی دوستوں کو ان کے گھروں پر ڈراپ کیا، پھر اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے ریشماں متفکر لہجے میں بولی۔ "جانے کیا بات ہے باجی!...... آج بھی وہ دونوں بہت غصے میں ہیں۔" اس کا اشارہ نجیب خان اور الماس نادری کی طرف تھا۔

یاسمین ان دونوں کے غصے کی وجہ سمجھ گئی۔ بالکل سامنے کی بات تھی۔ نجیب خان اس کی اور عارف کی باتیں ریکارڈ نہیں کر سکا ہوگا۔

البتہ یہ بات یاسمین کی سمجھ میں بھی نہیں آسکی کہ ان دونوں کی باتیں ریکارڈ کر کے یہ لوگ کیا فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

گھر پر الماس نادر بے چینی سے منتظر نظر آئی۔ اس کے ساتھ نجیب خان بھی تھا۔

فطری طور پر تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ ایک ماں کی حیثیت سے الماس نادر بڑی محبت سے یاسمین کو اپنے سینے سے لگا لیتی لیکن سامنا ہوتے ہی اس نے ایک سوال داغ دیا۔

''یہ لاکٹ رات کو کہاں تھا؟'' اس نے یاسمین کے گلے میں پڑے ہوئے لاکٹ کی طرف اشارہ بھی کیا تھا۔

جواب میں یاسمین نے وہی کچھ کہا جو وہ عارف کو بتا چکی تھی۔

''بے تکی بات ہے یہ!'' نجیب خان بول پڑا۔ ''ایسا کوئی نہیں کرتا۔''

''عارف کہہ رہے تھے کہ میں انہیں زیورات کے بغیر زیادہ اچھی لگتی ہوں۔'' یاسمین نے جواب دیا۔

''مجھے شبہ ہے کہ تم سچ نہیں بول رہی ہو۔'' الماس نادر نے یاسمین کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اور پھر اسے سب زیورات الماری میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی...... ایسے موقعوں پر زیورات قریب ہی کہیں رکھ دیے جاتے ہیں۔''

''جو بات تھی، وہ میں نے بتادی۔ آخر اس سے فرق بھی کیا پڑا کہ ماما ہماری باتیں ریکارڈ نہیں کر سکے۔''

نجیب خان اور الماس نادر نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر دونوں ہی یاسمین کو گھورنے لگے۔

''ریکارڈنگ کی کیا بات کی تم نے؟'' الماس نادر نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔

یاسمین نے بے خوفی سے جواب دیا۔ ''اس لاکٹ میں کوئی سم یا ڈیوائس...... یا جو کچھ بھی کہتے ہیں، وہ لگی ہوئی ہے۔ اتفاق سے میں نے آپ کی اور ماما کی باتیں سن لی تھیں۔ تب ہی مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ اس لاکٹ میں جو آلہ لگا ہے، وہ آوازیں نشر کرتا ہے۔ ماما اپنے کسی آلے پر وہ آوازیں ریسیو کرتے اور ریکارڈ کر لیتے۔ آخر اس کی ضرورت کیا تھی ممی؟ میری اور عارف کی باتوں کو ریکارڈ کرنے سے آپ کو کیا حاصل ہوتا؟''

''بے وقوف لڑکی۔'' نجیب خان غصے سے بڑبڑایا۔ پھر اس نے کہا۔ ''تمہاری ان باتوں سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ تم نے خود یہ لاکٹ الماری میں رکھا تھا۔ تم نہیں چاہتی تھیں کہ تم دونوں کی باتیں ریکارڈ ہوں۔''

''آپ جو چاہیں، سمجھیں لیکن میرا سوال اپنی جگہ ہے۔ ان باتوں کو ریکارڈ کر کے آپ کو کیا حاصل ہوتا؟''

''ہمیں اندازہ ہو جاتا اس کی باتوں سے کہ وہ تمہیں

لاجواب

ایک ہندو استاد کلاس روم میں۔ ''بچو...... کیا میں آپ کو نظر آرہا ہوں؟''

بچے۔ ''جی ہاں۔''

استاد۔ ''میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں اس لیے نظر آرہا ہوں کیا آپ کو اللہ نظر آرہا ہے؟''

بچے۔ ''نہیں۔''

استاد۔ ''ہوتا تو نظر آتا ناں۔''

ایک مسلمان بچے نے کھڑے ہو کر کہا۔ ''بچو! آپ کو استاد کی عقل نظر آرہی ہے؟''

بچے۔ ''نہیں۔''

مسلم بچہ۔ ''ہوتی تو نظر آتی ناں۔''

مرسلہ: محمد جاوید بلوچ، علی پور

کتنا چاہتا ہے اور تم اسے کس حد تک اپنی انگلیوں پر نچا سکتی ہو۔'' الماس نادر نے کہا پھر اس نے یاسمین کے قریب ہو کر بڑی محبت کا اظہار کیا۔ ''دیکھو میری جان...... یہ ٹھیک ہے کہ تم عارف سے محبت کرتی ہو لیکن ہمارا بھی تو کوئی حق ہے تم پر...... اچلو ہم مان لیتے ہیں کہ عارف ہی نے تمہارے سب زیورات اتارے تھے لیکن اب تم دو دن تک ایسا نہیں ہونے دینا۔ تم اس سے کیا اتنی بات بھی نہیں منوا سکتیں کہ وہ زیورات الماری میں بند کرنے کے بجائے قریب ہی کہیں رکھ دے۔ سائڈ ٹیبل پر رکھ دے۔''

''منوا سکتی ہوں میں یہ بات۔'' یاسمین نے سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر میں عارف کو اپنی انگلیوں پر نچا سکی تو اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟''

''دیکھو!'' الماس نادر کا لہجہ نرم ہی رہا۔ ''اب تک اس لاکٹ کی وجہ سے تمہارے بہت سے گاہک ہماری گرفت میں آچکے ہیں۔ ان کی اس آوارگی کو چھپانے کے لیے ہم ان سے رقومات لیتے رہے ہیں۔ ان لوگوں کو یہ حق آخر کس نے دیا کہ وہ دولت پر سانپ بن کر بیٹھے رہیں۔ ہم کیوں محروم رہیں اس دولت سے......؟ اور اب تم ڈھل چکی ہو۔ تمہارے لیے اب اچھے گاہک نہیں مل سکتے۔ اسی لیے اب تمہاری جگہ ریشماں لے لے گی لیکن دولت تو عارف کے پاس بھی بہت ہے۔ اس کے والد نے اپنا سب کچھ اس کے نام کر دیا ہے۔ اگر عارف تمہیں بے پناہ چاہتا

ہے تو تم بہ آسانی اسے اپنی انگلیوں پر نچا سکتی ہو۔ تم اس سے لاکھوں کی فرمائش کرو گی تو بھی وہ تمہیں نہیں ٹالے گا۔ بس یہی اندازہ لگانا ہے ہمیں کہ تم اس سے ہمارے لیے کتنی رقم اینٹھ سکتی ہو۔''

اب یاسمین کی سمجھ میں آیا کہ عارف کے گرد گھیرا ڈالنے سے ان لوگوں کا مقصد کیا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بھی آیا کہ رانی بیگم نے شادی کے نام پر کنور شمشاد سے تعلقات کس لیے قائم کیے ہوں گے۔ اسی نے کنور شمشاد کو اس کے لیے تیار کیا ہوگا کہ وہ عارف کی شادی یاسمین سے کروا دے اور کیا عجب کہ اسی کے کہنے سے کنور شمشاد نے اپنا سب کچھ ابھی سے عارف کے نام کر دیا ہو تا کہ یاسمین اپنی فرمائش آسانی سے پوری کروا سکے۔

یاسمین نے یہ سب کچھ سمجھنے اور اندازے لگانے کے بعد اپنے رویے میں تبدیلی لانا ضروری سمجھا۔ اسی طرح وہ الماس نادر سے کچھ اور باتیں بھی اگلوا سکتی تھی۔ اس نے آہستگی سے سر ہلایا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ''اچھا......! اگر آپ عارف سے بھی دولت گھسیٹنا چاہتی ہیں تو عارف سے محبت کی خاطر میں اسے گوارا کر لوں گی۔ بہت دولت ہے عارف کے پاس...... اگر آپ میرے ذریعے ایک آدھ کروڑ بھی حاصل کر لیں گی تو اس سے عارف کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، معاف کیجیے گا، اب جو آپ اتنے میٹھے انداز میں باتیں کرنے لگی ہیں، یہ مصنوعی ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ جس طرح عارف مجھے چاہتے ہیں، اسی طرح میں بھی ان کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔''

الماس نادر چونکی۔ کچھ ایسی ہی کیفیت نجیب خان کی بھی ہوئی تھی۔ ریشماں اس دوران میں نظریں جھکائے ایک طرف خاموشی سے بیٹھی رہی تھی۔ لیکن یاسمین کی اس بات پر اس نے بھی تیزی سے سر اٹھا کر یاسمین کی طرف دیکھا تھا۔

یاسمین نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''آپ جانتی ہیں کہ جس طرح عارف مجھے چاہتے ہیں، اسی طرح میں بھی عارف کو شدت سے چاہتی ہوں۔ اگر میں آپ لوگوں کی بات نہیں مانوں گی تو جس طرح رانی بیگم نے عارف کی مجھ سے شادی کرنے کے لیے ان کے والد کو آمادہ کیا ہے، اسی طرح آپ ان کے ذریعے عارف پر ان کے والد کا یہ دباؤ بھی ڈلوا سکتی ہیں کہ وہ مجھے طلاق دیدے۔''

''ارے نہیں۔'' الماس نادر نے پھر اداکاری کی اور یاسمین کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''اب ایسا بھی نہیں ہے کہ میری بیٹی میری بات نہ مانے تو میں اس سے اس طرح انتقام لوں۔ ہاں البتہ تمہاری عارف سے شادی کے لیے رانی بیگم ہی نے کوشش کی تھی۔''

یاسمین نے نجیب خان کی طرف دیکھا۔ ''آپ کو اس بات پر شرم بھی نہیں آئی ہوگی ماما کہ آپ نے اپنی بیوی کو کنور شمشاد کو سونپ دیا ہے۔ شاید انہیں آپ نے اور لوگوں کے پاس بھی بھیجا ہوگا جب وہ جوان ہوں گی۔''

''ہمارا پیشہ ہی یہ ہے۔'' نجیب خان نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ تم بھی جانتی ہو۔ خود تم بھی ایک طوائف کی اولاد ہو۔''

''مجھے بڑی حد تک یقین ہے کہ میں ان کی ناجائز اولاد نہیں ہوں۔'' یاسمین نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میرا باپ وہی ہوگا جس سے ممی نے شادی کی تھی۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹی!'' الماس نادر نے اپنے لب و لہجے کی نرمی برقرار رکھی۔ ''تم اور ریشماں، دونوں ہی میرے اس شوہر کی اولاد ہو لیکن وہ بہت غریب آدمی تھا۔ میرے لیے تو بہت اچھا ہوا کہ وہ جلد مر گیا۔ تم دونوں بہنوں نے اس وقت ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا۔ اس کے بعد ہی میں نے یہ پیشہ اختیار کیا جس کی یہ دولت میں نے ہی نہیں، تم دونوں بہنوں نے بھی عیش و عشرت کی زندگی گزاری ہے، لیکن اب تلخ باتیں ختم کرو۔ یہ خیال اپنے ذہن سے نکال دو کہ میں تمہیں عارف سے طلاق دلوانے کے بارے میں سوچوں گی۔ اب میں یہ تمہاری مرضی پر چھوڑتی ہوں کہ تم عارف سے ہمیں کچھ دلوانا چاہو گی یا نہیں۔''

''کیسے چھوڑ رہی ہو تم یہ بات اس پر۔'' نجیب خان بگڑ کر بولا۔ ''اسے وہ سب کچھ کرنا ہی پڑے گا جو ہم چاہتے ہیں۔ تم اسے طلاق نہیں دلوانا چاہو گی تو نہ چاہنا۔ میں رانی بیگم کے ذریعے اسے طلاق دلوا کر رہوں گا اگر یہ ہماری بات نہیں مانے گی تو۔''

''تم بہت ضدی ہو نجیب!'' الماس نادر نے سنجیدگی سے کہا، پھر نجیب خان کو آنکھوں سے کچھ اشارہ بھی کیا۔

''ہاں ضدی ہوں میں......! آخر اس لڑکی نے اتنی عیش و عشرت کی زندگی گزاری ہے تو ہماری ہی وجہ سے گزاری ہے۔ اب اسے ہمارے کام بھی آنا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' یاسمین نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں تم لوگوں کی ڈیمانڈ پوری کرتی رہوں گی۔''

یہ جواب دیتے وقت وہ دل ہی دل میں فیصلہ کر چکی تھی کہ عارف کو ان تمام باتوں سے آگاہ کر دے گی۔ عارف چاہتا بھی تھا کہ ان لوگوں کے خلاف کوئی ایکشن لیا جائے لہٰذا یہ سب کچھ جاننے کے بعد اسے کوئی معقول تدبیر

سوچ سکتی تھی۔

نجیب خان بولا۔ ''دو دن تک یہ لاکٹ تم سے دور نہیں ہونا چاہیے۔ میں اچھی طرح اندازہ لگا لینا چاہتا ہوں کہ تم دونوں کے تعلقات میں کتنی گہرائی ہے۔ گہرائی جاننے کے بعد ہی میں یہ فیصلہ کرسکوں گا کہ تم اس کو کس حد تک نچا سکتی ہو۔''

یاسمین بولی۔ ''میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ ایک آدھ کروڑ سے بھی عارف کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔''

''بس تو پھر وہی کرنا جو میں ابھی کہہ چکا ہوں۔ دو دن تک یہ لاکٹ تم سے دور نہیں ہونا چاہیے۔''

اس وقت الماس نادر بول پڑی۔ اس نے یاسمین سے پوچھا۔ ''تمہیں واپس کب جانا ہے؟''

''رات کو ولیمہ ہے۔'' یاسمین نے جواب دیا۔ ''پانچ بجے تک عارف خود آئیں گے مجھے لینے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ عارف کو تمہارے ماضی کے بارے میں کوئی شبہ تو نہیں ہوا؟''

''نہیں۔'' یاسمین نے جواب میں صرف اتنا ہی کہنا مناسب سمجھا۔

''ٹھیک ہے، مجھے اطمینان بھی تھا۔ جس لیڈی ڈاکٹر سے میں نے سب کچھ کروایا تھا وہ اس کام کی ماہر بھی ہے۔ اچھا خیر! جاؤ، اب آرام کرو تم جا کر۔''

یاسمین نے فوراً ہی قدم بڑھا دیا۔ اس نے اپنے کمرے کا رخ کیا تھا۔ سینڈل اتار کر اس نے زیورات بھی اتار کر ایک طرف رکھے اور بستر پر لیٹ کر سوچ بچار کرنے لگی۔ ایک خیال اسے یہ بھی آیا کہ ابھی اپنے موبائل پر عارف سے رابطہ کرے اور اسے سب کچھ بتا دے لیکن پھر اس نے یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ مناسب یہی تھا کہ اتنی تفصیلی باتیں فون پر نہ کی جائیں۔

یہ خیال ذہن سے جھٹکنے کے بعد بھی وہ سوچ بچار میں ڈوبی رہی۔ اب اس کا مرکزِ فکر یہ تھا کہ ان سب باتوں سے واقف ہوجانے کے بعد عارف ان لوگوں کے خلاف کوئی ایکشن لے بھی سکتا ہے یا نہیں؟

اس سوچ بچار میں آدھا گھنٹا گزرا تھا کہ ریشماں دستک دے کر اس کے کمرے میں آئی۔ وہ بہت سنجیدہ نظر آرہی تھی۔ یاسمین نے اسے محبت سے اپنے قریب بٹھایا۔

''اتنی فکرمند کیوں نظر آرہی ہے میری گڑیا!'' وہ بولی۔

''ماما کے گرگے بھی تو ہیں اسلام آباد میں!'' ریشماں نے کہا۔ ''ان میں سے کسی نے ماما کو اطلاع دی ہے کہ دو دن بعد کسی خلیجی ریاست سے کوئی آنے والا ہے جسے بڑی آسانی سے پھانسا جاسکتا ہے۔''

''تو؟''

''ماما نے پرسوں رات اسلام آباد جانے کا پروگرام بنالیا ہے۔''

''میں اب بھی نہیں سمجھی کہ تم فکرمند کیوں ہو؟''

''فکرمند نہیں ہوں باجی...... ! بس سوچ رہی ہوں تمہارے بعد اب مجھے مردوں کا کھلونا بننا پڑے گا۔''

یاسمین نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم نہیں بننا چاہتیں؟''

''میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔'' ریشماں اب کچھ اداس نظر آنے لگی۔ ''تمہاری طرح میرا بھی کوئی سہارا نہیں ہے۔ ماما کے اشاروں پر ناچنا تو پڑے گا۔ یہ جاننے کے بعد مجھے ان دونوں سے نفرت ہوگئی ہے کہ میں ایک شریف باپ کی بیٹی ہوں اور آپ بھی۔''

''اسی بارے میں مجھ سے مشورہ کرنے آئی ہو؟''

''آپ بھی کیا مشورہ دے سکتی ہیں باجی!'' ریشماں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''میں تو بس اس لیے آگئی کہ آپ سے باتیں کر کے شاید کچھ دھیان بٹے۔''

''لیکن تم چاہتی ہو کہ جو زندگی میں نے گزاری، وہ تمہیں نہ گزارنا پڑے؟''

''میں نے ابھی کہا نا باجی کہ میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

اس وقت یاسمین کے دماغ میں یہ سوال ابھرا کہ عارف اگر ان لوگوں کے خلاف کوئی ایکشن لے سکا تو کیا یہ بھی ممکن ہوگا کہ ریشماں کو بھی ان لوگوں کی گرفت سے نکالا جاسکے؟

یاسمین کے دماغ میں عارف کا جملہ گونجا۔ ''تو پھر میں اسے بھی اس خارزار سے بچاؤں گا۔''

عارف نے یہ بات ریشماں ہی کے لیے کہی تھی لیکن یاسمین کے لیے اندازہ لگانا بھی مشکل تھا کہ عارف یہ سب کچھ کس طرح کرسکے گا۔

✂✂✂

شام کے پانچ بجے تھے جب یاسمین نے اپنے موبائل پر عارف کی کال ریسیو کی۔ ''میں آرہا ہوں یاسمین! آدھا گھنٹا لگے گا، تیار ملنا؟''

''تیاری کیا کرنا ہے مجھے! جیسی آئی تھی، ابھی تک اسی حالت میں ہوں۔ تم آؤ گے تو اٹھ کر چل پڑوں گی۔''

''میک اپ تو خراب ہو ہی گیا ہوگا۔ خیر، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے میں جانے سے پہلے تمہیں بیوٹی پارلر تو جانا ہی ہوگا۔ بس الماس نادر کو بتا دو کہ میں تمہیں لینے آرہا ہوں۔''

''تم خود فون کر دو۔ میں تو اس وقت سے اب تک کمرے سے نہیں نکلی۔ کھانا بھی یہیں کھایا تھا ریشماں کے ساتھ۔ باہر نکلنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا ہے۔ ان لوگوں کی شکلوں سے نفرت ہوگئی ہے مجھے...... سب کچھ جان بھی چکی ہوں کہ یہ لوگ مجھ سے اور کیا کروانا چاہتے ہیں۔''

''اچھا!''

''ہاں۔'' یاسمین نے کہا۔ ''جب میں یہاں سے تمہارے ساتھ چلوں گی تو تمہیں وہ سب کچھ بتا دوں گی۔''

''بتا دینا۔ اچھا میں الماس نادر کو فون کیے دیتا ہوں۔ بس آدھے گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

یاسمین کو عارف کے اس انداز پر تعجب ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ جب وہ یہ بتائے گی کہ اس نے سب کچھ جان لیا ہے تو عارف متجسس ہو کر کچھ سوال ضرور کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ ''کیوں؟''

اس سوال نے یاسمین کو الجھن میں ڈالا، مگر اس کی یہ الجھن عارف سے باتیں کر کے ہی ختم ہو سکتی تھی۔ اس کے باوجود الجھن کی وجہ سے وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔

ٹہلتے ہوئے آدھا گھنٹا گزر گیا لیکن اسے وقت کا کچھ احساس ہی نہیں تھا۔ وہ اس وقت چونکی جب ریشماں کمرے میں آئی۔

''چلیے باجی!''

''عارف آگئے؟'' یاسمین نے جلدی سے پوچھا۔

''آتے ہی ہوں گے۔ ممی کو فون کیا تھا انہوں نے۔ ممی اور ماما ڈرائنگ روم میں ہیں، تمہیں بلایا ہے۔''

یاسمین سر ہلا کے ریشماں کے ساتھ کمرے سے نکلی۔ جب وہ دونوں ڈرائنگ روم میں پہنچیں تو وہاں عارف بھی تھا اور غالباً اسی وقت پہنچا تھا۔ نجیب خان اسے بڑی شفقت کے ساتھ سینے سے لگا رہا تھا۔

شریف زادہ بن رہا ہے، یاسمین نے جلے بھنے انداز میں نجیب خان کے بارے میں سوچا۔

''آؤ!'' الماس نادر نے یاسمین کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''تمہارے دلہا میاں آگئے تمہیں لینے!'' پھر وہ ریشماں سے بولی۔ ''جمن سے کہہ دیا تھا؟''

''جی ہاں، وہ دیکھیے!''

ریشماں کے اشارے پر الماس نادر نے اندرونی دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے ملازم جمن ایک بڑی سی ٹرالی کو دھکیلتا ہوا اندر آرہا تھا۔

نجیب خان نے بڑی محبت سے عارف کو اپنے قریب بٹھایا اور کہا۔ ''تم نے فون پر کہا تھا نا کہ تم بہت جلدی میں ہوگے اس لیے تمہاری خاطر تواضع کے لیے تیاری پہلے ہی کر لی گئی تھی۔''

''ارے اس کی کیا ضرورت تھی۔'' عارف نے کہا۔

''ارے واہ!'' الماس نادر بول پڑی۔ ''پہلی مرتبہ سسرال آئے ہو، کچھ کھائے پیے بغیر کیسے چلے جاؤ گے۔''

''ہمیں جلدی ہے ماما!'' یاسمین بول پڑی۔ ''عارف نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ ابھی مجھے بیوٹی پارلر بھی جانا ہے، وہاں خاصا وقت لگتا ہے۔''

''اب ایسی بھی جلدی نہیں ہے یاسمین!'' عارف نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اور پھر بڑوں کی بات ماننا ضروری ہے۔ اسی بہانے مجھے ماما سے کچھ باتیں کرنے کا موقع مل جائے گا۔''

یاسمین نے تعجب سے عارف کی طرف دیکھا لیکن پھر کچھ بولی نہیں اور ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

ملازم جمن ٹرالی قریب کھڑی کر کے چلا گیا۔ اسے جانے کا اشارہ خود ریشماں نے کیا تھا۔ وہ ٹرالی سے پلیٹیں اٹھا کر درمیانی تپائی پر رکھنے لگی تھی۔

''مجھ سے تمہیں کیا باتیں کرنا ہیں برخوردار!'' نجیب خان ہنس کر بولا۔

''یاسمین نے بتایا تھا کہ آپ زیادہ تر اسلام آباد میں رہتے ہیں۔''

''ہاں، میرا کاروبار وہیں ہے۔''

''عورتوں کا کاروبار!''

عارف کی اس بات پر الماس نادر اور نجیب خان ہی نہیں، یاسمین اور ریشماں بھی چونک پڑی تھیں۔

''عجیب سی بات کی ہے تم نے!'' نجیب خان نے عارف کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''کیا مطلب ہے اس سے تمہارا؟''

''مطلب تو وہی ہے جو آپ نے سمجھا ہے۔'' عارف نے سنجیدگی سے کہا، پھر یاسمین کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''ذرا یہاں آؤ!''

یاسمین شدید ذہنی الجھن کے عالم میں صوفے سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ عارف نے کس قسم کی منصوبہ بندی کر ڈالی ہے کہ اسی وقت

ایسی باتیں شروع کردیں جن کے لیے خاصی تیاری کی ضرورت تھی۔

عارف اور نجیب خان بڑے صوفے پر بیٹھے تھے۔

عارف نے یاسمین کو اپنے اور نجیب خان کے بیچ میں بٹھالیا۔

نجیب خان اب بھی تیکھی نظروں سے عارف کی طرف دیکھے جارہا تھا۔

عارف نے اس کی طرف توجہ دیے بغیر یاسمین کے گلے سے لاکٹ اتارا۔ اس وقت نجیب خان اور الماس نادر پھر چونکے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا بھی تھا۔

ریشماں ٹرالی سے پلیٹیں اٹھا کر تپائی پر رکھنا بھول گئی تھی اور کھڑے کھڑے سب کچھ دیکھے جارہی تھی۔

''ماما صاحب!'' عارف بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ نے اس لاکٹ میں جو سم لگا رکھی تھی نا، وہ اس وقت اس میں نہیں ہے، بالکل اسی جیسی دوسری سم ہے۔'' عارف نے لاکٹ میں پوشیدہ سم نکال کر نجیب خان کو دکھائی۔ ''تم نے جو سم لگائی تھی، وہ میری الماری میں پڑی ہوئی ہے۔ رات کو لاکٹ بھی اسی الماری میں تھا۔ اسی لیے تم میری اور یاسمین کی باتیں ریکارڈ نہیں کر سکے۔''

نجیب خان اور الماس نادر کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔

''اس میں یہ دوسری سم میں نے لگائی ہے۔'' عارف کہتا رہا۔ ''اس سم سے نشر کی جانے والی آوازیں جس ریسیور پر سنی جاسکتی تھیں، وہ ریسیور میری کار میں ہے۔ یاسمین جب سے یہاں آئی تھی تو میں اپنی کار میں تمہارے گھر کے قریب ہی تھا۔ یہاں یاسمین سے جو باتیں تم لوگوں نے کی تھیں، وہ میں نے ریکارڈ کر لی ہیں، سنواتا ہوں تمہیں!''

عارف نے کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکال کر اپنے گھٹنے پر رکھا۔

یاسمین کی حالت اس وقت ایسی تھی جیسے دم بہ خود رہ گئی ہو۔ اس کے دماغ نے جیسے کام کرنا ہی چھوڑ دیا تھا ورنہ وہ سمجھ جاتی کہ جب اس نے فون پر کہا تھا کہ وہ سارا کھیل سمجھ چکی ہے تو عارف نے اس سے کوئی استفسار اس لیے نہیں کیا تھا کہ وہ پہلے ہی ان سب باتوں سے واقف ہو چکا تھا۔

عارف ٹیپ ریکارڈر آن کر چکا تھا اور اس میں سے آوازیں ابھرنے لگی تھیں۔ وہ وہی باتیں تھیں جو یاسمین کے آتے ہی الماس نادر اور نجیب خان نے اس سے کی تھیں۔

ریشماں کھڑے کھڑے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔

نجیب خان اور الماس نادر کے چہرے بار بار رنگ بدل رہے تھے۔

دو منٹ بعد عارف نے ٹیپ ریکارڈر بند کیا اور بولا۔

''ساری باتیں سنانے کی، میرا خیال ہے کہ ضرورت نہیں ہے نجیب خان!...... تم سمجھ ہی گئے ہو گے کہ اس میں ساری باتیں موجود ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' نجیب خان نے سنبھالا لیا اور بولا۔ ''تم یہ سب کچھ جان ہی گئے ہو تو اب چاہتے کیا ہو.....؟'' پھر اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر یاسمین کو گھورتے ہوئے زہریلے انداز میں کہا۔ ''لاکٹ کے بارے میں تو ہی نے بتایا ہوگا۔''

یاسمین میں کچھ بولنے کی سکت ہی نہیں تھی۔ جواب عارف نے دیا۔ ''ہاں یاسمین نے ہی مجھے بتایا تھا کیونکہ یہ مجھے بہت چاہتی ہے۔ اس کے زیورات میں نے نہیں رکھے تھے الماری میں، خود اسی نے رکھے تھے۔ اسے اندازہ تو نہیں تھا کہ تم ہم دونوں کی باتیں کیوں سننا چاہتے ہو لیکن اسے غالباً شبہ ہو گیا ہوگا کہ تم مجھے بھی کسی قسم کے جال میں پھانسنا چاہتے ہو۔ اب میں نے جو باتیں ریکارڈ کی ہیں، اس سے ظاہر ہو گیا ہے کہ تم مجھے پھانسنا نہیں بلکہ صرف کچھ اندازہ لگانا چاہتے تھے کہ تم یاسمین کو آلۂ کار بنا کر مجھے لوٹنا چاہتے تھے۔ مجھے اس ریکارڈنگ سے اہم بات صرف یہی معلوم ہو سکی ہے کہ پہلے تم نے میری محبوب بیوی کو لوگوں تک پہنچایا تھا اور اب وہی کام تم معصوم ریشماں سے بھی لینا چاہتے تھے لیکن اب ایسا نہیں ہو سکے گا۔ یاسمین نے خود ہی مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس کے باوجود میرے دل سے اس کی محبت ختم نہیں ہو سکی۔ یہ میری ہے اور میری رہے گی۔'' پھر وہ ریشماں کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم نے آج اپنی باجی سے جو باتیں کی تھیں نا ریشماں، وہ بھی اب اس ٹیپ میں موجود ہیں۔ تمہاری خواہش ضرور پوری ہوگی۔ جو کچھ تم چاہتی ہو، وہی ہوگا۔ تم اب ان سوداگروں کے ساتھ نہیں، میرے گھر میں اپنی بہن کے ساتھ رہو گی۔''

''تمہارا مطلب کیا ہے ان باتوں سے!'' نجیب خان تیز لہجے میں بولا۔

''مطلب بالکل صاف ہے نجیب خان......! اگرچہ ٹیپ کی ہوئی آوازیں عدالت کے لیے ٹھوس ثبوت نہیں ہوتیں لیکن اگر اس ٹیپ کی بنیاد پر میں تم لوگوں کو عدالت میں گھسیٹوں تو پولیس مزید تفتیش کر کے تم لوگوں کے خلاف خاصے ثبوت اکٹھا کر لے گی۔ میں اس کے لیے بے تحاشا اخراجات کے لیے بھی تیار ہوں لیکن میں ایسا نہیں کرنا

چاہتا۔ اس صورت میں میری محبوب بیوی کو بھی عدالت میں جانا پڑے گا۔ اس کی بھی بدنامی ہوگی جو میں گوارا نہیں کرسکتا اس لیے میں بس یہ چاہتا ہوں کہ تم دونوں جہنم میں جاؤ۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم آئندہ کس قسم کی زندگی گزارو گے۔ خواہش تو یہی تھی کہ تم دونوں سے بھیانک انتقام لیا جائے لیکن اپنی بیوی سے میری محبت آڑے آرہی ہے۔ میں تم لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتا۔ بس آج کے بعد تم ہم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا۔ ریشماں کو بھی میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تم لوگ اسے اس جہنم میں نہیں جھونک سکتے...... اور ہاں نجیب خان! کوئی اوندھا سیدھا خیال اپنے دل میں نہ لانا۔ میرا مطلب ہے کہ تمہاری ایسی کوئی کوشش بار آور نہیں ہوسکتی کہ تم مجھ سے یہ ٹیپ چھین لو، اپنے ملازمین سے مدد لے لو۔ کوئی فائدہ نہیں ہوگا اس سے۔ اس ٹیپ کی ایک کاپی اور بھی ہے جو میں نے اپنے ایک دوست شکیب فاروقی کو دے دی ہے۔''

شکیب فاروقی کے نام نے یاسمین کو چونکایا۔ اسے یاد آگیا تھا کہ اسی روز عارف نے صبح ہی صبح اپنے جس دوست کو بلایا تھا، اس کا نام شکیب فاروقی ہی تھا۔

''وہ یہاں کی ایک لاانفورسمنٹ ایجنسی میں کام کرتا ہے۔'' عارف نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اگرچہ یہ سم اور اس قسم کے آلات اب کھلی مارکیٹ میں دستیاب ہیں لیکن میں نے اس سلسلے میں اپنے دوست کی مدد لی تھی۔ اسے فون کرکے اپنے گھر بلایا تھا۔ وہ کئی سمیں ساتھ لایا تھا تاکہ تمہاری لگائی ہوئی سم کی جگہ ان میں سے کوئی نہ کوئی سم فٹ ہوجائے۔ لاکٹ میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کرنا پڑے۔ میں نے اپنے دوست کو یہ ساری باتیں بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اگر بتادیتا تو یاسمین ہمیشہ اس کے سامنے شرمسار رہتی۔ اسی لیے میں نے ریکارڈنگ بھی خود کی تھی۔ بس اس سے طریقۂ کار سیکھ لیا تھا اس کام کا۔ جو دوسرا ٹیپ اس کے پاس ہے، وہ اسے سنے گا ہرگز نہیں۔ یہ وعدہ لے چکا ہوں میں اس سے......! مجھے یقین بھی ہے کہ وہ اپنے وعدے کا پاس کرے گا۔ ہاں ایک بات ضرور ہے۔ یہ خدشہ تو مجھے تھا اور ہے کہ تم شاید مجھے یہاں سے زندہ واپس نہ جانے دو۔ ایسی صورت میں شکیب حرکت میں آجائے گا۔ اس وقت بھی اس کی کار تمہارے گھر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اگر تم نے کوئی ایسی ویسی حرکت کرنا چاہی میرے ساتھ تو پھر شکیب حرکت میں آجائے گا۔ اسے صرف ایک گھنٹے انتظار کرنا ہے میرے باہر نکلنے کا اور ابھی ایک گھنٹا ہونے میں کافی دیر ہے۔ ہم اس سے پہلے یہاں سے چلے جائیں گے۔''

اب نجیب خان اور الماس کے چہرے سفید پڑ چکے تھے۔ اس دوران میں الماس نادر تو کچھ بول ہی نہیں سکی تھی۔

''ریشماں!'' عارف نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''چلو گی نا میرے ساتھ؟''

ریشماں کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ وہ تیزی سے قریب آئی۔ انداز کچھ ایسا تھا جیسے عارف کے قدموں میں گر پڑے گی لیکن عارف نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اپنے قریب صوفے کے ہتھے پر بٹھا لیا۔ ''میری چھوٹی سی پیاری سی بہن! اب تمہیں رونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تمہاری زندگی میں صرف خوشیاں بکھریں گی۔ بڑی دھوم دھام سے شادی کروں گا میں اپنی بہن کی۔''

اس وقت یاسمین کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔

عارف نے لاکٹ پھر اسے پہنا دیا۔ ٹیپ ریکارڈر اٹھا کر اپنی جیب میں رکھا اور نجیب خان کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجہ میں بولا۔ ''اب ہمیں اجازت ہے ماما صاحب!''

نجیب خان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا۔

عارف پھر بولا۔ ''یہ تم دونوں کی خوش قسمتی ہے کہ میں اپنی بیوی کی بدنامی نہیں چاہتا، ورنہ تم دونوں کو جیل میں سڑنا پڑتا۔''

پھر وہ یاسمین کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہوگیا۔

''ریشماں کو تم سنبھالو۔'' عارف نے اس سے کہا۔

ریشماں ابھی تک روئے جارہی تھی۔

''اور ہاں!'' عارف پھر نجیب خان کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ہمارے جاتے ہی تم اپنی بیوی رانی بیگم کو تو فون کرہی دو گے کہ کھیل ختم ہوچکا ہے۔ اس کے بعد وہ بھی فرار ہی کا راستہ تلاش کرے گی۔ اس کے غائب ہوجانے سے میرے والد پریشان ہوسکتے ہیں لیکن میں انہیں بتادوں گا کہ اس سے ان کی شادی ہوئی ہی نہیں تھی کیونکہ وہ تمہاری بیوی ہے۔ ساری تفصیلات میں ان کو بہرحال نہیں بتاؤں گا۔ میں اپنی محبوب بیوی کو ان کے سامنے ایکسپوز نہیں کرسکتا۔''

اس کے بعد بھی نجیب خان کے منہ سے کچھ نہ نکلا۔ الماس نادر پہلے ہی خاموش تھی۔

عارف، یاسمین اور ریشماں کے ساتھ بیرونی دروازے سے باہر نکل گیا۔ نجیب خان اور الماس نادر بے بسی سے انہیں جاتے دیکھتے رہے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے۔ ان کے دماغ میں اس وقت یہ خیال ضرور ہوگا کہ ان کی جان تو بچی!



زخمی محبت

ایچ اقبال

معاشرے کی ناہمواریوں سے عبارت ایک سبق آموز اور عبرت اثر کہانی

زندگی کی شاہراہ نہایت پیچ پیچ اور دشوار ہے۔ یہاں قدم قدم پر پُرفریب پھندے اور ہر گام پر ایک نیا سراب نظر آتا ہے انسان کے حالات اسے اکثر ان پھندوں اور سرابوں کا شکار بناتے ہیں۔ یہ بھی ایسی ہی لڑکی کی کہانی ہے جو کٹی پتنگ کی طرح زندگی کے اونچے نیچے رستوں پر بھٹک رہی تھی کہ اچانک اس پر محبت کا حبالہ بھی آگرا۔

حُسنہ بی اے فائنل ایئر کی طالبہ تھی۔ کالج کی چھٹی ہوئی تو وہ کسی نہ کسی بہانے رکی رہی اور جب اسے یقین ہو گیا کہ کالج کی ساری لڑکیاں جا چکی ہوں گی تو وہ کالج سے نکلی، پھاٹک کے باہر سناٹا چھایا ہوا تھا اور وہ چاہتی بھی یہی تھی کہ جب وہاں سناٹا ہو جائے تو وہ باہر نکلے۔ دائیں جانب ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر بس اسٹاپ تھا لیکن وہ محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد بائیں جانب چل پڑی۔ اسکول کے بعد ایک عمارت تھی جس کے بعد ایک پتلی سی گلی تھی۔ وہ اسی گلی میں مڑ گئی۔ دو منٹ میں ہی گلی پار کر کے وہ ایک کشادہ سڑک پر پہنچ گئی جہاں ٹریفک رواں تھا۔ کچھ گاڑیاں فٹ پاتھ سے لگی کھڑی ہوئی تھیں۔ حسنہ نے ان گاڑیوں میں ایک گاڑی کو پہچان لیا اور تیزی سے اس کے قریب پہنچ گئی۔

اس کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے خوبرو شخص کی عمر حسنہ سے دس سال زیادہ معلوم ہوتی تھی لیکن وہ اپنی دلکش شخصیت کی وجہ سے کسی بھی لڑکی کی توجہ کا مرکز بن سکتا تھا۔ وہ حسنہ کے بیٹھتے ہی کار حرکت میں لے آیا۔

"تمہیں زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑا شیراز؟" حسنہ نے پوچھا۔

"نہیں۔" شیراز نے جواب دیا "میں بس پانچ منٹ پہلے آیا تھا مگر یہ پانچ منٹ میں نے اتنی بے چینی سے گزارے کہ اتنی بے چینی مجھے کبھی نہیں ہوئی تھی۔"

"کیوں؟"

"تم نے وعدہ کیا تھا کہ آج مجھے اپنے کسی فیصلہ کن اقدام کی خوش خبری سناؤ گی۔"

حسنہ نے ٹھنڈی سانس لی "میں تمہیں کوئی خوش خبری نہیں سنا سکوں گی شیراز۔ یقین کرو۔ دو دن سے میں پوری کوشش کرتی رہی ہوں کہ اگر پاپا سے نہیں تو ممی سے ہی بات کر لیتی لیکن مجھے ہمت نہیں ہو سکی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہم ہمیشہ یونہی چھپ چھپ کر ملتے رہیں گے۔" شیراز نے سنجیدگی سے کہا "اور ہمیشہ بھی کیوں؟ تمہیں اپنے والدین سے میرے بارے میں بات کرنے کی ہمت نہیں ہو سکے گی اور کسی دن تمہاری شادی کسی اور سے ہو جائے گی۔"

"ایسی باتیں نہ کرو شیراز۔" حسنہ کی آواز کچھ رُندھ گئی۔ "اب میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی کہ میری زندگی تمہارے بغیر گزرے۔"

"اگر تم ہمت نہیں کر سکو گی اور مجھے اپنے والدین سے ملنے نہیں دو گی تو پھر کسی دن ایسا ہی ہو گا۔"

"تمہارے ملنے سے تو بات بالکل ہی بگڑ جائے گی شیراز۔ تم میرے والد کے مزاج سے واقف نہیں ہو۔ وہ اس کے بہت سخت خلاف ہیں کہ کسی بھی لڑکی کی شادی اس سے دس سال بڑے لڑکے سے ہو پھر میں تو ان کی اپنی بیٹی ہوں۔ وہ میرے لیے کسی ایسے شوہر کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں جو مجھ سے چار سال، یا زیادہ سے زیادہ پانچ سال بڑا ہو۔"

"ابھی تم کہہ چکی ہو کہ میرے سوا کسی سے شادی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتیں اور میرا بھی یہی حال ہے کہ تمہارے بغیر میری زندگی ویران ہو جائے گی لیکن تم میں اپنے والدین سے بات کرنے کی ہمت نہیں اور ان سے میری ملاقات تم چاہتی نہیں ہو پھر آخر نتیجہ کیا نکلے گا؟"

"مجھے ایک راستہ سوجھا ہے شیراز۔ میرے بھائی جان مجھے بہت چاہتے ہیں اور بھابی جان سے تو میری بہت بے تکلفی ہے۔ بھائی جان کے سوچنے کا انداز بھی پاپا سے بہت

مختلف ہے۔ میں اپنے دل کی بات بھابی جان کو بڑی آسانی سے بتاسکتی ہوں۔ وہ بھائی جان سے بات کرلیں گی اور بھائی جان پھر مجھ سے بات ضرور کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے بعد وہ کسی نہ کسی طرح پاپا کو میری اور تمہاری شادی کے لیے تیار کرلیں گے۔"

"تم شاید بتا چکی ہو کہ تمہارے بھائی جان کراچی میں رہتے ہیں۔"

"ہاں۔" حسنہ نے کہا "اپنی شادی کے ایک سال بعد ہی وہ لاہور سے چلے گئے تھے۔ کراچی میں ان کو بہت اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ وہاں ان سے میری بات چیت اس لیے بھی زیادہ مناسب نہیں رہے گی کہ تم بھی کراچی میں رہتے ہو۔ مجھ سے بات کرنے کے بعد بھائی جان تم سے مل بھی لیں گے۔ تم کراچی کب جارہے ہو؟"

"اس مرتبہ مجھے ایک کام کی وجہ سے جلدی جانا تھا لیکن تمہارے جواب کی وجہ سے میں رکا رہا۔ اب آج تمہارا کالج بھی بند ہوگیا ہے۔ جب تک کالج کی چھٹیاں ختم نہیں ہوجاتیں، تم سے ملاقات کا امکان بھی نہیں رہا اس لیے اگر مجھے آج کوئی فلائٹ مل گئی تو آج ہی چلا جاؤں گا۔"

"میں بھی دو ایک دن میں ہی کراچی پہنچوں گی۔ جب مجھے پاپا سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہوسکی تھی تو میں نے کل ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ کراچی جاکر بھابی جان سے بات کروں گی۔ میں نے پاپا اور ممی سے بات کرلی ہے۔ دو ایک دن میں بھائی جان اور بھابی جان کی شادی کی سالگرہ ہے۔ اس میں شرکت کے بہانے سے مجھے پاپا سے کراچی جانے کی اجازت بھی مل گئی ہے۔ اسے بھی خوش قسمتی کہا جاسکتا ہے کہ آج سے چھٹیاں شروع ہوگئی ہیں۔ اگر کالج بند نہ ہوجاتا تو مجھے کراچی جانے کی اجازت ہرگز نہیں ملتی۔"

"کتنے دن رکوگی وہاں؟"

"اجازت تو بس ایک ہفتے کی ملی ہے۔"

"کیا وہاں ہماری ملاقاتیں ہوسکیں گی؟"

"بہت آسانی سے۔" حسنہ نے مسکرا کر کہا "یہاں میں جتنی پابندیوں میں رہتی ہوں، اتنی پابندیاں وہاں نہیں ہوں گی۔"

"یہ میرا کارڈ رکھ لو۔ کراچی پہنچتے ہی مجھے فون کردینا۔" شیراز نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر حسنہ کی طرف بڑھا دیا۔



توصیف کی عمر پینتالیس سال سے کچھ زیادہ تھی۔ اس کی شادی کو بیس سال گزر چکے تھے۔ اس کی ایک جوان لڑکی بھی جس کی وہ شادی کرچکا تھا۔ اس سے چھوٹا ایک آٹھ سال کا لڑکا تھا جو اپنے اسکول کے ہاسٹل میں رہتا تھا۔ توصیف اور اس کی بیوی عائشہ بالکل نہیں چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا ہاسٹل میں رہے لیکن لاڈلے بیٹے کی ضد کے سامنے ان دونوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ دونوں میاں بیوی یہ کبھی نہیں سمجھ سکے تھے کہ ان کے بیٹے کو ہاسٹل میں رہنے کا شوق کیوں ہوا تھا۔

توصیف کی مصروفیت کچھ ایسی تھی کہ اس کی بیوی عائشہ نے وقت گزاری کے لیے ایک بیوٹی پارلر کھول لیا تھا اسی لیے اگر توصیف کبھی جلدی گھر آجاتا تو تنہائی اسے کاٹنے کو دوڑنے لگتی تھی۔ گھر میں ایک بوڑھی ملازمہ ہر وقت رہا کرتی تھی لیکن گھر کا کوئی ملازم گھر کے مالک کی تنہائی کا ازالہ نہیں کرسکتا۔ ملازمہ بھی ایسی تھی جسے کم سنائی دیتا تھا۔ توصیف کو پیاس بھی لگتی تھی تو وہ چیخ چلا کر ملازمہ کو بلانے کے بجائے خود ہی اٹھ کر پانی پی لیا کرتا تھا۔ اس معاملے میں کبھی کبھی عائشہ سے نوک جھوک ہوجاتی تھی لیکن عائشہ کا کہنا تھا کہ گھر میں رہنے والا ملازم تھوڑا سا بہرا ہو تو گھر کی کوئی بات اس کے کانوں میں نہیں جاپاتی۔ عائشہ کے اس نظریے پر توصیف کو تھوڑی سی ہنسی بھی آجاتی تھی اس لیے اس نوک جھوک کی وجہ سے کبھی تلخی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

ایک روز عائشہ کو بیوٹی پارلر میں کچھ دیر ہوگئی۔ اس نے کئی اچھی لڑکیاں ملازم رکھ لی تھیں اس لیے عموماً چھ بجے تک گھر لوٹ آتی تھی لیکن اس روز توصیف گھر پہنچا تو عائشہ موجود نہیں تھی۔ توصیف کو پہلے یہ کوفت ہوئی کہ پانچ مرتبہ کال بیل بجانے کے بعد دروازے میں ملازمہ کی صورت نظر آئی تھی اور پھر اس نے توصیف کو دیکھ کر جلدی سے آگے بڑھ کے پھاٹک کھولا تھا۔ اس کے بعد دوسری کوفت توصیف کو یہ ہوئی کہ عائشہ ابھی بیوٹی پارلر سے نہیں لوٹی تھی۔

"جاؤ، پھاٹک میں خود بند کرلوں گا۔" توصیف نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا اور پھر ہاتھ سے بھی ملازمہ کو جانے کا اشارہ کیا۔

ملازمہ دروازے کی طرف لوٹ گئی۔

توصیف پھاٹک کو تھوڑا سا اور کھول کر اندر داخل ہوا، پھر پھاٹک بند کرنے کے لیے پلٹا تو چونک پڑا۔

پھاٹک کے باہر کھڑے ہوئے آدمی کی وضع قطع کچھ ایسی تھی کہ اگر وہ کسی کو اندھیرے میں دکھائی دیتا تو ڈرا ہی دیتا۔ اس کی داڑھی مونچھیں زیادہ بڑی تو نہیں تھیں لیکن ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے اس نے آٹھ دس دن سے شیو نہ بنایا ہو۔ سر پر اگر زیادہ بال ہوتے تو شاید وہ بھی بکھرے ہوئے ہوتے لیکن قدرتی طور پر اس کے سر کے بال بہت کم تھے اور سر کے دائیں حصے کے بال تو خاصے اڑے ہوئے تھے۔ اس کی

آنکھیں اتنی سرخ ہو رہی تھیں جیسے ان میں خون اتر ہوا ہو۔ اس کے کپڑے بھی نہایت میلے کچیلے تھے۔ کوٹ کی حالت تو ایسی تھی جیسے اس پر کبھی استری کی نوبت نہ آئی ہو۔

اس کے چہرے پر ایسی وحشت تھی کہ وہ کوئی دیوانہ معلوم ہو رہا تھا مگر اس کے باوجود توصیف کو وہ چہرہ کچھ شناسا سا معلوم ہوا۔

وہ پلکیں جھپکائے بغیر توصیف کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "تم توصیف ہو نا؟"

"ہاں۔" توصیف نے اسے پہچاننے کے لیے اپنے دماغ پر زور ڈالا' پھر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کے منہ سے نکلا "سلارزی!"

اس وقت توصیف کا ذہن اتنا بُری طرح منتشر تھا کہ اسے سلارزی کا پورا نام یاد نہیں آسکا۔ وہ پشاور کا رہنے والا تھا۔ اس کے آباؤ اجداد افغانی تھے اس لیے اس کا نام خاصا لمبا اور اتنا ثقیل تھا کہ اسکول میں بھی سب لڑکے اسے صرف سلارزی کہا کرتے تھے۔

پشاور سے سلارزی کے والدین لاہور جا بسے تھے۔ وہاں سے انہوں نے سلارزی کو میٹرک کرنے کے لیے کراچی بھیجا تھا۔ یہ تیس سال پہلے کی بات تھی۔ میٹرک کرکے سلارزی واپس لاہور چلا گیا تھا۔

اسکول کی دو سالہ رفاقت گہری دوستی کی بنیاد کم ہی بنتی ہے لیکن چند لڑکوں سے اس کی شناسائی بہرحال رہی۔ انہی لڑکوں میں سے ایک توصیف بھی تھا۔ چند سال بعد وہ لاہور گیا تو اس نے سلارزی سے ملاقات کی تھی۔ پچیس سال کی عمر میں سلارزی کی شادی ہوئی تھی تو اس نے توصیف کو مدعو کیا تھا۔ لاہور کی تفریح کرنے کے شوق میں توصیف نے سلارزی کی شادی میں بھی شرکت کرلی تھی پھر ایک سال بعد توصیف کی شادی ہوئی تو اس کی دعوت پر سلارزی اپنی بیوی کے ساتھ کراچی آیا تھا۔ اس طرح ان دونوں کے تعلقات میں کچھ توانائی آئی تھی لیکن زندگی کی مصروفیات اور دونوں شہروں کے فاصلے کے باعث ان کی زیادہ ملاقاتیں نہ ہوسکیں۔ بس کبھی کبھار خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ چار سال پہلے سلارزی آخری مرتبہ اس وقت کراچی آیا تھا جب توصیف کی بیٹی کی شادی ہوئی تھی۔ اس مرتبہ وہ تنہا آیا تھا حالانکہ دو بیٹیوں کا باپ بھی بن چکا تھا۔ توصیف نے اس سے شکایت بھی کی تھی کہ وہ بیوی بچیوں کو ساتھ کیوں نہیں لایا تو اس کا سبب اس نے اپنی بیوی کی بیماری بتائی۔ دونوں بیٹیاں بھی ماں کو بیمار چھوڑ کر نہیں آسکتی تھیں اس لیے سلارزی اکیلا ہی آگیا تھا۔

اس کے بعد اچانک توصیف کو ایک ٹریننگ کے سلسلے میں دو سال کے لیے بیرونِ ملک جانا پڑ گیا۔ اس نے سلارزی کو بذریعہ خط اس کی اطلاع دے دی تھی لیکن جواب کا انتظار نہیں کرسکا تھا۔ دو سال بعد واپس آکر اس نے اپنی بیوی سے سلارزی کے خط کے بارے میں پوچھا تو اسے معلوم ہوا کہ سلارزی نے کوئی خط نہیں بھیجا تھا۔ توصیف نے بذریعہ خط فوراً سلارزی کو اطلاع دی کہ وہ ٹریننگ لے کر واپس آگیا ہے۔ ایک ہفتے بعد اسے جواب ملا لیکن جواب دینے والا سلارزی نہیں تھا۔

"ہم اس گھر میں کرائے پر رہتے ہیں توصیف صاحب جہاں سلارزی صاحب رہا کرتے تھے۔" جواب دینے والے نے لکھا تھا "آپ کا خط ہمارے ایک بچے نے کھول کر پڑھ لیا تھا۔ ڈاکیے نے بھی یہ غلطی کی تھی کہ سلارزی صاحب کا نام پڑھے بغیر صرف پتا دیکھ کر لفافہ ہمارے گھر میں ڈال گیا تھا اسی لیے ہمیں وہ خط پڑھنے کا موقع ملا۔ خط کی عبارت سے اندازہ ہوا کہ آپ سلارزی صاحب کے کوئی دوست ہیں جو سلارزی صاحب کے حالات سے بے خبر ہیں اسی لیے ہم نے اپنا اخلاقی فرض سمجھا ہے کہ آپ کو حالات سے آگاہ کردیں۔ ہمیں زیادہ کچھ تو نہیں معلوم کیونکہ ہم اس مکان میں صرف ڈیڑھ سال سے ہیں جبکہ سلارزی صاحب یہاں ساڑھے تین سال پہلے رہا کرتے تھے۔ اپنی بیوی کی علالت کی وجہ سے اپنی ایک بیٹی کی شادی بڑی عجلت میں کردی تھی اور دوسری بیٹی کی بھی شادی کرنا چاہتے تھے کہ ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ دوسری بیٹی کو انہوں نے اپنے کسی عزیز کے پاس کسی اور شہر بھیج دیا۔ غالباً وہ اپنی جوان لڑکی کو اپنے اس گھر میں نہیں رکھنا چاہتے ہوں گے جہاں کوئی اور عورت نہیں تھی پھر کچھ دن بعد سلارزی صاحب پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ شاید ابتدا میں تو انہوں نے اپنی بیوی کی موت پر ضبط سے کام لیا تھا لیکن پھر ان کا ضبط جواب دے گیا۔ پاگل پن کے دورے شدید سے شدید تر ہوتے چلے گئے۔ وہ لوگوں پر حملے بھی کرنے لگے تھے۔ آخر پولیس نے انہیں گرفتار کرلیا۔ اس کے بعد انہیں کسی دماغی اسپتال میں داخل کردیا گیا تھا یا سرکاری پاگل خانے بھیج دیا گیا تھا۔ اب ہمیں اس کا علم نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔"

اس جواب کو پڑھ کر توصیف کو بہت رنج ہوا تھا۔ اس نے لاہور پولیس سے رابطہ کرکے اس معاملے کی چھان بین کی تو اسے معلوم ہوا تھا کہ سلارزی واقعی پاگل خانے میں تھا۔

تین ماہ پہلے توصیف نے پاگل خانے کے ڈاکٹر سے ٹیلی فون پر بات کی تھی تو ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ سلارزی کی حالت پہلے سے کافی بہتر تو ہوگئی تھی لیکن وہ بالکل ٹھیک نہیں ہوا تھا۔

اور اب اچانک توصیف نے سلارزی کو اپنے سامنے پایا۔



"یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟" توصیف نے اسے نیچے سے اوپر تک دیکھا۔

سلارزی نے اس طرح نظریں جھکا کر اپنا جائزہ لیا جیسے خود اسے اپنی حالت کا کچھ علم نہ ہو۔

اگر سلارزی عام حالات میں میرے سامنے آیا ہوتا تو میں اس سے بڑی گرم جوشی سے ملتا۔ اسے فوراً اپنے گھر میں لے جاتا لیکن اس وقت سلارزی کی حالت دیکھ کر مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ وہ پاگل خانے سے کہیں بھاگ تو نہیں آیا؟ اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں وحشت سی تھی۔

"میں ٹھیک تو ہوں۔" وہ توصیف کی بات کے جواب میں بولا۔ اس کی آواز کچھ بلغمی سی تھی۔ ایسا معلوم ہوا تھا جیسے اس کا سینہ جکڑا ہوا ہو۔ اس نے کچھ رک کر کہا "مجھے کہیں سونے کی جگہ مل سکتی ہے توصیف؟ میں تین دن سے سو نہیں سکا ہوں۔"

اوہ، توصیف نے سوچا تو اس لیے اس کی آنکھیں اتنی سرخ ہیں؟ اس نے پوچھا "یہ تین دن تم نے کہاں گزارے ہیں؟"

"تمہارے ہی شہر میں ہوں۔" سلارزی کی آواز کھرکھرا رہی تھی "رات کو کسی جگہ فٹ پاتھ پر لوگ سوتے نظر آتے تھے تو انہی کے قریب لیٹ جاتا تھا لیکن آدھی رات کے بعد سردی اتنی ہو جاتی تھی کہ سو نہیں پاتا تھا۔"

اب توصیف کی سمجھ میں آیا کہ کھلے آسمان تلے سردی میں رات گزارنے کی وجہ سے ہی سلارزی کا سینہ جکڑ گیا تھا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟" توصیف نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑا "اوہ.... ! تمہیں تو حرارت معلوم ہو رہی ہے۔"

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔ بس سویا نہیں ہوں۔"

اس کی حالت کی وجہ سے توصیف کا دل بھر آیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سلارزی اسے کبھی اتنے مفلوک الحال میں ملے گا۔ اس کی چند باتوں سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ عدم دماغی توازن کا شکار نہیں تھا۔ بس تکلیفوں میں وقت گزارتے گزارتے اس کی حسیات کچھ مردہ ہو گئی تھیں یا مردہ ہونے لگی تھیں۔

"میرے ساتھ آؤ۔" توصیف اسے پھاٹک سے اندر لایا تو اس نے دیکھا کہ سلارزی کی پیٹھ کی طرف ایک خاکی تھیلا تھا جو اس نے اپنے شانے سے لٹکا رکھا تھا۔

توصیف نے اسے کمرے میں لے جا کر بٹھایا "تم شاید بھوکے بھی ہو۔"

اس نے جواب دینے کے بجائے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "یہ شاید تمہارا ڈرائنگ روم ہے۔ کیا کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں میں سو سکوں؟"

"میں ابھی تمہیں ایک کمرے میں لے چلتا ہوں۔ اس میں باتھ روم بھی ہے۔ تم نہا دھو لینا۔ تمہارے لیے میں اپنے کپڑے بھی نکال دوں گا۔ باتھ روم میں تمہیں شیو کا سامان بھی مل جائے گا۔"

"نہیں۔" اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا "میں اسی طرح رہنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"مجھے پہچاننے میں تمہیں دیر لگی تھی نا؟"

"ہاں۔"

"بس یہی ضروری ہے۔"

"کیوں؟"

"میں سونا چاہتا ہوں توصیف!" اس نے توصیف کا سوال نظر انداز کر دیا۔

"اچھا آؤ۔" توصیف نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر تم نہا دھو کر اپنا حلیہ تبدیل نہیں کرو گے تو میں تمہاری بھابی کو کیا بتاؤں گا؟ ابھی تو وہ گھر میں نہیں ہے لیکن آتی ہی ہوگی۔"

"مجھے ان کے سامنے مت لانا۔ میں کل صبح چلا جاؤں گا۔"

"کہاں چلے جاؤ گے؟"

"کہیں بھی۔" سلارزی نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔

"بے تکی باتیں نہ کرو۔ اب تم میرے پاس ہی رہو گے۔"

"تمہیں پریشانی ہوگی توصیف! میں گھر سے نہ جانے کب نکلوں اور کب لوٹوں۔"

"مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔" توصیف اسے لیے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ "اس کمرے کا ایک دروازہ باہر کی طرف بھی کھلتا ہے۔ تم جب چاہو آ جا سکتے ہو۔ بس قفل لگا جایا کرنا۔ یہاں تم اب آرام کرو۔ میں تمہارے کھانے کے لیے کچھ لاتا ہوں۔"

سلارزی کچھ نہیں بولا۔

توصیف جلدی سے باورچی خانے میں گیا۔ اس وقت تک ملازمہ نے کھانا تیار نہیں کیا تھا۔ توصیف نے اس سے انڈے تلوائے اور ایک ٹرے میں ڈبل روٹی رکھ کر سلارزی کے پاس لے گیا۔ اسے پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے

لیکن سلارزی اتنی ہی دیر میں گہری نیند سو چکا تھا۔ توصیف ٹھنڈی سانس لے کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ یقیناً تین دن سے نہیں سویا تھا۔ توصیف نے فیصلہ کیا کہ اسے کھانے کے لیے نہ جگائے تو بہتر ہے۔ جس شخص کو نیند نہ مل سکی ہو' اس کے لیے بھوک کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

توصیف نے کمرے سے نکل کر آہستگی سے دروازہ بند کیا۔ ٹرے واپس باورچی خانے میں لے جا کر رکھ دی اور تیزی سے بیڈ روم میں جا کر ٹیلی فون سنبھالا۔

سلارزی کو جس پاگل خانے میں بھیجا گیا تھا' وہاں کا نمبر اسے معلوم تھا کیونکہ وہاں وہ پہلے بھی فون کر چکا تھا۔ اس وقت اس نے وہاں اس لیے فون کیا کہ سلارزی کے بارے میں کچھ معلوم کر سکے۔ شام ہو جانے کی وجہ سے یہ اندیشہ تو تھا کہ شاید ٹیلی فون پر کوئی ذمّے دار آدمی نہ مل سکے لیکن توصیف نے کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا تھا۔ اس کی وہ کوشش رائگاں بھی نہیں گئی۔ وہاں سے کسی نے بتایا کہ سلارزی کی دماغی حالت ٹھیک ہو جانے کے بعد اسے ایک ماہ قبل پاگل خانے سے چھٹی دے دی گئی تھی۔

یہ بات توصیف کے لیے خاصی باعث اطمینان ثابت ہوئی کہ سلارزی کی دماغی حالت ٹھیک ہو چکی تھی لیکن اس کا دماغ اس سوال میں ضرور الجھا کہ سلارزی اتنے دن تک کہاں رہا تھا۔

عائشہ کے قدموں کی آہٹ سن کر توصیف چونکا۔

"آ گئے آپ؟" وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی تھی "ملازمہ نے بتایا ہے کہ آپ کا کوئی دوست بھی آیا ہے۔"

"ملازمہ نے اسے دیکھا تھا؟" توصیف نے جلدی سے پوچھا۔

"نہیں۔ بس آہٹ سنی تھی۔ آپ اس کے لیے انڈے....."

"بیٹھو۔" توصیف نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "جب میں اس کے لیے انڈے ڈبل روٹی لے کر گیا تو وہ سو چکا تھا۔ نیند سے اس کی حالت بہت غیر تھی۔ تم اسے دیکھتیں تو بڑی مشکل سے پہچان پاتیں۔"

"ایسا کون ہے؟"

"سلارزی۔"

"ارے! سلارزی بھائی؟ کہاں ہیں وہ۔"

"بتایا تو ہے کہ وہ سو چکا ہے۔ بڑی عجیب حالت میں آیا ہے وہ۔"

توصیف نے بڑی تفصیل سے اپنی بیوی کو سب کچھ بتا دیا۔ پاگل خانے سے ملی ہوئی اطلاع سے بھی آگاہ کر دیا۔

عائشہ نے متفکر لہجے میں کہا "جب ان کی دماغی حالت ٹھیک ہو چکی ہے تو وہ ایسی حالت میں کیوں ہیں؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ اب تو جب وہ بیدار ہو گا' تبھی اس سے باتیں ہو سکیں گی اور اسی سے معلوم ہو سکے گا کہ وہ پاگل خانے سے نکلنے کے بعد کہاں کہاں رہا ہے اور کس قسم کے حالات سے دو چار رہا ہے۔"

"وہ اپنا حلیہ ٹھیک کیوں نہیں کرنا چاہتے؟"

"شاید وہ چاہتا ہے کہ یہاں اس کا کوئی جاننے والا اسے پہچان نہ سکے۔"

"ایسا کیوں؟"

"میں تمہیں تفصیل سے سب کچھ بتا تا ہوں۔ ان باتوں سے اگر تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آ سکا تو میری سمجھ میں کیسے آیا ہو گا۔"

"نہ جانے کیا گزری ہے بے چارے پر۔" عائشہ نے ٹھنڈی سانس لی۔

"میں اس کی بیٹیوں کے بارے میں بھی سوچ رہا ہوں۔ ہمیں جو خط ملا تھا' اس میں یہی لکھا تھا نا کہ بڑی بیٹی کی تو اس نے شادی کر دی تھی اور بیوی کے انتقال کے بعد دوسری کو کہیں بھیج دیا تھا۔"

"شاید بڑی بیٹی کے پاس بھیجا ہو۔"

"وہ بہت کھرا پٹھان ہے۔ کنواری بیٹی کو داماد کے گھر نہیں بھیج سکتا۔"

توصیف اور عائشہ بہت دیر تک سلارزی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

○☆○

سلارزی شام کا سویا سویا دوسرے دن دس بجے اٹھا۔ اس کی وجہ سے توصیف نے اپنے دفتر سے چھٹی کر لی تھی۔ وہ سلارزی کی بیداری کے انتظار میں اس کے بستر کے قریب کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھتا رہا تھا۔ عائشہ دو ایک مرتبہ دروازے سے جھانک کر چلی گئی تھی۔

جاگنے کے بعد بھی سلارزی کی آنکھیں سرخ ہی نظر آئیں۔ توصیف کو اس پر تعجب ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ اتنی طویل نیند لینے کے بعد آنکھوں کی گہری سرخی اگر ختم نہ ہو سکی تو بھی کم ضرور ہو جائے گی۔

"تم نہا لو تو میں تمہارے لیے ناشتا لے آؤں۔" توصیف نے کہا۔

"نہیں۔" سلارزی آہستہ سے بولا "میں بس کلّی کر کے منہ دھولوں گا۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔"

سلارزی اٹھ کر باتھ روم کی طرف گیا تو اس کی ٹانگوں

تھی۔ توصیف کی دانست میں اس کی سب جسمانی کمزوری ہو سکتی تھی۔ سلارزی نے شاید کئی وقت سے کھانا نہیں کھایا تھا۔

جب سلارزی نے ناشتا کیا تو توصیف کے شبہے کی تصدیق بھی ہو گئی۔ وہ تلے ہوئے انڈوں سے پوری ڈبل روٹی کھا گیا تھا۔

"کیا اور لاؤں؟" توصیف نے اس سے پوچھا۔

"نہیں۔" سلارزی شاید دھیمے لہجے میں بولنے کا عادی ہو گیا تھا "بس اب چائے پیوں گا۔"

"میں تو ناشتا کر چکا ہوں لیکن چائے تمہارے ساتھ بھی پی لوں گا۔" توصیف نے کہا اور دو پیالیوں میں چائے بنانے لگا۔

سلارزی کھوئے کھوئے سے انداز میں پیالیوں کی طرف دیکھتا رہا۔

"کل تم نے بتایا تھا کہ تین دن سے فٹ پاتھوں پر لیٹتے رہے ہو۔" توصیف نے کہا "پہلے ہی دن میرے پاس کیوں نہیں آ گئے تھے؟"

"میں آنا چاہتا تھا لیکن تمہارا گھر یاد نہیں آ رہا تھا۔"

"جیب میں پیسے کتنے ہیں؟"

"پیسے تو بالکل نہیں ہیں۔" سلارزی نے توصیف کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"تین دن تک کھانا کہاں سے کھایا؟"

"مجھے جگہ کا نام تو نہیں معلوم۔ نہاری کا ایک ہوٹل ہے وہاں۔ اس کے سامنے ہیرونچیوں اور فقیروں کا مجمع رہتا ہے۔ پیسے والے لوگ انہیں کھانا کھلا جاتے ہیں۔ انہی کے ساتھ میں بھی کھا لیا کرتا تھا۔"

توصیف نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "دوپہر کو بھی وہیں کھاتے تھے؟"

"نہیں۔" سلارزی نے جواب دیا "دن بھر تو میں اِدھر اُدھر پھرتا رہتا تھا۔"

"دن بھر بھوکے رہتے تھے؟"

"ہاں۔" سلارزی نے اس طرح جواب دیا جیسے دن بھر بھوکا رہنا کوئی خاص بات نہ ہو۔

"لیکن تمہاری یہ حالت ہوئی کیسے سلارزی۔" توصیف نے دکھی لہجے میں پوچھا "میں تمہارے حالات سے زیادہ بے خبر نہیں رہتا لیکن مجھے ایک ٹریننگ کے سلسلے میں دو سال کے لیے ملک سے باہر رہنا پڑا تھا۔ واپس آکر میں نے تمہیں ایک خط لکھا تو مجھے ایک صاحب نے جواب میں لکھا کہ وہ تمہارے مکان میں کرائے پر رہتے ہیں۔ اسی خط میں

توصیف نے وہ سب کچھ بتا دیا جس کا علم اسے خط سے ہوا تھا۔ سلارزی وہ سب کچھ خاموشی سے سنتا رہا، پھر سر ہلا کر بولا "ہاں۔ یہ سب ٹھیک ہے۔ ایک مہینے پہلے تک علاج ہوا ہے میرا پھر انہوں نے مجھے رخصت کر دیا۔"

"اتنے دن تک تم کہاں رہے؟"

"میں اسی دن کراچی آنے کے لیے ٹرین میں سوار ہو گیا تھا لیکن پکڑا گیا۔ میرے پاس ٹکٹ نہیں تھا۔ کچھ دن پولیس کی قید میں رہا۔ انہوں نے چھوڑا تو میں پھر ٹرین میں سوار ہو گیا۔ ٹکٹ کے پیسے میرے پاس تھے ہی نہیں لیکن اس مرتبہ میں پکڑا نہیں گیا اور کراچی پہنچ گیا۔"

"تم اپنے کرائے داروں سے کچھ رقم نہیں لیتے تھے؟"

"وہ میرے کرائے دار نہیں ہیں۔ وہ [illegible] ہے۔"

"لیکن جب تم نے مکان بدل کر مجھے [illegible] لکھا تھا اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ تم [illegible] لیا ہے۔"

"میں نے غلط لکھا تھا۔ میں [illegible] چاہتا تھا کہ میری مالی حالت اچانک بالکل تباہ ہو گئی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مکان بیچ کر اس رقم سے لڑکیوں کی شادی کر دوں [illegible] کے مکان میں جا کر جب میں نے پہلی بیٹی کی شادی کی تھی تو چند دن پہلے مجھے تمہارا وہ خط ملا تھا جس میں تم نے اطلاع دی تھی کہ ٹریننگ کے لیے باہر جا رہے ہو۔ اس کے بعد میری بیوی کی حالت اتنی تیزی سے بگڑنے لگی کہ میں حواس باختہ ہو گیا۔ بیوی کے مرنے کے بعد میں نے شیریں کو کہیں اور بیاہ دیا تھا۔ غم سے میں بہت نڈھال تھا توصیف۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ مجھے اب بھی یاد نہیں ہے۔ وہ سب کچھ مجھے لوگوں سے معلوم ہوا۔ میں اپنے گھر گیا تو مجھے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ وہاں اب کچھ اور لوگ رہ رہے تھے۔ میں نے اپنے سامان کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ میں مالک مکان سے ملا تو وہ شریف آدمی مجھ سے بہت اچھی طرح پیش آیا۔ اس نے میرا سامان اپنے گھر میں رکھ لیا تھا۔ اس نے مجھے یہ پیشکش بھی کی کہ میں رہنے کے لیے اس کے گھر کا ایک کمرا لے لوں، بعد میں وہ میرے لیے کسی اور مکان کا بندوبست کر دے گا۔ میں نے اس کی یہ پیشکش قبول نہیں کی۔ مجھے وہاں رہنا ہی نہیں تھا۔ میں نے اپنے سامان میں سے بس یہ کپڑے نکال کر بدلے اور اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ میری خودداری نے یہ گوارا نہیں کیا تھا کہ میں مالک مکان سے کچھ مالی مدد لیتا اس لیے ٹکٹ خریدے بغیر ہی ٹرین

میں سوار ہو گیا اور پکڑا گیا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ میں کتنے دن قید رہا تھا۔ میرے دماغ میں تو بس۔۔۔۔" وہ روانی سے بولتے بولتے ایک دم اس طرح رکا جیسے اچانک بریک لگنے سے گاڑی کو دھچکا لگتا ہے۔

توصیف ہمدردانہ نگاہوں سے سلارزی کی طرف دیکھتا رہا لیکن سلارزی کے انداز سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ بھول ہی گیا ہو کہ وہاں اس کے علاوہ اور بھی کوئی تھا۔

"تمہارے دماغ میں کیا تھا سلارزی؟" توصیف نے پوچھا۔

سلارزی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

توصیف پھر بولا "تم کچھ کہتے کہتے رک گئے تھے۔"

"کیا کہتے کہتے رک گیا تھا؟"

"یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے تھے۔"

سلارزی کچھ دیر سوچتا رہا، پھر سر ہلا کر بولا "مجھے اب یاد نہیں آرہا ہے۔"

"تم کراچی کیوں آئے تھے؟" توصیف نے پوچھا۔

"یہ پھر کبھی بتاؤں گا۔"

توصیف نے جاننے کے لیے اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور بولا "تمہاری پیشانی پر دائیں جانب یہ سرخ سا نشان کیسا ہے۔"

"یہ۔" سلارزی نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھا "ڈاکٹروں نے مجھے بتایا تھا کہ میری کنپٹیوں پر بجلی کے جھٹکے لگائے جاتے تھے۔ میری پیشانی پر بھی اس جگہ دھات کا کوئی ٹکڑا رکھ کر کرنٹ لگایا گیا تھا جس سے یہ نشان بن گیا۔ ان لوگوں سے کوئی غلطی ہوگئی ہوگی جس کا اعتراف انہوں نے نہیں کیا مگر وہ کہہ رہے تھے کہ آہستہ آہستہ یہ داغ مٹ جائے گا۔"

"تم اپنی بیٹیوں سے نہیں ملے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

سلارزی چپ رہا۔ شاید وہ کسی وجہ سے اس بات کا جواب بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔

توصیف نے پوچھا "اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"دن میں تو نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا پھروں لیکن رات کو مجھے اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دے دو۔ میں تمہارا احسان مند رہوں گا۔"

"ایسی بیگانگی کی باتیں نہ کرو۔ یہ تمہارا ہی گھر ہے۔"

"شکریہ توصیف! مجھے اب جانا چاہیے۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

"تم مجھے نہیں بتاؤ گے کہ تمہیں کہاں جانا ہے اس لیے میں پوچھوں گا بھی نہیں، لیکن تمہارے پاس پیسے بالکل نہیں ہیں اس لیے یہ رکھ لو۔" میں نے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

"نہیں۔" سلارزی نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم بہت خوددار پٹھان ہو۔ یہ روپیہ تم قرض سمجھ کر رکھ لو۔"

سلارزی کچھ سوچتا رہا، پھر اس نے صرف ایک نوٹ لے کر کہا "فی الحال یہ کافی ہے میرے لیے۔ ضرورت پڑے گی تو اور لے لوں گا۔ مجھے لاہور جاکے اپنے گھر کا سارا سامان بیچنا پڑے گا۔ مجھے اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ سامان بیچ کر میں تمہارا قرض لوٹا دوں گا۔"

"کیا اسی وقت یہ سب سوچنا ضروری ہے؟"

"نہیں، ضروری تو نہیں ہے۔" سلارزی بڑبڑایا، پھر توصیف کی طرف دیکھ کر بولا "تم نے بھابی کو تو میرے بارے میں نہیں بتایا؟"

"یہ کیسے ممکن ہے سلارزی کہ کوئی یہاں رہے اور میری بیوی کو اس کی خبر نہ ہوسکے۔ بس تمہاری خواہش کے مطابق میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ اس سے تمہارا آمنا سامنا نہ ہو۔ وہ یہ سن کر بہت دکھی ہوئی تھی کہ تم اس حالت میں یہاں پہنچے ہو۔"

"میں اس دروازے سے آیا جایا کروں؟" سلارزی نے پوچھا۔ اس نے توصیف کی باتوں پر دھیان نہیں دیا تھا۔

"ہاں۔" توصیف نے کہا "دراصل یہ کمرا میں نے ایسے مہمانوں کے لیے بنوایا تھا جن سے میرے گھریلو مراسم نہ ہوں۔"

"مجھے باہر سے تالا لگا کر جانا چاہیے۔"

"وہ رکھا ہے تالا۔ اسی میں چابی لگی ہوئی ہے۔"

سلارزی نے تالا چابی اٹھالی۔

"واپسی کب ہوگی؟" توصیف نے پوچھا۔

"رات کو کسی وقت۔"

"اچھا یہ شیشی اپنے تھیلے میں ڈال لو۔ دن میں تین بار پی لیا کرنا۔ تمہارا سینہ جکڑا ہوا ہے۔ اس کی دوا سے تمہاری طبیعت ٹھیک ہوجائے گی۔ کل شام تو تمہیں حرارت تھی لیکن آج نہیں ہے۔ صبح تم سو رہے تھے تو میں نے تمہاری نبض دیکھی تھی۔"

سلارزی نے شیشی اپنے خاکی تھیلے میں ڈالی اور اسے اپنے شانے سے لٹکالیا۔

"تھیلے میں کچھ زیادہ سامان تو شاید نہیں ہے۔ اسے یہیں چھوڑ جاؤ۔"

"نہیں۔" سلارزی نے سوچتے ہوئے کہا "اس میں

میری کچھ ضروری چیزیں ہیں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔" وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

توصیف اسے مغموم نظروں سے دیکھتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے دروازے تک گیا۔



حسنہ نے جہاز سے اترنے کے بعد ائرپورٹ سے بھی اپنے بھائی جبران یا اپنی بھابی غزالہ کو فون پر اپنے پہنچنے کی اطلاع نہیں دی اور ایک ٹیکسی کرکے ائرپورٹ سے روانہ ہوئی۔ وہ کئی مرتبہ کراچی آچکی تھی اور یہاں کے تمام راستوں سے اچھی طرح واقف تھی اس لیے اسے تنہا یہاں آتے ہوئے ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی تھی۔

پینتیس منٹ میں ٹیکسی منزل پر پہنچ کر رکی۔ نارتھ ناظم آباد میں دو سو گز کے پلاٹ پر وہ مکان جبران نے اپنی ہی آمدنی سے بنوایا تھا۔ ایک اچھی سیکنڈ ہینڈ کار بھی خرید لی تھی جو مکان کے سامنے کھڑی رہتی تھی لیکن اس وقت وہ وہاں نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جبران ابھی دفتر سے نہیں آیا تھا لیکن حسنہ کو یہ اندیشہ لاحق نہیں ہوا کہ غزالہ بھی گھر میں نہیں ہوگی۔

"میرا اٹیچی کیس اتار دو۔" حسنہ نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا اور ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے اپنے پرس سے نوٹ نکالنے لگی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے ڈکی سے اٹیچی کیس نکال کر رکھ دیا تو غزالہ روپے ہاتھ میں سنبھالے ہوئے ٹیکسی سے اترنے لگی اور اسی وقت اس کی نظر سامنے کھڑے ہوئے ایک ایسے شخص پر پڑی کہ پل بھر کے لیے اس کے سارے جسم میں خوف سرایت کرگیا۔

حسنہ کو وہ کوئی خطرناک قسم کا پاگل معلوم ہوا تھا۔ اس نے میلی سی قمیص شلوار پر کوٹ بھی ایسا پہن رکھا تھا جس پر سیکڑوں شکنیں تھیں۔ چپل بھی پرانے سے تھے لیکن یہ سب چیزیں کسی بھی غریب شخص کے جسم پر ہوسکتی تھیں۔ حسنہ کے جسم میں خوف سرایت کرنے کا سبب تو اس شخص کا چہرہ تھا۔ بڑھے ہوئے شیو اور بالوں کی بے ترتیبی کے ساتھ اس شخص کی آنکھیں بڑی خوفناک معلوم ہو رہی تھیں۔ حسنہ نے اپنی زندگی میں ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا تھا جس کی آنکھیں اتنی زیادہ سرخ ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بھی لمحے اس کی آنکھوں سے خون کے قطرے ٹپکنے لگیں گے۔ وہ اپنی ان خونیں آنکھوں سے حسنہ ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اگر رات کا وقت ہوتا تو حسنہ کو ٹیکسی سے اترتے ہوئے بھی ڈر لگتا لیکن وہ شام کا وقت تھا۔ اِکّا دُکّا لوگوں کی آمدورفت کے علاوہ سڑک پر سات آٹھ بچے بھی کرکٹ کھیل رہے تھے۔ اس کے علاوہ ٹیکسی ڈرائیور کی موجودگی بھی حسنہ کے لیے تقویت کا باعث تھی۔ وہ ٹیکسی سے اتری اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ اس کا اٹیچی کیس مکان کے پھاٹک تک پہنچادے۔

پھاٹک کی طرف بڑھتے ہوئے حسنہ نے اس شخص سے نظریں چرالی تھیں جو اسے بہت خطرناک قسم کا پاگل معلوم ہوا تھا۔ پھاٹک پر پہنچ کر حسنہ نے ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا تو دیکھا کہ پاگل چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا ایک طرف چل پڑا تھا۔ حسنہ کی طرف اس کی پشت تھی۔

حسنہ نے کچھ سکون محسوس کیا اور کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھی۔ اس وقت اسے خود پر غصہ بھی آیا تھا کہ وہ ایک پاگل سے ڈر گئی تھی۔

چودہ پندرہ سال کی ایک غریب لڑکی نے پھاٹک کھولا۔ وہ وہاں دو سال سے ملازم تھی اس لیے حسنہ کو پہچانتی تھی۔ اس نے سلام کیا۔ حسنہ نے جواب دے کر اس کا گال تھپکا اور اپنا اٹیچی کیس گھسیٹ کر پھاٹک کے اندر لے گئی۔

"کون آیا ہے چھوٹی؟" مکان میں سے غزالہ کی بلند آواز آئی۔

حسنہ نے ملازمہ کو چپ رہنے کا اشارہ کیا جو پھاٹک بند کر رہی تھی۔ حسنہ نے اپنا اٹیچی کیس وہیں چھوڑا اور تیزی سے مکان میں داخل ہوئی۔ سامنے سے غزالہ آرہی تھی جو اس وقت بہت سجی بنی ہوئی تھی۔

"ارے تم!" غزالہ کے منہ سے نکلا۔

حسنہ آگے بڑھ کر غزالہ سے لپٹ گئی اور ایک لمبی سانس لے کر بولی "اس وقت آپ اتنی مہک رہی ہیں کہ بھائی جان مدہوش ہوجائیں گے۔"

"چڑیل!" غزالہ نے اس کے پیٹ میں اتنے زور سے چٹکی لی کہ وہ سسکاری لے کر غزالہ سے الگ ہوگئی۔

"اتنی زور سے چٹکی لیتے ہیں۔" حسنہ نے غزالہ کو گھورا۔

"اتنی زور سے بھی لیتے ہیں۔" غزالہ نے ہنس کر کہا اور پھر اسے خود سے لپٹا کر اس کی پیشانی چومی "اطلاع بھی نہیں دی آنے کی؟"

"میں آپ لوگوں کو سرپرائز دینا چاہتی تھی۔"

"ڈیڈی، ممی بھی شریک ہوگئے تھے تمہاری اس ایکٹی وٹی میں؟"

"نہیں۔" حسنہ نے جواب دیا "فون کیا تھا ممی نے

یہاں لیکن شاید آپ کا فون خراب ہے۔"

"ہاں آج دن بھر ہی فون ہیلڈ اپ رہا۔ ابھی آدھے گھنٹے پہلے تمہارے بھائی جان نے دفتر سے فون کیا تو اس کے بعد سے ٹھیک ہے لیکن ٹیلی فون خراب تھا تو ٹیلی گرام دے دیتیں یا اپنے بھائی جان کے دفتر کر دیتیں۔"

"ٹیلی گرام تو شاید کل میں خود ہی وصول کرتی کیونکہ ہمارے ڈاک خانے اکثر بڑی شاندار کارکردگی دکھاتے ہیں' اور بھائی جان کے دفتر فون کرنے کا خیال شاید ممی کو آیا نہیں۔ ڈیڈی اور ممی مجھے چھوڑنے ائرپورٹ آئے تھے تو مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ لوگوں کو کراچی ائرپورٹ سے فون کردوں لیکن میں نے نہیں کیا۔ میں آپ دونوں کے سامنے اچانک آنا چاہتی تھی۔"

"اچھا اب بیٹھو تو سہی۔"

دونوں ایک ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"اچانک آنے کا پروگرام کیسے بنالیا؟" غزالہ نے پوچھا۔

"کالج کی چھٹیاں ہوگئی ہیں۔ میں نے سوچا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کی شادی کی سالگرہ میں شرکت کی جائے۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ دونوں اپنی شادی کی سالگرہ خود ہی منالیتے ہیں، کسی مہمان کو نہیں بلاتے لیکن مجھ جیسی بن بلائی مہمان کو تو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔"

"تم مہمان نہیں اسی گھر کی فرد ہو۔"

"بھائی جان کب آئیں گے؟"

"فون پر کہا تھا کہ ایک گھنٹے میں آجائیں گے۔ اب آتے ہی ہوں گے۔"

"ڈیڈی اور ممی نے بھی آپ دونوں کے لیے کچھ تحفے بھیجے ہیں۔ اٹیچی کیس میں ہیں۔"

اسی وقت پندرہ سالہ ملازمہ اٹیچی کیس گھسیٹتے ہوئے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

"بڑی محنتی ہے یہ چھوٹی۔" حسنہ نے ہنس کر کہا۔

"اچھا اب جلدی سے تم بھی تیار ہو جاؤ۔"

"میں لاہور سے ہی تیار ہو کر چلی تھی۔" حسنہ نے اپنے سراپا پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "کیا یہ کپڑے ٹھیک نہیں ہیں؟"

"میں نے سوچا شاید تم سالگرہ کی وجہ سے کچھ اور کپڑے لے کر آئی ہو گی۔"

"کپڑے تو میں لے کر آئی ہوں۔ ہفتے بھر تو رہوں گی لیکن آپ جانتی ہیں کہ میں تو شادی بیاہ میں بھی ایسے ہی سادہ کپڑے پہن کر جاتی ہوں۔ بھڑک دار کپڑوں کا شوق نہیں ہے مجھے۔ اچھا وہ کیک کہاں ہیں جو آپ کاٹیں گی؟"

"شادی کی سالگرہ کا کیک ہم بیڈ روم میں کاٹتے ہیں۔"

"اوہ!" حسنہ نے مایوسانہ لہجے میں کہا "پھر تو..."

"پھر تو کیا؟" غزالہ نے کہا۔

"میں تو وہاں نہیں آسکوں گی۔"

"کیوں؟" غزالہ نے کہا اور پھر حسنہ کی آنکھوں میں شرارت کی چمک دیکھ کر بولی "اگر کوئی اوٹ پٹانگ بات کہی تو اس مرتبہ چٹکی لینے کے بجائے چانٹا ہی رسید کردوں گی۔"

"ہائے!" حسنہ نے ایک سرد آہ بھری "کاش ہماری بھی کوئی نند ہوتی جسے ہم اس طرح دھمکا سکتے۔"

"اوہو!" غزالہ مسکرائی "یہ خواہش بھی جاگ چکی ہے تمہارے دل میں۔"

"کم بخت' دل ہی تو ہے۔" حسنہ نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"تو کیا کالج میں کسی کو پسند بھی کرلیا ہے؟"

"وہ میرے کالج میں نہیں ہے بھابی۔ یہیں کراچی میں رہتا ہے۔" حسنہ نے نظریں جھکا کر کہا اور پھر اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غزالہ کو اپنی محبت اور شیراز کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

"اب مسئلہ اس کی عمر کا ہے۔" حسنہ نے کہا "ڈیڈی اس قسم کی شادیاں پسند نہیں کرتے۔ اب اس سلسلے میں آپ ہی کچھ کرسکتی ہیں۔"

"میں کیا کرسکتی ہوں بھئی۔"

"بھائی جان کو بتائیے گا۔ آپ دونوں نے بھی تو محبت کی شادی کی ہے۔ آپ دونوں ہی کو اندازہ ہوگا کہ میں اور شیراز ایک دوسرے کے لیے کتنے بے قرار ہوں گے۔"

"لیکن تمہارے بھائی جان کی بات کیا ڈیڈی مان لیں گے؟"

"آپ تو شادی کے کچھ دن بعد ہی یہاں آگئی تھیں۔ آپ کو نہیں معلوم کہ ڈیڈی سے بھائی جان کس طرح بات کرتے ہیں۔ ان کے استدلال کا طریقہ ایسا ہوتا ہے کہ انہوں نے ڈیڈی سے کئی ایسی باتیں بھی منوالی تھیں جو ڈیڈی کے مزاج کے خلاف تھیں۔"

"اچھا میں انہیں آج ہی بتاؤں گی کہ ہماری نند نے ہمارے لیے نندوئی تلاش کرلیا ہے۔" غزالہ نے حسنہ کا گال تھپتھپایا۔

"لیکن آپ نے ہمارے لیے کچھ نہیں کیا۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ کی شادی کو یہ پانچواں سال ہے لیکن ابھی تک کوئی مجھے پھوپی جان کہنے والا نہیں آیا۔"

"اب آجائے گا۔" غزالہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "بس چھ سات مہینے انتظار کرلو۔"

"ارے واہ بھابی۔" حسنہ غزالہ سے لپٹ گئی۔

"اچھا تم بیٹھو۔ میں ذرا دیکھ آؤں کہ چھوٹی نے کیک کی ٹرالی بیڈ روم میں پہنچادی یا نہیں۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔ میں اٹیچی کیس سے کچھ چیزیں نکال لوں۔"

غزالہ اس کمرے سے چلی گئی۔ حسنہ نے اپنا اٹیچی کیس کھولا۔ اسی وقت قریب کی تپائی پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

اندر سے غزالہ کی آواز آئی "ذرا دیکھ لو حسنہ، کس کا فون ہے۔"

حسنہ نے ریسیور اٹھایا "ہیلو۔"

"مجھے غزالہ سے بات کرنا ہے۔" ایک نسوانی آواز آئی۔

"میں انہیں بلاتی ہوں۔ آپ کا نام؟"

"دھنک۔"

"کیا؟ دھنک؟" حسنہ نے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں۔" ہلکی سی ہنسی کے ساتھ جواب دیا گیا "میں غزالہ کی دوست ہوں۔"

حسنہ نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز میں کہا "بھابی۔ آپ کی کسی دوست کا فون ہے۔ دھنک نام بتایا ہے انہوں نے۔ عجیب نام ہے۔"

"اچھا میں آرہی ہوں۔"

حسنہ نے ریسیور تپائی پر رکھا اور اٹیچی کیس سے کچھ پیکٹ نکالنے لگی۔

غزالہ نے آکر فون ریسیو کیا "ہیلو!.... ہاں دھنک! میں سوچ بھی رہی تھی کہ آج تمہارا فون ابھی تک نہیں آیا۔ اچھا ہاں۔ ہاں۔ آج میرا فون سارے دن ہیلڈاپ رہا ہے۔ شکریہ دھنک! تم میری سالگرہ کا دن کبھی نہیں بھولتیں۔ ہاں بھئی! مجھے یقین ہے کہ میرا تحفہ تم نے اپنے پاس میری امانت کے طور پر محفوظ کرلیا ہوگا۔ اب جب بھی آنا ہو تو لیتی آنا۔ وہ.... ہاں وہ آواز تمہارے لیے اجنبی ہوگی۔ وہ میری نند ہے۔ لاہور سے آئی ہے۔ ارے نہیں، اس کی تم فکر نہ کرو۔ اچھا ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔"

حسنہ نے اٹیچی کیس بند کیا۔ اس نے غزالہ کی ساری باتیں سن لی تھیں اور اس کا دماغ "دھنک" میں الجھا رہا تھا۔

غزالہ نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ حسنہ بولی "دھنک نام تو اچھا ہے بھابی، لیکن اس قسم کے نام عام طور پر شوبزنس میں آنے والی لڑکیاں رکھ لیتی ہیں۔ یہ وہی تو نہیں جو ایک ماڈل گرل ہے۔"

"ہاں۔" غزالہ نے سنجیدگی سے کہا "وہی ہے۔"

"مجھے حیرت ہوئی بھابی کہ وہ آپ کی دوست ہے۔ اس لائن میں اس نے کوئی اہمیت حاصل نہیں کی لیکن اس کے کچھ اور قصے اخبارات میں آئے دن چھپتے رہتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے، لیکن اس کا ذکر اتنی حقارت سے نہ کرو حسنہ۔ میں کسی وقت تمہیں اس کے بارے میں بتاؤں گی تو تم اس سے ہمدردی کرنے لگوگی۔"

اسی وقت باہر سے کار کا ہارن سنائی دیا۔

"جبران آگئے۔" غزالہ نے جلدی سے کہا اور پھر تیزی سے دروازے کی طرف جاتے ہوئے سر گھما کر بولی "اپنے بھائی جان کے سامنے دھنک کی کوئی بات نہ کرنا۔"

"ٹھیک ہے، میں خیال رکھوں گی۔ آپ بھی بھائی جان کو پھاٹک پر ہی نہ بتایئے گا کہ میں آئی ہوں۔"

غزالہ سرہلاتے ہوئے باہر نکل گئی۔

ذرا دیر بعد دونوں میاں بیوی ساتھ ساتھ ڈرائنگ روم میں آئے۔

چھوٹی بہن کو دیکھ کر جبران بھی تحیرزدہ مسرت سے دوچار ہوا اور ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھ گیا۔ ایک کے بعد ایک بات چھڑتی رہی لیکن پھر حسنہ ہی نے باتیں روک کر کیک کاٹنے کی یاددہانی کراتے ہوئے کہا "باتیں تو اب ہوتی ہی رہیں گی بھائی جان۔"

اس طرح باتوں کا سلسلہ رکا۔ جبران نے غسل کرکے کپڑے تبدیل کیے۔

بیڈ روم میں کیک کاٹا گیا۔ حسنہ نے تین پیکٹ ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا "ایک ڈیڈی کی طرف سے ہے، ایک ممی کی طرف سے اور ایک میری طرف سے۔"

پھر کچھ وقت کھانے پینے اور چائے پینے میں گزرا۔

"اب آپ لوگوں کا کیا پروگرام ہے؟" حسنہ نے پوچھا۔

"ہم لوگ تو گھومنے کے لیے نکل جاتے ہیں۔ آج بھی یہی پروگرام ہے۔" غزالہ نے کہا "رات کا کھانا بھی کسی ریسٹورنٹ میں کھاتے ہیں۔ آج تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔"

"چلیے۔" حسنہ نے خوش ہوکر کہا "لیکن گھر میں چھوٹی کیا اکیلی رہے گی؟"

"نہیں۔" غزالہ نے جواب دیا "ایسے موقعوں پر ہم اس کی ماں کو بلا لیتے ہیں۔ وہ بس آہی رہی ہوگی۔"

○☆○

رات کو وہ تینوں خاصی دیر سے لوٹے۔ تھکن اتنی ہوگئی تھی کہ حسنہ کو بستر پر پڑتے ہی نیند آگئی۔ صبح وہ دیر تک سوتی رہتی اگر غزالہ نے اسے جگایا نہ ہوتا۔

"جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" غزالہ نے کہا "تمہارے بھائی جان کو دفتر جانا ہے اور وہ ناشتا تمہارے ساتھ ہی کرنا چاہتے ہیں۔"

حسنہ جلدی سے تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچ گئی۔ ناشتے کے دوران میں اس نے چہکنا شروع کر دیا لیکن یکایک اسے احساس ہوا کہ غزالہ تو اس سے باتیں کر رہی تھی لیکن جبران خاموشی سے ناشتا کر رہا تھا۔ حسنہ کی طرف وہ کبھی کبھی کن انکھیوں سے دیکھ لیتا تھا۔ حسنہ کو خیال آیا کہ غزالہ رات ہی کو جبران سے اس کے اور شیراز کے بارے میں بات کر چکی تھی۔ یہ خیال آتے ہی حسنہ کا چہکنا بند ہوگیا۔ وہ اپنے بھائی سے خاصی بے تکلف تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ اپنی شادی یا اپنی محبت کے معاملے میں اسے بالکل شرم نہ آتی۔

ناشتا کرنے کے بعد جبران نے حسنہ سے کہا "میں کار چھوڑے جا رہا ہوں۔ تمہیں گھومنا پھرنا ہو تو اپنی بھابی کے ساتھ چلی جانا۔"

"اور آپ دفتر کیسے جائیں گے؟"

"میں نے اپنے ایک دوست کو فون کر دیا ہے۔ وہ اپنی کار میں ادھر سے ہی گزرتا ہے۔ وہ مجھے لیتا ہوا چلا جائے گا۔ واپسی بھی اسی کے ساتھ ہوگی۔ جب تک تم یہاں ہو، میری کار تمہارے ڈسپوزل پر رہے گی۔"

حسنہ خوش ہوگئی۔ اسے آج کسی وقت شیراز کو فون کر کے اس سے ملنے جانا تھا۔ کار نہ ہونے کی صورت میں اسے ٹیکسی کرنا پڑتی۔

جبران کے جانے کے بعد حسنہ نے غزالہ سے کہا "آپ نے شاید رات کو ہی بھائی جان سے بات کرلی ہے۔"

"ہاں تو اس میں دیر کیوں لگاتی؟ تمہاری بے تابی مجھ سے چھپی ہوئی تو رہی نہیں ہے۔"

"پھر کیا کہا بھائی جان نے؟" حسنہ نے جلدی سے پوچھا۔

"ناراض ہو رہے تھے کہ تم نے اپنے لیے بڈھا تلاش کرلیا ہے۔"

"مذاق نہ کیجیے بھابی۔ پلیز۔"

غزالہ ہنس پڑی "ارے وہ تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ بات کریں گے وہ ڈیڈی سے لیکن پہلے وہ شیراز سے ملنا چاہتے ہیں۔ تم نے مجھے اس کا پتا بتا دیا ہوتا تو میں وہ بھی انہیں بتا چکی ہوتی۔"

"میں ابھی دے دیتی ہوں اس کا پتا۔" حسنہ نے اپنے پرس میں سے شیراز کا کارڈ نکالا اور اس کا پتا، مع ٹیلی فون نمبر ایک کاغذ پر لکھ کر غزالہ کو دے دیا۔

"یہ تو فارورڈنگ، کلیئرنگ ایجنسی کا پتا ہے۔" غزالہ نے کہا۔

"یہ ایجنسی اسی کی ہے۔ میں نے یہ بات تو کل ہی آپ کو بتا دی تھی۔"

"لیکن گھر کا پتا اور فون نمبر بھی تو ہونا چاہیے تھا۔"

"میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ وہ اکیلا ہے۔"

"تو کیا گھر اور ٹیلی فون نہیں ہے۔"

"ہاں وہ تو ہوگا لیکن جب اس نے مجھے کارڈ دیا تھا تو میں یہ دیکھنا بھول گئی تھی کہ اس پر اس کے گھر کا پتا اور ٹیلی فون نمبر ہے یا نہیں۔ وہ میں اس سے آج ہی معلوم کرلوں گی۔ نو بجے کھلتا ہے اس کا دفتر۔ میں ساڑھے نو بجے تک فون کروں گی اسے۔"

"پونے نو بج رہے ہیں۔" غزالہ نے گھڑی دیکھ کر کہا "اتنی دیر تک کیا کرو گی؟"

"آپ سے شیراز کی تعریفیں کروں گی۔" حسنہ نے ہنس کر کہا۔

"مجھے ابھی گھر کے کچھ کام کاج بھی دیکھنا ہیں۔"

"اور وہ چھوٹی؟"

"ارے وہ ابھی بچی ہے۔ ہر چیز کا خیال تو نہیں رکھ سکتی۔"

"اچھا تو آپ اپنا کام کیجیے، میں اخبار پڑھتی ہوں۔"

حسنہ نے اسے اچھا ہی سمجھا تھا کہ وہ شیراز سے اکیلے میں بات کرتی۔ اس نے سوا نو بجے ہی شیراز کا نمبر ملا ڈالا۔

"ارے!" شیراز اس کی آواز سن کر چونکا "کیا کراچی آگئی ہو؟"

"ہاں۔ کل شام آگئی تھی۔ کارڈ پر تمہارے گھر کا ٹیلی فون نمبر تو....."

"وہ میں نے کارڈ پر چھپوانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔" شیراز نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "وہ میں بہت خاص لوگوں کو بتاتا ہوں۔"

"میں عام ہوں؟" حسنہ نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ارے بس بھول گیا تھا کارڈ دیتے وقت۔ اب یہ بتاؤ

کہ آج کہاں اور کب ملاقات ہو رہی ہے؟"
"جہاں تم کہو۔"
"کراچی تمہارا اچھی طرح دیکھا ہوا ہے نا؟"
"ہاں ہاں، کیوں۔"
"بس تو پھر انٹر کانٹی نینٹل میں ایک بجے ملو۔ کھانا وہیں کھائیں گے۔"
"ٹھیک ہے۔ میں آجاؤں گی۔ اپنے گھر کا پتا اور ٹیلی فون نمبر تو بتاؤ۔"
"ملاقات پر بتادوں گا نا۔ آخر اتنی جلدی کیا ہے؟"
"بھائی جان سے بات کرلی ہے بھابی نے۔ وہ تم سے ملنے کے بعد ہی ڈیڈی سے بات کریں گے۔ بھابی تمہارے گھر کا پتا اور ٹیلی فون نمبر پوچھ رہی تھیں۔"
"اتنی جلدی بات ہو گئی؟"
"اتنی ہی پیاری ہیں میری بھابی۔ انہوں نے ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ میں نے بھی انہیں کل شام ہی بتا دیا تھا۔"
"اچھا ٹھیک ہے۔ تم ہوٹل آکر ملو تو اور باتیں ہوں گی۔ پتا اور فون نمبر بھی لکھ کر دے دوں گا اسی وقت۔ پہنچنے میں دیر نہیں لگانا۔"
"نہیں دیر نہیں ہوگی۔ بھائی جان نے مجھے اپنی کار دے دی ہے۔"
غزالہ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر حسنہ نے ریسیور رکھ دیا۔
"ہو گئی بات چیت؟" غزالہ مسکرا کر بولی۔
"ہاں بھابی۔ وہ چاہتا ہے کہ میں دوپہر کا کھانا اس کے ساتھ انٹر کانٹی نینٹل میں کھاؤں۔ آپ کی طرف سے اجازت ہے نا؟"
غزالہ نے سوچتے ہوئے کہا "بس ہوٹل ہی جانا اس کے ساتھ کہیں اور نہ جانا۔"
"مجھے اس پر مکمل بھروسا ہے بھابی، لیکن میں آپ کی بات رد نہیں کروں گی۔ کھانا کھا کر ہوٹل سے واپس آجاؤں گی۔"
"تم یہاں ہو حسنہ اس لیے ہماری ذمے داری ہو۔"
"آپ فکر نہ کریں بھابی۔ میں جلدی واپس آؤں گی اور ہاں کار لے جاؤں؟"
"ڈرائیونگ لائسنس تو خیر ہے تمہارے پاس لیکن یہاں کا ٹریفک لاہور کے ٹریفک سے مختلف ہے۔"
"میں خیال رکھوں گی بھابی۔ زیادہ رفتار سے ڈرائیونگ نہیں کروں گی۔"
"اس کے گھر کا پتا اور ٹیلی فون نمبر لے لیا؟"
"ملاقات ہوگی تو وہ دے دے گا۔" حسنہ نے جواب دے دیا، پھر کہا "لیکن جس دن بھائی جان اس سے ملنے جائیں، مجھے ضرور بتا دیجئے گا۔ میں اسے فون پر اطلاع دے دوں گی۔"
"وہ اس سے ملنے کے لیے تمہارے بھائی کی حیثیت سے نہیں جائیں گے۔"
"پھر؟"
"بھئی وہ ایک فارورڈنگ، کلیئرنگ ایجنسی ہے۔ اپنے کسی کام سے کوئی بھی وہاں جا سکتا ہے۔"
"بھائی جان نے یہ بات پہلے ہی سے کیسے سوچ لی۔" حسنہ نے حیرت سے کہا "اس کی ایجنسی کا پتا تو میں نے آپ کو ابھی دیا ہے۔"
"یہ تو کل ہی بتا دیا تھا نا کہ اس کی فارورڈنگ، کلیئرنگ ایجنسی ہے۔" غزالہ نے کہا، پھر مسکرا کر بولی "ویسے میں ابھی ان سے فون پر بات کر چکی ہوں۔"
"کیسے!" حسنہ حیرت سے بولی "ٹیلی فون تو یہاں ہے۔"
"کل تم نے شاید غور نہیں کیا۔ ایک ٹیلی فون بیڈ روم میں بھی ہے۔"
"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" حسنہ نے خوش ہو کر کہا "آپ نے جو کمرا مجھے دیا ہے، یہ ٹیلی فون میں وہیں لے جاؤں گی۔ اس کا تار خاصا لمبا ہے۔"
"یہ تار اسی لیے اتنا بڑا ہے کہ اس کمرے تک جا سکے۔ کبھی کبھی جبران کا کوئی مہمان آتا ہے تو اسے اسی کمرے میں ٹھہرایا جاتا ہے اور یہ ٹیلی فون بھی اس کمرے میں پہنچا دیا جاتا ہے۔"
"پچھلی بار میں آئی تھی تو ایسا نہیں تھا۔"
"دوسرا ٹیلی فون ابھی حال ہی میں لگا ہے اسی لیے تم لوگوں کو اس کا نمبر نہیں معلوم تھا ورنہ یہ فون ہینڈ اپ پا کر ممی دوسرے فون پر رنگ کر لیتیں۔"
"چلیں اچھا ہی ہوا کہ وہ نمبر ابھی ہمارے گھر تک نہیں پہنچا ورنہ کل میں آپ دونوں کو سرپرائز نہ دے پاتی۔"
غزالہ ہنس کر رہ گئی، پھر اس نے کہا "اچھا ابھی میرا کام ختم نہیں ہوا تھا۔ میں بس دیکھنے آگئی تھی کہ تم کیا کر رہی ہو۔"
"آپ اطمینان سے اپنا کام دیکھیے، میں اب کمرے میں جا کر لیٹتی ہوں۔ رات کو میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔"
غزالہ چلی گئی اور حسنہ کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گئی۔

آنکھیں بند کر کے اس نے خیالوں میں خود کو شیراز کے پاس پایا۔

بارہ بجے سے پہلے اس نے بستر چھوڑ دیا۔ غسل کر کے اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ ساڑھے بارہ بجے وہ روانگی کے لیے تیار تھی۔ اس نے غزالہ سے کار کی چابی لی تو غزالہ اسے چھوڑنے باہر تک آئی۔

اس وقت ان دونوں میں سے کوئی نہیں دیکھ سکا کہ وہ "دیوانہ" کچھ فاصلے پر ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ان کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن جب حسنہ کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوئی تو اس کی نظر دیوانے پر پڑ گئی۔

یہ کیا یہیں چکراتا رہتا ہے؟ حسنہ نے سوچا۔

○☆○

ایک بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے جب حسنہ نے کار انٹر کانٹی نینٹل کے پارکنگ لاٹ میں کھڑی کی۔ انجن بند کر کے وہ جلدی سے اتری پھر جیسے ہی اس نے دروازہ بند کیا' اسے شیراز کی آواز سنائی دی "ہیلو۔"

حسنہ نے چونک کر شیراز کی طرف دیکھا اور ہنس پڑی "تم یہیں کھڑے ہو! میرا خیال تھا کہ تم ہوٹل کے اندر ہی ملو گے۔"

"میں بھی ابھی پہنچا ہوں۔ وہ کھڑی ہے میری کار!"

وہ ایک چھوٹی سی "آلٹو" تھی۔

"لاہور میں تو تمہارے پاس اچھی کار تھی؟"

"وہاں جانا ہوتا ہے تو کرائے کی کار لیتا ہوں۔ آؤ۔"

اس نے قدم بڑھائے پھر بولا "شاید تمہیں اچھا نہیں لگا ہوگا کہ میرے پاس اتنی معمولی سی کار ہے۔"

"کیوں؟ مجھے برا کیوں لگے گا؟"

"مجھ سے شادی کر کے تمہیں ایک بہتر زندگی کو خیرباد کہنا پڑے گا۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ میری بہتری تو یہ ہوگی کہ تم میری زندگی میں آجاؤ گے۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ تمہارے پاس ایک چھوٹی سی کار ہے۔"

"میری ایجنسی بھی چھوٹی سی ہے۔"

"کسی دن بڑی بھی ہو جائے گی۔ ہر شخص اپنے منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ میں بھی کسی انڈسٹریلسٹ کی بیٹی نہیں ہوں۔"

"لیکن تم نے بہتر حالات میں آنکھ کھولی ہے۔ تمہارے بھائی جان بھی یہاں کسی اچھے عہدے پر فائز معلوم ہوتے ہیں۔ یہ اندازہ میں نے وہ کار دیکھ کر لگایا ہے جس میں تم آئی ہو۔ تم نے بتایا تھا کہ یہ تمہارے بھائی جان کی کار ہے۔"

"شیراز!" حسنہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا "کیا تم مجھے آزمانے کے لیے اسی قسم کی باتیں کرتے رہو گے؟ کیا میرا یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ شادی کے بعد میری سب سے بڑی دولت تمہاری ذات ہوگی۔"

"تم تو ناراض ہونے لگیں!"

"تم نے باتیں ہی ایسی شروع کر دیں!" حسنہ نے منہ پھلا کر کہا۔

"اچھا مجھے معاف کرو بھئی! اپنا موڈ خراب نہ کرو۔"

"وعدہ کرو کہ آئندہ ایسی کوئی بات نہیں کرو گے۔"

"پکا وعدہ۔"

حسنہ مسکرا دی۔

باتیں کرتے ہوئے وہ ہوٹل میں داخل ہو گئے۔

"میں گھنٹے سوا گھنٹے سے زیادہ نہیں رکوں گی۔" حسنہ نے کہا۔

"کیوں؟"

"بھابی سے مجھے اتنی ہی دیر کی اجازت ملی ہے۔"

"تم تو کہتی تھیں کہ لاہور کی بہ نسبت یہاں تمہیں زیادہ آزادی مل جائے گی؟"

"کیا یہ آزادی کم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کھانا کھانے ہوٹل میں آئی ہوں؟ لاہور میں تو بس کار میں بیٹھے بیٹھے ہی باتیں ہوا کرتی تھیں۔"

"میں نے سوچا تھا کہ کھانے کے بعد باغ جناح دیکھنے چلیں گے۔"

"وہ پروگرام پھر کسی دن سہی! میں کراچی سے آج ہی تو رخصت نہیں ہو جاؤں گی۔ ویسے بھی وہاں چہل قدمی کا مزہ شام کے وقت آئے گا۔"

میز پر بیٹھنے کے بعد شیراز نے فوراً ہی کھانے کا آرڈر دے دیا۔

"اپنے گھر کا ٹیلی فون نمبر اور پتا تو دے دو۔" حسنہ نے کہا۔

"یہ لیجیے حضور!" شیراز نے فوراً ہی اپنے کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا کاغذ نکال کر حسنہ کو دے دیا۔

حسنہ نے کاغذ پر نظر ڈالے بغیر پرس میں رکھ لیا اور بولی "تم ہر وقت اپنے دفتر میں رہتے ہو یا کچھ خاص ٹائمنگ ہیں؟"

"کسی وقت کسی کام سے کہیں جانا ہوتا ہی ہے۔ اس وقت بھی تو تمہارے ساتھ ہوں لیکن یہ تم نے کیوں پوچھا؟"

"ڈیڈی سے بات کرنے سے پہلے بھائی جان تم سے ملنے آئیں گے۔"
"وہ کیوں زحمت کرتے ہیں؟ مجھے بلا لیتے!"
"وہ کسی اجنبی کی طرح آئیں گے تمہارے پاس! تمہیں یہ نہیں بتائیں گے کہ وہ میرے بھائی ہیں۔"
"اوہ!" شیراز مسکرایا پھر سرہلا کر بولا "شادی کے معاملات میں لڑکے کو پرکھنے کا صحیح طریقہ بھی یہی ہے لیکن تم مجھے بتا تو دو گی نا کہ وہ کس دن آئیں گے۔"
"شاید وہ مجھے بھی نہ بتائیں کہ تمہارے پاس کس دن اور کس وقت پہنچیں گے۔"
"پھر تو یہ ممکن ہے نا کہ میں اس وقت انہیں دفتر میں نہ ملوں!"
"اب یہ تو بھائی جان کا دردِ سر ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ سوچ ہی لیں گے۔"
"بات تو بن جائے گی نا حسنہ؟ کہیں میرے مالی حالات کی وجہ سے تمہارے بھائی جان..."
"نہیں۔" حسنہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "ان کی سوچ اس قسم کی نہیں ہے۔ جب ان کی شادی ہوئی تھی تو خود ان کے مالی حالات اتنے اچھے نہیں تھے، جتنے اب ہیں۔ وہ تو ملازمت پیشہ تھے اور ہیں، جب کہ تمہارا ایک کاروبار ہے۔ وہ چھوٹا سا سہی لیکن ملازمت کی بہ نسبت کاروبار میں ترقی کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔"
"کبھی کبھی مجھے ایک خوف بہت پریشان کرتا ہے۔" شیراز نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا "اگر تم مجھے نہ مل سکیں تو میری زندگی بہت ویران ہو جائے گی۔"
"ایسی باتیں نہ کرو کہ میرا دل بھی بیٹھنے لگے!" حسنہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا "بھائی جان کی وجہ سے میں تو بہت پُرامید ہوں۔"
شیراز مسکرایا لیکن اس کی مسکراہٹ ایسی تھی جیسے وہ کوشش کرکے مسکرایا ہو!
حسنہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ "ہوٹل کے باہر تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس ملاقات کو ناخوش گوار نہ بناؤں لیکن اب تم...."
"ارے نہیں۔" شیراز جلدی سے ہنس پڑا "چلو وعدہ رہا۔ اب ایسی کوئی بات نہیں کروں گا۔"
کسی خیال سے حسنہ کی آنکھوں میں چمک آئی اور اس نے کہا "شادی کے بعد میں ایجنسی کے معاملات میں تمہارا ہاتھ بٹایا کروں گی تاکہ ہماری ایجنسی جلد از جلد ترقی کر سکے۔"

اس کے بعد وہ دونوں کھانے کے دوران میں اپنے مستقبل کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ انہی باتوں میں کھانا کھایا گیا پھر چائے پینے کے بعد حسنہ نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "ابھی میں بیس پچیس منٹ اور رک سکتی ہوں۔"
"کیا تم نے اس ہوٹل کی شاپس دیکھی ہیں؟"
"ایک مرتبہ یہاں آ تو چکی ہوں لیکن شاپس دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔"
"تو آؤ اس طرف چلتے ہیں۔" شیراز نے کہا "تھوڑی سی چہل قدمی بھی ہو جائے گی اور ان خوب صورت دکانوں میں کوئی چیز اچھی لگی تو خرید بھی لیں گے۔"
حسنہ نے آمادگی کا اظہار کیا تو شیراز نے فوراً بل ادا کیا اور حسنہ کے ساتھ ایک طرف بڑھا۔
دس منٹ تک وہ دکانوں پر گھومتے رہے۔ ایک بک اسٹال پر حسنہ نے اپنی ایک پسندیدہ مصنفہ کے نئے ناول کے بارے میں پوچھا لیکن وہ نہیں ملا۔
زیورات کی دکان پر حسنہ کی نظر ایک جیولری سیٹ پر پڑی تو اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "بہت خوب صورت ہے۔"
"خرید لیتے ہیں۔" شیراز نے کہا۔
"میرے پرس میں پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ہیں۔ یہ سیٹ ہے تو بہت ہلکا پھلکا لیکن خاصا مہنگا ہوگا۔"
"شاید بیس پچیس ہزار کا ہو۔" شیراز نے کہا "یہ میں خرید لیتا ہوں تمہارے لیے!"
"ارے نہیں۔" حسنہ جلدی سے بولی "کیا ضرورت ہے۔"
"کیا مجھ سے کوئی تحفہ لینا تمہیں برا لگے گا؟"
"یہ بات نہیں شیراز! بھائی جان یا بھابی جان ضرور پوچھیں گے کہ میں نے اتنا مہنگا سیٹ کہاں سے خرید لیا۔"
"انہیں بتا دینا کہ میں نے تحفہ دیا ہے۔"
"شاید وہ یہ پسند نہ کریں کہ میں شادی سے پہلے تم سے اتنے مہنگے تحائف لینا شروع کردوں۔"
"اچھا تو پھر ایک اور تدبیر ہو سکتی ہے۔ میں یہ خرید کر اپنے پاس رکھ لیتا ہوں۔ جب ہماری شادی ہو جائے گی تو یہ تمہاری امانت کے طور پر میرے پاس ہوگا۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بعد میں اس بناوٹ کا سیٹ شاید مل نہ سکے اور یہ تمہیں پسند آ گیا ہے۔"
اس کے بعد بھی حسنہ نے گریز کی کوشش کی لیکن شیراز

کے اصرار کے سامنے اسے پسپا ہونا پڑا۔
لیکن جب قیمت پوچھی گئی تو حسنہ بوکھلا گئی۔ وہ اسی ہزار کا تھا۔ حسنہ نے یہ بھی محسوس کیا کہ قیمت سن کر شیراز بھی ایک دم چپ ہو گیا تھا۔
"چلو آگے چلتے ہیں۔" حسنہ بولی۔
شیراز بجھے ہوئے چہرے کے ساتھ مڑا اور پھر چونک گیا "ارے ناصر!"
حسنہ نے اس نوجوان کو دیکھا جس نے شیراز کو چونکایا تھا۔ اس کی وضع قطع بتا رہی تھی کہ وہ متمول حیثیت کا مالک تھا۔ اس کی انگلیوں میں انگشتریاں اور جسم پر خاصا قیمتی سوٹ تھا۔ عمر شیراز سے کچھ کم معلوم ہوتی تھی۔
"کیا ہو رہا ہے!" ناصر نے حسنہ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر شیراز کی طرف دیکھا۔
"بس ایسے ہی۔" شیراز نے جواب دیا "تفریحاً ذرا دکانیں دیکھ رہے تھے۔ تم یہاں کہاں؟"
"میں یہیں مقیم ہوں۔ کل ہی امریکا سے آیا ہوں۔ ایک ضروری میٹنگ ہے ابھی یہاں میری لیکن تم پر نظر پڑی تو ادھر آگیا۔ بہت دن بعد نظر آئے ہو۔"
"بس یار! زندگی کی دوڑ میں لگا ہوا ہوں۔ ہماری ملاقات نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ تم عموماً بیرونی ملکوں کے دورے پر رہتے ہو۔" شیراز نے کہا پھر حسنہ سے بولا "یہ ناصر ہے۔ میرا بچپن کا دوست! اس کا بزنس کئی ملکوں میں پھیلا ہوا ہے۔"
"ایک طرفہ تعارف کوئی اچھی بات نہیں۔" ناصر مسکرایا۔
"یہ حسنہ ہے۔"
"میں شاید دو منٹ سے پیچھے کھڑا تمہاری باتیں سن رہا تھا۔ ان باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ میری ہونے والی بھابی ہیں۔"
حسنہ کا شہابی رنگ کچھ گہرا ہو گیا۔
"ہاں۔" شیراز نے ہنس کر کہا "بہت جلد ہماری شادی ہونے والی ہے۔"
"ابھی تم شاید یہ سیٹ خریدنے کی بات کر رہے تھے!"
"ہاں مگر..."
"ایک منٹ۔" ناصر نے اس کی بات کاٹی اور پھر سیلزمین سے کہا "یہ سیٹ پیک کر دیجیے۔"
حسنہ نے پہلو بدلا۔ شیراز کے چہرے پر بھی الجھن کے آثار تھے۔
ناصر نے سیلزمین کو اپنا کریڈٹ کارڈ دیا اور پھر شیراز سے بولا "تم تو جانتے ہو کہ میں مختلف ملکوں میں گھومتا رہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری شادی میں شرکت نہ کر سکوں اس لیے اپنی شادی کا تحفہ مجھ سے آج ہی لے لو۔"
"یہ تو مناسب نہیں ہو گا۔" حسنہ خاموش نہ رہ سکی۔
"اس معاملے میں آپ کو نہیں بولنا چاہیے۔" ناصر نے مسکراتے ہوئے نرمی سے کہا "یہ ہم دو دوستوں کا معاملہ ہے۔ ویسے بھی یہ سیٹ آپ کو ابھی تو ملے گا نہیں۔ میں آپ دونوں کی باتیں سن چکا ہوں۔ یہ سیٹ شیراز کے پاس رہے گا۔ شادی کے بعد ہی یہ آپ کو ملے گا اور آپ مجھ ناچیز کو یاد رکھ سکیں گی۔"
"لیکن یہ بہت مہنگا ہے، ناصر!" شیراز نے کہا۔
"ہماری دوستی ایسی ہے کہ میں تمہاری شادی پر اس سے بھی زیادہ قیمتی تحفہ دیتا لیکن یہ سیٹ کیونکہ میری ہونے والی بھابی کو پسند آگیا ہے لہٰذا اس سے زیادہ قیمتی چیز کوئی بھی نہیں ہو سکتی جو میں تمہیں دوں۔"
"اچھا بھئی!" شیراز نے شکست خوردہ انداز میں ایک طویل سانس لی۔
حسنہ نے اسے ٹھوکا دیا۔ وہ اب بھی نہیں چاہتی تھی کہ ناصر اس کے لیے وہ سیٹ خریدے۔
"بے کار ہے بھئی!" شیراز نے اس سے کہا "اب ناصر میری کوئی بات نہیں سنے گا۔ یہ ضدی بھی بہت ہے۔"
ناصر نے مسکرا کر حسنہ کی طرف دیکھا۔ "میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ آپ کو ہم دونوں دوستوں کے معاملات میں نہیں بولنا چاہیے۔"
اب حسنہ کو بھی چپ ہو جانا پڑا۔
سیلزمین نے "سیٹ" پیک کر کے ناصر کی طرف بڑھایا اور ناصر نے وہ شیراز کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "میری طرف سے شادی کی پیشگی مبارک باد۔"
"شکریہ میری جان۔" شیراز نے کہا۔
ناصر نے سیلزمین سے اپنا کارڈ واپس لیا "اچھا اب میں چلتا ہوں۔ میں نے بتایا تھا نا کہ ایک بہت ضروری میٹنگ ہے۔"
"یار، اتنے دن بعد ملاقات ہوئی ہے تو ساتھ بیٹھ کر ایک پیالی چائے تو..."
"وہ پھر کبھی سہی!" ناصر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "میں ابھی دو تین دن تو یہیں ہوں۔ تمہارا ٹیلی فون نمبر میرے پاس ہے۔ ذرا بھی فرصت ملنے پر میں تم سے رابطہ

کروں گا۔ اچھا! خدا حافظ!" اس نے شیراز سے مصافحہ کرنے کے بعد حسنہ کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی اور مڑ کر تیزی سے ایک طرف بڑھتا چلا گیا۔

"آؤ!" شیراز نے حسنہ سے کہا۔

حسنہ نے اس کے ساتھ قدم بڑھائے اور بولی "یہ تو کچھ مناسب نہیں لگا کہ شادی سے پہلے ہی شادی کا تحفہ وصول کرلیا جائے۔"

"وہ بہت بے تکلف ہے مجھ سے! شادی کے بعد وہ گھر آئے گا تو دیکھنا۔ اپنی کوئی بات منوانے کے لیے وہ میری گردن بھی دبوچ لیتا ہے۔ بس ایک ہی معاملہ ہے جس میں اس نے ایسا نہیں کیا۔"

"کس معاملے میں؟"

"وہ مجھ سے دو تین مرتبہ کہہ چکا ہے کہ میرے پاس جو چھوٹا موٹا سرمایہ ہے، وہ اس کے کاروبار میں لگا کر اس کا پارٹنر بن جاؤں لیکن اس بارے میں سوچنا مجھے مضحکہ خیز لگتا ہے۔ اس کے اتنے بڑے کاروبار میں میرے چھوٹے سے سرمائے کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ دراصل وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ میری مالی پوزیشن مضبوط ہوجائے۔ بچپن کا دوست ہے نا اور واقعی بہت اچھا دوست ہے۔ شادی کے بعد اگر وہ گھر آئے اور میں اس وقت نہ ہوں تو بھی اس کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھنا۔"

"ظاہر ہے کہ جب وہ تمہارا اتنا قریبی دوست ہے تو مجھے اس کا خیال رکھنا ہی ہوگا۔"

شیراز اپنے دوست کی کاروباری وسعت کے بارے میں بتانے لگا اور باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں ہوٹل سے نکل کر اس جگہ آ کے رکے جہاں حسنہ نے کار کھڑی کی تھی۔

"تو یہ میں لے جاؤں؟" شیراز کا اشارہ سیٹ کی طرف تھا۔

"ظاہر ہے۔" حسنہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

"اچھا اب ملاقات کب ہوگی؟"

"میں تمہیں فون کروں گی۔ شاید آج رات کو ہی کروں۔"

"اپنا فون نمبر تم نے مجھے نہیں دیا۔"

"جب فون کروں گی تو بتا دوں گی۔" حسنہ نے مسکرا کر کہا اور کار کا دروازہ کھولنے لگی۔

"میں تمہارے فون کا بے چینی سے انتظار کروں گا۔"

حسنہ نے انجن اسٹارٹ کیا اور الوداعی انداز میں ہاتھ ہلانے کے بعد کار کو حرکت میں لائی۔ عقب نما آئینے میں اس نے دیکھا کہ شیراز اپنی آلٹو کی طرف بڑھ رہا تھا۔

حسنہ احتیاط سے کار چلاتے ہوئے ناصر کے بارے میں سوچنے لگی۔ یہ اس کے لیے ایک خوش آئند بات تھی کہ ایک بہت بڑا سرمایہ دار شیراز کا بہت بے تکلف دوست تھا۔ شیراز کی یہ بات غلط بھی نہیں تھی کہ وہ اپنا چھوٹا سا سرمایہ ناصر کے کاروبار میں نہیں لگانا چاہتا تھا لیکن یہ تو کیا جاسکتا تھا کہ ناصر کے رسوخ و اثر سے شیراز اپنے کاروبار کو زیادہ مستحکم بنانے کی کوشش کرتا۔

شادی کے بعد شیراز کو یہ بات سمجھاؤں گی، حسنہ نے سوچا۔



رات کے دو بج رہے تھے جب کسی قسم کی آواز سے توصیف کی آنکھ کھل گئی۔ عائشہ بدستور سوتی رہی۔ توصیف غور کرنے لگا کہ اس کی آنکھ کھلنے کا سبب کس قسم کی آواز تھی۔ ایک منٹ گزر گیا لیکن کوئی آواز نہیں سنائی دی۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ آواز کو اپنا وہم سمجھ کر توصیف دوبارہ لیٹنا چاہتا تھا کہ آواز پھر سنائی دی۔

کھٹ!

توصیف لیٹتے لیٹتے رک گیا۔ آواز بہت دھیمی تھی لیکن توصیف نے اندازہ لگایا تھا کہ کوئی چیز فرش یا دیوار پر ماری گئی تھی۔

کھٹ! آواز پھر سنائی دی۔

"عائشہ! عائشہ!" توصیف نے آہستگی سے پکارتے ہوئے عائشہ کو جھنجوڑا۔

کھٹ! آواز تیسری مرتبہ سنائی دی۔

عائشہ بوکھلا کر اٹھ گئی "کیا ہوا؟"

"سنو تو! یہ آوازیں کیسی ہیں!"

"آوازیں؟"

"ہاں۔"

"مجھے تو کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے۔"

"ذرا دیر خاموش رہو۔"

عائشہ نے خاموشی اختیار کی اور ذرا دیر بعد سناٹے میں پھر وہی آواز سنائی دی۔

"پڑوس کے گھر میں کوئی کچھ کر رہا ہوگا۔" عائشہ نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

کھٹ! آواز پھر آئی۔

"نہیں۔" توصیف نے کہا "یہ آواز ہمارے ہی گھر میں ہو رہی ہے۔"

کھٹ!

"یہ عجیب بات ہے۔" توصیف پھر بولا "تین مرتبہ یہ آواز دو تین سیکنڈ کے وقفے سے ہوتی ہے اور اس کے بعد ایک ڈیڑھ منٹ کا وقفہ ہوتا ہے۔"

عائشہ غور کرنے لگی۔ توصیف کے کہنے کے بعد ایک ڈیڑھ منٹ بعد ہی "کھٹ، کھٹ، کھٹ" کی آواز دو تین سیکنڈ کے وقفے سے سنائی دی۔

"اب مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے۔" توصیف نے مضطربانہ انداز میں کہا اور بستر سے اترنے لگا۔

"کیا اندازہ ہوا ہے آپ کو؟" عائشہ نے پوچھا۔

"آواز اسی کمرے سے آرہی ہے جہاں میں نے سلارزی کو ٹھہرایا ہے۔" توصیف نے چپلیں پہنتے ہوئے کہا۔

"سلارزی بھائی آگئے ہوں گے؟"

"دو بج چکے ہیں۔ آتو جانا چاہیے۔"

"میں بھی چلتی ہوں آپ کے ساتھ۔"

"چلو لیکن تم میرے ساتھ اندر نہ جانا۔"

"پہلے کب گئی ہوں جو اب جاؤں گی۔"

دونوں میاں بیوی دبے قدموں اس کمرے کے دروازے پر پہنچ گئے۔

کھٹ! آواز یقیناً اسی کمرے کے اندر سے آئی تھی۔

"سلارزی!" توصیف نے آواز دیتے ہوئے دروازہ تھپتھپایا۔

"کھٹ" کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

"سلارزی!" توصیف نے پھر پکارا۔

دروازہ جلد ہی کھل گیا لیکن توصیف کا خیال تھا کہ تھوڑی سی دیر ضرور لگی تھی۔

سلارزی دروازہ کھول کر پیچھے ہٹ گیا۔

"کب آئے؟" توصیف نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

عائشہ باہر ہی رک گئی تھی۔

"ابھی آیا ہوں۔ آدھے گھنٹے پہلے۔" سلارزی نے جواب دیا۔

"کچھ آوازیں آرہی تھیں یہاں سے!"

"آوازیں؟..... ہاں۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی تو کچھ کرنے لگا تھا۔"

"کیا کرنے لگے تھے؟"

"میں معافی چاہتا ہوں توصیف! یہ میری کم ظرفی ہے کہ تمہارے گھر کی چھت کے نیچے پناہ تو لے لی لیکن تمہارے ہی آرام کا خیال نہیں رکھا۔"

اسی وقت توصیف کی نظر ایک فریم پر پڑی اور وہ چونک گیا۔ فریم فرش پر دیوار کے سہارے رکھا ہوا تھا۔ توصیف کی نظر دیوار کی اس کیل کی طرف بھی گئی جس سے فریم لٹکایا گیا تھا۔

"یہ نیچے کیسے آگیا؟" توصیف بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

"بہت دھول جمی ہوئی تھی اس پر! میں نے ہی اتارا تھا۔ اس کی دھول صاف کررہا تھا۔ شاید اسی کی آواز سے تمہارے آرام میں خلل پڑا۔"

توصیف کو اس جواب پر یقین نہیں آیا۔ وہ آواز ایسی نہیں تھی جو فریم کا شیشہ جھاڑنے سے پیدا ہوتی۔ سلارزی یقیناً کوئی بات چھپا رہا تھا لیکن توصیف نے اس سے جرح نہیں کی اور کہا "سوا دو بج چکے ہیں۔ اب آرام کرو۔ تم دو راتیں سو کر گزار چکے ہو لیکن تمہاری آنکھوں کی سرخی ختم نہیں ہوئی۔"

"یہ شاید کبھی ختم نہیں ہوگی۔"

"کیوں!"

"وہ لوگ میرے علاج کے لیے میری کنپٹیوں پر بجلی کے جھٹکے دیتے تھے نا! اسی کا کچھ اثر ہے میری آنکھوں پر۔ اب تم جاؤ' آرام کرو۔"

توصیف نے سر ہلایا اور کچھ سوچتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔ عائشہ وہیں دیوار سے چپکی غالباً ان کی باتیں سنتی رہی تھی۔ توصیف نے دروازہ بند کیا اور عائشہ کو اشارہ کرکے قدم بڑھایا۔

اپنے کمرے میں پہنچنے کے بعد توصیف بڑبڑایا "سلارزی اب مجھے کچھ پُراسرار سا لگنے لگا ہے۔"

"سمجھ میں نہیں آسکا کہ وہ کیا کررہے تھے! وہ آوازیں فریم کا شیشہ جھاڑنے کی تو نہیں تھیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"آج صبح بھی تو آپ ان سے باتیں کرتے رہے تھے!"

"ہاں لیکن اس نے کوئی خاص بات نہیں بتائی تھی۔ دن بھر نہ جانے کہاں پھرتا رہتا ہے اور رات کو بھی دیر سے آتا ہے۔"

"ان کی حالت سے ایسا لگتا ہے جیسے انہیں کچھ کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہتا ہوگا۔"

"میں نے اسے آج کچھ اور پیسے دینا چاہے تھے مگر اس نے نہیں لیے۔ کہہ رہا تھا کہ ابھی وہ سو روپے ہی ختم نہیں

ہوئے ہیں۔"

"میں نے کہا نا کہ انہیں شاید کچھ کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہتا ہوگا۔"

"یا وہ معمولی کھانا کھاتا ہوگا تاکہ اسے مجھ سے مزید پیسے نہ لینا پڑیں۔ وہ پوری طرح ہوش و حواس میں نہیں معلوم ہوتا لیکن خاندانی خودداری اس کے لاشعور میں رچی ہوئی ہے۔"

"کسی دن آپ دفتر سے چھٹی کرکے ان کے پیچھے جائیں۔ معلوم تو ہو کہ وہ کہاں جاتے ہیں۔"

"ایک دن سے تو شاید کام نہ بنے۔"

"تو ایک ہفتے کی چھٹی لے لیجیے!"

توصیف متفکرانہ انداز میں سرہلا کر رہ گیا۔



دوسری صبح ناشتے کے بعد جبران کے دفتر جاتے ہی حسنہ نے غزالہ کی طرف دیکھتے ہوئے بے تابی سے پوچھا "بھائی جان کو آپ نے شیراز کے گھر کا پتا اور فون نمبر دے دیا نا؟"

"ہاں ہاں، دے دیا ہے۔ تم تو پاگل ہوئی جارہی ہو اس کے لیے!"

"وہ ہے ہی ایسا بھابی! میرے دل و دماغ پر ایک بوجھ ہے! بھائی جان اس سے جلد از جلد مل لیں تو یہ بوجھ ہٹ جائے گا۔"

"صرف ان کے ملنے سے بوجھ ہٹ جائے گا؟"

"ہاں بھابی! بس بھائی جان اس سے مل کر مطمئن ہوجائیں پھر ڈیڈی کو تو وہ منا ہی لیں گے۔"

"شیراز سے وہ جلدی تو شاید نہ مل سکیں۔ اچانک ہی انہیں اسلام آباد جانا پڑ رہا ہے۔ ان کے دفتر کا ہیڈ آفس اسلام آباد میں ہے نا! وہاں کسی وجہ سے ہنگامی طور پر ایک میٹنگ کال کی گئی ہے۔ اس میٹنگ میں تمہارے بھائی جان کا جانا بہت ضروری ہے۔ اسی میٹنگ کی وجہ سے وہ آج دفتر میں بھی بہت مصروف رہیں گے اور شام کو گھر آتے ہی فوراً ائر پورٹ جانے کی تیاری کریں گے۔ سات آٹھ بجے کے درمیان کوئی فلائٹ ہے جس سے وہ جارہے ہیں۔"

"واپسی کب ہوگی؟" حسنہ نے بجھے دل سے پوچھا۔

"میٹنگ کل صبح شروع ہوگی۔ اگر کل ہی ختم ہوگئی تو کل ہی آجائیں گے اور اگر میٹنگ کا دوسرا سیشن پرسوں بھی ہوا تو وہ پرسوں رات کو آسکیں گے۔"

"اب جو قدرت کو منظور۔" حسنہ نے ٹھنڈی سانس لی۔

"اس قسم کے معاملات میں زیادہ عجلت کرنا بھی نہیں چاہیے حسنہ!" غزالہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"اپنا وقت یاد کیجیے!" حسنہ نے شرارت سے کہا۔

"مجھے سب یاد ہے۔" غزالہ نے مسکرا کر کہا "میں نے اور جبران نے بڑے تحمل سے صحیح وقت کا انتظار کیا تھا۔"

"انتظار تو مجھے بھی کرنا ہی ہے۔" حسنہ اخبار اٹھا کر اس پر نظر دوڑانے لگی پھر چونکنے ہوئے انداز میں اس کے منہ سے "اوہ" نکلا۔

"کوئی خاص خبر ہے کیا؟" غزالہ نے پوچھا۔

"خبر نہیں، یہ اشتہار دیکھ کر چونکی ہوں میں۔"

"اشتہار میں کیا چونکانے والی بات ہے؟"

"یہ دیکھیے!" حسنہ نے اخبار اس کی طرف بڑھایا "اشتہار کی ماڈل گرل یہ وہی دھنک ہے نا جو آپ کی دوست ہے؟"

"ہاں۔" غزالہ نے اشتہار پر نظر ڈال کر اثبات میں سرہلایا۔

"آپ نے کہا تھا کہ مجھے اس کے بارے میں کچھ بتائیں گی۔"

"تم نے بعد میں اس کی بات ہی نہیں چھیڑی۔ شیراز کی باتیں کرنے سے ہی فرصت نہیں ملتی تمہیں!" غزالہ نے ہنس کر کہا۔

"اچھا چلیے اب اس وقت تو بتائیے! میں حیران ہوں کہ اس جیسی لڑکی آپ کی دوست ہے۔ خود آپ بھی اسے اچھا نہیں سمجھتی ورنہ بھائی جان سے یہ بات نہ چھپاتیں۔"

"ان سے چھپانے کا سبب کچھ اور ہے۔" غزالہ نے سنجیدگی سے کہا "میں ان کے مزاج سے واقف ہوں اس لیے مجھے ڈر لگتا ہے کہ وہ دھنک کی موافقت میں کسی اقدام کا فیصلہ نہ کرلیں۔ اس قسم کے لوگوں سے الجھنا ٹھیک نہیں رہتا۔ شریف آدمیوں کے لیے وہ کسی وقت بھی خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں۔"

"آپ کی باتوں نے تو میرا تجسس بہت بھڑکا دیا۔"

"میں نے کوئی مبالغہ نہیں کیا ہے حسنہ! شیریں کی زندگی ایسی ہی ہے جیسے کوئی مکھی کسی مکڑی کے جال میں پھنسی ہوئی ہو۔"

"شیریں؟"

"دھنک کا اصل نام شیریں ہے۔" غزالہ نے بتایا "اس سے میری دوستی لاہور میں ہی ہوئی تھی۔ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹی ہے لیکن ہم دونوں میں بہت قربت ہوگئی تھی۔

جب شادی کے بعد میں اور جبران کراچی آئے تھے تو وہ مجھ سے لپٹ کر بہت روئی تھی۔ بعد میں ہم دونوں آپس میں خط و کتابت کرتے رہے۔ اس کے والد بھی ہماری اس دوستی سے باخبر تھے۔ میں انہیں سلارزی انکل کہا کرتی تھی۔"

"سلارزی؟" حسنہ نے کہا "یہ کیا نام ہوا؟"

"دراصل یہ نام سلارزئی ہے لیکن اب اس قبیلے کے بعض لوگ خود کو زئی کے بجائے زی ہی لکھنے لگے ہیں۔ وہ خالص پٹھان ہیں۔"

"خیر چھوڑیے! آپ مجھے دھنک .... میرا مطلب ہے شیریں کے بارے میں بتائیے!"

غزالہ چند لمحے کسی سوچ میں ڈوبی رہی پھر اس نے بولنا شروع کیا۔ حسنہ خاموشی سے سنتی رہی۔ خاموشی سے اس نے سارے واقعات سن ڈالے لیکن درمیان میں ایک مرتبہ اس کے چہرے کا رنگ فق پڑ گیا اور پھر اس کا چہرہ بار بار رنگ بدلتا رہا۔ غزالہ اس کی اس کیفیت سے بے خبر رہی۔ وہ شیریں کے بارے میں وہ سب کچھ بتاتے ہوئے خاصی مغموم نظر آنے لگی تھی۔



شیریں ان دنوں کالج میں پڑھ رہی تھی جب اس کے باپ سلارزی کا سارا کاروبار کسی وجہ سے ایسا تباہ ہوا کہ زندگی بہت دشوار ہو گئی۔ سلارزی اس خوف کا شکار بھی ہو گیا کہ خرابی حالات کی وجہ سے اس کا مکان بھی بک گیا اور حالات نہ سدھر سکے تو اس کی بیٹیوں کی شادی کا کیا ہوگا۔ اسی خوف کے باعث اس نے فیصلہ کیا کہ مکان بیچ کر اس رقم سے فوراً ہی بیٹیوں کی شادی کردے۔ فیصلہ کرنے کے بعد قدم اٹھانے میں بھی اسے کچھ دیر لگی تو صرف اس لیے کہ لڑکیوں کا رشتہ ملنا آسان نہیں ہوتا۔ رہنے کے لیے اس نے کرائے کا مکان لے لیا تھا۔ گھریلو حالات کی تباہی کے صدمے سے سلارزی کی بیوی بیمار رہنے لگی تھی لیکن سلارزی نے اس کی صحت یابی کا انتظار نہیں کیا اور رشتہ ملتے ہی بڑی لڑکی کی شادی کردی۔ شادی کے بعد ہی وہ لڑکا اپنی بیوی کو لے کر امریکا چلا گیا۔ اس کے دو دن بعد ہی سلارزی کے گھر پر ڈاکا پڑا۔ چھوٹی بیٹی شیریں کا جو جہیز اس نے تیار کیا تھا' وہ سب اس طرح لٹا کہ اس صدمے سے سلارزی کی بیوی کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ ان حالات نے سلارزی کو کچھ مخبوط الحواس کردیا۔ اس نے اپنی بیٹی شیریں کو اس کے ماموں کے پاس راولپنڈی بھیج دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جوان بیٹی اس گھر میں رہے جہاں کوئی عورت نہیں تھی۔

شیریں کو یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ اپنے ماموں کے گھر میں بے سکون نہیں رہے گی کیونکہ اس کی ممانی بھی جب لاہور آتی تھی تو اس کے لیے کچھ نہ کچھ تحفے ضرور لاتی تھی لیکن چند دن میں ہی شیریں کو احساس ہو گیا کہ ممانی کی وہ دکھاوے کی محبت صرف اس صورت میں تھی جب وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں ایک خوش گوار زندگی گزار رہی تھی۔ حالات بگڑ جانے کے بعد وہ شیریں کو اپنے گھر میں بوجھ سمجھنے لگی تھی۔ شیریں سے اس کا رویہ خراب سے خراب تر ہوتا چلا گیا۔ اس کے ماموں کو اس کی خبر ہو نہیں سکی کیونکہ وہ ریلوے میں ٹکٹ چیکر ہونے کی وجہ سے دو دو دن اپنے گھر میں نہیں رہ پاتا تھا اور جب وہ آتا تھا تو شیریں کو ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ ماموں سے اپنی ممانی کی شکایت کرے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ ماموں کے گھر کی زندگی میں تلخیوں کو جنم دے۔ وہ اپنی قسمت پر شاکر ہو کر زندگی گزارنے لگی۔ باپ کو خط بھی لکھتی تھی تو اس سے بھی ممانی کی کوئی شکایت نہیں کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا باپ اپنی زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہوگا اس لیے شیریں اسے اپنی طرف سے پریشان نہ کرے تو بہتر ہے۔ اسے اپنے باپ کی طرف سے بہت کم جواب ملتا تھا اور پھر ایسا ہوا کہ اس کی طرف سے ڈیڑھ ماہ تک کوئی خط نہیں آیا۔ ماموں شیریں کو سمجھایا کرتے تھے کہ اس کا باپ زیادہ مصروف ہو گیا ہوگا اس لیے جواب نہیں دے سکا لیکن شیریں کا اضطراب بڑھتا ہی رہا پھر یکایک اسے ایک ایسی اطلاع ملی کہ وہ سر سے پیر تک لرز کر رہ گئی۔ اس کے ماموں کے کسی جاننے والے نے جو لاہور میں رہتا تھا' خط میں لکھا تھا کہ اس کے باپ پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے تھے جو بہت جلدی اتنے خطرناک ہو گئے کہ پولیس نے اسے پکڑ کر پاگل خانے بھیج دیا۔

شیریں کے لیے وہ ایک تڑپا دینے والی اطلاع تھی۔ اس نے اسی دن لاہور جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کا ماموں اپنے دوست کا خط آنے سے صرف چار گھنٹے پہلے اپنی ڈیوٹی پر گیا تھا اور دو دن سے پہلے اس کی واپسی کے امکانات نہیں تھے۔ شیریں اپنی ممانی کو کچھ بتائے بغیر گھر سے نکل کر اس بس اڈے تک پہنچ گئی جہاں سے لاہور واپس جا سکتی۔ وہ جب لاہور سے آئی تھی تو اسی بس اڈے پر اتری تھی لیکن اس دن اس کا ماموں اسے لینے کے لیے وہاں موجود تھا اور لاہور سے اس کے باپ نے بس میں بٹھایا تھا۔

شیریں حواس باختگی کے عالم میں ایک بس میں بیٹھ کر

روانہ ہوگئی۔ زندگی میں اپنے طور پر اس نے تن تنہا کبھی سفر نہیں کیا تھا۔ وہ اس کا پہلا موقع تھا اور وہ حواس باختہ بھی تھی۔ اس عالم میں اس سے ایک فاش غلطی ہوگئی۔ وہ لاہور کی طرف جانے والی بس کے بجائے پشاور کے شہروں کی طرف جانے والی بس میں سوار ہوگئی تھی۔ بس اس کا ستارہ ہی گردش میں آگیا تھا کہ ٹکٹ دینے والا بھی اس کی بات نہ سمجھ سکا یا شیریں نے اس کی بات نہیں سمجھی۔ اپنی غلطی کا احساس اسے خاصی دیر سے اس وقت ہوا جب پاس بیٹھی ہوئی عورت کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ بس صوبہ سرحد کے شہروں کی طرف جارہی تھی۔

یہ علم ہونے کے بعد جو اسٹاپ آیا' شیریں وہیں اتر پڑی۔ کوہاٹ شہر تھا۔ شیریں ایک طرف کھڑی ہوکر سوچنے لگی کہ اب کیا کرے' کس سے کیا پوچھے اور کس بس میں بیٹھ کر واپس روانہ ہو۔ اس کی پریشانی اس کی حرکات و سکنات اور چہرے سے صاف ظاہر ہورہی تھی اس لیے ایک نوجوان جوڑا اس کے قریب آگیا اور لڑکی اس سے پوچھنے لگی کہ وہ کیوں پریشان ہے۔

شیریں پہلے تو یہ سمجھی تھی کہ وہ دونوں میاں بیوی ہوں گے لیکن لڑکی نے بتایا کہ وہ دونوں بہن بھائی تھے۔ بہن کا نام شہناز اور بھائی کا نام انور تھا۔ وہ دونوں حیدر آباد میں رہتے تھے اور ان دنوں مختلف شہروں کی سیاحت کے لیے نکلے ہوئے تھے۔

ان کا ہمدردانہ انداز دیکھ کر شیریں نے انہیں اپنی پریشانی سے آگاہ کردیا۔ وہ سن کران دونوں نے مزید ہمدردی کا اظہار کیا اور اسے لاہور پہنچانے کی پیش کش کی۔

ان دونوں کا انداز ایسا تھا کہ شیریں نے ان پر اعتبار کرلیا۔ وہ ان کے ساتھ واپس راولپنڈی پہنچی تو اس کا اعتبار اور بڑھ گیا پھر لاہور پہنچنے کے بعد تو اس کی یہ حالت تھی کہ اگر اسے ان دونوں کے پاؤں چوم کر شکریہ ادا کرنا پڑتا تو وہ اس سے بھی گریز نہیں کرتی۔

پنڈی سے لاہور آتے ہوئے اس نے ان دونوں کو وہ سارے حالات بھی بتادیے تھے جن کی وجہ سے اسے لاہور سے پنڈی جانا پڑا تھا اور حواس باختگی کے عالم میں وہ پھر لاہور روانہ ہوئی تھی۔

لاہور پہنچنے کے بعد شیریں ان سے جدا ہوجانا چاہتی تھی لیکن ان دونوں نے اس سے شدید اپنائیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ اسے اس شہر میں تنہا نہیں چھوڑیں گے جہاں اس کا کوئی نہیں تھا۔

شیریں اپنے گھر پہنچی تو شہناز اور انور اس کے ساتھ تھے۔ شیریں نے اپنے باپ کے بارے میں خود ساری معلومات حاصل کیں اور سسک سسک کر رونے لگی۔ سبھی کا یہ کہنا تھا کہ اس کا باپ اپنی بیوی کی موت کے صدمے سے پاگل ہوا تھا۔

شیریں کے لیے دنیا اندھیر ہوچکی تھی۔ کوئی نہیں تھا جو اس کا سہارا بن سکتا۔ اس وقت بھی شہناز اور انور نے اس کی ڈھارس بندھائی اور اس سے کہا کہ وہ ان کے ساتھ حیدر آباد چلی جائے۔ وہاں رہتے ہوئے بھی پاگل خانے سے رابطہ رکھا جاسکتا تھا لہٰذا جب بھی اسے اپنے باپ کا پاگل پن ختم ہونے کی اطلاع ملتی' شہناز اور انور اسے اس کے باپ کے پاس پہنچادیتے۔

شہناز کو شدت سے احساس ہوچکا تھا کہ باپ کے پاگل پن کے بعد وہ بالکل بے سہارا ہوچکی تھی اور ماموں کے گھر واپس جانے کے بارے میں وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی اس لیے اس نے وہ پیش کش اس شرط کے ساتھ منظور کرلی کہ وہ حیدر آباد میں اسے کوئی ملازمت دلوا دیں گے۔ وہ انہیں بتاچکی تھی کہ اس نے ایف اے تک پڑھا تھا۔

حیدر آباد پہنچنے کے بعد شیریں کو پتا چلا کہ شہناز اور انور ایک چھوٹے سے بنگلے میں اکیلے رہا کرتے تھے۔ ان کے والدین کا انتقال ہوچکا تھا۔ والد نے جو ایک اچھا خاصا کاروبار چھوڑا تھا' اسے انور نے سنبھال لیا تھا۔

حیدر آباد آتے ہوئے شیریں نے یہ بھی سوچا تھا کہ اب وہ اپنی دوست غزالہ سے بھی رابطہ کرے گی جو کراچی میں رہتی تھی۔

حیدر آباد پہنچنے کے بعد انور اور شہناز نے شیریں کو کچھ ملبوسات بھی دلائے۔ شیریں انکار کرتی رہی تھی لیکن ان دونوں نے شدید اصرار کے ساتھ خود ہی یہ شرط بھی اپنے اوپر لاگو کرلی تھی کہ شیریں ملازمت ملنے کے بعد ان کا یہ قرض واپس کردے گی۔

رات کو بنگلے میں شہناز نے شیریں کو اپنے کمرے میں سلایا اور اسی رات ایک ایسی بات کہی کہ شیریں ہکا بکا رہ گئی۔

"دیکھو شیریں! اتنا وقت ساتھ گزارنے کے بعد مجھے ایسا لگنے لگا ہے جیسے تم میری بہت ہی گہری دوست ہو اور جو گہرے دوست ہوتے ہیں' وہ اپنی باتیں ایک دوسرے سے نہیں چھپاتے۔ تم تو اپنے بارے میں سب کچھ بتاچکی ہو اور اب میں بھی تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتادینا چاہتی

ہوں۔ مجھے کسی سے محبت ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں لیکن میں یہ نہیں چاہتی کہ بھائی جان اکیلے رہ جائیں۔ میری خواہش ہے کہ پہلے ان کی شادی ہو۔ ہمارے والدین تو ان کی شادی کا ارمان لیے دنیا سے رخصت ہوچکے ہیں۔ بھائی جان کو کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی تھی لیکن تم نے اتنے کم وقت میں ان پر نہ جانے کیا جادو کردیا ہے کہ وہ تم سے شادی کرنے کے لیے انتہائی بے تاب ہیں۔"

شیریں اس کا منہ تکتی رہ گئی۔

شہناز مسکرا کر بولی "تم ان سے شادی کرلوگی تو مجھے بھی میرا محبوب مل جائے گا۔ شادی تو تمہیں کبھی نہ کبھی کسی سے کرنا ہی ہے۔ تم یقیناً کسی اچھے ہی انسان کو اپنا شریکِ زندگی بنانا چاہوگی اور میرا خیال ہے کہ تم نے میرے بھائی جان کو ایک اچھا ہی انسان پایا ہوگا۔"

شیریں اسے کوئی جواب نہیں دے سکی۔ شہناز نے بھی اسی وقت جواب کے لیے اصرار نہیں کیا۔ اس رات شیریں کو نیند نہیں آسکی۔ اسے محسوس ہورہا تھا کہ اس نے جاگتی آنکھوں سے ایک طویل اور بے تکا سا خواب دیکھ ڈالا ہے۔ باپ کے کاروبار کی تباہی' بڑی بہن کی شادی اور اس کی امریکا روانگی پھر ماں کی موت' لاہور سے راولپنڈی روانگی' ممانی کی زیادتیاں پھر باپ کے پاگل پن کی خبر' پنڈی سے لاہور جانے کی کوشش میں کوہاٹ پہنچنا' وہاں شہناز اور انور سے ملاقات' وہاں سے لاہور روانگی' باپ کے بارے میں ساری معلومات' شہناز اور انور کی پیشکش پھر ان کے ساتھ حیدر آباد آنا! یہ سب کچھ ایک طویل خواب تھا جس کے آخری حصے میں انور کی شادی کی پیش کش بھی اس کے سامنے آگئی تھی۔

شیریں نے انور کے بارے میں بھی بہت سوچا۔ دونوں بہن بھائی اسے بہت پسند آئے تھے۔ اس پسندیدگی کا سبب یہ بھی تھا کہ وہ ان کی بے حد احسان مند تھی۔ اسے اپنا وجود ایک کٹی ہوئی پتنگ کی طرح معلوم ہورہا تھا جسے اچانک کوئی سنبھالنے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔

شیریں کے اندازے کے مطابق انور کی عمر اس سے پانچ سال زیادہ تھی۔ وہ بڑھا لکھا بھی تھا۔ اس کی شخصیت بھی دلآویز تھی۔ وہ کسی اچھی سے اچھی لڑکی کے لیے خوابوں کا شہزادہ بن سکتا تھا جبکہ شیریں تو خود کو بالکل بے سہارا محسوس کررہی تھی اس لیے اسے ایسا لگا جیسے خدا کو اس کی لاچاری پر ترس آگیا تھا اور قسمت کی دیوی اس کے دروازے پر دستک دینے چلی آئی تھی۔

دوسرے دن انور کار میں اپنے دفتر چلا گیا۔ شہناز' شیریں کے ساتھ گھر پر ہی رہی۔ اس دن اس نے شیریں کے سامنے اپنی رات کی بات پھر دہرائی اور اس وقت جواب کے لیے اصرار بھی کیا۔

شیریں کو محسوس ہورہا تھا کہ انور اس کی بے سہارا زندگی کے لیے ایک ستون بن جائے گا۔ اس نے کچھ تذبذب کے بعد شہناز کی بات مان لی اور شہناز نے خوش ہوکر اسے گلے سے لگالیا۔

اسی شام کو انور نے تنہائی میں اس سے بات کی "میں بہت خوش ہوں شیریں کہ تم نے مجھے مسترد نہیں کیا لیکن مجھے اس بات کا افسوس رہے گا کہ ہماری شادی دھوم دھام سے نہیں ہوسکے گی۔ قدرت کی ستم ظریفی سے تمہارا کوئی سرپرست نہیں ہے اس لیے صرف میری طرف سے دھوم دھام' یک طرفہ دھوم دھام ہوگی جو مجھے اچھی نہیں لگے گی اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ ہماری شادی بہت سادگی سے ہوجائے۔"

شیریں کو اس پر کوئی اعتراض ہو ہی نہیں سکتا تھا لیکن اس خیال سے وہ بہت دکھی رہی کہ اس کا باپ زندہ تھا لیکن اس کا سرپرست نہیں بن سکتا تھا۔

انور کو اتنی عجلت تھی کہ اگلے ہی دن ان کی شادی اتنی سادگی سے ہوگئی کہ اس وقت انور کے چند دوستوں اور شہناز کے سوا کوئی نہیں تھا۔

شیریں چند دن تو بجھی بجھی سی رہی لیکن انور کی پُرجوش محبت نے اسے ایک بار پھر زندگی کی رعنائیوں کی طرف متوجہ کردیا۔ وہ دفتر سے آنے کے بعد اپنا سارا وقت شیریں کے ساتھ گزارتا تھا۔ دوسرے تیسرے دن اسے شاپنگ کرانے بھی لے جاتا۔ اس کی وارفتگی ایسی تھی کہ شیریں ان دنوں میں اپنی دوست غزالہ کو بھی بھولے رہی جو کراچی میں رہتی تھی۔

وہ ان کی شادی کا بیسواں دن تھا۔ اس دن انور نے اپنے دفتر سے چھٹی کرلی تھی۔ وہ شیریں کے ساتھ کار میں گھومنے نکل پڑا۔

"شہناز کی شادی کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" شیریں بولی۔

"اس میں کچھ وقت اب اس لیے لگے گا کہ وہ لڑکا کچھ دن کے لیے کسی کام سے بینکاک گیا ہوا ہے۔" انور نے جواب دیا "وہ واپس آجائے تو میں اس ذمے داری سے سبکدوش ہونے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔ وہ میرے والد کے ایک دوست کا لڑکا ہے لیکن ہم انہیں انکل کہتے ہیں۔ انہیں

مجھ سے شکایت بھی رہے گی کہ میں نے چپ چپاتے شادی کرلی۔ میں اور شہناز اکثر ان سے ملنے جاتے ہیں۔ ان کا گھر نواب شاہ میں ہے۔ شہناز دو تین دن میں ان سے ملنے جارہی ہے لیکن میری مصروفیت ایسی ہے کہ میں ابھی نہیں جاسکوں گا۔"

"کسی دن آپ مجھے تو اپنا دفتر دکھائیے نا!"

"کسی خاص موقع پر لے چلوں گا۔"

"خاص موقع کیسا ہوگا؟"

اسی وقت انور نے کار روک دی۔

شیریں نے چونک کر پوچھا "یہاں کیوں رک گئے؟"

"یہاں جیولری کی بڑی بڑی اچھی دکانیں ہیں۔ کچھ شاپنگ کرلینا۔"

"خاصی شاپنگ تو آپ مجھے کرا چکے ہیں۔"

"آج بھی ہماری جان کچھ شاپنگ کرلے گی تو کیا فرق پڑے گا۔" انور نے بڑی محبت سے کہا "چلو اترو۔"

کار سے اتر کر ان دونوں نے جیولری کی کئی دکانوں کا چکر لگایا اور معمولی معمولی سی دو ایک چیزیں خرید کر بولی "بس اب چلیے!"

"تم نے دس ہزار کی شاپنگ بھی نہیں کی!" انور نے کہا۔

"پیسہ اس لیے تو نہیں ہوتا کہ بس لٹایا جاتا رہے!"

وہ دکان سے نکلے ہی تھے کہ ایک نوجوان نے بڑی زور سے انور کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "یار، بڑے چھپے رستم نکلے!"

"ارے ذاکر!" انور نے ہنس کر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "اس مرتبہ بہت دن بعد آئے ہو حیدر آباد! اور یہ تم نے مجھے چھپا رستم کیوں کہا؟... تم کیا سمجھ رہے ہو انہیں!" اس نے شیریں کی طرف اشارہ کیا "یہ تمہاری بھابی ہیں، کوئی ایری غیری نہیں ہیں۔"

"ارے!" ذاکر اچھل پڑا "شادی کرلی تم نے اور مجھے خبر بھی نہیں کی!"

"یار بس صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ سب کچھ بڑی سادگی سے کرنا پڑا۔"

"یہ تم نے بہت برا کیا کہ مجھے نہیں بلایا۔ ویسے تو منہ دکھاوے کو کہتے رہتے ہو کہ میں تمہارا سب سے اچھا دوست ہوں۔" پھر وہ شیریں سے بولا "معاف کیجئے گا بھابی! آپ نے اسے اپنا شوہر بنا کر اچھا نہیں کیا۔ بڑا نالائق ہے یہ! غضب خدا کا! مجھے بھول گیا اپنی شادی میں!"

شیریں مسکرا کر رہ گئی لیکن انور بولا "یار کہا نا کہ سب کچھ بڑی عجلت میں اور بڑی سادگی سے ہوا تھا۔"

"اچھا اب میرے ساتھ آؤ۔" ذاکر نے انور کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا "آپ بھی آئیے بھابی!"

وہ اسی دکان میں داخل ہونے لگا جس سے وہ دونوں نکلے تھے۔

"آخر بات کیا ہے یار!" انور بولا۔

"تم نے مجھے شادی میں شریک نہیں کیا لیکن میرا فرض ہے نا کہ تمہیں شادی کا تحفہ دوں۔"

"ارے یار، تو دے دینا، ایسی جلدی کیا ہے۔"

"بزرگوں نے کہا ہے کہ جو کل کرنا ہو، وہ آج کرو۔" ذاکر نے کہا اور پھر سیلزمین سے کہا "کوئی اچھا سا سیٹ دکھائیے!"

سیلزمین نے یکے بعد دیگرے کئی سیٹ نکال کر شوکیس پر رکھ دیے۔ ذاکر نے شیریں کی طرف دیکھ کر کہا "آپ پسند کیجئے بھابی!"

"ارے یہ تو بہت قیمتی ہوں گے۔" شیریں نے کہا۔

"یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔"

شیریں نے اس کے بعد بھی گریز کیا تو ذاکر نے خود ہی ایک سیٹ پسند کرکے اس کی قیمت پوچھی۔ وہ سیٹ پینتالیس ہزار کا تھا۔ ذاکر نے پرس نکال کر اس کی قیمت ادا کی۔ سیٹ پیک کروایا اور بڑے احترام سے شیریں کی طرف بڑھایا "یہ حقیر سا تحفہ قبول کیجئے بھابی!"

شیریں نے انور کی طرف دیکھا۔

"لے لو بھئی!" انور نے ہنس کر کہا "یہ جان تھوڑی چھوڑے گا۔"

شیریں نے شکریے کے ساتھ تحفہ قبول کرلیا۔

دکان سے نکلتے ہوئے انور نے ذاکر سے کہا "اب ہمارے ساتھ گھر چلو۔ رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھانا ہوگا۔"

"آج نہیں یار! مجھے دو گھنٹے میں کراچی واپس پہنچنا ہے۔ ڈیڈی انتظار کررہے ہوں گے۔ کھانا تو کسی دن بھی کھایا جاسکتا ہے۔"

"دو مہینے بعد تو آج ملے ہو۔"

"یار میں باہر چلا گیا تھا۔ کراچی میں ہوتا تو اتنے دن تھوڑی لگ سکتے تھے۔ تم جانتے ہی ہو کہ دوسرے تیسرے دن حیدر آباد آنا میرے لیے لازمی ہے۔ آج کے بعد جس دن بھی آؤں گا، تمہارے گھر ضرور آؤں گا۔ شادی کے بعد گھر تبدیل

تو نہیں کردیا؟"

"گھر کیوں تبدیل کرتا؟"

"بس تو پھر میں آؤں گا اور ہاں! شہناز کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ وہ بھی دو ایک بار پوچھ چکی ہے کہ ذاکر بھائی کیوں نہیں آئے!"

"اچھا میری اس پیاری بہن کو میری بہت سی دعائیں دینا۔ اب میں چلتا ہوں۔" اس نے شیریں کی طرف دیکھا "خدا حافظ بھابی!"

"خدا حافظ۔" شیریں نے کہا۔

ذاکر کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی کار کی طرف بڑھ گیا۔

شیریں نے واپسی پر کار میں انور سے کہا "یہ آپ کے بہت ہی زیادہ بے تکلف دوست معلوم ہوتے ہیں!"

"میرا سب سے قریبی دوست یہی ہے۔"

"خاصا مہنگا تحفہ دیا ہے انہوں نے!"

"وہ اس سے بھی زیادہ مہنگا تحفہ دے سکتا ہے۔ پچاس ساٹھ ہزار روپیہ تو اس کی جیب میں ہر وقت پڑا رہتا ہے۔ دوستوں اور ان کی بیویوں کو تحائف دینا اس کا شوق بھی ہے۔"

بات آئی گئی ہوئی۔

دو دن بعد شہناز نے دوپہر کے کھانے پر شیریں کو بتایا کہ وہ تیسرے پہر تک نواب شاہ کے لیے روانہ ہوجائے گی۔

شہناز کے جانے کے بعد شیریں کو گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ وہ تنہا رہنے کی عادی نہیں تھی۔ انور جب دفتر چلا جاتا تھا تو وہ شہناز ہی کے ساتھ وقت گزارتی تھی۔ شہناز کی روانگی کے ایک گھنٹے بعد اس نے انور کے دفتر فون کیا اور اس سے پوچھا کہ وہ کب گھر آئے گا۔ جواب میں انور نے کہا۔

"دفتر سے اٹھنے کا وقت تو ہوگیا ہے لیکن آج کچھ کام زیادہ ہے۔ دیر سے آؤں گا۔ ممکن ہے کل بھی دیر سے آؤں۔"

"آج ہی شہناز گئی ہے اور آج ہی آپ کو زیادہ کام بھی ہوگیا۔" شیریں نے پریشانی سے کہا۔

"جب اس کی شادی ہوجائے گی تو کیا کرو گی؟" انور ہنسا۔

"آدمی حالات کے تحت ہی خود کو ایڈجسٹ کرتا ہے۔"

"ابھی سے عادت ڈالو نا اس کی۔ خیر، میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔"

شیریں نے فون رکھا ہی تھا کہ اسے کال بیل کی آواز سنائی دی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کا خیال تھا کہ چوکی دار کچھ پوچھنے آیا ہوگا۔ چوبیس گھنٹے کے لیے صرف وہی ایک ملازم تھا۔ گھر کے کام کاج کے لیے جو ملازمہ تھی، وہ دوپہر تک سارا کام کرکے چلی جاتی تھی۔

شیریں نے دروازہ کھولا اور چونک گئی۔ وہ چوکیدار نہیں بلکہ انور کا دوست ذاکر تھا۔

"ہیلو!" وہ مسکراتا ہوا بے تکلفی سے اندر آگیا۔ "کہاں ہے ہمارا یار جانی۔"

"وہ تو ابھی دفتر سے نہیں آئے۔ شاید انہیں کچھ دیر بھی ہوجائے آج۔" شیریں نے جواب دیا اور پھر کچھ پریشانی سے بولی "کیا پھاٹک پر چوکیدار نہیں ہے؟"

"وہ تو ہے لیکن اسے اتنی ہمت کہاں ہوسکتی ہے کہ مجھے روکتا۔ وہ جانتا ہے کہ میں اور انور کیسے دوست ہیں۔ خیر! انور آج دیر سے کیوں آئے گا؟... آج میں آیا ہوں اور آج ہی وہ دیر سے آئے گا۔"

"دفتر میں کچھ کام ہوگیا ہے۔ ابھی فون پر بات ہوئی تھی ان سے۔"

"اسے ایک بار پھر فون کرو بھابی! بلکہ میرے سامنے کرو۔ میں ابھی بات کروں گا اس سے۔"

شیریں نے فون کیا اور انور کو ذاکر کی آمد سے باخبر کیا۔

"اس کم بخت کو بھی آج ہی آنا تھا۔" انور نے کہا "اس سے بات کراؤ میری۔"

شیریں نے ریسیور ذاکر کو دے دیا۔ "ہیلو!" ذاکر دہاڑا "تجھے بھی آج ہی زیادہ کام نکل آیا..... دو گھنٹے؟ ارے میں کیا اتنی دیر تک بور ہوتا رہوں؟ خیر وہ تو میری جیب میں ہر وقت رہتی ہے لیکن..... اچھا... اچھا یار!" ذاکر نے ٹھنڈی سانس لی "میں انتظار کرتا ہوں تیرا لیکن کیا کچھ کھانے پینے کو مل جائے گا؟ اچھا۔" ذاکر نے ریسیور شیریں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے وہ!"

شیریں نے ریسیور کان سے لگایا "ہیلو۔"

"شیریں! فریج میں کچھ کباب تو بنے رکھے ہوں گے۔ وہ تل دو ذاکر کو، دو چار انڈے بھی ابال دینا۔ اب وہ بوریت تو کسی طرح دور کرے گا نا اپنی! بوتل اس کی جیب میں رہتی ہے۔ بس ایک جگ پانی اور گلاس دے دینا اسے۔"

شیریں کا دل دھک سے رہ گیا۔ ذاکر قریب ہی کھڑا مسکرا رہا تھا اس لیے وہ انور سے کچھ نہ کہہ سکی۔

"اسے کوئی شکایت نہیں ہونا چاہیے شیریں!" انور نے پھر کہا "اب ریسیور پھر اسے دے دو۔ تم اس کے لیے سب

ضروری چیزوں کا بندوبست کرو۔"
شیریں نے ریسیور ذاکر کو دے دیا اور وہاں سے کچن کی طرف چلی گئی۔ یہ اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ گھر میں اکیلی تھی لیکن ذاکر وہاں بیٹھ کر شراب پیتا۔ وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ کیا انور بھی پیتا ہوگا؟ اس نے ایک جگ میں ٹھنڈا پانی بھرا اور گلاس کے ساتھ ٹرے میں رکھ کر ڈرائنگ روم میں لے گئی۔
"تھینک یو!" ذاکر مسکرایا "میرا تحفہ کیسا تھا؟"
"بہت اچھا۔" شیریں نے مسکرانے کی کوشش کی پھر جلدی سے بولی "میں آپ کے لیے کچھ تیار کرلاؤں۔"
ذاکر نے کچھ نہیں کہا۔ شیریں جلدی سے کچن میں لوٹی۔ اس نے چار انڈے ابلنے کے لیے رکھے اور پھر فریج سے کباب نکال کر تلنے لگی۔ یہ سب چیزیں تیار کرکے وہ ڈرائنگ روم میں لے گئی تو ذاکر نے پینا شروع کردیا تھا۔ شراب کی ایک چپٹی سی بوتل تپائی پر رکھی ہوئی تھی۔
"واہ! کباب دیکھ کر تو میری رال ٹپکنے لگتی ہے۔" ذاکر نے کہا "بیٹھو۔"
"اب آپ آئے ہیں تو مجھے کھانے کا اہتمام تو کرنا پڑے گا نا!"
"ارے نہیں!" ذاکر نے کہا "فون پر انور سے میری بات ہو چکی ہے۔ وہ کسی ہوٹل سے کھانا لیتا ہوا آئے گا۔ بیٹھو بیٹھو! انور نے مجھے بتادیا ہے کہ تم نہیں پیتیں لیکن میرے ساتھ بیٹھ تو سکتی ہو! اکیلے بیٹھ کر تو مجھے بہت بوریت ہوگی۔ انور بھی پیتا نہیں ہے لیکن میرے ساتھ بیٹھتا ضرور ہے۔"
شیریں کو بیٹھنا پڑا۔ انور اسے تاکید کر چکا تھا کہ ذاکر کو کسی قسم کی شکایت نہیں ہونا چاہیے۔ ذاکر اسے بتانے لگا کہ اسے اپنے باپ کے کاروبار میں اتنی ذمّے داریاں سنبھالنا پڑتی ہیں کہ جب بھی اسے تھوڑا بہت وقت ملتا ہے تو وہ کچھ شراب پی کر اپنی تکان دور کرتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اسے پامسٹری کا بھی بہت شوق ہے لیکن مصروفیت کی وجہ سے اس کے لیے بھی بہت کم وقت نکال پاتا ہے۔
"فون پر انور نے کہا تھا کہ میں تمہارا ہاتھ دیکھوں۔" وہ بولا۔
"مجھے ان باتوں پر کوئی یقین نہیں ہے۔" شیریں نے جلدی سے کہا۔
"لیکن انور چاہتا ہے کہ میں تمہارا ہاتھ دیکھوں اور اسے تمہارے بارے میں بتاؤں۔" ذاکر مسکراتا ہوا اٹھا اور صوفے پر اس کے برابر میں آبیٹھا "لاؤ پہلے اپنا الٹا ہاتھ دکھاؤ۔"
شیریں تذبذب تھی لیکن جب ذاکر نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو شیریں نے جلدی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اسے ڈر تھا کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں کہیں ذاکر کا ہاتھ اس کے جسم سے نہ چھو جائے کیونکہ وہ اس کے دائیں ہاتھ پر بیٹھا تھا۔
ذاکر اس کے ہاتھ کی لکیروں کا جائزہ لیتے ہوئے اسے بتاتا رہا کہ ماضی میں اس کی زندگی خاصی مشکلات کا شکار رہی ہے۔ وہ پانچ سات منٹ تک بولتا رہا، پھر شیریں کے ہاتھ کو آہستہ آہستہ دبانے لگا "تمہارے ہاتھ بہت گداز ہیں اور ایسے ہاتھ.... میں ان ہاتھوں کے بارے میں بہت کچھ کہہ سکتا ہوں۔" ذاکر دائیں ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑے رہا اور اپنا بایاں ہاتھ شیریں کی کلائی سے اس کے بازو تک لے گیا۔
شیریں کا سارا جسم سنسنا اٹھا۔ اس نے یکایک صوفے سے اٹھ جانا چاہا لیکن اس نے خود کو بے جان سا محسوس کیا۔ ذاکر کے ہاتھ کے لمس میں ایسی نہ جانے کیا بات تھی کہ اس کا سارا وجود جیسے کسی پگھلی ہوئی آگ میں ڈوبنے لگا تھا۔ اس نے ذاکر کی نیت بھانپ لی تھی۔ وہ دل ہی دل میں چیخ اٹھی "انور! انور.... آجاؤ انور۔ میں بے بس ہوئی جارہی ہوں، مجھے بچالو۔ میں اس کی نوبت نہیں آنے دیتی لیکن تم نے تاکید کی تھی کہ ذاکر کو کسی قسم کی شکایت نہ ہو۔"
لیکن انور کو آنا تھا، نہ آیا۔ شیریں نے اپنی کیفیت سے لڑنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکی۔ ذاکر کے طلسماتی لمس نے اس کی قوتِ ارادی کو جیسے چور چور کردیا تھا۔ اس کے تنفس کی بڑھی ہوئی رفتار سے بھی ذاکر نے فائدہ اٹھایا اور شیریں کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔
اور جب شیریں کی آنکھیں کھلیں تو ان آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ سکتے کی سی حالت میں بیٹھی رہ گئی۔ اسے اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کا بھی احساس نہیں تھا۔
ذاکر نے دوسرا پیگ بنایا اور ایک بار پھر شیریں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر لکیروں کا جائزہ لیتے ہوئے بڑبڑانے لگا "تم واقعی جادوگر ہو۔ تمہاری لکیروں نے مجھے بالکل ٹھیک بتایا تھا۔ بڑا خوش قسمت ہے انور کہ تم اس کی بیوی بنی ہو۔"
شیریں مجسمے کی طرح ساکت رہی۔ اس کے دماغ میں ایک بھونچال سا آیا ہوا تھا۔ کسی وقت اس کی آنکھوں سے آنسو بہنا بھی بند ہوگئے جس کا اسے بالکل خیال نہیں آیا۔
جب انور آیا تو اسے دیکھ کر شیریں کے ہونٹ کانپنے لگے اور ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"کیا ہوا؟" انور نے اسے حیرت سے دیکھا۔
"کچھ نہیں یار۔" ذاکر نے مخمور لہجے میں کہا "میں تمہاری بیوی کا ہاتھ دیکھ کر انہیں بتا رہا تھا کہ ان کی خوش قسمتی 'ان کے شوہر کے لیے بھی خوش قسمتی کا پیغام ہے۔"
یکایک انور کے چہرے پر سنجیدگی دکھائی دی۔ شیریں نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ انور کی آنکھیں لپ اسٹک کے وہ سرخ داغ دیکھ رہی تھیں جو ذاکر کی قمیص پر دکھائی دے رہے تھے۔
یکایک شیریں اپنی جگہ سے اٹھی اور انور سے لپٹ گئی "انور.... انور۔ میں بالکل.... میں نے تو.... میں...." اس کی کیفیت ہذیانی سی تھی۔ اس نے جو کچھ کہنا چاہا تھا' کہہ نہیں سکی تھی۔
انور نے اس کی پیٹھ تھپکی "عجیب ہو تم بھی۔ آج پہلی مرتبہ مجھے کچھ دیر ہوئی اور تم۔ خیر چھوڑو۔ کھانا لگاؤ میز پر۔ یہ کھانے کے پیکٹ ہیں۔"
شیریں کے لیے انور کا ردِّعمل اتنا غیر متوقع تھا کہ اس کے دماغ کو ایک عجیب سا جھٹکا لگا اور وہ انور کا منہ تکنے لگی۔
آدھے گھنٹے بعد ذاکر کھانا کھا کر چلا گیا۔ وہ انور سے اس طرح باتیں کرتا رہا تھا جیسے انور کی موجودگی میں وہاں کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا ہو۔
اسے رخصت کرنے کے بعد انور نے شیریں کا بازو پکڑا اور اسے بیڈ روم کی طرف لے جانے لگا۔ اس وقت شیریں سہم گئی۔ وہ سمجھی تھی کہ انور اپنے دوست کے سامنے اس سے کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا لیکن اب وہ اس سے کسی بھی قسم کا سخت برتاؤ کر سکتا تھا۔
لیکن کمرے میں پہنچنے کے بعد انور کا ردِّعمل شیریں کے لیے ایک بار پھر غیر متوقع ہو گیا۔ اس نے شیریں کو بستر پر بٹھاتے ہوئے کہا "آرام کرو۔" خود وہ کپڑے تبدیل کرنے لگا۔
شیریں ایک بار پھر سکتے کی سی کیفیت میں رہ گئی۔
کپڑے تبدیل کر کے انور بستر پر لیٹا اور بولا "تم ابھی تک بیٹھی ہوئی ہو۔ میں نے کہا نا کہ لیٹ جاؤ۔ جو ہو گیا' سو ہو گیا' اب اس کا ماتم کرنے سے کیا حاصل؟ اب تو یہ سوچنا ہے کہ جو کچھ ہو گیا' اس سے فائدہ تو اٹھایا جائے۔ ذاکر کو اس کی بہت بڑی قیمت تو دینا ہو گی۔"
شیریں چونکی لیکن انور کی بات اس کی سمجھ میں پوری طرح نہ آسکی۔
"یہ تو ٹھیک ہے کہ وہ میرا دوست ہے۔" انور کچھ سوچتا ہوا بولنے لگا "اسے تحائف دینے کا بھی بہت شوق ہے لیکن اس نے یہ کبھی نہیں چاہا کہ میں سرمائے کی مدد سے اپنے کاروبار کو وسعت دوں لیکن اب اسے یہ کرنا ہی پڑے گا۔ وہ تمہارا دیوانہ ہو گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ اسے ابھی دو ایک دن حیدر آباد میں رکنا ہے۔ وہ یہاں دوبارہ ضرور آئے گا۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ اسے اپنا ایسا اسیر کر لو کہ وہ تمہاری انگلیوں پر ناچنے لگے۔"
شیریں اس کا منہ تکتی رہ گئی۔ وہ تو اس خوف میں مبتلا تھی کہ اگر انور نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی تو اسے ساری زندگی اتنی ٹھوکریں کھانا پڑیں گی جو انور سے شادی نہ ہونے کی صورت میں اسے نہیں کھانا پڑیں۔
"میں بے وقوف قسم کا جذباتی آدمی نہیں ہوں شیریں۔" انور کہتا رہا "میں یہ نہیں کروں گا کہ جو کچھ ہوا' اس کے نتیجے میں تم سے علیحدگی اختیار کر لوں۔ یہ نہ ہوتا تو اچھا تھا لیکن اب ہو گیا ہے تو ہمیں اپنی زندگی بنانے کے لیے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ آج کی سوسائٹی میں اس قسم کا کوئی واقعہ ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے لیکن ہمیں اس سے فائدہ ضرور اٹھانا چاہیے۔ یہ تو بہت بے وقوفانہ بات ہو گی کہ میں جذبات میں آکر تمہیں دنیا کی ٹھوکروں میں پھینک دوں۔ تمہیں تباہی کی طرف دھکیلنے سے مجھے کیا حاصل ہو گا۔ بہتر یہی ہے کہ اس صورتِ حال سے ہم دونوں ہی فائدہ اٹھائیں۔ چلو لیٹو۔"
اور اس رات شیریں کو بہت دیر تک نیند نہیں آسکی۔ کبھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے اور کبھی آنکھیں خشک ہو جاتی تھیں۔ ماں کی موت اور باپ کی دیوانگی نے اسے ایک ایسے مقام پر لے جا کے کھڑا کر دیا تھا۔ جہاں اس کے آگے بھی کھائی تھی اور پیچھے بھی کھائی تھی لیکن اس کی اور انور کی سوچ میں فرق تھا۔ وہ انور کی بات مان کر بھی خود کو ایک کھائی میں ہی گراتی لیکن انور اس کھائی کو ایسا راستہ بنانا چاہتا تھا جس پر چل کر اس کی زندگی بلندیوں تک جا سکتی۔
اور پھر ایسا ہی ہوا کہ دنیا سے ڈری ہوئی شیریں' انور کے اشاروں پر ناچتی رہی۔ انور نے اسے ماڈل بھی بنوا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ بہت سے مالدار لوگوں کی نظر میں بھی آجائے گی اور اس کے ذریعے انور ان لوگوں سے بڑے بڑے فوائد حاصل کرتا رہے گا۔
حیدر آباد سے وہ دونوں کراچی آگئے تھے جہاں انور کو اپنے لیے ایک وسیع میدان مل گیا۔ شیریں نے اپنی قسمت پر صبر کر لیا تھا۔ دھنک بن کر وہ دنیا کی ٹھوکریں کھانے کے

بجائے لوگوں کو اپنی ٹھوکروں میں رکھنے لگی تھی لیکن کبھی کبھی اس کا دل کڑھتا ضرور تھا کہ وہ کس خاندان کی تھی اور کیا بن گئی تھی۔

کراچی آنے کے کچھ عرصے بعد اس نے اپنی دوست غزالہ سے بھی رابطہ کرلیا تھا اور اپنی زندگی کی یہ کہانی بے کم و کاست سنادی تھی۔

○☆○

وہ ساری کہانی سن کر حسنہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا تھا اور سر جھکا کر اس طرح کانپنے لگی تھی جیسے اچانک بخار ہوگیا ہو۔

غزالہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میں نے کہا تھا ناکہ اس کی کہانی تمہیں بہت متاثر کرے گی۔ میں تمہارے بھائی جان کو اس کے بارے میں بتاتے ہوئے اس لیے ہچکچاتی ہوں کہ وہ انور کے پاس جاکر اسے صحیح راہ دکھانے کی کوشش کرنے لگیں گے اور انور ان کے لیے خطرناک ثابت ہوگا۔ اس شخص کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ وہ فطرتاً ایک گھٹیا آدمی ہے۔ شیریں کو اس راہ پر لگانے کے لیے اس نے باقاعدہ منصوبہ بندی کی تھی۔ یہ اتفاق نہیں ہوسکتا کہ شیریں کی بربادی سے صرف دو دن پہلے انور کی ملاقات اپنے دوست ذاکر سے ہو' وہ اس کی بیوی کو ایک قیمتی تحفہ دے' پھر انور شیریں سے کہے کہ اس کے دوست کو کبھی کسی قسم کی شکایت نہیں ہونا چاہیے اور اس کے دو ہی دن بعد شہناز' حیدر آباد' سے چلی جائے۔ اسی روز ذاکر اس کے گھر پر دھمک پڑے اور اسی روز انور کو اپنے دفتر میں زیادہ کام ہوجائے اور وہ گھر نہ آسکے۔ اتنی بہت سی باتوں کو میں اتفاق نہیں سمجھ سکتی۔"

لیکن حسنہ اس وقت ایک اور ہی اتفاق کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ انور کے دوست ذاکر نے شیریں کو پینتالیس ہزار روپے کا تحفہ دیا تھا اور شیریں کو انور نے تاکید کی تھی کہ اس کے دوست ذاکر کو کبھی شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔ بالکل اسی قسم کا واقعہ حسنہ کے ساتھ پیش آچکا تھا۔ اسے شیراز کے دوست ناصر نے اسّی ہزار روپے کا تحفہ دیا تھا۔ گو کہ وہ تحفہ شیراز ہی کے پاس رہا تھا لیکن شادی کے بعد وہ حسنہ کو اس سے مل جاتا اور شیراز نے بھی اس سے کچھ اسی قسم کی بات کہی تھی کہ اگر کبھی ناصر اس کی عدم موجودگی میں گھر آئے تو حسنہ اس کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے۔

حسنہ اسی خیال سے کانپ گئی تھی کہ کیا اس کے ساتھ بھی اسی قسم کے کھیل کی تیاری کی گئی تھی' جیسا کھیل شیریں کے ساتھ کھیلا گیا تھا؟ کیا یہ بات ممکن تھی کہ دو مختلف آدمی' دو مختلف لڑکیوں سے ایک ہی قسم کا کھیل کھیلیں؟

انہی خیالات کے ساتھ حسنہ کو بار بار اس پاگل کا خیال بھی آرہا تھا جسے وہ اپنے بھائی کے گھر کے آس پاس چکراتے دیکھتی رہی تھی۔

"بھابی!" اس نے سر اٹھا کر سنجیدگی سے پوچھا "کیا شیریں کے والد اب بھی پاگل خانے میں ہیں؟"

"مجھے اس کا علم نہیں۔" غزالہ نے کہا "کچھ دن پہلے میں نے بھی شیریں سے اس بارے میں پوچھا تھا لیکن اب تو شیریں بھی' باپ سے اپنی محبت کے باوجود باپ کے بارے میں کچھ نہیں جاننا چاہتی۔ وہ اب خود کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ باپ کے سامنے جائے' اسے اپنا چہرہ دکھائے۔"

"لیکن اگر اس کے والد ٹھیک ہونے کے بعد پاگل خانے سے باہر آجائیں اور انہیں کسی طرح پتا چل جائے کہ شیریں کیا بن چکی ہے.... تو؟"

"میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ وہ پٹھان ہیں۔ یہ صدمہ ان سے برداشت نہیں ہوگا۔ اگر اس صدمے سے خود ان کا ہارٹ فیل نہیں ہوا تو وہ شاید اپنے ہاتھوں سے شیریں کو زندہ دفن کردینا چاہیں گے لیکن تم نے اس پہلو سے کیوں سوچنا شروع کردیا؟"

"جب سے میں یہاں آئی ہوں' آپ کے گھر کے آس پاس ایک ایسے شخص کو چکراتے دیکھتی رہی ہوں۔ جو اگر پاگل نہیں تو کچھ مخبوط الحواس ضرور معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے جو واقعات سنائے ہیں' انہیں سن کر میرے ذہن میں یہ خیال آیا ہے کہ وہ کہیں آپ کی دوست کے والد نہ ہوں۔"

"سلارزی انکل!" غزالہ نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا "نہیں وہ کوئی اور ہوگا حسنہ! اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ سلارزی انکل پاگل خانے سے باہر آچکے ہیں تو اس کا کوئی جواز نہیں کہ وہ میرے گھر کے آس پاس چکرانے لگیں۔"

"کیا آپ کے سلارزی انکل کو اس کا علم ہے کہ آپ ان کی بیٹی کی دوست ہیں؟"

"وہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں لیکن...."

"کیا آپ کا پتا ان کے علم میں ہوسکتا ہے؟" حسنہ نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"میں شیریں کو خط لکھا کرتی تھی۔ ممکن ہے انہوں نے کبھی میرا خط دیکھا ہو۔ میں ان لفافوں کی پشت پر اپنا پتا ضرور لکھا کرتی تھی۔"

"آپ ایک نظر اس مخبوط الحواس شخص کو دیکھ لیجیے

بھابی۔ مجھے بار بار یہ خیال آرہا ہے کہ وہ شیریں کا پتا نہ لگا سکے ہوں اور انہوں نے یہاں کا چکر اس لیے لگانا شروع کیا ہو کہ شیریں ایک دوست کی حیثیت سے شاید کسی وقت آپ سے ملنے آئے۔"

"تم نے میرا ذہن بہت الجھا دیا ہے حسنہ۔" غزالہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"آپ کار میں باہر نکلیں اور آس پاس کا ایک چکر لگا لیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کہیں نہ کہیں آپ کی نظر میں آجائے گا۔ اگر آپ کو اطمینان ہو گیا کہ وہ شیریں کے والد نہیں ہیں تو میرے ذہن سے ایک خلش مٹ جائے گی۔"

"تم نے تو میرے ذہن میں بھی خلش پیدا کر دی ہے۔ میں بھی چاہوں گی کہ یہ خلش میرے ذہن میں نہ رہے۔"

"تو بس کار لے کر نکل جائیے ذرا دیر کے لیے باہر۔"

"میں جاتی ہوں۔" غزالہ نے مضطربانہ انداز میں کہا اور پھر ایک کاغذ پر ایک نمبر لکھ کر حسنہ کو دیتے ہوئے بولی "تم جلدی سے یہ نمبر رنگ کر کے شیریں سے بات کرو۔ اس نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے اس وقت آئے گی۔ اس سے کہنا کہ وہ یہاں کے لیے روانگی سے پہلے میرے فون کا انتظار کرے۔ اگر تمہارا خدشہ درست ہے تو شیریں کا یہاں آنا مناسب نہیں ہو گا۔"

"میں اسے دیکھتی ہوں۔ آپ جلدی سے باہر کا چکر لگا کے آئیے۔"

غزالہ ذہنی طور پر بہت منتشر ہو گئی تھی۔ وہ یہ بھی کر سکتی تھی کہ پہلے خود ہی شیریں کو فون کرتی اور باہر جاتی لیکن اس نے یہ کام حسنہ کے سپرد کر دیا۔

حسنہ نے غزالہ کے جاتے ہی ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف گھنٹی بجی۔ حسنہ انتظار کرنے لگی لیکن جب خاصی گھنٹیوں کے بعد ریسیور نہیں اٹھایا گیا تو حسنہ سمجھ گئی کہ شیریں اپنے گھر سے روانہ ہو چکی تھی۔

حسنہ اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ اسے تمام خیالات کے ساتھ ایک خیال یہ بھی آرہا تھا کہ اگر شیراز اور رانو ایک ہی شخصیت کے دو روپ ہوئے تو یہ اس کے لیے کسی صدمے سے کم نہیں ہو گا لیکن اس صورت میں وہ شیراز کو آسانی سے معاف بھی نہیں کرے گی۔ اس قسم کے شخص کو معاف کر دینا انسانیت کے کسی زمرے میں نہیں آتا تھا جو خوب صورت اور معصوم لڑکیوں کو اپنے جال میں پھنسا کر اپنی آمدنی کا ذریعہ بناتا ہو۔

غزالہ واپس لوٹی تو بوکھلائی ہوئی تھی۔ وہ صوفے پر گر سی پڑی "تمہارا اندیشہ درست نکلا حسنہ۔ وہ وہی ہیں لیکن اگر تمہاری بات میرے ذہن میں نہ ہوتی تو میں انہیں پہچان نہیں پاتی۔ وہ تو بہت سرخ سفید انسان تھے اور بہت صاف ستھرے رہتے تھے۔ تم نے شیریں کو فون کر دیا؟"

"گھنٹی بجتی رہی، کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا۔"

"ارے!" غزالہ کی بوکھلاہٹ میں اضافہ ہوا "اس کا مطلب ہے کہ وہ یہاں کے لیے روانہ ہو چکی ہے۔ یا اللہ! اب کیا ہو گا۔ انکل سلارزی کو یقیناً اسی کی تلاش ہے۔"

"کیا آپ چاہتی ہیں کہ آپ کی دوست اپنے باپ کی نظر میں نہ آئے؟"

"یقیناً۔" غزالہ نے کہا "میں ہرگز نہیں چاہوں گی کہ میرے گھر کا رخ کرنے کی وجہ سے وہ اپنے باپ کی کسی قسم کی کارروائی کا نشانہ بنے۔"

"تو میں آپ کے انکل سلارزی کو فوری طور پر یہاں سے ہٹا سکتی ہوں۔"

"کیسے۔"

"یہ آپ مجھ پر چھوڑیے اور مجھ پر اعتبار کیجیے۔" حسنہ کھڑی ہوتے ہوئے بولی "لیکن جب شیریں یہاں آجائے تو اسے میری واپسی تک روکے رکھیے گا۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔"

غزالہ نے کار کی چابی تپائی پر ڈال دی تھی جو حسنہ نے اٹھالی۔

"کیا سوچ رہی ہو تم۔" غزالہ نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

"اگر آپ اپنی دوست کو بچانا چاہتی ہیں تو مجھ پر اعتبار کیجیے۔ وقت بہت کم ہے۔ مجھے جلد از جلد کچھ کرنا ہو گا۔"

حسنہ جو کچھ کرنا چاہتی تھی، وہ غزالہ کو بتانا مناسب نہیں ہوتا۔ غزالہ اسے اس اقدام سے روکتی جس اقدام کا فیصلہ حسنہ نے کیا تھا۔

کار لے کر وہ وہاں سے چلی۔ رفتار اس نے بہت کم رکھی۔ اس کی نظریں دائیں بائیں کا جائزہ لیتی جا رہی تھیں۔ ایک ڈیڑھ فرلانگ آگے نکل آنے کے بعد اس نے کار واپس موڑی۔ اس سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ اسے غزالہ سے پوچھ لینا چاہیے تھا کہ اس نے سلارزی کو کہاں دیکھا تھا۔

لیکن اس غلطی نے اس کا بہت زیادہ وقت ضائع نہیں کیا۔ سلارزی اسے دکھائی دے گیا۔ حسنہ نے کسی جھجک کے بغیر کار اس کے قریب لے جا کے روک دی۔ وہ اس وقت بالکل خوف زدہ نہیں تھی۔

سلارزی اسے گھورنے لگا۔
"میری کار میں آجاؤ بابا۔" حسنہ نے اس سے کہا۔
سلارزی اسے گھورتے ہوئے بولا "تمہیں مجھ سے ڈر نہیں لگ رہا ہے؟"
"کیوں؟ ڈرنے کی کیا بات ہے؟"
"کیا میں ایک سودائی نہیں معلوم ہو رہا ہوں؟ کیا تم مجھے پاگل نہیں سمجھتیں؟"
"اب نہیں سمجھتی۔" حسنہ نے کہا "مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ تم پر کس بات کا سودا سوار ہے۔ ممکن ہے کہ میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔"
سلارزی اسے خاموشی سے گھورتا رہا۔
"جلدی کرو بابا۔" حسنہ بولی "کچھ لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں زیادہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنوں، تمہیں میری کار میں آجانا چاہیے ورنہ اگر میں تمہارے بغیر چلی گئی تو شاید تم بعد میں الجھتے رہو کہ تمہیں مجھ [illegible] کوئی اہم بات بھی معلوم ہو سکتی تھی۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ میرا تعلق اسی گھر سے ہے جس کی تم نے نگرانی شروع کر رکھی ہے۔"
سلارزی کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں ابھرے لیکن اس کے قدم آہستگی سے حرکت میں آگئے تھے۔ وہ کار [illegible] آیا تو [illegible] نے اس طرف کا دروازہ کھول دیا۔ وہ کار [illegible]
[illegible] حیرت سے دیکھتے رہ گئے تھے کہ ایک [illegible] پاگل سے آدمی کو اپنی کار میں بٹھا لے [illegible]
[illegible] کار [illegible] گلی میں موڑ دی۔ وہ اپنے بھائی کے [illegible] رہنا چاہتی تھی۔ اس میں احتمال تھا کہ [illegible] اپنی کار میں آتی دکھائی دے جاتی۔ حسنہ کو [illegible] ذاتی استعمال کے لیے کار تو ہو گی [illegible]
"[illegible] والدہ ہو نا بابا۔" حسنہ نے پوچھا۔
وہ [illegible] تھا جب سلارزی کے چہرے پر چونکنے کے تاثرات پیدا ہوئے۔
"آپ کی بیٹی کی دوست غزالہ میری بھابی ہیں۔" حسنہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی "آپ یقیناً اپنی بیٹی کی تلاش میں ہیں لیکن آپ اس کی تلاش یہاں کیوں کر رہے ہیں؟"
"میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"
"کیوں؟"
"کوئی باپ اپنی بیٹی سے کیوں ملنا چاہ سکتا ہے؟"
"آپ اس سے اس لیے نہیں ملنا چاہتے کہ اس کی محبت نے آپ کو بے قرار کر دیا ہے۔" حسنہ نے سنجیدگی سے کہا "آپ کے دل میں کچھ اور ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی قصوروار بیٹی کو سزا ضرور ملنا چاہیے تو میں اس میں آپ کی مدد کروں گی لیکن پہلے آپ کو مجھ سے سارے واقعات سننا ہوں گے۔ آپ کو دلیل سے ثابت کرنا ہوگا کہ قصوروار آپ کی بیٹی ہے یا اسے اس کی بدقسمتی نے ایک جہنم میں جھوک دیا ہے۔"
سلارزی خاموش رہا۔
"میں آپ کو تمام حالات سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔" حسنہ نے کہا "اور یہ بھی بتانا چاہتی ہوں کہ میں آپ کے تمام حالات سے بھی آگاہ ہوں۔ آپ کی بیٹی نے میری بھابی کو سب کچھ بتایا تھا اور بھابی سے مجھے معلوم ہوا ہے۔"
حسنہ نے وہ سب کچھ دہرانا شروع کر دیا جو اسے غزالہ سے معلوم ہوا تھا۔ سلارزی خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ سب کچھ بتانے کے بعد جب حسنہ نے سلارزی کی طرف دیکھا تو اس کی سرخ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔
"یہ ہے آپ کی بیٹی کی بدقسمتی کی کہانی۔" حسنہ نے لوہا گرم دیکھ کر ایک گہری ضرب لگائی "اب آپ خود فیصلہ کیجیے کہ مجرم کون ہے۔ وہ شخص جس نے آپ کی بیٹی کو اس جہنم میں پہنچایا یا وہ حالات جنہوں نے آپ کی بیٹی کو راولپنڈی سے لاہور نہیں پہنچنے دیا اور وہ انور جیسے کمینے شخص کے ہاتھ لگ گئی اور اپنی معصومیت میں اس شیطان کو اپنے لیے فرشتہ سمجھ بیٹھی۔"
"انور کہاں ہے؟" سلارزی نے دھیمی آواز میں پوچھا۔
"مجھے ابھی اس کے بارے میں نہیں معلوم لیکن میں اس کا پتا لگا کر آپ کو ضرور بتاؤں گی۔ مجھے شبہ ہے کہ شاید میں بھی اس شخص کو معاف نہ کر سکوں۔"
"کیوں؟ تمہیں اس سے کیا شکایت ہے؟"
"ابھی تو کوئی شکایت نہیں ہے لیکن میں ابھی اس سلسلے کی کوئی بات اپنی زبان پر نہیں لا سکتی۔ کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ آپ کو اپنی بیٹی کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا، وہ کیسے معلوم ہوا؟ اور اب آپ اس کی تلاش میں میرے بھائی کے گھر کے آس پاس کیوں چکرا رہے ہیں؟"
سلارزی چند لمحے خاموشی سے کچھ سوچتا رہا، پھر اپنی بلغم سے کھرکھراتی آواز میں کہنے لگا "پاگل خانے سے جب مجھے رہا کیا گیا، اس سے کچھ دن پہلے ہی میری دماغی حالت ٹھیک

ہوچکی تھی۔ مجھے پڑھنے کے لیے اخبار دیے جانے لگے تھے۔ انہی اخبارات میں مجھے وہ اشتہارات میں نظر آئی۔"

سلار زی نے ہونٹ بھینچ لیے۔ چند لمحے رک کر وہ پھر بولنے لگا "میں نے اس کے بارے میں دو ایک خبریں بھی پڑھیں تو میرا خون کھول اٹھا۔ پھر جب میں پاگل خانے سے رہا ہوا تو میں نے کراچی ہی کا رخ کیا۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری میں مجھے اس کا پتا یا ٹیلی فون نمبر نہیں مل سکا۔ میں بظاہر جو کچھ دکھائی دے رہا ہوں' اس حلیے کی وجہ سے میں کسی سے شیریں کا پتا معلوم کرنا چاہتا تو ناکام رہتا۔ مجھے پاگل سمجھ کر دھتکار دیا جاتا اسی لیے مجھے تمہاری بھابی کے گھر کی تلاش ہوئی تھی۔ مجھے اس کا پتا یاد تھا لیکن میری ذہنی حالت ایسی تھی کہ میں اس کا تو کیا' اپنے ایک دوست کا گھر بھی فوری طور پر تلاش نہیں کرسکا۔ یہ اتفاق ہے کہ جس دن تم نے مجھے پہلی بار دیکھا تھا' اسی دن میں تمہاری بھابی کا گھر تلاش کرنے میں کامیاب ہوسکا تھا اور اس سے صرف ایک دن پہلے شام کو مجھے اپنے دوست کا گھر ملا تھا۔"

"اب تمہارا کیا فیصلہ ہے؟" حسنہ نے پوچھا۔

حسنہ کی ذہنی حالت پوری طرح اس کے قابو میں نہیں تھی۔ اسی لیے وہ سلار زی کو کبھی تو "آپ" کہہ کر مخاطب کرنے لگتی تھی اور کبھی اس کے طرزِ تخاطب میں "تم" آجاتا تھا۔

"میرے فیصلے سے تمہاری کیا مراد ہے؟" سلار زی کی آنکھوں سے آنسو بہنا بند ہوچکے تھے۔

"آپ کسے مجرم سمجھتے ہیں؟"

"یہ سارا جرم تو حالات کا ہے یا میری بدقسمتی کا۔"

"بنیادی جرم تو ان سوداگروں کا ہے جو معصوم لڑکیوں کے حالات کا سودا کرتے ہیں۔"

سلار زی غیر محسوس سے انداز میں سرہلانے لگا۔

"آپ نے مجھے اپنا فیصلہ نہیں بتایا۔" حسنہ پھر بولی۔

"تم نے اچانک مجھ سے ملنے کا فیصلہ کیوں کیا؟" سلار زی نے پوچھا "کیا تم اس وقت مجھے وہاں سے ہٹانا چاہتی تھیں؟ کیا اس وقت وہاں شیریں کو آنا تھا؟"

حسنہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔ سلار زی نے اپنے ذہنی انتشار کے باوجود سمجھ لیا تھا کہ اس وقت حسنہ کا اس سے ملنا بے سبب نہیں تھا اور اس نے سبب کے بارے میں بھی غلط قیاس آرائی نہیں کی تھی۔

"اگر میں اس سوال کا جواب ہاں میں دوں تو؟" حسنہ بولی۔

"تو کچھ نہیں۔" سلار زی نے دھیمی آواز میں کہا "مجھے کہیں بھی اپنی کار سے اتار دو۔ شیریں کو اس کے بدنصیب باپ کا ایک پیغام پہنچا دینا۔"

"کیسا پیغام؟"

"وہ ایک بار مجھ سے مل لے۔ وہ فون کرکے مجھے بتا سکتی ہے کہ ہم بدنصیب باپ بیٹی کہاں مل سکتے ہیں۔"

"آپ کا فون نمبر؟"

"میں اپنے جس دوست کے گھر میں ہوں' وہاں ٹیلی فون ہے۔ مجھے اس کا نمبر نہیں معلوم لیکن آج میں اپنے دوست سے معلوم کرکے تمہیں بتا دوں گا۔ کیا تم اپنا فون نمبر دے سکتی ہو؟"

"ضرور۔" حسنہ نے کار سڑک کے کنارے لگا کر روکی اور ایک کاغذ پر ٹیلی فون نمبر لکھ کر سلار زی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "آپ جہاں کہیں' میں وہاں آپ کو پہنچا دوں۔"

"میں یہیں اتر جاتا ہوں۔" سلار زی نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

حسنہ کچھ نہیں بولی۔ سلار زی کار سے اتر کر حسنہ سے مزید کچھ کہے سنے بغیر تیزی سے ایک طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس کی چال میں شدید اضطراب تھا۔ حسنہ چند لمحے اسے جاتے دیکھتی رہی' پھر کار حرکت میں لے آئی۔

جب وہ گھر پہنچی تو غزالہ کے ساتھ شیریں موجود تھی اور اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ غزالہ نے اسے ساری صورتِ حال بتادی تھی۔

"تم نے بڑی جرأت کا ثبوت دیا ہے حسنہ۔" غزالہ نے اسے دیکھتے ہی کہا "آخر وہ تمہاری کار میں بیٹھ کیسے گئے؟"

"آپ دیکھ رہی تھیں؟"

"میں یہ جاننے کے لیے بے چین تھی کہ تم کیا کرنا چاہتی ہو۔"

"میں نے ان سے بہت سیدھی سیدھی' صاف صاف باتیں کی تھیں۔"

"یعنی؟"

حسنہ نے شروع سے آخر تک سب کچھ بتا دیا۔ شیریں نے بھی اس کا ایک ایک لفظ بڑے غور سے سنا اور اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جب اس نے اپنے باپ کی یہ خواہش سنی کہ وہ اس سے ملنا چاہتا تھا۔

حسنہ اس سے مخاطب ہوئی "جیسے ہی وہ مجھے اپنا ٹیلی فون نمبر بتائیں گے' میں آپ کو اس سے آگاہ کردوں گی۔ فیصلہ کرنا تو آپ کا کام ہے لیکن میں آپ کو مشورہ ضرور دوں گی کہ ان

سے مل ضرور لیجیے۔ مجھے یقین ہے کہ مجھ سے سب کچھ سننے کے بعد ان کا سینہ درد سے بھر گیا تھا۔"

شیریں چپ بیٹھی رہی۔

غزالہ نے بے چینی سے پوچھا "شیریں کے لیے اب ان کے جذبات کیا ہیں؟ میرا مطلب ہے...."

"میں آپ کا مطلب سمجھ رہی ہوں بھائی۔" حسنہ نے غزالہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ مجھ سے ساری کہانی سننے کے بعد انہوں نے سمجھ لیا ہوگا کہ بدقسمتی کے اس سمندر میں ان کی بیٹی کی حیثیت ایک بے بس اور بے سہارا تنکے جیسی تھی۔"

غزالہ نے شیریں سے پوچھا "تم بڑی گہری سوچ میں ڈوب گئی ہو۔"

"میں ایک مرتبہ بابا سے ضرور ملوں گی۔" شیریں نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا "مجھے بس یہ سوچنا ہے کہ میں ان کے سامنے کس طرح جاؤں۔"

حسنہ نے اس سے کہا "آپ مجھے ایک بات بتائیں گی؟"

"پوچھیے۔"

"انور کی تصویر تو آپ کے پاس ہوگی؟ میں وہ دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"نہیں۔" شیریں نے جواب دیا "اس کی کوئی تصویر نہیں ہے میرے پاس۔ میں نے دو ایک مرتبہ چاہا تھا کہ وہ میرے ساتھ تصویر کھنچوائے لیکن وہ اس کے لیے بھی تیار نہیں ہوا۔"

"بہت عجیب معاملہ ہے۔" حسنہ نے تلخی سے کہا "اچھا یہ تصویر دیکھیے۔ یہ اس کی تو نہیں ہے؟" اس نے اپنے پرس میں سے ایک تصویر نکال کر اسے دی۔

"نہیں۔" غزالہ نے تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ انور نہیں ہے۔"

"اس کی تصویر ہے؟" غزالہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"شیراز کی۔" حسنہ نے جواب دیا۔

غزالہ کے چہرے پر حیرت کے آثار دکھائی دیے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آسکا ہوگا کہ شیراز کی تصویر کے بارے میں حسنہ کو یہ خیال کیوں آیا کہ وہ تصویر انور کی ہوگی؟

"اس تصویر کا کیا معاملہ ہے؟" شیریں نے آہستہ سے پوچھا "آپ نے یہ کیوں سمجھا تھا کہ یہ تصویر انور کی ہوسکتی ہے۔"

"ایک حیرت انگیز اتفاق کی وجہ سے۔" حسنہ نے ایک طویل سانس لے کر کہا "بھائی۔ مجھے معاف کردیجیے گا کہ میں نے آپ سے ایک بات چھپائی تھی۔"

"ایسی کیا بات چھپالی کہ معافی مانگ رہی ہو۔"

حسنہ نے اس قیمتی تحفے کے بارے میں بتا دیا جو اسے شیراز کے دوست ناصر نے دیا تھا لیکن فی الحال وہ تحفہ شیراز ہی کے پاس تھا۔

○☆○

تھوڑی دیر بعد شیریں نے رخصت ہونے سے پہلے غزالہ سے کہا "کیا تم میری خاطر باہر کا ایک چکر لگالو گی؟ میں جاننا چاہتی ہوں کہ وہ واپس تو نہیں آگئے۔ میں ان سے ملوں گی تو ضرور لیکن یہ مجھے ابھی سوچنا ہے کہ میں ان کے سامنے کس طرح جاؤں گی۔ یہ شاید مناسب نہیں رہے گا کہ وہ باہر موجود ہوں اور میں یہاں سے نکلوں۔"

غزالہ نے ہمدردی سے شیریں کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "میں جائزہ لے کر آتی ہوں۔"

وہ چلی گئیں۔

"پلیز!" شیریں نے حسنہ سے کہا "آج آپ گھر سے کہیں نہ جائیے گا۔ بابا نہ جانے کس وقت آپ کو فون کریں اور اپنا نمبر بتائیں۔"

"میں...."

حسنہ بات پوری نہیں کرسکی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ حسنہ نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو۔"

"میں تمہاری آواز پہچان سکتا ہوں۔" کھرکھراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"میں نے بھی آپ کی آواز پہچان لی ہے، لیکن مجھے توقع نہیں تھی کہ آپ اتنی جلدی فون کریں گے۔" حسنہ نے جواب دیتے ہوئے شیریں کی طرف دیکھا۔

شیریں سمجھ گئی کہ وہ کس کا فون تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر حسنہ کی طرف دیکھتے ہوئے نفی میں سرہلایا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ حسنہ اس کے باپ کو اس کی موجودگی کے بارے میں بتائے۔

"میرا نمبر لکھ لو۔" حسنہ نے دوسری طرف کی آواز سنی۔

"بولیے!" حسنہ نے کہتے ہوئے قلم سنبھالا اور ٹیلی فون کے قریب رکھے ہوئے پیڈ پر وہ نمبر لکھ لیا جو دوسری طرف سے بتایا گیا تھا۔

نمبر بتانے کے بعد سلارزی نے پوچھا "شیریں ہے یا چلی گئی؟"

"وہ چلی گئی ہیں۔"

"خیر! میں بے دھیانی میں سوال کر بیٹھا۔ وہ ہوگی بھی تو یہی چاہے گی کہ فی الحال مجھے اس کی موجودگی کے بارے میں نہ بتایا جائے۔ اسے میرا سامنا کرنے کے لیے خاصی ہمت کرنا پڑے گی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ سے ملے گی ضرور! اس کے دل میں اپنے بابا کی جو محبت ہوگی' میں اس سے بے خبر نہیں ہوں۔ تم اسے میرے پیغام کے ساتھ یہ نمبر دے دینا۔"

حسنہ کا جواب سنے بغیر دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کردیا گیا۔

شیریں نے بے چینی سے قریب آتے ہوئے پوچھا "کیا ٹیلی فون نمبر ہے؟"

حسنہ نے پیڈ سے کاغذ پھاڑ کر اسے دے دیا۔

"میں کسی وقت تمہیں فون کروں گی۔" شیریں نے کہا "میں نے ابھی ابھی کچھ سوچا ہے۔"

"کیا؟"

"ٹیلی فون کروں گی تو بتاؤں گی۔" شیریں نے کہا "میں اب چلتی ہوں۔ غزالہ کو خواہ مخواہ بھیجا۔ بابا نے یہ فون اپنے دوست ہی کے گھر سے کیا ہوگا۔"

"لیکن بھابی کو واپس تو آجانے دیں!"

"شاید وہ آگئیں۔" شیریں نے کہا۔

باہر کسی کار کے رکنے کی آواز سنائی دی تھی۔

غزالہ نے اندر آکر کہا "وہ آس پاس کہیں نہیں ہیں۔"

"ابھی ابھی ان کا فون آیا تھا۔ وہ کہیں اور ہی ہوں گے۔" حسنہ نے کہا۔

"میں اب چلتی ہوں۔" شیریں نے کہا اور غزالہ سے لپٹ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے "شاید ہم پھر کبھی نہ ملیں۔"

"ایسی باتیں نہ کرو شیریں!" غزالہ بھی جذباتی ہوگئی۔ "خدا پر یقین رکھو' سب ٹھیک ہوجائے گا۔ تمہارے والد اب تمہیں قصوروار نہیں سمجھ رہے ہوں گے۔"

شیریں نے غزالہ اور حسنہ کو خدا حافظ کہا پھر تیزی سے چلتے ہوئے باہر نکل گئی۔ اس کی کار برآمدے کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ حسنہ اور غزالہ برآمدے میں آگئیں۔ انہوں نے شیریں کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ اسے رخصت کرکے وہ کمرے میں لوٹیں تو غزالہ مغموم لیکن حسنہ متفکر تھی۔

"وہ اتفاق مجھے ابھی تک پریشان کیے ہوئے ہے بھابی!" حسنہ نے کہا۔

"تحفے والا؟"

"ہاں۔"

"بعض اوقات ہماری دنیا میں غیر معمولی اتفاقات پیش آتے تو ہیں۔"

"لیکن میں بہت ڈر گئی ہوں۔ آج کل ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی محبت بھی نیلام کردیتے ہیں یا شاید انہیں محبت ہوتی ہی نہیں۔ وہ اپنے گھناؤنے منصوبوں کے تحت لڑکیوں کو اپنے جال میں پھانستے ہیں اور میں شیراز کے بیک گراؤنڈ سے واقف نہ ہونے کے باعث خوف زدہ ہوں۔"

"تمہارے بھائی جان سب کچھ معلوم کرلیں گے۔ تم اپنا دماغ اس پریشانی سے نہ تھکاؤ۔"

"جب تک بھائی جان اس کے بارے میں سب معلومات حاصل نہیں کرلیتے' میں اب اس سے نہیں ملوں گی۔ اگر اس کا فون آیا اور اس نے کہیں ملاقات کے لیے بلایا تو میں کسی بہانے سے ٹال جاؤں گی۔"

"تم نے شیریں کے واقعے کا بہت اثر لے لیا ہے۔ خیر! جیسا تم مناسب سمجھو۔"

حسنہ اس دن اپنے کمرے میں ہی پڑی رہی۔

جبران شام کو دفتر سے آنے کے بعد اسلام آباد جانے لگا تو غزالہ اسے چھوڑنے کے لیے ائرپورٹ جانا چاہتی تھی۔ اس نے حسنہ سے بھی کہا لیکن حسنہ نے اپنا سر بھاری ہونے کی وجہ سے معذرت کرلی۔

غزالہ اور جبران کو گئے ہوئے پندرہ منٹ گزرے تھے کہ اس ٹیلی فون کی گھنٹی بجی جو حسنہ اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ حسنہ کو ریسیور اٹھاتے ہوئے ڈر لگنے لگا۔ وہ کال شیراز کی بھی ہوسکتی تھی۔ جب گھنٹی بجتی ہی رہی تو حسنہ کو ریسیور اٹھانا پڑا "ہیلو!" اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"بڑی دیر میں ریسیور اٹھایا۔" شیریں کی آواز آئی "میں تو سمجھی تھی کہ تم چلی گئی ہو۔ اچھا ہوا کہ مل گئیں۔"

"کوئی خاص بات؟"

"غزالہ کہاں ہے؟"

"بھائی جان اسلام آباد گئے ہیں۔ بھابی انہیں چھوڑنے ائرپورٹ گئی ہیں۔"

"اوہ!" شیریں کچھ رکی پھر اس نے کہا "کیا تم غزالہ کی اجازت کے بغیر گھر سے نکل سکتی ہو؟"

"ہاں ہاں' کیوں نہیں؟ کوئی خاص بات؟"

"میں چاہتی ہوں کہ تم ٹھیک ایک گھنٹے بعد میرے فلیٹ

پر آجاؤ۔"

"خیریت تو ہے نا؟"

"میں نے بابا کو یہیں بلایا ہے۔" شیریں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "اگر تم بھی اس وقت یہاں موجود رہو تو....."

"ہاں ہاں۔ میں آجاؤں گی۔" حسنہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اس کے خیال کے مطابق شیریں اپنے باپ کا سامنا کرتے وقت کسی ہمدرد کا سہارا چاہ رہی تھی۔

"وقت کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔ اب سے ٹھیک ایک گھنٹے بعد یہاں پہنچ جاؤ۔"

"میں نے تمہارا گھر نہیں دیکھا۔"

"بہت آسانی سے پہنچ جاؤ گی' میں پتا بتاتی ہوں۔"

پتا واقعی آسان تھا لیکن حسنہ نے فوراً ہی بستر چھوڑ دیا۔ اس نے سوچا تھا کہ بعض اوقات آسان پتا تلاش کرنے میں بھی کچھ دیر لگ جاتی ہے۔ ابھی اسے تیاری میں بھی کچھ وقت لگتا اور پھر اسے جانا بھی ٹیکسی میں تھا۔ کار اس وقت جبران اور غزالہ لے گئے تھے۔

شیریں کی تاکید کی وجہ سے حسنہ نے ایک منٹ بھی ضائع نہیں کیا تھا اس لیے جب وہ ٹیکسی میں شیریں کے فلیٹ کے دروازے پر پہنچی تو اسے تاخیر نہیں ہوئی تھی۔ وہ دو منٹ پہلے ہی پہنچ گئی تھی۔

کال بیل کا بٹن دبانے کے صرف ایک منٹ بعد دروازہ کھل گیا۔

"شکر ہے کہ تم بروقت آگئیں!" شیریں نے کہا "آؤ۔"

وہ اندر داخل ہوئی۔ وہ کمرا ڈرائنگ روم تھا۔ اندرونی سمت میں اس کے دو دروازے تھے۔ ایک دروازے کے پیچھے سے ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے وہاں ایک سے زیادہ آدمی ہوں۔

"کسی اور کو بھی بلایا ہے؟" حسنہ نے پوچھا۔

"ہاں۔" شیریں نے کہا اور بیرونی دروازہ بھیڑ کر حسنہ کا ہاتھ تھامے اسی دروازے کی طرف بڑھی جس کے پیچھے سے آوازیں آرہی تھیں۔

حسنہ کچھ مضطرب ہوگئی۔ وہ اندازہ لگا رہی تھی کہ شیریں نے اس وقت وہاں کس کو بلایا ہوگا؟

شیریں نے دروازہ کھولا اور حسنہ کو لیے ہوئے دوسری طرف پہنچی۔

وہ ٹی وی لاؤنج تھا۔ وہاں لگے ہوئے مخصوص قسم کے صوفوں پر بیٹھے ہوئے دو آدمی شراب نوشی میں مصروف تھے۔ گلاس ان دونوں کے ہاتھوں میں تھے۔ حسنہ ان دونوں کو پہچان گئی۔ ان میں سے ایک شیراز اور دوسرا اس کا دوست ناصر تھا۔

حسنہ اس منظر کو دیکھ کر دروازے پر ہی ساکت رہ جاتی لیکن شیریں اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے اسے تقریباً زبردستی ہی ان دونوں کے قریب لے گئی۔ حسنہ کو دیکھتے ہی شیراز اور ناصر کے ہاتھوں سے شراب کے گلاس گرتے گرتے بچے تھے۔

شیریں نے حسنہ کی طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا "اچھا ہوا تم اس وقت مجھ سے ملنے آگئیں۔ بہت اشتیاق تھا تمہیں میرے شوہر سے ملنے کا۔ یہ ہیں میرے شوہر انور۔" اس نے ناصر کی طرف اشارہ کیا "اور یہ ان کے دوست ذاکر۔" اس مرتبہ اشارہ شیراز کی طرف تھا۔ "میں نے تمہیں وہ قیمتی سیٹ دکھایا تھا نا؟ وہ انہوں نے ہی مجھے شادی کا تحفہ دیا تھا۔"

حسنہ کی سانسیں پھول گئی تھیں۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر شیراز کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اس نے شیریں کو اس کی تصویر دکھائی تھی اور شیریں نے ٹھیک ہی جواب دیا تھا کہ وہ اس کا شوہر انور نہیں ہے۔ وہ تو شیراز کو ذاکر کے نام سے جانتی تھی اور اس نے یقیناً سمجھ لیا ہوگا کہ اب ذاکر یا شیراز' جو کچھ بھی اس کا نام تھا' اس نے حسنہ کے ساتھ وہی کھیل کھیلنے کی تیاری کرلی تھی جو کھیل خود اس کے ساتھ انور نے کھیلا تھا۔ وہ بس اسی ایک بات سے ناواقف ہوگی کہ حسنہ کو تحفہ دینے والا انور دراصل ذاکر تھا لیکن اس صورتِ حال میں حسنہ یقین سے نہیں سمجھ سکتی تھی کہ ان دونوں کے اصل نام کیا تھے' شیراز یا ناصر یا انور اور ذاکر؟

"ارے!" شیریں پھر ہنسی "آپ لوگ اس طرح ایک دوسرے کی طرف ٹکٹکی باندھے کیوں دیکھنے لگے؟ کیا آپ لوگ ایک دوسرے سے واقف ہیں؟"

انور یا ناصر' یا جو کچھ بھی اس کا نام تھا' اپنی جگہ سے اٹھا لیکن ڈگمگا گیا۔ وہ یا وہ دونوں ہی خاصی پی چکے تھے یا حسنہ نے شاید اپنے کسی منصوبے کے تحت انہیں زیادہ پلادی تھی۔

ڈگمگاتے ہوئے اس نے شراب کا گلاس دیوار پر مار کے توڑ دیا اور شیریں کی طرف دیکھتے ہوئے دانت پیس کر بولا۔ "کمینی عورت!..... تو نے میری اجازت کے بغیر اپنی اس دوست کو یہاں....."

"میں نے اسے جان بوجھ کر بلایا ہے۔" شیریں سنجیدہ ہوگئی "میں نہیں چاہتی کہ میری طرح ایک اور معصوم لڑکی بھی تم دونوں کے شیطانی جال میں پھنس جائے۔"

"کتنے خوب صورت ہو تم!" حسنہ نے شیراز کی طرف دیکھتے ہوئے حقارت سے کہا "اور اندر سے اتنے بدصورت

کہ دیکھ کرتے ہو جانا چاہیے۔"

"دیکھو حسنہ!" شیراز نے لکنت آمیز لہجے میں کہا "بات اب کھل ہی گئی ہے تو اب تم اپنا راستہ ناپو' دفع ہو جاؤ یہاں سے!"

"لیکن اس کو تو سزا ملے گی۔" ناصر یا انور نے شراب کی بوتل اٹھائی۔ اس کا ہاتھ بلند ہوا تو شراب اس کا لباس بھگونے لگی لیکن اس نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ بوتل کو پوری طاقت سے شیریں کے سر پر دے مارنا چاہتا تھا لیکن اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ کمرے میں سنسناہٹ سی ہوئی تھی اور پھر دوسرے ہی لمحے ایک "ڈارٹ" ناصر یا انور کی دائیں آنکھ میں پیوست نظر آیا۔ اس کے منہ سے بڑی بھیانک چیخ نکلی۔ بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ایک طرف گری۔ اس کا جسم جھٹکا کھا گیا تھا لیکن وہ گرتے گرتے بچ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھ میں پیوست "ڈارٹ" کو پکڑ کر کھینچ لیا۔ اس کا یہ عمل اضطراری تھا۔ اس کے منہ سے پھر ایک چیخ نکلی "ڈارٹ" اس کی آنکھ سے نکل آیا لیکن اس کی آنکھ پھوٹ چکی تھی اور اس سے خون بہہ نکلا تھا۔

شیراز' حسنہ اور شیریں' تینوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ شیراز اس دیوانے سے شخص کو نہیں پہچان سکا ہوگا لیکن حسنہ اور شیریں کے لیے سلارزی کی شخصیت اجنبی نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ میں دبا ہوا' چار پروں والا دوسرا "ڈارٹ" بھی سنسناتا ہوا اس کے ہاتھ سے نکلا اور انور یا ناصر کی دوسری آنکھ میں پیوست ہو گیا۔ کمرے میں ایک بھیانک چیخ پھر گونجی۔ چیخ کے ساتھ ہی وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔

حسنہ اور شیریں کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔

شیراز بوکھلائے ہوئے سے انداز میں سلارزی کی طرف جھپٹا لیکن سلارزی نے بڑی پھرتی کے ساتھ ایک اور "ڈارٹ" پھینکا جو شیراز کی بائیں آنکھ میں پیوست ہو گیا۔ اس مرتبہ ناصر کی چیخوں میں ایک چیخ شیراز کی بھی شامل ہو گئی تھی۔

سلارزی کے چہرے پر اس وقت بھی کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ اس نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے شیریں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بیٹی! میں نے تیری بربادی کے ذمے دار کو تو اندھا کر دیا ہے۔ اب یہ کسی لڑکی کو بری نیت سے دیکھنے کے قابل نہیں رہا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ میرے پاس تین ہی ڈارٹ تھے ورنہ اس دوسرے شخص کی دوسری آنکھ بھی سلامت نہ رہتی۔"

"بابا!" شیریں کی آنکھوں میں آنسو تھے "میں نے اس وقت آپ کو اسی لیے بلایا تھا کہ آپ بھی ان دونوں کو دیکھ لیں جنہوں نے میری زندگی تباہ کی تھی۔"

"اس تباہی کے بعد تجھے اپنے آپ کو ختم کر لینا چاہیے تھا بیٹی!"

"بابا!" شیریں بلکتے ہوئے آگے بڑھی اور سلارزی کے سینے سے لگ گئی۔

حسنہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ناصر فرش پر بری طرح پچھاڑیں کھا رہا تھا اور شیراز ایک صوفے سے ٹکا اپنی بچی ہوئی آنکھ سے بڑے خوف زدہ انداز میں سلارزی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی پھوٹی ہوئی آنکھ خون بہا رہی تھی لیکن اس میں تکلیف ضبط کرنے کا حیرت انگیز مادہ تھا۔

سلارزی نے شیریں کی پیٹھ تھپکی اور پھر اس کا چہرا اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ "اب یہ معاملہ شہرت پائے گا تو اب تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ تجھے اب تو مر ہی جانا چاہیے۔"

"اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دو بابا!" شیریں نے بلک کر کہا۔

"مجھے ایسا کرنا ہی پڑے گا تو خود کشی کی ہمت تو کر نہیں سکے گی۔" سلارزی کے دونوں ہاتھ شیریں کی گردن پر پہنچ گئے۔

حسنہ نے اس طرح جھرجھری لی جیسے کسی بھیانک خواب سے چونکی ہو۔

"بابا!" وہ چیختے ہوئے سلارزی پر جھپٹی۔

سلارزی نے دونوں ہاتھوں سے شیریں کا گلا دبانا شروع کر دیا تھا اور شیریں ذرا بھی مزاحمت نہیں کر رہی تھی۔

"تجھے مرنا ہی ہوگا میری پیاری بچی!" سلارزی کی سرخ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اس کا سپاٹ چہرہ پہلی مرتبہ غم زدہ نظر آیا۔

"بابا!" حسنہ نے چیختے ہوئے سلارزی کے ہاتھ پکڑے اور انہیں کھینچ کر شیریں کی گردن سے الگ کرنا چاہا لیکن ناکام رہی۔ اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ بوڑھے سلارزی کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت ختم کر سکتی۔ اس وقت ان بوڑھے ہاتھوں میں جنون کی طاقت بھری ہوئی تھی۔

"اسے چھوڑ دو بابا!" حسنہ وحشت میں سلارزی کو نوچنے کھسوٹنے لگی۔

سلارزی نے شیریں کو چھوڑ دیا۔ وہ گرنے لگی۔ وہ مرچکی تھی۔ سلارزی نے اس کے گرتے ہوئے جسم کو اپنے ہاتھوں پر سنبھالا اور آہستہ آہستہ فرش پر بیٹھتے ہوئے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اب وہ پھوٹ پھوٹ کر' بلک بلک کر رو رہا تھا۔

حسنہ نے اپنا سر دیوار سے ٹکرا دیا۔ وہ بھی بلک بلک کر رونے لگی تھی۔

یکایک سلارزی کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس نے شیریں کا سر آہستگی سے فرش پر رکھا اور اٹھ کر ایک ڈارٹ اٹھالیا جو ناصر نے اپنی آنکھ سے نکال کر پھینکا تھا۔

"تیری دوسری آنکھ بھی ختم کی جاسکتی ہے۔" سلارزی بڑبڑاتا ہوا شیراز کی طرف بڑھا۔

"نہیں۔" شیراز چیختا ہوا بوکھلا کر اٹھا۔

سلارزی جھپٹ کر اس کے سر پر پہنچا اور ڈارٹ کسی چاقو کی طرح شیراز کی دوسری آنکھ میں اتار دیا۔

کمرے کی ویرانی میں شیراز کی چیخ پھر گونجی۔ ویرانی سی اس لیے ہوگئی تھی کہ ناصر سے تکلیف کی شدت برداشت نہیں ہوئی تھی اور وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔

"میں تم دونوں کو قتل بھی کرسکتا تھا۔" سلارزی نے کہا "لیکن کسی سے انتقام لینا ہو تو اسے قتل کرنا احمقانہ بات ہے۔ اب تم دونوں زندہ رہو گے اور ہمیشہ ٹھوکریں کھا کھا کر اپنے کرتوت یاد کرتے رہو گے۔ میری بیٹی تو مرکر سکون کی دنیا میں جاچکی ہے اور میں اس لیے پھانسی کے تختے تک جاؤں گا کہ تم جیسے لوگ مجھے دیکھیں تو ان کی روح لرز اٹھے۔"

حسنہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات جاری تھی۔

○☆○

ٹیلی فون ریسیو کرنے کے بعد توصیف نے بوکھلائے ہوئے انداز میں عائشہ سے کہا "میں پولیس اسٹیشن جارہا ہوں۔ سلارزی گرفتار ہوگیا ہے' گرفتار کیا ہوگیا ہے' اس نے خود ہی کو پولیس کے حوالے کیا ہے۔ اس کی جیب سے پولیس کو ایک کاغذ ملا تھا جس پر میرا ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا تھا۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ!" عائشہ کے منہ سے نکلا۔

"واپس آکر ہی تفصیل بتاسکوں گا۔ ابھی تو پولیس انسپکٹر نے مجھے بھی کچھ زیادہ نہیں بتایا ہے۔"

"اللہ خیر کرے۔" عائشہ' توصیف کے ساتھ دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولی "اگر دیر ہوجائے تو فون ضرور کردیجئے گا۔"

توصیف نے سرہلایا اور رخصت ہوگیا۔

عائشہ کمرے میں آکر بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ یہ بات اس کے علم میں بھی تھی کہ اسی دن سلارزی نے گھر آکر توصیف سے ٹیلی فون نمبر مانگا تھا اور بعد میں ٹیلی فون پر اس کے لیے کسی لڑکی کی کال بھی آئی تھی۔ سلارزی نے ہی وہ نمبر اس لڑکی کو دیا ہوگا لیکن عائشہ کو اس کا علم نہیں تھا کہ سلارزی نے اس لڑکی کو وہ نمبر کس طرح دیا ہوگا۔ اس نے گھر کا ٹیلی فون تو استعمال کیا نہیں تھا۔ توصیف سے ٹیلی فون نمبر لے کر وہ گھر سے چلا گیا تھا۔

عائشہ ایک گھنٹے ٹہلتی ہی رہی اور پھر توصیف کا فون آیا "مجھے دیر لگ سکتی ہے عائشہ! معاملہ بہت گمبھیر ہے۔ تفصیل میں گھر آکر ہی بتاؤں گا۔ فون اسی لیے کردیا کہ تمہیں پریشان ہونے سے بچاؤں۔"

لیکن توصیف کا مقصد پورا نہ ہوسکا۔ اس بات سے عائشہ کی پریشانی اور بڑھ گئی کہ معاملہ گمبھیر تھا۔

پھر کوئی دو گھنٹے بعد توصیف واپس آیا۔ وہ بہت مغموم نظر آرہا تھا۔ اس نے تھکے ہوئے انداز میں ایک کرسی پر گرتے ہوئے کہا "سلارزی نے دو آدمیوں کی آنکھیں پھوڑ دی ہیں اور اپنی بیٹی کو گلا گھونٹ کر مار دیا ہے۔"

"کیا!" عائشہ اچھل پڑی۔

توصیف نے اثبات میں سرہلایا اور پھر اپنی بیوی کو

سارے واقعات بتانے لگا۔ ان واقعات کا علم اسے پولیس اسٹیشن پر ہی ہوا تھا۔ اس نے عائشہ کو جو کچھ بتایا' اس میں حسنہ کی کہانی بھی شامل تھی۔

"وہ بے چاری اسپتال میں ہے۔" توصیف نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا ہے۔"

عائشہ وہ سب کچھ سن کر روہانسی نظر آنے لگی تھی۔

توصیف کچھ رک کر بولا "مجھے دیر صرف اس لیے ہوئی کہ میں اپنے ایک دوست کے گھر گیا تھا جو وکیل ہے۔"

"وکیل کیا کرسکے گا!" عائشہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "جب سلارزی بھائی خود سب اعتراف کرچکے ہیں اور اپنے بیان میں کسی قسم کی تبدیلی کے لیے تیار نہیں تو ان کے بچاؤ کی کوئی صورت کیسے نکل سکتی ہے!"

"ذرا میرے ساتھ تو آؤ۔" توصیف اچانک کھڑا ہوا۔

"کہاں؟"

"آؤ تو۔"

توصیف اسے اس کمرے میں لے گیا جہاں اس نے سلارزی کو ٹھہرایا تھا۔ اس نے دیوار پر آویزاں فریم اتارا اور دیوار کا جائزہ لینے لگا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" عائشہ نے پوچھا۔

"ایسے ہی خیال آیا تھا کہ شاید نشان رہ گیا ہو!"

"پتا نہیں کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"تین ڈارٹ تھے سلارزی کے پاس! یہاں سے فریم اتار کر وہ دائروں کا بورڈ لٹکایا کرتا تھا اور پھر ڈارٹ سے اس پر نشانہ بازی کیا کرتا تھا۔ رات کو ہماری نیند جن آوازوں سے اچاٹ ہوئی تھی' اس کا سبب یہی تھا۔"

"لیکن سلارزی بھائی یہ مشق کیوں کیا کرتے تھے؟ انہیں اس وقت تو نہیں معلوم تھا کہ انہیں کسی کی آنکھیں پھوڑنے کا قدم اٹھانا ہے؟"

"ہاں۔" توصیف..... نے ٹھنڈی سانس لی "اس کی وجہ کچھ اور تھی۔ میں حوالات میں سلارزی سے کافی باتیں کرچکا ہوں۔ اسی نے بتایا تھا کہ یہ اس کی بہت پرانی عادت ہے۔ جب وہ کسی ذہنی انتشار میں ہوتا تھا تو خود کو اس مشغلے میں الجھالیا کرتا تھا۔ جب وہ اپنے گھر سے کراچی کے لیے چلا تھا تو ڈارٹ اور بورڈ اپنے گھر سے لے کر چلا تھا۔ اس کے خاکی تھیلے میں یہ چیزیں بھی رہتی تھیں۔ یہ محض ایک اتفاق ہے کہ اس کا یہ مشغلہ اس کی مشق کا سبب بنا اور اس نے بڑی آسانی سے ان دونوں کو اندھا کردیا۔ آؤ۔"

وہ دونوں اپنے کمرے میں لوٹ آئے۔

اس رات ان دونوں ہی کو ٹھیک سے نیند نہ آسکی۔ سلارزی کی باتیں ہوتی رہیں۔

"کیا ان کے بچنے کا کوئی امکان ہے؟" عائشہ نے پوچھا۔

"کوئی امکان نظر نہیں آتا۔" توصیف نے ٹھنڈی سانس لی "اور یہ اچھا ہی ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ!"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں عائشہ! سلارزی سے میرے تعلقات بہت گہرے تو نہیں رہے لیکن آج مجھے ایسا محسوس ہورہا ہے جیسے میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں اسی لیے میری خواہش ہے کہ اسے پھانسی ہوجائے۔"

"پاگلوں جیسی باتیں کررہے ہیں آپ!"

"غور کروگی تو یہ پاگلوں جیسی بات نہیں معلوم ہوگی۔ بعض اوقات حالات ایسے ہوتے ہیں کہ جن سے محبت ہو' ان کی موت کی خواہش ہونے لگتی ہے۔ سلارزی اگر بچ گیا تو مر مر کر زندہ رہے گا' تڑپ تڑپ کر زندہ رہے گا۔ اس کا ایک پل زندگی ہوگی تو دوسرا پل موت ہوگی۔ اس سے بہتر ہے کہ وہ سکون کی دائمی نیند سوجائے۔ ایسی ہی نیند وہ اپنی بیٹی کو سلا چکا ہے۔"

عائشہ چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر بولی "بڑی بیٹی کی انہوں نے شادی کردی تھی۔ اسے....."

"چھوڑو بھی!" توصیف نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا "باپ کی طرف سے کوئی اطلاع ملنے پر اسے فکرمند ہونا چاہیے تھا لیکن امریکا جیسے ملکوں میں جاکر انسان خود ہی اس طرح گم ہوجاتا ہے کہ اسے کسی کی یاد نہیں آتی۔"

"بے بنیاد بدظنی تو ٹھیک نہیں ہوتی۔ ہوسکتا ہے وہ بے چاری خود کسی پریشانی میں گرفتار ہو۔"

"بعد میں اس کا بھی پتا کرلیا جائے گا۔ اچھا اب سونے کی کوشش کرو۔ صبح اٹھنا بھی جلدی ہے۔"

عائشہ چپ ہوگئی۔

دوسرے دن توصیف نے اٹھتے ہی کسی کو فون کیا اور مختصر سی بات کرکے بند کردیا۔ "ابھی اس بدنصیب لڑکی حسنہ کی بھابی سے بات ہوئی ہے۔" اس نے عائشہ کو بتایا "وہ اسپتال سے گھر آگئی ہے لیکن ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ اسے پوری طرح سنبھلنے میں کچھ دن لگیں گے۔ بہت گہری چوٹ کھائی ہے اس نے اپنے دل پر اور جب محبت زخمی ہوجائے تو بڑی دیر میں سکون ملتا ہے۔ اس نے شیراز کو دل و جان سے چاہا تھا۔"

ہیروں کا مدفن
جنگ دل ربا
جنون
پرخار راستے
شکستہ گڑیا
زخمی محبت